بسم اللہ الرحمن الرحیم

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ

اَجوِبۂ اربعین

در

ردِّ روافض

شیعہ کے چالیس سوالات کے جوابات

از

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ
بانی دارالعلوم دیوبند

مقدمہ

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان سواتی مدظلہ العالی
بانی، مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

ادارہ نشرو اشاعۃ مدرسہ نصرۃ العلوم
گوجرانوالہ ○ پاکستان

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (انعام)

اجوبہ اربعین

ردّ روافض

حصّہ اوّل

از: حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

واز

حضرت مولانا عبداللہ انصاریؒ سابق ناظم شعبہ دینیات علی گڑھ کالج

مقدّمہ

حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب مدظلہ سواتی بانی مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

(حقوق طبع مع اضافات وحواشی بحق ادارہ محفوظ ہیں)

نام کتاب ــــــــ اجوبہ اربعین

مصنف ــــــــ حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

مقدمہ ــــــــ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی

مصحح ــــــــ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید صاحب سواتی، مولانا حافظ محمد صاحب، مولانا مفتی محمد عیسیٰ صاحب، مولوی محمد اشرف صاحب

مطبع ــــــــ فائن بکس پرنٹرز لاہور

تاریخ طباعت اوّل ــــــــ صفر المظفر ۱۴۰۲ھ بمطابق دسمبر ۱۹۸۱ء

سرورق ــــــــ سید انور حسین شاہ صاحب نفیس رقم لاہور

ناشر ــــــــ ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

تعداد ــــــــ ۵۰۰

قیمت ــــــــ ۹۰

تاریخ طبع ثانی ــــــــ جمادی الثانی ۱۴۱۳ھ، بمطابق دسمبر ۱۹۹۲ء

ملنے کے پتے

ــــ مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ

ــــ ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

فہرس اجوبہ اربعین حصہ اوّل

فہرس اجوبہ اربعین حصہ دوم

تقریظ مولوی محمد ناظر حسن
مدرس اوّل مدرسہ عربی میرٹھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہزار حمد و سپاس اس خدائے لایزال کو جس نے اپنے دین متین کو آیات محکمات سے محکم فرمایا۔ اور کافہ انام خصوص اہلِ اسلام کو ان آیات کی اتباع کا حکم فرمایا اور درود نامحدود اس جناب رسالت مآب پر جس نے گم گشتانِ ضلالت کو راہِ ہدایت پر چلایا اور اس کی آل و اصحاب پر جنہوں نے اسی کے دین متین کو اطراف بلاد میں پھیلایا۔ امّا بعد!

جملہ متبعین سنت و جماعت کو مژدہ ہو اور تمام اہلِ تشیع کو تنبیہ کہ وہ اٹھائیس ۲۸ سوالات جو بعض اہل تشیع نے گھڑ کر جناب فاضلِ اجل عالم باعمل مرجع علماء شرع متین مظہر علوم مرسلین کشاف دقائق وضاح حقائق سالک مسالک شریعت عارف معارف طریقت عمدۃ الافاضل والاعاظم جناب مولانا مولوی محمد قاسم نانوتوی مرحوم و مغفور کی خدمت میں پیش کئے تھے جناب ممدوح نے بسبب اس کے کہ یہ وہی سوالات ہیں کہ جن کے علماء اہلسنت نے بارہا جواب دیئے ہیں۔ فقط ان کا رنگ و روپ بدل دیا ہے۔ اپنے اوقاتِ عزیز کو تحریر جوابات میں ضائع کرنے سے انکار فرمایا۔ مگر بعض بزرگارانِ دین کا تقاضا اور نیز احباب کا اصرار بدرجہ غایت پہنچا۔ تو اس پر مولانا مرحوم نے قلم سنبھالا نہایت عجلت کے ساتھ ایک شب و روز میں ان کے جوابات پورے فرمائے۔ حسب مشورہ ارباب شوریٰ بغرض تعمیم افادہ ان کے چھپوانے کی تجویز ہوئی اس کے دو حصے کئے گئے۔ اول حصہ میں مولانا مرحوم کے جوابات دندان شکن تحریر ہیں علاوہ بریں مولوی عبداللہ انبیھٹوی خلف مولوی انصار علی کے جوابات بھی جو کتب احادیث و قرآن مجید سے لکھے گئے ہیں اور اہل نقل کے لیے باعثِ تسکین قلب ہیں اس میں لعد جوابات مولانا مرحوم کے لکھے گئے ہیں دوسرے حصے میں فقط مولانا مرحوم ہی کی تحریرات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

(از: احقر عبد الحمید سواتی خادم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہٖ سیدنا محمد وآلہٖ واصحابہٖ واتباعہ اجمعین

اما بعد!

انیسوی صدی عیسوی (تیرویں صدی ہجری) میں امام ولی اللہ دہلویؒ کی جماعت کے پسماندہ لوگوں میں برصغیر (ہندو پاک) میں ایک حکیم عالم پیدا ہوا جن کا نام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھا یہ عالم مجدد دین و مجدد علوم و فنون تھا۔ یہی عالم دار العلوم دیوبند کا بانی مبانی اور علوم اسلامیہ کی از سر نو اشاعت کرنے والا عظیم المرتبت عالم دین اور کامل درجہ کا ولی اور خدا پرست تھا۔ آج کے برصغیر میں دینی۔ مذہبی۔ اخلاقی اور علمی قوت کا سب سے اچھا سرمایہ وہی لوگ ہیں جو مولانا محمد قاسمؒ اور انکی جماعت کے توسط سے امام ولی اللہؒ سے مربوط ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ گذشتہ پوری صدی میں اس پایہ کا کوئی حکیم عالم پیدا نہیں ہوا تو یقیناً مبالغہ نہ ہوگا۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کس پایہ کے عالم تھے یہ بات ان کی تصنیفات سے ظاہر ہوتی ہے اور ان کے تلامذہ اور مدارس و مکاتب کا علمی نظام اور وہ تحریکات اور اصلاحات جو برصغیر کے کونے کونے پر پھیلے ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے۔ جسطرح ہم امام ولی اللہؒ کے تجدیدی اور تحقیقی کارنامے اُن کی کتابوں سے معلوم کر سکتے ہیں۔ اور ان کے وسیع و عریض اثرات سے جو برصغیر

میں بالخصوص اور تمام عالم میں بالعموم پھیلے ہوئے ہیں اُن سے دریافت کر سکتے ہیں۔ اسی طرح حضرت نانوتویؒ کی کتب و رسائل کا مطالعہ کرنے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عقلی اور ذہنی طور پر کتنے بلند مرتبہ عالم دین تھے۔

آپ کے رفیق حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نے جو آپ کی ایک مختصر سی سوانح عمری لکھی ہے اسی میں درج بعض واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا نانوتویؒ کو ابتدا ہی سے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ مثلاً حضرت نانوتویؒ نے ایام طفلی میں ایک خواب دیکھا کہ "گویا میں اللہ جل شانہٗ کی گود میں بیٹھا ہوں"۔ حضرت نانوتویؒ کے دادا نے اس خواب کی یہ تعبیر بیان کی کہ تم کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے گا۔ اور تم بہت بڑے عالم ہوگے۔

اسی طرح ایام طالب علمی میں حضرت نانوتویؒ نے خواب میں دیکھا کہ "میں خانہ کعبہ کی چھت پر کھڑا ہوں اور مجھ سے نکل کر ہزاروں نہریں جاری ہو رہی ہیں"۔ حضرت مولانا محمد یعقوبؒ کے والد گرامی اور حضرت نانوتویؒ کے استاذ مکرم مولانا مملوک علیؒ سے جب اس خواب کا ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ "تم سے علم دین کا فیض بکثرت جاری ہوگا"۔

حضرت نانوتویؒ جب سفر حج پہ گئے تھے تو آپ کے پیر و مرشد حضرت مولانا حاجی محمد امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے مولانا محمد قاسمؒ کے متعلق فرمایا تھا کہ "ایسے لوگ کبھی پہلے زمانہ میں ہوا کرتے تھے اب مدتوں سے نہیں ہوتے"۔ (سوانح مذکور) اور پھر حضرت حاجی صاحبؒ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ مولوی صاحب کی تحریر و تقریر کو محفوظ رکھا کرو۔ اور غنیمت جانو"۔ (سوانح مذکور)

اور حضرت حاجی صاحبؒ نے مولانا نانوتویؒ کے والد جناب اسد علی صدیقیؒ سے بھی فرمایا تھا کہ بھائی اسد علی مبارک ہو خدا تعالیٰ نے تمہیں ایسا فرزند عطا فرمایا ہے جو ولی کامل ہے۔ مولانا نانوتویؒ کے کمال حافظہ کا حال یہ تھا کہ تراویح میں قرآن کریم سنانے کے بعد فرمایا کہ "فقط دو سال صرف رمضان کے مہینے میں قرآن کریم یاد کیا ہے"۔

عبادت کا حال یہ تھا کہ اکثر تمام رات تنہا نوافل میں قرآن کریم پڑھتے رہتے تھے ایک رات ایک رکعت میں ستائیس پارے پڑھے تھے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ماہ شعبان (یا رمضان) ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں پیدا

ہوئے تھے۔ تاریخی نام خورشید حسین ہے۔ اور آپ کی وفات ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ ۱۵ اپریل ۱۸۸۰ء بعد نماز ظہر بروز جمعرات واقع ہوئی۔ حضرت مولانا سید فخر الحسن گنگوہیؒ نے انتصار الاسلام کے مقدمہ میں جو کلمات تحریر فرمائے ہیں ان کا نقل کرنا شاید حضرت رحؒ کے متعلقین و معتقدین کے لیے باعث تسلی بن سکے۔ مولانا سید فخر الحسنؒ فرماتے ہیں "حیف صد ہزار حیف کہ زمانہ ایسے عالم ربانی سے جو اپنے زمانے میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا خالی ہوگیا۔ افسوس صد ہزار افسوس کہ حامی شریعت جو نہ فقط اپنی جان بلکہ پڑوسیوں کی بھی جانیں شریعت کی حمایت میں جھونک دے۔ اس وقت دنیا سے اٹھ جائے۔ ہائے وہ باغ اسلام کا باغبان کہاں گیا جو اس باغ کی حفاظت کرتا تھا۔ جس سے اس کو رونق تھی ہائے اب اس باغ کی خدمت کون کرے گا۔ اس کی روشیں کون درست کرے گا۔ خس و خاشاک سے صحن چمن دین کس طرح صاف ہوگا۔ ہائے وہ نخل بند گلستان اسلام کدھر گیا جو سرو اسلام یعنی صراط مستقیم کی درستی و موروثی کی فکر رکھتا تھا۔ ہائے وہ جاروب کش باغ دین کہاں گیا۔ جس کی تقریر خس و خاشاک اوہام کے لیے جاروب تھی۔ اب سوائے حسرت و افسوس کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نہ کوئی رہا ہے نہ کوئی رہے گا البتہ ایک ذات وحدہٗ لاشریک جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

جناب مولانا مرحوم نے شاگرد و معتقد بہت چھوڑے اب ان کو چاہیے کہ جناب مولانا مرحوم کی طرح جان و مال و عزت و آبرو کا کچھ خیال نہ کریں۔ آپس کے جھگڑوں میں نہ پڑیں۔ خدا ورسول کے دشمنوں سے لڑیں۔ حتی الوسع دین اسلام کی حمایت کریں۔"

حضرتؒ کے سوانح حیات اور تاریخی حالات مکمل طور پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے سوانح قاسمی کے تین مجلدات میں مدون کئے ہیں جن کے ساتھ ان کے حالات کے لیے مزید وقائع اور استشہادات حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب دامت برکاتہم اور شیخ المعقول والمنقول استاذ العلماء و سابق صدر مدرس دار العلوم دیوبند حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاویؒ اور مولانا اشتیاق احمد دیوبندیؒ کاتب نے بھی حصہ لیا ہے۔ ان کے علاوہ

مولانا انوار الحسن شیر کوٹی ایم اے فاضل دیوبند نے بھی انوار قاسمی میں حضرت کی سیرت کا بڑا حصہ مدون کر دیا ہے۔ اور حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر صاحب شیخ الحدیث و صدر مدرس مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے بھی ایک عمدہ رسالہ بانی دار العلوم مرتب کیا ہے جو اپنی زبان اور استناد کے اعتبار سے معیاری ہے۔ اسی رسالہ کا ایک حصہ مکمل طور پر "بیس بڑے مسلمان" کے مصنف نے اپنی کتاب میں نقل کر لیا ہے، ان کے علاوہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی مختصر سوانح حیات بھی بہت عمدہ کتاب ہے جس میں حضرت نانوتویؒ کی زندگی کے تمام اہم واقعات کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ حضرت مولانا سید محمد میاں صاحبؒ نے بھی شاندار ماضی میں بھی ایک بڑا حصہ ذکر کر دیا ہے۔ طبقات الحنفیہ کے مصنف مولانا فقیر محمد جہلمیؒ نے بھی حضرت کی تاریخ ذکر کی ہے۔ اور مولوی رحمان علی صاحبؒ نے بھی تاریخ علماء ہند فارسی میں بھی حضرت کا ذکر کیا ہے۔ موج کوثر کے مصنف شیخ اکرام مرحوم نے بھی حضرت نانوتویؒ کا ذکر کسی قدر تفصیل سے کیا ہے مولانا کے شاگرد رشید مولانا منصور علی خان صاحبؒ نے اپنی کتاب مذہب منصور میں حضرت کی زندگی کے کئی حیرت انگیز واقعات ذکر کیے ہیں۔ حضرت نانوتویؒ کی سب سے بڑی مفصل سوانح حیات اور آپ کے ملفوظات و حکایات و لطائف حیات اور علمی تقریرات وغیرہ آپ کے قدیم شاگرد و خادم مولانا سید فخر الحسنؒ گنگوہی (محشی ابی داؤد و ابن ماجہ) نے مرتب کی تھی۔ جس کی ضخامت ایک ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل تھی مگر افسوس کہ وہ کتاب طبع نہ ہو سکی اور زمانہ کے دست برد سے ضائع ہو گئی۔

(حضرت نانوتویؒ کے ایک خادم مولانا امیر شاہ خانؒ نے بھی اپنی حکایات کی کتاب امیر الروایات" میں حضرت نانوتویؒ کے بہت سے واقعات ذکر کیے ہیں)

لیکن سب سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ کے علوم و معارف کی تسہیل اور آپ کی کتابوں کی تبویب جو مولانا مناظر احسن صاحب کرنا چاہتے تھے اس پر کوئی کام نہ ہو سکا۔ مولانا اس سے قبل ہی رحلت فرما گئے۔ اور اسی طرح مولانا انوار الحسنؒ شیر کوٹی کا بھی خیال تھا کہ انوار قاسمی کی دوسری جلد میں علوم قاسم سے بحث کی جائے

گی۔ غالباً وہ بھی یہ کام نہیں کر سکے۔ مولانا نانوتویؒ کے علوم و معارف کی تحقیق و تشریح و تسہیل و تفہیم کی اشد ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ کوئی عالم اس کو انجام دے جو اس کی صلاحیت بھی رکھتا ہو۔ کیونکہ عام اہل علم بلکہ بہت سے خواص کے بس کا بھی یہ کام نہیں۔ ہاں اللہ تعالیٰ جس کو خاص توفیق عنایت فرمائے۔ اور اس کام کو اس کے لیے آسان کر دے۔

حکمت قاسمیہ

احکام اسلام کی عقلی و نقلی تائید قدیم و جدید فلاسفی کی تردید اور شرائع اسلامیہ کے خاص اسرار و حکم۔ دلائل کا عجیب و غریب سلسلہ، قدیم و جدید فلسفہ کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کا کافی شافی رد۔ نظام اسلام کو مربوط شکل میں پیش کرنا، یہ سب حکمت قاسمیہ کے اہم مقاصد میں شامل ہیں۔ لیکن حضرت نانوتویؒ کی کتابوں کا صحیح معنوں میں وہی شخص مطالعہ کر سکتا ہے اور ان سے مستفید ہو سکتا ہے جو علوم عقلیہ میں کافی بصیرت رکھتا ہو۔ دین کی اعانت کے لیے عقلیات کا حصول بھی اسی طرح باعث اجر و ثواب ہوگا جس طرح نقلیات کا۔ بلکہ بعض اوقات دین پر قائم رہنا معقولات حاصل کیے بغیر بہت دشوار ہوتا ہے، اسی لیے عقلیات دیوبندی نظام تعلیم کا ہمیشہ ایک اہم حصہ رہا ہے۔ حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے لکھا ہے کہ "علماء کو چاہیے کہ عقلیات کے حصہ کو اسی طرح ذوق و شوق سے حاصل کریں جس طرح نقلیات کو حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بغیر وہ حجۃ اللہ البالغہ جیسی کتابوں کے سمجھنے سے عاری رہیں گے اور اگر ایسا ہوا تو انہیں آسانی سے بہکانے والے بہکاتے رہیں گے، کیونکہ جس کا اپنا کوئی فلسفہ نہ ہو اس کو اسی طرح دوسرے لوگ گمراہ کرتے رہتے ہیں۔"

حضرت نانوتویؒ کے حکیمانہ اسرار و افکار اور خاص نظریات، اور دین کی محققانہ اور عارفانہ تشریحات کو جاننا اشد ضروری ہے۔ حضرت نانوتویؒ کو اللہ تعالیٰ نے کمال درجہ کا حافظہ اور ذہانت عطا فرمائی تھی۔ جب کوئی بات یا اشکال آپ کے سامنے پیش کیا جاتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تمام دلائل آپ کے ذہن میں بیک وقت مجتمع ہیں۔ اور ان میں سے آپ مخاطب کے حالات کی مناسبت سے دلیل منتخب فرما کر بیان کرتے ہیں، کمال درجہ کا تبحر علمی قدرت نے عطا فرمایا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نانوتویؒ نقلیات و عقلیات کے بہت بڑے ماہر امام تھے۔

علم عقائد میں آپ نے حجۃ الاسلام اور تقریر دلپذیر جیسی ادق الیکن بہت گرانقدر کتابیں تصنیف فرمائیں ہیں مابعد الطبیعات اور ملکوت، جبروت عالم مثال لاہوت برزخ اور امور آخرت کو بالکل عقلی براھین کے انداز میں افہام کے قریب کر دیا ہے۔ مولانا سندھیؒ کا قول بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ حقائق و معارف اپنے لوگوں کو یعنی اہل اسلام کو سمجھا دیتے ہیں۔ لیکن مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اسلام کے حقائق غامضہ غیر مسلموں عیسائی یہود ہنود بدھ مجوس وغیرہ کو اسی طرح سمجھا سکتے ہیں جس طرح اہل اسلام کو، چونکہ حضرت نانوتویؒ زیادہ تر علم منطق فلسفہ اور ریاضی اور طبعی فلسفہ وغیرہ سے کام لیتے ہیں۔ ذرائع تفہیم میں بالکل عقل عام سے بات کرتے ہیں اور مشاہداتی دلائل جو موجودہ دور میں ہر اہل خرد و تمیز اور اصحاب عقول کے ذہن میں فٹ بیٹھ جاتے ہیں، ان سے کام لیتے ہیں۔ زبان اردو آپ کی نہایت دقیق ہوتی ہے۔ کچھ تو اس لیے کہ حضرت کے زمانہ تک بھی اردو زبان نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ جتنی آج ہے۔ اور کچھ اصطلاحات وغیرہ کی دقت کی وجہ سے مشکل پیدا ہو جاتی ہے لیکن علمی ذوق والے حضرات محنت سے اس کو حاصل کر سکتے ہیں۔ جس طرح امام ولی اللہؒ کا کلام ہر ایک صاحب علم کے بس کا روگ نہیں کہ وہ اس کو آسانی سے سمجھ سکے اس کے لیے کافی محنت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح مولانا نانوتویؒ کے کلام کے لیے بھی کافی محنت کی ضرورت ہے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ کا مقولہ ہے کہ "جب تک حضرت نانوتویؒ ہم میں موجود تھے ہم منطق کو تازہ کرتے رہتے تھے تاکہ حضرت کے کلام کو آسانی سے سمجھ سکیں ان کی وفات کے بعد اس سے دل سرد ہو گیا ہے۔"

اجوبہ اربعین

کے بارہ میں عرض ہے کہ احقر عبد الحمید سواتی تقریباً پینتیس ۳۵ سال سے اس کتاب کا متلاشی تھا، حضرت نانوتویؒ کی باقی کتب و رسائل نظر سے گزرے تھے اور کچھ بقدر فہم ان سے استفادہ بھی کیا، لیکن اجوبہ اربعین کہیں سے دستیاب نہ ہو سکی، اس کے مطالعہ کا انتہائی شوق تھا۔ اس کی تلاش جاری تھی۔ ایک دفعہ اتفاق سے سید الخطاطین حضرت سید انور حسین شلو صاحب مدظلہ

نفیس رقم (جنکو اللہ تعالیٰ نے کمال ظاہر و باطن عطا فرمایا ہے آپ صاحب نسبت اور بلند روحانیت کے مالک بزرگ ہیں) کسی کتاب کی تلاش میں مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ تشریف لائے تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپکے پاس اجوبہ اربعین ہے۔ تو شاہ صاحب نے فرمایا "ہے" میں نے عرض کیا کہ مطالعہ کے لیے عنایت فرمائیں، انہوں نے ازراہ عنایت بڑی خوشی سے کتاب مطالعہ کے لیے عنایت فرمائی۔ کتاب کے مطالعہ کے دوران یہ بات ظاہر ہوئی کہ موضوع کے لحاظ سے اس کتاب کی اشاعت ضروری ہے۔ لیکن کتاب غالباً صرف ایک مرتبہ ہی طبع ہوئی ہے، دوبارہ اس کی طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ اور ابتدائی طباعت بھی غالباً بڑی عجلت سے ہوئی ہے۔ اس میں کتابت کی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اُن کی اصلاح ضروری ہے عربی عبارات بھی بہت سی غلط ہی طبع ہوئی ہیں۔ احقر کے پاس اتنا وقت و فرصت نہ تھی۔ چنانچہ اس کام کے لیے فاضل نوجوان مولانا حافظ مہر محمد صاحب فاضل مدرسہ نصرۃ العلوم اور فاضل تخصص فی علوم الحدیث جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، جو بڑے صاحب استعداد نوجوان ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ مذہب رفض و تشیع سے انہیں خصوصی مناسبت ہے، احقر نے ان کو اس کام کی طرف متوجہ کیا انہوں نے اس کو قبول کیا اور کتاب کی تصحیح شروع کر دی، اور ساتھ ہی ساتھ بعض عنوانات کا اضافہ بھی کیا، اور کہیں کہیں کچھ حواشی بھی لکھے تاکہ کتاب کی افادیت میں اضافہ اور آسانی بھی ہو۔ کتاب کی جلد اوّل کی تصحیح کے بعد اس کی خواندگی کے لیے احقر نے مولانا مفتی حافظ محمد عیسیٰ خان صاحب گورمانی جو کئی سال سے مدرسہ نصرۃ العلوم میں افتاء کا کام کرتے ہیں ساتھ تدریس بھی، موصوف خود بھی مدرسہ نصرۃ العلوم کے قدیم فضلاء میں سے ہیں اور انکو فتویٰ نویسی میں کافی وسیع تجربہ اور درک ہے۔ اور دوسرے صاحب مولوی محمد اشرف صاحب فاضل نصرۃ العلوم کو اس کام کے لیے مقرر کیا جو محنتی اور مستعد نوجوان ہیں۔ ان حضرات نے اس کی خواندگی مکمل کی، چنانچہ جلد اوّل اس قابل ہو سکی کہ اس کی کتابت کا سلسلہ شروع کیا جائے۔

کتاب کی طباعت ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم کی طرف سے ہو رہی ہے۔ عنوانات کا اضافہ، بعض احادیث کے الفاظ، اور صفحات کتب، ان سب کو قوسین کے اندر

رکھا گیا ہے، تاکہ اصل کتاب کے ساتھ امتیاز قائم رہے۔ اکثر حواشی اور عنوانات مولانا حافظ مہر محمد صاحب نے قائم کیے ہیں اور حوالجات اور صفحات کی تلاش میں مولانا حافظ مفتی محمد عیسٰی صاحب اور مولوی محمد شریف صاحب شریک ہیں۔ اور بعض مقامات میں احقر عبد الحمید سواتی بھی ان کے ساتھ شریک رہا ہے۔

کتاب کے لیے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا نام نامی اس بات کی ضمانت کیلئے کافی ہے کہ کتاب علوم و معارف حقائق و دقائق کا مجموعہ ہے۔

اجوبہ اربعین بھی ان کتب میں سے ہے جن میں حضرت نانوتویؒ کے علوم و فیوض مناظرانہ و تنقیدانہ مضامین کا وقیع سرمایہ موجود ہے۔ یہ کتاب اہل رفض و تشیع کے رد میں ہے برصغیر (پاک و ہند) میں نویں اور دسویں صدی ہجری سے تشیع و رفض کا فتنہ بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا ہے قدیم ادوار میں بھی علماء اہل سنت والجماعت کے جید اور محقق حضرات اس فتنہ کا اپنے اپنے دور میں رد کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ امام ابن تیمیہؒ نے اس فرقہ ضالہ کا اپنی معروف و مشہور کتاب منہاج السنۃ میں بڑی قوت و شدت کے ساتھ رد کیا ہے۔ امام مجدد الف ثانیؒ نے بھی اس سلسلہ میں عظیم کام کیا ہے۔ اور پھر ان کے بعد امام ولی اللہؒ نے اس فتنہ کی بہت سرکوبی کی ہے، پھر آپ کے فرزند امام عبد العزیزؒ نے ایک ایسی عمدہ کتاب فارسی زبان میں لکھی ہے، جس کے بارہ میں ہمارے استاذ محترم امام اہلسنت حضرت مولانا عبد الشکور لکھنویؒ فرماتے تھے کہ "تحفہ اثنا عشریہ کا جواب اہل تشیع قیامت تک نہیں دے سکتے" ہمارے اکابر میں سے حضرت نانوتویؒ نے بھی اس فتنہ کے رد میں متعدد کتابیں، رسائل اور مکاتیب لکھے ہیں، چنانچہ ہدیۃ الشیعہ جیسی گرانقدر کتاب جو عمدہ اور سہل عام فہم زبان میں تحریر فرمائی ہے، پھر اجوبہ اربعین کا نمبر ہے۔ اس کے علاوہ انتباہ المومنین بزبان فارسی اور فیوضات قاسمیہ کے کئی مکاتیب اور دیگر متعدد مکاتیب میں اس فتنہ کا پورا تعاقب کیا گیا ہے۔ کتاب آب حیات کا ایک بڑا حصہ بھی اس فتنہ کے رد پر مشتمل ہے، وراثت نبوی اور حیات نبوی کی دقیق بحث بھی کی گئی ہے۔ اجوبہ اربعین کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ اس کتاب میں اہل رفض و تشیع کی طرف سے چالیس اعتراضات اہل سنت والجماعت پر کیے گئے ہیں، ان کے دندان شکن اور مسکت جوابات دیے گئے ہیں۔ اس کا پہلا حصہ حضرت نانوتویؒ نے

ایک دن رات میں مکمل کیا ہے اور اس میں ۲۸ اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ اور حضرت نانوتویؒ کے ساتھ مولانا عبداللہ انصاریؒ (سابق ناظم دینیات مدرسہ علی گڑھ) بھی شریک تھے۔ یہ مولانا عبداللہ صاحب حضرت نانوتویؒ کے داماد تھے اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ کے چچازاد بھائی دیوبند کے قدیم فضلا میں سے تھے، بڑے نیک و صالح انسان تھے، یہ مولانا محمد میاں انصاریؒ عرف منصور انصاریؒ کے والد محترم تھے۔ منصور انصاریؒ مولانا شیخ الہندؒ کے شاگرد اور مولانا سندھیؒ کے رفیق اور برصغیر ہندوپاک کی آزادی کے عظیم رہنما تھے، یہ بڑے عرصہ تک جلاوطن رہے اور جلاوطنی کی حالت میں کابل میں ۱۹۴۶ء کو وفات پائی۔ ان کے فرزند مولانا حامد انصاری غازی ہیں جو فاضل دیوبند اور بہت سی کتابوں کے مصنف اور ہندوستان کے مشہور صحافی ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کے ساتھ ہر ایک اعتراض کا ایک ایک جواب مولانا عبداللہ انصاریؒ نے بھی تحریر فرمایا ہے۔ پہلا جواب حضرت نانوتویؒ کا اور دوسرا جواب مولانا عبداللہ انصاریؒ کا ہے۔ بعض جوابات نہایت مختصر ہیں اور بعض کافی طویل ہیں۔ زبان اُردو قدیم ہے علم عمیق اور فہم دقیق ہے۔ جوابات لاجواب ہیں، جن کے پڑھنے اور ان میں غور و فکر اور تدبر کرنے کی ضرورت ہے اور انصاف شرط ہے۔

پہلے حصہ میں زیادہ تر بحث مسئلہ خلافت کے بارہ میں تحقیقات پر مشتمل ہے۔ یہ مسئلہ ایک اہم اور اصولی مسئلہ ہے اور خلفاء راشدین اربعہ کی خلافت علی منہاج النبوۃ ہے۔ اور علی الترتیب ان کے مراتب بھی اسی طرح ہیں جب تک اس اصولی مسئلہ پر یقین نہ ہو۔ دیگر شرائع اور احکام کا ثبوت بڑا مشکل ہے۔ چنانچہ امام ولی اللہؒ ازالۃ الخفاء کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"و اکثر اہل ایں اقلیم در اثبات خلافت خلفاء راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین شکوک بہم رسانیدند لاجرم نور توفیق الٰہی در دل ایں بندہ ضعیف علمے را منشرح و مبسوط

اس زمانہ میں بدعت تشیع آشکارا ہوگئی۔ اور عام لوگوں کے دل ان کے شکوک و شبہات سے متاثر ہونے لگے اور اس ملک کے اکثر لوگ خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی خلافت کے ثبوت

گردانید، تا آنکہ بعلم الیقین دانستہ شد کہ اثبات،
خلافت ایں بزرگواراں اصلے است از اصول دین
تا وقتے کہ ایں اصل را محکم نگیرند، ہیچ مسئلہ از
مسائل شریعت محکم نشود زیرا کہ اکثر احکامے
کہ در قرآن عظیم مذکور شدہ مجمل است بدون تفسیر
سلف صالح بحل آن نتواں رسید، و اکثر احادیث
خبر واحد محتاج بیان بغیر روایت جماعة از سلف
آں را، و استنباط مجتہدان ازاں متمسک بہ نگردد،
و تطبیق احادیث متعارضہ بدون سعی ایں بزرگواراں
صورت نگیرد، و ہم چنیں جمیع فنون دینیہ مثل علم قراۃ
و تفسیر و عقائد و علم سلوک بغیر آثار ایں بزرگواراں
متاصل نشود، و قدوہ سلف دریں امور خلفاء
راشدین است تمسک ایشاں با ذیال خلفاء جمع
قرآن و معرفت قراۃ متواترہ از شاذہ مبتنی بر سعی
خلفاء است و قضایا و حدود و احکام فقہ و غیر آں
ہمہ مترتب بہ تحقیق ایشاں، ہر کہ در شکستن ایں
اصل سعی می کند بحقیقت ہدم جمیع فنون دینیہ
می خواہد"

(ص۱ ج۱)

میں شک کرنے لگے لہذا توفیق الٰہی کے نور نے اس بندۂ
ضعیف (امام ولی اللہ) کے دل میں ایک علم پیدا کیا جس
سے یقین کے ساتھ معلوم ہوا کہ خلافت ان بزرگوں
(خلفاء اربعہ) کی ایک اصل ہے اصول دین سے
جب تک لوگ اس اصل کو مضبوط نہ پکڑیں گے تو
کوئی مسئلہ مسائل شریعت میں سے مضبوط نہ ہوگا، کیونکہ
اکثر احکام جو قرآن عظیم میں مذکور ہیں وہ مجمل ہیں بغیر
سلف صالحین کی تفسیر کے ان احکام کا حل نہیں ہو
سکتا اور اکثر حدیثیں خبر واحد ہیں شرح کی محتاج ہیں۔
بغیر اس کے کہ سلف کی ایک جماعت ان کو روایت
کرے، اور مجتہدین ان سے استنباط کریں، قابل
تمسک نہیں ہو سکتیں، اور نہ بدون ان بزرگوں کی کوشش
کے متعارض احادیث میں تطبیق کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی
ہے، اسی طرح تمام فنون دینیہ مثل علم قرأت و تفسیر
و عقائد و سلوک بغیر ان بزرگوں کے اقوال کے کسی اصل
پر قائم نہیں رہ سکتے، اور سلف صالحین نے ان امور
میں خلفائے راشدین ہی کی پیروی کی ہے اور انہیں کے
دامن کو مضبوط پکڑا ہے۔ قرآن کا جمع ہونا اور
قرآت شاذہ سے قراۃ متواترہ کا امتیاز پانا خلفائے
راشدین ہی کی کوشش پر مبنی ہے اور اسی طرح
قضایا کے فرائض اور حدود اور احکام فقہ وغیرہ انہی
خلفاء کی تحقیق پر مترتب ہیں لہذا جو شخص اس اصل
کے توڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ فی الحقیقت

تمام فنون دینیہ کو مٹانا چاہتا ہے۔"

اجوبہ اربعین کا دوسرا حصہ جو بارہ اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہے اور یہ صرف حضرت نانوتوی کے قلم حق رقم کا مرہون منت ہے۔ اس میں دقت نظر، زیرکی، انکیق حقائق، و معارف لطائف و ظرائف کا گنج گراں مایہ موجود ہے۔ حضرت نانوتوی نے اس میں متعہ کا مسئلہ فدک و راثت جیسے اہم مسائل کے علاوہ مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ حصہ زیادہ دقیق صعب اور بہت سے اہم علمی نکات پر مشتمل ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی کتابوں کا اجمالی تذکرہ

مناسب معلوم ہوتا ہے حضرت کی تمام کتابیں جو اس وقت تک طبع ہو چکی ہیں ان کا اجمالی تعارف کرا دیا جائے۔ بعض کتابیں نایاب بھی ہیں بعض صرف ایک دفعہ یا دو دفعہ ہی طبع ہوئی ہیں۔ حضرت کی تحریرات کے بعض حصے ابھی تک طبع بھی نہ ہو سکے۔ اور وہ دستیاب بھی نہیں، حضرت کی تمام کتب و رسائل و مکاتیب کی جدید طباعت کی اشد ضرورت ہے۔

۱۔ حجۃ الاسلام

یہ بڑے سائز کے ۵۰ صفحات پر مشتمل رسالہ ہے۔ اردو زبان میں اس میں اسلام کے تمام ضروری عقائد حضرت نانوتویؒ نے اپنے حکیمانہ طرز بیان میں ذکر کئے ہیں۔ اور اس انداز میں ان کی تبیین و تشریح کی ہے کہ عقل سلیم رکھنے والے حضرات اس کو پڑھ کر اسلام کے عقائد کے بارہ میں اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔ اور غیر مسلم حضرات بھی ان کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہ رسالہ بارہا طبع ہوا ہے اور بہت سے خوش بخت لوگوں نے اس سے استفادہ کیا ہے، اس کے عنوانات حضرت شیخ الہندؒ نے قائم کئے ہیں، یہ رسالہ بھی حضرت نانوتویؒ نے ایک دن رات میں لکھا ہے۔ اس رسالہ کا نام حجۃ الاسلام حضرت مولانا سید فخر الحسن گنگوہیؒ نے تجویز فرمایا ہے۔ یہ رسالہ حکمت قاسمیہ کا ایک اہم جزء ہے، حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے لکھا ہے کہ "میں نے مولانا محمد قاسمؒ کا رسالہ حجۃ الاسلام مولانا شیخ الہندؒ سے سبقاً سبقاً پڑھا۔

۲۔ تقریر دلپذیر

یہ کتاب حضرت نانوتویؒ کی بے مثال اور عجیب و غریب کتاب ہے، افسوس کہ یہ کتاب حضرت مکمل نہیں کر سکے، یہ اردو زبان میں ہے۔ تمام عقائد دینیہ اصولیہ و فروعیہ کو عقلی استدلال سے قریب الفہم کر دیا ہے اس طرح کہ اگر کوئی غیر متعصب غیر مسلم بھی اس کو پڑھے گا تو اسلام کے نظام عقائد کو برحق ہی سمجھے گا۔ اور اس کو بھی بہت کم اشکالات واقع ہوں گے۔ یہ کتاب بھی بارہا طبع ہو کر خراج عقیدت وصول کر چکی ہے۔ اس کتاب کی تبویب غالباً مولانا سید محمد میاں صاحبؒ دیوبندی نے کی ہے۔ کتاب کے دیباچہ یا حواشی میں اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔ نیز کہیں کہیں مختصر حواشی بھی تحریر کئے گئے ہیں اس میں بعض حواشی حضرت مولانا سید فخر الحسنؒ کے ہیں اس کتاب کی ابتداء میں حضرت نانوتویؒ بنظر خیر خواہی خلائق سب اہل مذاہب خواہ وہ مسلمان ہوں، یا ہندو، یہود، نصاریٰ، مجوس آتش پرست، وغیرہ سب کی خدمت میں دین اسلام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور عقل سلیم رکھنے والے سب حضرات سے درخواست کی ہے۔ کہ تعصب کو برطرف رکھتے ہوئے ایک بار اس کتاب کو اوّل سے آخر تک پڑھیں۔ اگر حق و باطل کی تمیز ہو جائے تو اس کو قبول کریں انہیں تو اصلاح کریں۔

پھر وجود صانع۔ توحید، صفات سے لے کر تمام اعتقادی مسائل کا عقلی ثبوت اور عمدہ تمثیلات سے بیان فرمایا ہے، اور عقلیات کے اماموں کے باطل نظریات کی پرزور تردید فرمائی ہے۔

۳۔ انتصار الاسلام

اس رسالہ میں آریہ سماجیوں کے دس سوالات کے جوابات لکھے ہیں۔ ہر اعتراض کے دو دو جواب حضرت نانوتویؒ نے دیے ہیں۔ ایک جواب الزامی ہے، جس سے معترض کو خاموش کر دیا ہے، اور دوسرا جواب تحقیقی، آریہ سماجیوں اور اس قسم کے دیگر معترضین حضرات کو ایسے دندان شکن جوابات دیے ہیں کہ ہمیشہ ان لوگوں کو اس قسم کے اعتراضات کرنے کی جرأت نہ ہو سکے کمال درجہ کی تحقیقات پر مشتمل ہے اس رسالہ کی تبویب اور عنوانات کا قائم کرنا اور بعض جگہ مفید حواشی تحریر کرنے کا کام مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ

نے کیا ہے۔ رسالہ بارہا طبع ہوا ہے اور ہزارہا لوگوں نے اس سے استفادہ کیا ہے۔
اس رسالہ کا مقدمہ حضرت نانوتویؒ کے تلمیذ حضرت مولانا سید فخر الحسن گنگوہیؒ نے تحریر فرمایا ہے

۴۔ قبلہ نما

یہ حضرت نانوتویؒ کی ایک اہم اور معرکۃ الآراء کتاب ہے۔ یہ دراصل انتصار الاسلام کا دوسرا حصہ ہے۔ یہ کتاب آریہ سماج کے پنڈت دیانند سرسوتی کے ایک اعتراض کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ دیانند سرسوتی نے ۱۲۹۵ھ میں مسلمانوں پر اعتراض کیا تھا کہ مسلمان اہل ہنود پر بت پرستی کا الزام لگاتے ہیں حالانکہ وہ خود بھی ایک مکان کعبہ کی طرف سجدہ کرتے ہیں جو بہت سے پتھروں کا بنا ہوا ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے اس اعتراض کے اولاً سات جوابات دیے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جواب کافی شافی ہے۔ پھر اس کے بعد آٹھواں جواب دیا ہے جس کی دو تقریریں کی ہیں ایک مجمل دوسری مفصل، یہ کتاب نہایت باریک حروف کی کتابت سے ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے، اکثر حصہ اس کتاب کا مفصل جواب پر حاوی ہے۔ اس میں حقیقت کعبہ حقیقت صلوٰۃ سجدہ کی حقیقت استقبال کی شرح عابدیت و معبودیت اور تجلی الٰہی اور خانہ کعبہ کا مورد و مہبط تجلی ہونا۔ اور یہ کہ جسم کی سامنت مکان (کعبہ) کی طرف ہوتی ہے اور روح کی تجلی الٰہی کی طرف، اور یہ کہ مسلمان اس تجلی الٰہی کی طرف ہی سجدہ کرتے ہیں، اور وہ تجلی الٰہی گویا عین معبود ہوتی ہے۔ تجلی کا ورود خانہ کعبہ پر کس طرح ہوتا ہے اس کی حقیقت واضح فرمائی ہے اور اس کے ساتھ نہایت ہی غامض حقائق کا ذکر کیا ہے اور ایسی عجیب علمی بحث فرمائی ہے کہ بلا مبالغہ نہ کسی کان نے سنی ہو گی اور نہ کسی آنکھ نے کسی کتاب میں دیکھی پڑھی ہو گی۔ حقیقت کعبہ حقیقت محمدیہ حقیقت صلوٰۃ وغیرہ جیسے دقیق اور عسیر الفہم مسائل کا تذکرہ کمال متانت و رزانت اور عقلی انداز میں کر دیا ہے عبادات کی حقیقت اور تجلی الٰہی کے ساتھ مصلی کی توجہ اور سامنت کی دقیق و عمیق بحث، پھر آخر میں بُعد مجرد (بعد موہوم) پر بڑا دقیق تبصرہ کیا ہے۔ اس کتاب کی تبویب و تبلیغ مضامین بھی نہیں کی گئی حالانکہ یہ بارہا طبع ہوئی ہے۔ لیکن دقیق ہونے کی وجہ سے اہل علم نے ادھر توجہ نہیں فرمائی؛ لیکن علوم قاسمیہ کا ایک بڑا حصہ اس کتاب میں آگیا ہے، سنا تھا کہ حضرت مولانا سید احمد رضا

بجنوری صاحب (انوار الباری شرح بخاری کے مصنف) نے قبلہ نما کی ایک ہزار عنوانات سے تبویب و تسہیل کی ہے۔ لیکن ابھی تک وہ منظر عام پر نہیں آیا۔ یہ رسالہ نادر تحقیقات کا عجیب و غریب مجموعہ ہے اور اس میں جس طرح عقلی استدلال کئے گئے ہیں ان سے حضرت نانوتویؒ کی بلندیٔ مرتبت نمایاں ہے۔

مولانا سعید احمد صاحب پالن پوری توثیق الکلام کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ "حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحبؒ نے اس کی قابلِ قدر خدمت کی ہے مگر اس سے کماحقہٗ کتاب حل نہیں ہوگی۔ حضرت الاستاذ مولانا محمد طیب صاحب مدظلہٗ نے بھی ایک خاص نہج پر اس کی شرح تحریر فرمائی تھی مگر وہ ضائع ہوگئی"۔

۵۔ آبِ حیات

حضرت نانوتویؒ کی معرکۃ الآرا کتاب ایسی دقیق، عمیق اور صعب بلکہ اصعب کتاب ہے حالانکہ اردو زبان میں ہے اپنی دقت کی بناء پر شاید ہی کوئی کتاب اس کی مثال ہو ہم نے اپنے استاذ و شیخ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنیؒ کے ترمذی اور بخاری شریف کے درس کے دوران بار ہا سنا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ "حضرت نانوتویؒ نے یہ کتاب علماء کے امتحان کے لیے لکھی ہے" اس کو دیکھنا اور اس کے مطالب کا حل کرنا اور اس کو پوری طرح سمجھنا معرکہ کی چیز ہے ہر ایک عالم کے بس کا روگ نہیں ہے اس کتاب کو کماحقہٗ سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اس کتاب کے دیباچے میں حضرت نانوتویؒ نے خود لکھا ہے کہ جس طرح ہدیۃ الشیعہ کی تصنیف کا محرک حضرت مولانا گنگوہیؒ تھے اسی طرح آبِ حیات کی تصنیف کا محرک حضرت پیر و مرشد مولانا حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ تھے اُن کے ایماء پر مسئلہ حیات النبی پر اس کتاب کو ہدیۃ الشیعہ سے الگ مستقل کتاب کی شکل میں تصنیف کیا ہے اور اس کتاب کے وجدانی اور الہامی حقائق کی تصدیق حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمائی ہے، اس کتاب میں نقلیات یعنی قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کا بھی ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ بعض حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ کتاب صرف منطق پر مشتمل ہے۔ ان کا خیال غلط ہے یہ صحیح ہے کہ نقلیات کے ساتھ عقلیات کا ایک معتدبہ حصہ اس میں پایا جاتا ہے، جو شخص عقائد حقہ سے پوری طرح باخبر ہو اور ان دلائل

سے بھی آگاہ ہو جن سے ان عقائد کی توثیق کے لیے استدلال کیا جاتا ہے۔ اور مذہب شیعہ سے
اچھی طرح آگاہ ہو پھر عام علوم و فنون کے علاوہ عقلیات بالخصوص علم منطق اور فلسفہ اور ریاضی اور علم کلام
وغیرہ میں کمال درجہ کا درک رکھتا ہو اور اس کے ساتھ مستقل مزاج بھی ہو جو مطالعہ کرنے کا عادی ہو
اور ذہن بھی وقاد طبع ذکی اور مزاج سیال رکھتا ہو اور اس میں کسی حد تک للٰہیت و روحانیت بھی پائی
جاتی ہو۔ اور کشف سے بھی فی الجملہ مناسبت رکھتا ہو وہ اس کتاب کو سمجھنے کا اہل ہو گا اس کتاب کے
دو تین صفحات مطالعہ کرنے کے بعد ذہن درماندہ ہو جاتا ہے اور اس پر بے حد تھکاوٹ اور بوجھ
پڑتا ہے اور اس وقت اس کو ترک کر دینا پڑتا ہے تاکہ پھر کسی دوسرے وقت تازہ دم ہو کر اس کا
مطالعہ کیا جا سکے، امام ولی اللہؒ کی کتابوں کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی ہوتا ہے بہر حال یہ
کتاب حضرت نانوتویؒ نے ۱۲۸۶ھ میں لکھی ہے اور پھر حج کے موقعہ پر حضرت حاجی امداد اللہؒ
نے اس کو پڑھ کر اس کی تصدیق و تصویب فرمائی ہے اور اس کی اشاعت کی اجازت مرحمت
فرمائی حضرت خود مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"اس لیے یہ ہیچمدان بدترین گنہگاران، زبان و دل سے اس بات کا معترف ہے کہ
میرے کلام پریشان میں اگر کوئی سخن دل نشین اہل دل، اور کوئی تحقیق لائق تصدیق اہل حق ہے
تو وہ حضرت مرشد برحق ادام اللہ فیوضہ کے انتساب و توسل کا پھل ہے اور اگر اختلاط اغلاط
اور آمیزش خرافات ہو تو یہ تیرہ دروں خود قائل ہے کہ اپنی عقل نارسا ہے اور اپنے دماغ
میں خلل ہے یہی وجہ ہوئی حضرت پیر و مرشد ادام اللہ فیوضہ کے سنانے کی ضرورت ہوئی۔
مگر جب زبان فیض ترجمان سے آفرین و تحسین سن لی تو اصل مضامین کی حقیقت تو اپنے نزدیک
محقق ہو گئی یوں کوئی منکر نہ مانے تو وہ جانے منکروں کا کام یہی ہے"

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن اب تک کسی صاحب علم نے اس
کتاب کی تبویب و تسہیل کی طرف توجہ نہیں فرمائی میرے پیش نظر مطبع مجتبائی دہلی کا طبع شدہ
نسخہ ہے جو ۱۹۰۵ء / ۱۳۲۳ھ کا مطبوعہ ہے اور بڑے سائز کے دو صد ساٹھ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اس
کتاب میں حضرت نانوتویؒ نے مسئلہ حیات النبی پر نہایت نفیس بحث کی ہے کتاب کے جملہ مضامین
اور علوم معارف پر بحث کرنا مجھ جیسے کم فہم طالب علم کا کام نہیں ہے۔

مولوی سعید احمد صاحب پالن پوری توثیق الکلام کے مقدمہ میں لکھتے ہیں آب حیات (کا)

اثبات حیات انبیاء علیہم السلام اس کتاب کا موضوع ہے آپ کی تمام کتابوں میں یہ سب سے زیادہ مشکل کتاب سمجھی گئی ہے اگرچہ اس میں سے ایک معتد بہ حصہ جس کے بارے میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی (اولین صدر مدرس دار العلوم دیوبند) کی رائے یہ تھی کہ اسے کوئی نہیں سمجھ سکتا اس کو نکال دیا گیا ہے۔ اور یہ اوراق متخرجہ آب حیات "بھلا وہ (بھارت میں ایک مقام کا نام ہے) میں ہیں غرض اس کی شرح کی بھی خاص ضرورت ہے۔ ولعل اللہ سبحانہ وتعالیٰ یوفقنی لذالک وما ذالک علیہ بعزیز۔

احقر عبد الحمید سواتی عرض کرتا ہے کہ اولاً یہ روایت جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ منکر معلوم ہوتی ہے کہ کچھ حصہ کتاب کا محض اس لیے نکال دیا جائے کہ وہ ادق، اصعب یا عسیر الفہم ہے یہ حق صرف مصنف کا ہے کہ وہ خود اپنی کتاب میں سے نکال دے دوسرے حضرات یا ناشرین وغیرہ کو اس کا حق حاصل نہیں اگر خود مصنف نے ان اوراق کے استخراج کی اجازت دی ہے تو اس کا ثبوت قطعی ہونا چاہیئے۔ اگر یہ اوراق مصنف کی اجازت کے بغیر نکالے گئے ہیں تو ان کو دوبارہ کتاب کے ساتھ شامل کرنا از حد ضروری ہے ورنہ یہ علمی دیانت کے خلاف ہے۔

ثانیاً عرض ہے کہ اگر کتاب کے ادق ہونے کی وجہ سے اس کے حصوں کو الگ کرنا عام ناشرین یا شارحین کے لیے جائز ہوتا تو پھر تمام ادق قسم کی کتابوں میں وہ حصے جو عام فہم نہیں ہیں وہ نکال دیے جاتے لیکن ایسا کرنا روا نہیں۔

ثالثاً عرض ہے کہ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کی بہت سی کتابیں اسی قسم کی ہیں مثلاً حجۃ اللہ البالغہ کے بعض مقامات الخیر الکثیر، تفہیمات الٰہیہ کے بہت سے حصے بدور بازغہ کے کئی مقامات الہوامع کے کچھ حصے سطعات کے بعض سطعات لمحات کے کئی مقامات، الفوز الکبیر کے بعض مقامات بلکہ شاہ ولی اللہؒ کی بہت سی کتابوں کے کئی مقامات ایسے ہیں لیکن ان کو کسی شارح یا ناشر نے کتاب سے نکال دینے کی جرأت نہیں کی۔ اور نہ یہ مشورہ دیا ہے کہ ان کو عسیر الفہم ہونے کی وجہ سے نکال دیا جائے۔

۶۔ تحذیر الناس من انکار اثر ابن عباسؓ

یہ مختصر سا رسالہ حضرت نانوتویؒ کا ایک معرکۃ الآراء اور علمی رسالہ ہے۔ ایک استفتائے کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا ہے رسالہ اپنے استدلال اور علمی نکات کی دقت کی وجہ سے مشکل ہے، بعض لوگوں نے کم فہمی یا اپنی شقاوت کی وجہ سے عبارتوں میں قطع برید و تقدیم و تاخیر کر کے کچھ کا کچھ بنا کر حضرت نانوتویؒ پر تکفیر بازی بھی کی ہے۔ دراصل رسالہ میں حضرت نے آیتِ ختم نبوت (خاتم النبیین) کی ایسی عالی تحقیق فرمائی ہے جس کی مثال علمی لٹریچر میں نہیں مل سکتی۔ ختم نبوت زمانی، مکانی اور رتبی ہر طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہے۔ آخر میں استاذ العلماء حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنویؒ اور دیگر علماء کرام کی تصویب و تصدیق بھی شامل ہے۔

۷۔ مناظرہ عجیبہ

یہ کتاب بھی حضرت نانوتویؒ کے مکتوبات کے سلسلے کی کتاب ہے۔ اس کے دو حصے ہیں، حصہ اوّل میں محذورات عشرہ جو تحذیر الناس کی عبارتوں پر کئے گئے ہیں۔ اور ان کے جوابات ہیں۔ اور دوسرے حصہ میں وہ خط و کتابت ہے جو حضرت نانوتویؒ کے ایک ہم عصر عالم مولانا عبدالعزیز صاحب نے تحذیر الناس پر جو اعتراضات کئے تھے اور جانبین سے چار چار خطوط میں مولانا عبدالعزیز صاحب اعتراضات لکھتے رہے حضرت نانوتویؒ ان کے جوابات تحریر فرماتے رہے بالآخر مولانا عبدالعزیز صاحب نے حضرت نانوتویؒ کے موقف کو تسلیم کر لیا، جو اہل حق کا شیوہ ہوتا ہے۔

اس کتاب کے مکتوب ثالث میں حضرت نانوتویؒ لکھتے ہیں "اپنا دین و ایمان ہے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور نبی کے ہونے کا احتمال نہیں جو اس میں تامل کرے اس کو کافر سمجھتا ہوں" (ص ۱۰۳ طبع قدیم)

اتنی واضح بات کے بعد بھی جو لوگ حضرتؒ کی طرف غلط بات منسوب کرتے ہیں ان کے بارہ میں اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ کہ لعنۃ اللہ علی الکاذبین۔ ایسے بدنیتوں کے لیے خدا تعالیٰ کے ہاں روزِ قیامت میں روسیاہی کے سوا کیا ہوگا۔

۸ - مکاتیب حضرت نانوتویؒ

جدید طباعت میں اس مجموعہ کا نام قاسم العلوم مع اردو ترجمہ انوار النجوم ہے۔ یہ فارسی زبان میں دس مکتوبات کا مجموعہ ہے اس کی ترتیب و تبویب و تسہیل و تحشیہ و ترجمہ حضرت مولانا پروفیسر انوار الحسن شیرکوٹیؒ فاضل دیوبند فیصل آبادی نے کیا ہے اور لاہور سے طبع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ پہلی طباعتوں میں چار حصوں پر مشتمل تھا لیکن اب اس کی ایک ہی جگہ مترجم شکل میں جمع کر کے طباعت کرائی گئی ہے۔

اس میں بعض مکتوبات بہت اہم ہیں مثلاً مکتوب شرح حدیث ابی رزین رضؓ بہت مشکل اور اہم مکتوب ہے۔ اس کا ترجمہ اور تفہیم ابھی بہت کچھ ناکافی ہے یہ حدیث محدثین کے نزدیک بھی بہت مشکل حدیث مانی جاتی ہے۔ محققین نے اس حدیث کی شرح اپنے اپنے انداز سے لکھی ہے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ امام عبدالکریم جیلیؒ نے الانسان الکامل میں اور امام ولی اللہ دہلویؒ نے فیوض الحرمین، الدر الثمین اور تفہیمات الٰہیہ وغیرہ کتب میں اس کو بیان کیا ہے۔ امام بیہقیؒ نے کتاب الاسماء والصفات میں اور شیخ ابن عربیؒ نے فتوحات مکیہ میں اس حدیث پر بحث کی ہے۔ اس میں عماء کا مفہوم متعین کرنا اور نیز فوقیت تحتیت مکان ظرفیت وغیرہ کی وجہ سے اشکالات پیدا ہوتے ہیں اور مسئلہ بھی اہم ہے اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات، اور تجلیات کی بحث، یہ مکتوب بھی فارسی زبان میں ہے۔ علوم قاسمیہ کی وقت اس میں نمایاں ہے۔ مکتوب صعب بلکہ اصعب ہے۔ اس پر بہت زیادہ وقت اور محنت کی ضرورت ہے اور اسکی تبویب و تسہیل ارباب حکمت قاسمیہ کے لیے اہم مقاصد میں سے ہے۔

اسی طرح عصمت انبیاء کا مکتوب بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے عمدہ طریق پر عصمت انبیاء کا مسئلہ حضرت نانوتویؒ نے بیان فرمایا ہے، اختصار و جامعیت کے ساتھ ہزاروں صفحات سے بے نیاز کرنے والا ہے۔ جن جن حضرات نے اس مسئلہ پر کلام کیا ہے ان سب سے دلائل کی قوت کے اعتبار سے زیادہ قوی ہے متکلمین کی عام کتابوں میں ایسی عمدہ بحث اس مسئلہ پر کہیں نظر نہیں آئی۔ اسی طرح ما اھل لغیر اللہ کے موضوع پر جو مکتوب ہے وہ بھی اپنی نظیر آپ ہے اس مکتوب کا اردو ترجمہ اور تبویب و تسہیل حضرت مولانا مفتی محمد عیسیٰ

خان صاحب گورمانی مفتی مدرسہ نصرۃ العلوم نے کی ہے، جو بہت عمدہ ہے اگر طبع ہو جائے تو بہت مفید ہوگی امید ہے کہ عنقریب یہ بھی طبع ہو جائے گی۔

باقی مکاتیب بھی علمی نکات سے لبریز ہیں اور ہر ایک مکتوب اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اسلام کے بہت سے شرائع وقوانین، احکام کی علل ومصالح اسباب خفیہ اور حکم غامضہ جس طرح ان مکاتیب سے سمجھ میں آتی ہیں از حد اہم اور لاجواب ہیں۔

۹۔ تصفیۃ العقائد

اس رسالہ میں جو اردو زبان میں ہے سر سید احمد خان بانی علی گڑھ کالج کے پندرہ سوالوں کے جوابات ہیں۔ جن میں حضرت نانوتویؒ نے سر سیدؔ احمد خان صاحب اور ان کے ہم خیال حضرات کی نیچریت کا نہایت لطیف انداز میں ردّ فرمایا ہے، اور سب کو لاجواب کر دیا ہے۔ اور ضمناً علم وحکمت کے بے شمار حقائق آ گئے ہیں۔ آخر میں حضرت نانوتویؒ کا ایک مکتوب ہے سر سید احمد خان صاحب کے نام جو ناصحانہ اور مبلغانہ انداز میں احقاق حق کے لیے لکھا گیا ہے

۱۰۔ اسرار قرآنی

یہ مختصر سا رسالہ ہے فارسی زبان میں ہے جس میں مختلف آیات قرآنیہ کے بارہ میں مولانا محمد صدیق صاحب مراد آبادی نے سوالات حضرت نانوتویؒ کی خدمت میں لکھ کر بھیجے تھے۔ جن کے جوابات حضرت نے تحریر فرمائے ہیں اور بہت سے اشکالات کو رفع کیا ہے آخر میں معوذتین کی حکیمانہ تفسیر ہے۔ اور مثنوی رومی کے ایک مشکل شعر کی شرح ہے۔ درحقیقت یہ بھی مکاتیب کے سلسلہ میں شامل ہے۔

۱۱۔ تحفہ لحمیہ

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے جس میں حضرت نانوتویؒ نے ہنود کے اس وہم باطل کا ردّ لکھا ہے کہ جانوروں کا ذبح کرنا ظلم ہے اور ان کا گوشت کھانا تعدی ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ حلال جانوروں کا گوشت کھانا اور انکا ذبح کرنا بالکل فطرت کے مطابق ہے عقل سلیم بھی اس کو تسلیم کرتی ہے۔ عقلی دلائل سے اس مسئلہ کو حضرت نے بین طور پر ثابت کر دیا ہے۔ اگر ان کا گوشت کھانا ظلم ہے تو ان کی کھال کا جوتا پہننا اور ان کی ہڈیاں اور دیگر

اجزاء کا استعمال کرنا اور ان سے سواری وغیرہ کی خدمت لینا کونسا انصاف ہے۔

۱۲۔ انتباہ المؤمنین

یہ مختصر سا رسالہ فارسی زبان میں ہے۔ اور ترمذی شریف کی اس حدیث کی شرح ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے خلفاء راشدین کا ذکر فرمایا ہے اور ہر ایک کی ایک فضیلت کی خاص وجہ بیان فرمائی ہے۔ بے مثال تحقیق پر مشتمل ہے۔ رسالہ کے آخر میں مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا ایک مکتوب عربی زبان میں ہے جو انہوں نے شیخ عبداللہ بغدادیؒ کے نام لکھا تھا اور تقویۃ الایمان کے بارہ میں اٹھائے گئے اعتراضات کے جوابات ہیں۔

۱۳۔ میلہ خداشناسی

اس رسالہ میں اس مذہبی مناظرہ اور بحث و مباحثہ کی روئیداد مذکور ہے جو ۱۲۹۳ھ میں شاہجہانپور میں ہوا تھا۔ جس میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں نے حصہ لیا تھا۔ ہندو، عیسائی اور مسلمان سب ہی اس میں شریک ہوئے تھے۔ اور اہل اسلام کو اس میں فتح حاصل ہوئی تھی۔ اس بحث میں حضرت نانوتویؒ نے سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ حضرت کی تقاریر اور جوابات اس میں درج ہیں۔

۱۴۔ مباحثہ شاہجہانپور

اس مجموعہ میں حضرت نانوتویؒ کی وہ تقاریر ہیں جو آپ نے ۱۲۹۵ھ میں مختلف عیسائی پادریوں اور ہندو پنڈتوں کے اعتراضات کے جوابات میں کی تھیں۔ پنڈت دیانند سرسوتی، پنڈت اندرمن، پادری اسکاٹ جو انجیل کا مفسر مانا جاتا تھا اور پادری نولس وغیرہ معترضین نے جو مختلف اعتراضات اٹھائے تھے کہ خدا تعالیٰ نے دنیا کو کس چیز سے پیدا کیا ہے اور ذات باری تعالیٰ محیط کل کس طرح ہے؟ اور خدا تعالیٰ اگر عادل ہے تو پھر رحیم کس طرح ہو سکتا ہے؟ قرآن کریم کے کلام الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے؟ اور بائبل کیوں الہامی نہیں اور وید کے الہامی ہونے میں کیا چیز مانع ہے؟ نجات کس چیز میں حاصل ہو سکتی ہے؟ وغیرہ۔ حضرت نانوتویؒ نے اپنی تقاریر میں ان سب اعتراضات کے جوابات باحسن طریق ذکر کئے ہیں۔ اور اسلام کی حقانیت کے عقلی و نقلی قوی دلائل بیان فرمائے ہیں جو تمام

اہل عقل وخرد کے لیے سامانِ طمانینت پیدا کرتے ہیں اور اہل اسلام کے ہاتھ مخالفین کے رد کے لیے بے مثال قوی دلائل کا ذخیرہ آتا ہے۔

۱۵- توثیق الکلام فی الانصات خلف الامام

یہ اردو زبان کا ایک مختصر رسالہ ہے جس میں حضرت نانوتویؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرأت کرنی ممنوع ہے نقلی دلائل کے ساتھ زیادہ تر عقلی انداز میں یہ مسئلہ سمجھا دیا ہے۔ انصاف شرط ہے۔

۱۶- الدلیل المحکم۔

اس رسالہ میں بھی امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ نہ پڑھنے کی تحقیق بیان فرمائی۔ (توثیق الکلام اور الدلیل المحکم درحقیقت ایک ہی کتاب کے دو نام ہیں البتہ توثیق الکلام میں چند سطریں زائد ہیں (ان دونوں کی شرح وتسہیل واضافہ عنوانات تمہید مقدمات وغیرہ دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا سعید احمد پالن پوری نے کی ہے۔ اور اس کا نام "کیا مقتدی پر فاتحہ واجب ہے"؟ تجویز کیا ہے اور مکتبہ وحیدیہ دیوبند سے شائع ہوئی ہے۔

۱۷- لطائف قاسمی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات اور تراویح کا مسئلہ اس میں ذکر کیا گیا ہے۔

۱۸- جمال قاسمی

اس رسالہ میں حضرت نانوتویؒ کے دو مکتوب ہیں۔ جو حضرت مولانا سید جمال الدین دھلویؒ کے خطوط کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمائے ہیں۔ ایک مکتوب میں وحدت وجود کی تشریح ہے اور دوسرے میں سماعِ موتی کا مسئلہ ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا سید جمال الدین دھلویؒ وہی بزرگ ہیں جنہوں نے اپنی بعض تحریروں میں لکھا کہ حضرت نانوتویؒ سے ہم نے "سو رسائل ہندسہ۔ ہیئت۔ فلاحت طبعی، جبر ومقابلہ جر ثقیل وغیرہا علوم میں، ایک ایک ورق لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ واللہ اعلم کہ حضرت نانوتویؒ کو ان رسائل کے لکھنے کا موقعہ پیش آیا یا نہیں، اور یہ کہ یہ رسائل کس کے پاس ہیں۔ اسی طرح حضرت مولانا سید فخر الحسن گنگوہیؒ انتصار الاسلام کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ" اور جناب مولانا کی

وہ تحریریں جو زیر طبع اب تک نہیں آئیں۔ اور وہ کوئی سوجھ ہوں گے ان کے شائع کرنے پر بندہ نے کمر ہمت باندھی تو ہے، خداوند کریم مدد کرے۔ آمین۔

۱۹۔ فیوض قاسمیہ

یہ مجموعہ حضرت نانوتوی رح کے کچھ مکاتیب پر مشتمل ہے جو مختلف حضرات نے آپ سے دریافت کئے تھے۔ بعض میں شیعہ حضرات کے اعتراضات کے جوابات ہیں، اور کچھ اعتراضات وہ ہیں جو حضرت کی کتاب ہدیۃ الشیعہ پر اٹھائے گئے تھے ان کے جوابات دیئے ہیں ایک مکتوب جمعہ کی تحقیق پر مشتمل ہے یزید کے ایمان اور عدم ایمان کی بحث۔ نذر لغیر اللہ کی تحقیق۔ علم غیب مختص ذات باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ سری و جہری قراۃ کی حکمت بدعت و سنت کی تحقیق۔ تصور شیخ کا مسئلہ۔ اور نفس کی تحقیق وغیرہ پر مشتمل ہے۔

۲۰۔ مصابیح التراویح

بزبان فارسی۔ بڑے سائز کے ۱۲ اصفحات پر مشتمل ہے اس میں مسئلہ تراویح کی وضاحت ہے اور احادیث جو اس باب میں وارد ہوئی ہیں ان کی تشریح اور بیس ۲۰ عدد رکعات تراویح کا ثبوت شرعی و عقلی دلائل سے، اور یہ کہ بیس ۲۰ تراویح پڑھنا سنت کی فرد ہے یہ بدعت نہیں اسکو بدعت شمار کرنے والے حضرات غلو و تعدی کا شکار ہیں اور زیادتی کے مرتکب ہیں۔ اور حدیث علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین کی تشریح بیان کی گئی ہے۔

ہمارے پیش نظر جو نسخہ ہے یہ غیر مترجم ہے، اس کو ادارہ نشر و اشاعت دار العلوم دیوبند نے طبع کرایا ہے۔ یہ کتاب حضرت نانوتوی رح نے اپنے تلمیذ رشید مولانا سید احمد حسن امروہی جو دار العلوم دیوبند کے قدیم فضلاء میں تھے۔ ان کے ایک استفتار پر جو انہوں نے حضرت نانوتوی کی خدمت میں بھیجا تھا اس کے جواب میں لکھی ہے نہایت اعلیٰ تحقیقات پر مشتمل ہے مولانا سعید احمد پالن پوری لکھتے ہیں کہ۔

"اس کتاب کا ترجمہ مولانا اشتیاق احمد صاحب دیوبندی رح نے کیا ہے جو انوار المصابیح کے نام سے شائع ہوا ہے مگر اس سے کتاب کماحقہ حل نہیں ہوتی ہے۔ ابھی مزید کام کی ضرورت ہے۔"

۲۱- الحق الصریح فی اثبات التراویح

یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں مصابیح التراویح کی طرح بیس تراویح کے اثبات میں لکھا گیا ہے یہ بھی ایک صاحب، جناب عبدالرحیم خان صاحب کے مکتوب کے جواب میں حضرت نانوتویؒ نے لکھا ہے۔ اور اس میں بیس رکعات کی مخالفت کرنے والے حضرات کے تعصب و ہٹ دھرمی کو ظاہر کیا ہے اور اس سلسلہ میں حضرت سائب بن یزیدؓ کی روایت پر جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ روایت مرسل ہے اس کا جواب حضرت نانوتویؒ نے دیا ہے اور متعصبین کی افسوسناک حالت کو خوب آشکارا فرمایا ہے۔

۲۲- اسرار الطہارۃ

یہ بھی مختصر سا رسالہ ہے اور اس کو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نے حضرت نانوتویؒ کی تحریرات حاصل کر کے ان سے مرتب کیا ہے اس میں طہارۃ کے اسرار و حکم اور عجیب و غریب نکات بیان کئے گئے ہیں۔ قہقہہ اور خروج ریح کیسے ناقض وضوء ہوتے ہیں اس کی حیرت انگیز تشریح بیان فرمائی ہے۔ اور ایسے حکیمانہ افکار بیان کئے ہیں۔ جن میں حضرت منفرد معلوم ہوتے ہیں۔

۲۳- قصائد قاسمی

اس رسالہ میں حضرت نانوتویؒ کے چند قصائد ہیں ایک قصیدہ بہاریہ جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں زبان اردو میں ہے، جس کے ایک ایک شعر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت لگاؤ و تعظیم ظاہر ہوتی ہے۔ ایک قصیدہ عربی زبان میں ہے جو ترکی خلافت کے خلیفہ وقت سلطان عبدالحمید کے بارہ میں لکھا ہے بڑا معیاری قصیدہ ہے زبان کے اعتبار سے کسی متقدم شاعر کی فصاحت و بلاغت سے کم نہیں۔ اسی طرح ایک قصیدہ فارسی زبان میں ترکی خلافت کے متعلق ہے۔ اس دور میں علماء دیوبند کا ایک بنیادی نظریہ خلافت اسلامیہ کے ساتھ اتصال تھا جس کے نمائندہ ترکی تھے۔ ایک قصیدہ میں اپنے رفیق شہید حضرت حافظ ضامن کا مرثیہ لکھا ہے اور شجرہ منظومہ بھی فارسی زبان میں ہے۔ اس مجموعہ میں کچھ قصائد دوسرے اکابر کے بھی ہیں مثلاً مولانا ذوالفقار علی صاحبؒ، مولانا فیض الحسنؒ

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا بھی ایک ایک قصیدہ اس مجموعہ میں شامل ہے۔

۲۴۔ حاشیہ بخاری شریف

آخری پانچ پاروں کا حاشیہ حضرت نانوتویؒ نے اپنے استاذ محترم مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے حکم سے بالکل اسی انداز میں جس طرح حضرت سہارنپوریؒ نے لکھا ہے۔ تحریر کیا ہے اور آخری حصہ کے مشکل مسائل کا خوب حل کیا ہے۔

۲۵۔ فتویٰ متعلقہ اجرت تعلیم

جس میں حضرت نانوتویؒ نے دینی تعلیم پر اجرت لینے کے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر محققانہ طریق پر بحث کی ہے۔

۲۶۔ جواب ترکی بترکی

یہ رسالہ دراصل حضرت نانوتویؒ کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ یہ آپ کے اشارہ اور حکم سے آپ کے تلمیذ حضرت مولانا عبد العلیؒ نے حضرت نانوتویؒ کے افادات سے اور آپ کے طرز استدلال سے آریہ سماجیوں کے ایک رسالہ کے ردّ میں لکھا ہے۔ رسالہ آریہ سماچار بابت ماہ اساڑھ ۱۹۳۶ء بکرمی ۱۲۹۶ھ میں لالہ انند لال آریہ سماجی نے اسلام کے متعلق بعض غلط قسم کے اعتراضات کئے تھے۔ انکا جواب اسی کی زبان اور محاورہ میں دیا گیا ہے یہ قدیم طباعت میں ۶۰ صفحات پر مشتمل ہے یہ رسالہ بھی بہت سے علمی افادات پر مشتمل ہے۔ اور اس کے عنوانات وغیرہ کا اضافہ اور تسہیل مولانا اشفاق احمد دیوبندیؒ مدرس دار العلوم نے کی ہے۔ اور براہین قاسمیہ کے نام سے مجلس معارف القرآن کی طرف سے عمدہ کاغذ و کتابت کے ساتھ دیوبند سے طبع ہوئی ہے۔

۲۶۔ ہدیۃ الشیعہ

۱۲۸۳ھ میں شیعہ کے کچھ اعتراضات کے بارہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ایک خط حضرت نانوتویؒ کی طرف لکھا تھا کہ ان اعتراضات کے جوابات لکھ کر روانہ فرمائیں۔ حضرت مولانا نانوتویؒ نے متفرق اوقات میں ان اعتراضات کے جوابات لکھ کر ماہ صفر ۱۲۸۴ھ یعنی چند ماہ میں اس کو مکمل کیا اور اس کا نام ہدیۃ الشیعہ رکھا اس کتاب

میں شیعہ حضرات کے تمام اور مابہ الامتیاز مسائل کا ذکر آگیا ہے۔ خلافت، صحابہ کرامؓ کا ایمان و مقام۔ شیعوں کا عقیدہ و تقیہ، مباحث فدک، وراثت وغیرہ۔ حضرت نانوتویؒ نے قرآن کریم اور وہ احادیث جو اہل سنت والجماعت کی مسلمہ ہیں اور پھر ان روایات سے بھی جو مسلم عند الشیعہ ہیں، تمام اعتراضات کے ایسے مسکت جوابات دیے ہیں کہ ان کے جواب سے ان شاء اللہ شیعہ ہمیشہ عاجز رہیں گے۔ کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ عام فہم اُردو زبان میں لکھی گئی ہے۔ اور اس میں منطقی اصطلاحات وغیرہ کا ذکر بھی کم ہے۔ اس سے عام تعلیم یافتہ حضرات بخوبی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اور اس کتاب میں ضمناً ایسے عجیب و غریب علمی نکات بیان کیے گئے ہیں جن سے اہل علم کو ایقان و اذعان نصیب ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عالم بر حق کو دین قیّم کے بارے میں کتنی عظیم سمجھ عطا فرمائی تھی، یہ کتاب اس پر دلیل بین ہے، یہ کتاب پاکستان میں دو بار طبع ہوئی ہے۔ پہلی دفعہ کراچی میں۔ پہلی طباعت کے وقت حضرت مولانا محمد اسلم صاحب (سابق خطیب مسجد ہیڈ کوارٹرز کراچی) نے کتاب میں جا بجا عمدہ مفید عنوانات قائم کیے ہیں جس سے کتاب کی اچھی تبویب و تسہیل سے اس کتاب کے مضامین و مسائل زیادہ قریب الفہم ہو گئے ہیں ساتھ کتاب کی فہرست بھی مرتب کی ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کی دوسری طباعت لاہور میں مکتبہ نعمانیہ والوں نے کرائی ہے۔ بہر حال جو حضرات فرقہ شیعہ کے ساتھ مبتلا ہوتے ہیں ان کے لیے بالخصوص اور عام اہل علم کے لیے بالعموم اس کتاب کا مطالعہ از حد ضروری ہے اور غایت درجہ کا مفید۔

۲۸- اجوبہ اربعین

یہ اُردو زبان میں پہلی طباعت سے دو حصّوں میں تقریباً ڈھائی صد صفحات پر مشتمل ہے اور اس کتاب میں شیعہ حضرات کے چالیس ۴۰ اعتراضات کے جوابات ہیں۔

مولانا سعید احمد صاحب مدرس دار العلوم دیوبند نے توثیق الکلام کے مقدمہ میں حضرت نانوتویؒ کی کتابوں کا تعارف بھی مختصر طور پر کرایا ہے، اسی ضمن میں حضرت نانوتویؒ کی چند مزید کتابوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

۲۹- اجوبۃ الکاملۃ فی الاسولۃ الخاملہ (اُردو) کسی شیعہ کے پانچ لغو قسم کے

اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہے۔

۳۰۔ مکاتیب قاسمی (فارسی)

یہ مسائل سلوک پر چند مکاتیب ہیں۔

۳۱۔ الحظ المقسوم من قاسم العلوم (عربی)

یہ جزء الذی لا یتجزیٰ کا اثبات اور سماع وغناء کی تحقیق پر مشتمل ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے تلمیذ مولانا محمد رحیم اللہؒ بجنوری کے نام یہ دو مکتوب ہیں۔ جو فصیح عربی زبان میں ہیں۔

واللہ اعلم

احقر عبد الحمید سواتی

خادم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

ماہ شعبان ۱۴۰۱ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دیباچہ

(طبع اول ۱۲۹۱ھ از ناشر)

بعد حمد خداوند متعال وصلوٰۃ وسلام بر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجمیع اصحاب وآلؓ بندہ احقر وبے ثبات محمد حیات عرض کرتا ہے کہ ان دنوں بعض عقل کے کچے مذہب کے متزلزل لوگوں نے چند سوال شیعوں کی جانب سے پیش کیے، ہر چند کہ یہ مضامین قدیمی اور پرانے تھے جن کے جواب بارہا علمائے اہل سنّت وجماعت نے دیئے اور لکھے مگر عادت ان مذہب والوں کی ہے کہ اپنی باتوں کو رنگ بدل کر پیش کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ اٹھائیس سوال اسی قبیل کے تھے، جواب ان سوالوں کے مشفق ومکرم مولوی عبداللہ صاحب انبٹھوی فرزند رشید مولوی انصار علی صاحب نے لکھے تھے، ازاں بعد وہی سوال جناب فخر الاماثل مرجع الافاضل جناب مولوی محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کی خدمت میں پیش ہوئے، تو جناب موصوف نے بھی باصرار احباب قلم برداشتہ ایک روز وشب میں اس کے جواب تحریر فرمائے۔ یہ دونوں تحریریں بندہ کو ہاتھ آئیں اور مناسب زمانہ یوں معلوم ہوا کہ یہ گوہر بے بہا یوں ہی چھپے نہ رہیں بلکہ چھپ کے مشتہر ہو جائیں اس لیے اس کی طرز مناسب یوں تجویز ہوئی کہ اوّل سوال لکھا جائے بعد اس کے جواب جناب مولوی محمد قاسم صاحب کا، اس کے بعد جواب مولوی عبداللہ صاحب کا اور ان جوابوں کا ایک حصہ قرار دیا جائے چنانچہ یہ حصہ اوّل ٹھہرا اور ان جوابوں کے اخیر میں دونوں صاحبو نے چند سوال علماء شیعہ سے کیے ہیں اگر کوئی صاحب اس رسالہ پر کچھ تحریر فرمائیں تو ان سوالوں کے جواب لکھنے کی بھی ہمت کریں اور بعد اس کے چند مسائل اور کہ مذہب شیعہ کے اصول مہمہ سے ہیں اس پر کچھ تحریریں مولانا مولوی محمد قاسم صاحب کی ہمارے ہاتھ آئی ہیں اس کو جدا کر کے دوسرا حصہ قرار دیا اب یہ کل جوابات چالیس ۴۰ ہو گئے اور اس مناسبت سے نام اس مجموعہ کا اجوبہ اربعین رکھا گیا، اللہ جل شانہ سعی احقر کی مقبول فرمائے۔

(مقدمہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ
رسولہ سید المرسلین وآلہ وصحبہ وازواجہ اجمعین

(سبب تالیف کتاب)

بعد حمد وصلوٰۃ کے یہ خادم خاص محمد قاسم اپنے مخدوم ومکرم مولانا محمد یعقوب[1] صاحب کی خدمت میں عرض سلام ونیاز کے بعد عرض پرداز ہے کہ آج بروز چارشنبہ معلوم نہیں تاریخ ۱۶ ہے یا ۱۷ آپ کا والا نامہ لاوڑے میرے پاس آیا دیکھا تو ایک طومار تھا شیطان کے وسوسوں کو بھی مات کیا، دیکھ کر دل بہت گھبرایا۔ جی میں کہتا تھا یہ ناگہانی بلا اوقات کھونے کے لیے کہاں سے سر پہ آپڑی، پھر تیسیر حاصل نہ وصول، شیعوں کی راہ پر آنے کی امید نہیں ادھر دل کاہل کا یہ خیال تھا کہ مولوی محمد یعقوب صاحب ہی نے ان سوالوں کی اپنی لاحول سے کیوں نہ خبر لی، میں کجا اور دیوبند کجا، مگر کچھ آپ کا خوف کچھ حاجی[2] صاحب کا لحاظ چار وناچار قہر درویش برجان درویش۔ جب اور وقت فرصت نہ ملی تو اس وقت بعد مغرب لے کر بیٹھا اور اپنے اوقات کے خون پہ کمر باندھی، مولانا! میری کم فرصتی کا کچھ حال نہ پوچھئے، صبح کو ۱۲ بجے، شام کو

---

[1] دارالعلوم دیوبند کے اول صدر مدرس اور حضرت نانوتویؒ کے استاذ زادہ اور حضرت کے شاگرد بھی۔ مولانا مملوک علی صاحبؒ کے فرزند۔

[2] اس سے مراد حاجی ظہور الدین صاحب ہیں جو سوالات حضرت مولانا نانوتوی کی خدمت میں لائے تھے ۱۲۔ مہر محمد

دن چھپے پر کیا چھوٹتا ہوں نہ عقل ٹھکانے نہ ہوش بجا میں کہیں، دل کہیں، تس پر عقل کی نارسائی اور اوپر کی بے سروسامانی، اور ادھر نامہ بریعنی حاجی ظہورالدین کو گھر کا یہ شوق کہ کل کے جاتے آج ہی جانے کو تیار۔

(استاذ زادہ کی تعظیم و فرمانبرداری۔)

بہرحال یہ آپ ہی کا ارشاد ہے کہ مجھ سا کاہل باوجود ہجوم موال[1] اور گم گشتگی سامان کتب اس ناامیدی پر کہ سائل کو خدا ہی راہ پر لائے تو آئے، قلم اٹھاتا ہوں اور بنام خدا جو کچھ خیال نارسا میں گذرتا ہے لکھتا ہوں۔ پر یہ ڈر ہے کہ قلم کی باگ چھوڑ دیجیے تو پھر دیکھیے کب انتہا آتی ہے، اور روک دیجئے تو کہاں تک رک جائے۔ اس ششش و پنج میں بارہا یوں خیال آتا ہے کہ مولانا اس ناکارہ کو معاف رکھتے تو بہت مناسب تھا اور انصاف سے دیکھئے تو میری دلتنگی بجا بھی ہے آپ کے ہوتے میری کیا ضرورت؟ اور اگر آپ کو فرصت نہ تھی تو مولوی عبدالحق مولوی عبداللہ مولوی محمود حسن مولوی فخرالحسن مولوی خلیل احمد مجھ سے کس بات میں کم تھے، پھر آپ کی (طرف سے) اصلاح ہو جاتی تو چاندی کا سونا بن جاتا، (ان علماء کے سامنے) قاسم کیا بجنے لگا۔ مولانا آپ کا ارشاد برسر، یہ اپنی کیفیت بے اختیاری کا بیان تھا، امتثال امر میں بندہ نے چوں تک نہیں کی یہ گستاخی نہیں آپ کے اخلاق پر ناز تھا۔

(ضدی ہٹ دھرم کی اصلاح نہیں ہوتی۔)

دیکھئے یہ آپ کا خادم سر زیر بانیاز رکھ کر بسم اللہ کرتا ہے، مخدوم من! مجھ کو امید نہیں کہ سائل راہ پر آئے، انداز سوال کہے دیتے ہیں کہ یہ اوپر کی بات نہیں اس میں تہ دل کا ملاؤ ہے ہاں خدا کو سب قدرت ہے ورنہ اپنا تجربہ اور پرانے افسانے سب اسی بات پر شاہد ہیں کہ جیسے کنواں تو ایک پیشاب کے قطرہ سے ناپاک ہو جاتا ہے، اور قطرہ پیشاب بہت سے پانی مثل دریا سے ملے تو پاک ہو، ایسا ہی اہل اسلام کے بگڑ جانے کے لیے تو ایک قطرہ بھی کافی ہے، اور اہل خطرہ بہت سے لاحولوں سے بھی درست نہیں ہوتے۔

---

[1] لفظ تو موال ہی ہے لیکن اس کا معنی واضح نہیں ہو رہا شاید ملال یا اموال ہو۔ واللہ اعلم ۱۲۔ سواتی

(اہل تشیع اور بنی اسرائیل میں مشابہت تامہ)

بنی اسرائیل کو دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا کیا احسان کیے۔ راہ اسلام تعلیم کیا سو کیا! فرعون کے کس عذاب سے بچایا، تسپر تسلیم احکام میں کس قدر تین پانچ کرتے تھے پہاڑوں کو اٹھا اٹھا کر ان کے سر پر معلق کر دکھایا، اور گرنے سے ڈرایا تب کہیں انہوں نے احکام کو تسلیم کیا۔

مخدوم من! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کیسے کیسے معجزے دیکھتے تھے، اور باخبر نہ ہوتے تھے، ہاں سامری نے ایک کرشمہ دکھایا اور سب کو گمراہ کر دیا۔ اس کرشمہ اور ان معجزوں کو کیا نسبت؟ غور سے دیکھئے تو یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طفیل تھا۔ نہ حضرت جبرئیل علیہ السلام گھوڑے پر سوار ہو کے ان کی مدد اور حفاظت کے لیے آتے، نہ اُن کے گھوڑے کی خاک پا سبز ہوتی، نہ یہ تاثیر دیکھ کر سامری اٹھا کر لاتا، نہ یہ کرشمہ دکھاتا، غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وہ معجزات عظیمہ کہ کسی نبی کے ہوئے ہوں گے، کجا، اور یہ کرشمہ ظاہری کجا، کہ دھوکہ ہی دھوکہ تھا، اور وہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طفیل، پھر تسپر ان معجزات کا کچھ اثر نہ ہوا، پر اس کرشمہ پر سارے بنی اسرائیل باوجودیکہ نبی زادے تھے، قدیم کے مسلمان تھے، نیک بد، بھلے بُرے کو پہچانتے تھے، لٹو ہو گئے اور ایمان کھو بیٹھے؛

سو مولانا یہاں بظاہر یہی نظر آتا ہے سامریان شیعہ کی یہ دھوکہ بازی جتنا کام کر گئی ہے، میرے جوابات دندان شکن سے وہ امید نہیں۔ ہاں یہ بھی امید نہیں کہ علماء شیعہ میں اگر کچھ حیا ہو، تو پھر اس طرف کو منہ بھی کریں۔

(اٹھائیس ۲۸ سوال دراصل ایک ہی سوال ہے)

مولانا! ہر چند سوالات مرسلہ دیکھنے میں اٹھائیس ہیں، پر اہل فہم جانتے ہیں کہ وہ حقیقت میں ایک سوال ہے، مطلب سب کا فقط اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی مذمت، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بڑائی ہے اور اس کی ویسی مثل ہے جیسے کسی حجام نے کہا تھا: "استاد حجام نائی میں اور میرا بھائی گھوڑا اور گھوڑے کا بچھیرا غلام کو آپ جانتے ہیں"۔ سو جیسے اہل فہم کے نزدیک حجام کی یہ جعلسازی ایسی نہیں کہ اس پر کان رکھئے، ایسے ہی اہل عقل کے نزدیک شیعوں کی یہ دھوکہ بازی اس قابل نہیں کہ فریب کھائیے، پر کیا کیجئے عقل بہت دن ہوتے اٹھ گئی، کوئی کوئی صاحب عقل نظر

آتا ہے۔ ناچار بپاس خاطر احباب روزگار اوّل ایک جواب اجمالی معروض ہے بعد ازاں تفصیل وار ہر ہر سوال کا جواب عرض کروں گا آپ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے، کہ جواب اجمالی کس کے لیے ہے اور جواب تفصیلی کس کے لیے، پر میں بھی اوروں کو جتانے کے لیے بتائے جاتا ہوں، مخدوم من! جواب اجمالی تو فقط اہل عقل اور انصاف کے لیے ہے، جن کی بصیرت و دانش تیز اور سینہ صاف ان کے حق میں ان اٹھائیس ستاروں کی کھٹ کھٹ کے سامنے وہ اجمال ایسا ہوگا کہ انشاءاللہ جیسے لوہار کی ایک،۔ اور جوابات تفصیلی ان کے لیے ہیں جن کو عقل سے بہرہ، نہ فہم سے مطلب، اب قلم کو بہت تھام تھام کر مختصر مختصر عرض پرداز ہوں۔

(**سب کا اجمالی جواب**) ہم اوّل جواب اجمالی ہے حاصل ان سب سوالوں کا اگرچہ بادی النظر میں جُدا جُدا معلوم ہوتا ہے بلکہ سادہ لوح تو یوں سمجھتے ہوں گے کہ یونہی اتفاقی باتیں ہیں لیکن موافق مصرعہ مشہور ہے ؎

ہم خوب سمجھتے ہیں تیرے بھید کی باتیں

سوالات مذکورہ کا مطلب ہم سے پوچھیے، سائل کو نہ حکم پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلّم سے مطلب ہے۔ نہ کسی کے اجماع سے غرض، اس کو اپنے مطلب سے مطلب ہے، غرض اصلی اس کی فقط یہ ہے کہ مستحق خلافت فقط حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، اور لوگ زبردستی خلیفہ بن بیٹھے، ان پر ظلم کیا، اور اس ظلم کا بار اپنی گردن پر لیا، بایں ہمہ وہ لوگ خطاوار، گنہگار، منافق، بے دین، بدآئین، بے وفا، سراپا دغا، دل کے نامرد، نیتوں کے خراب تھے (معاذاللہ) اگر بالفرض والتقدیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہوتے، اور کسی کا خلیفہ ہونا جائز بھی ہوتا، تو ایسے اوصاف والوں کا خلیفہ ہونا تو پھر بھی جائز نہ ہوتا جس نے ان سوالات کو لکھا ہے اس کی غرض اس کو تو معلوم ہی ہے پر جس نے غور سے دیکھا ہوگا وہ بھی سمجھ جائے گا۔ کہ مطلب اصلی یہی ہے، اور سب باتیں ہیں۔

اب ہماری بھی سنیئے، سائل نے کچھ صراحتہً کچھ کنایۃً اصحاب کرام حضرت خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلّم خصوصاً اصحاب ثلثہ رضی اللہ عنہم پر اعتراض کئے، اور پھر ان میں کوئی دلیل ایسی نہیں، کہ جو کلام اللہ سے ماخوذ ہو، بلکہ فقط چند شبہے ہیں، جن کا جواب عاقل کو تو بے تامل اور کم عقل کو تھوڑے سے تامل کے بعد معلوم ہو جاتا ہے۔

(صحابہ کرامؓ کی تعریف میں چار واضح ترین آیات)

پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریفیں عموماً اور خصوصاً کلام اللہ میں اتنی ہیں کہ گنیئے تو اٹھائیس ۲۸ سوالوں سے (کئی گنا) زیادہ ہوں گی، سب کی تو گنجائش نہیں، پر بمقدار عدد چار یار چار آیتیں شائقوں کے لیے منقول ہیں۔ اوّل تو (پہلی آیت)

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (پ۱۱ ع ۲) حاصل اس آیت کا یہ ہے: "کہ اول ہجرت میں سبقت کرنے والے اور انصار، اور جن لوگوں نے ان کی خوبی اور احسان سے پیروی کی، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے اور ابھی سے تیار کر رکھی ہیں ان کے لیے جنتیں جن کے نیچے سے بہتی ہیں نہریں ہمیشہ ہمیشہ وہ اس میں رہیں گے۔ یہ بڑی مراد ہے"

اب دیکھئے اللہ تو بشہادت آیت مسطورہ ان سے ایسا راضی ہوا کہ خدا اس کا ہزاروں حصہ ہی اوروں کے نصیب کرے۔ پر سائل اور حضرات شیعہ تس پر راضی نہیں کہیئے یہ وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہے کہ نہیں؟

دوسری آیت

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ○ (پ توبہ ع ۳)

اس آیت کا خلاصہ مطلب یہ ہے۔ کہ جو لوگ ایمان لائے اور گھر بار چھوڑ کر ہجرت کر آئے، اور جان و مال سے خدا کی راہ میں جہاد کیا، وہ لوگ سب میں بڑے درجے والے ہیں۔ اللہ کے نزدیک اور اصل مراد کو وہی پہنچے ہیں بشارت دیتا ہے انکو ان کا رب اپنی رحمت کی اور اپنی رضامندی کی اور ایسی جنتوں کی جن میں ان کے لیے ہمیشہ کی راحت اور نعمت ہے اور پھر وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، بیشک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

اس آیت سے صاف روشن ہے کہ مہاجرین اوّلین کے برابر اس امت میں کسی کا

رتبہ نہیں، اس میں کوئی ہوں امام ہوں یا امام زادے پھر تس پر شیعہ بارہ کے بارہ اماموں کو اوروں سے افضل بتائے جاتے ہیں اور اس پر بھی بس نہیں کرتے فوارہ لعنت بن کر اپنی عاقبت رہی سہی بھی خراب کر لیتے ہیں۔

تیسری آیت

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ۝ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ

(پ۱۷ حج ع ۵)

ترجمہ اس کا یہ ہے، ہماری طرف سے ان لوگوں کو بھی اجازت ہوئی، جن سے کفار قتال کیا کرتے تھے کیونکہ وہ مظلوم تھے اور اللہ ان کی مدد پر قادر ہے وہ کون لوگ ہیں جن کو بے قصور ان کے گھروں سے نکالدیا گیا، فقط اتنی بات پر کہ وہ یوں کیوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے۔

پھر اس کے بعد انہیں لوگوں کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ (ایضاً)

یعنی وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین کا بادشاہ بنائیں تو وہ اوروں کی طرح عیش و عشرت میں نہ گزاریں گے بلکہ نماز کو قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے، نیک باتوں کا حکم کریں گے بُری باتوں سے منع کریں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ کامل، مکمل اور ہادی مہدی ہیں بذاتِ خود تو ایسے کہ عبادات بدنی اور مالی دونوں میں پورے، اور ان کے لیے ہادی ایسے کہ بھلے کام سے چوکنے نہ دیں، اور بُرے کام کے پاس پھٹکنے نہ دیں، دیکھئے خدا تو مہاجرین کی نسبت علی العموم لیاقت خلافت کی گواہی دے، پر حضرات شیعہ کی کچہری میں خدا کی بھی نہیں سنتے یہ بھی اندھیر نہیں تو پھر کب ہوگا خلافت اور امامت میں سوا اس بات کے کہ آپ بذاتِ خود خلیفہ اچھا ہو اور رعیت کا ہادی ہو اور کیا ہوتا ہے نبی کا یہی کام ہے، خلیفہ اور امام کا کام کیوں نہ ہوگا۔ ورنہ پھر نیابت کا کیا معنیٰ ؟۔

چوتھی آیت

مُّحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ ۚ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ

اس کا حاصل یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں

عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا۔ (پ۲۶ فتح آخری آیت)

اور ان کے ساتھی اور ساتھ والے کافروں پر سخت، آپس میں رحمدل جب دیکھئے رکوع میں جھکے ہوئے سجدہ میں پڑے ہوئے طالب اللہ کا فضل اور اس کی رضا کی طلب رکھتے ہیں۔

اس آیت کو دیکھئے تو صحابہؓ کے ایمان کی حدی تعریف، نعمتوں کی حدی تعریف، اعمال کی حدی تعریف کرتے ہیں بشہادت احادیث ایمان تو اس سے زیادہ نہیں کہ خدا کے دوست اپنے دوست ہو جائیں اور خدا کے دشمن اپنے دشمن۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ اِيْمَانَهٗ۔ (ازالۃ الخفاء ص۲۸ ج۱)

یعنی جس نے کسی سے خدا واسطے محبت کی اور خدا ہی کے واسطے بغض رکھا، اور خدا ہی واسطے دیا، اور خدا ہی واسطے ہاتھ کھینچ لیا اس نے بیشک اپنا ایمان کامل کر لیا۔

سو کوئی صاحب انصاف کر کے فرمائیں کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ کا یہی خلاصہ ہے یا نہیں، پھر نیت اس سے بڑھ کر متصور نہیں کہ طالب رضا ہو عمل اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ شب و روز نماز ہی سے مطلب ہے، اس پر بھی حضرات شیعہ کو پسند نہ آئیں تو یہ معنی ہوئے کہ (معاذ اللہ) جو سب میں بڑا کافر اور بڑا ریاکار رنڈی باز شراب خوار ہو۔ وہ قابل خلافت اور امامت ہے۔

(صحابہ کرامؓ کو نہ ماننے سے تمام دین ختم ہو جاتا ہے۔)

ان آیتوں کے بعد یہ عرض ہے کہ صحابہؓ نے جو کچھ کیا بجا کیا یا بیجا؟ ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ بنایا پھر حضرت عمرؓ کو پھر حضرت عثمانؓ کو پھر حضرت علیؓ کو اگر یہ ترتیب حسب مرضی شیعہ ہے تو فبہا ورنہ یہ معنی ہوئے کہ صحابہؓ نے ظلم کیا، دین محمدی میں رخنہ ڈالا جن سے ہدایت متصور تھی ان کو دم نہ مارنے دیا، جنہوں نے نیا دین نیا آئین کر دیا، وہ مسند خلافت دبا بیٹھے۔ باقی ان کے معین اور مددگار ہو گئے اور چھوٹے سے لے کر بڑے تک عاقل سے لے کر دیوانہ تک یہ بات جانتے ہیں کہ جیسے ہدایت کے برابر کوئی عبادت نہیں اسی وجہ سے انبیاء سب میں بڑھ کر ہے ایسے ہی گمراہ کر دینے کے برابر کوئی گناہ نہیں اس لیے شیطان کو یہ منصب سپرد ہوا، سو درصورتیکہ (بزعم شیعہ) ترتیب معلوم غلط اور خلفاء ثلاثہ ظالم اور بیدین

اور باقی صحابہؓ ان کے مددگار، تو یہ معنی ہوں کہ نعوذ باللہ خدا نے اخوان الشیاطین کی اتنی تعریف کی جو اولیاءؒ کو بھی نصیب نہیں۔

اب حضرات شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ خدا کے قول و قرار کا اعتبار ہے، یا بھول چوک اور تقیہ کا احتمال ہے، اگر خدا کو خدا اور کلام اللہ کو کلام اللہ سمجھتے ہو تو ایمان لاؤ اور شیطان کے وسوسوں پر نہ جاؤ ورنہ اپنا کہیں اور ٹھکانا بناؤ۔

صاحبو! بندہ نے کلام اللہ کا حوالہ دیا ہے کسی پنڈت کی پوتھی کا اشلوک، نہیں پڑھا ہے، تس پر اگر بوجہ وساوس معلوم تردد ہے، تو ہم جانیں کہ خدا کا بھی اعتبار نہیں، پر یوں ہے تو ہمیں بھی شکایت نہیں، الغرض سائل کے اعتراض ہم پر نہیں خدا پر ہیں آگے پیچھے وہی جواب دے دیں گے، ہاں اگر یہ مطلب ہے کہ کلام اللہ پر ایمان اور صحابہؓ کے اعتقاد سے سر سے پا تک معمور ہیں پر بطور تحقیق عرض سوالات ہے یہ غرض نہیں کہ دل کے پھپھولے پھوڑیے اور سوال کے پردہ میں طعنے توڑیے، بہت سے سوال لکھ بھیجے کسی سنی کو کیا غرض پڑی ہے کہ اپنے اوقات کو خراب کرے گا ایسے سوالوں کے جواب میں کتاب کی کتاب لکھیگا تو آپ کی تسکین دو باتوں میں ہوئی جاتی ہے۔

(حضرت موسیٰ و خضر کے واقعہ میں مشاجرات اصحابہؓ کے طعن کا ازالہ یقینی ہے)

سورہ کہف میں سولھویں پارہ کے شروع میں دیکھئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر کا سفر نامہ مسطور ہے۔ دیکھئے حضرت خضر نے کشتی کو توڑ ڈالا پھر کشتی بھی کس کی، جنھوں نے بے لیے دیے سوار کیا، دریا سے پار کیا۔ کیا یہ بھی کوئی قصور ہے کہ بے وجہ ان کی کشتی توڑ ڈالی؟ اب آگے چلیے۔ آگے بڑھے تو کیا کیا۔ ایک بیگناہ نابالغ لڑکے کو ذبح کر ڈالا گناہ نہیں قصور نہیں؟ کسی کا خوبصورت بچہ یا کھیل ہی رہا تھا یا سر کہیں ہے، دھڑ کہیں ہے۔ دیکھئے یہ افعال حضرت خضر جن میں سر مو شائبہ گناہ نہ تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے نبی کی سمجھ میں نہ آئے عقل کیسی، کچھ، نور نبوت کس قدر، تس پر، حضرت خضر کے پاس گئے، تو خدا کی تعریف کے بعد گئے، مگر بایں ہمہ صواب کو خطا اور فعل نیک کو گناہ ہی سمجھے، جب خضر نے بتلایا تو جانا کہ کشتی کا توڑ ڈالنا ہی کشتی والوں کے حق میں اچھا تھا، ورنہ پیچھے سے کشتیوں کی پکڑ تھی۔ اگر صحیح سالم دیکھتے تو حاکم کے پیادے کھینچ لیجاتے

بیچارے ملاح اپنی روزی سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ ایسے ہی طفل مقتول اگر جوان ہوتا، تو جیسے شیر بھیڑیئے سانپ کا بچہ بعد جوانی اپنے ہی اطوار سیکھتا ہے، یہ بھی اطوار کفر اختیار کرتا، اور ماں باپ کو بھی کافر بنا ڈالتا، سو جیسے سانپ، شیر، بھیڑیئے کے بچوں کا قبل جوانی ہی مار ڈالنا مناسب ہے، ایسے ہی اس اس لڑکے کا مار ڈالنا بھی مناسب تھا اس صورت میں گو کسی قدر اس کے ماں باپ کو رنج و فراق کا صدمہ ہوا ہو پر ان کے حق میں یہ رنج ایسا ہو گیا جیسے پھوڑے میں نشتر مار کر جراح جب پیپ نکالتا ہے تو تکلیف تو ہوتی ہے، پر ہمیشہ ہمیشہ کی تکلیف کے عوض اول تو اس تھوڑی تکلیف پر ٹلتی ہے، پھر جب مادہ فاسد نکلتا ہے، تو اس کی جگہ اچھا مادہ پیدا ہوتا ہے، اور تولد مادہ فاسد موقوف ہو جاتا ہے، ہاں تا دم بقاء مادہ فاسد، البتہ امید تولد مادہ صالحہ نہیں، سو یہاں بھی بعد مقتول ہو جانے طفل مذکور کے اس کے ماں باپ کو ایک دختر صالحہ ملی جس سے ایک نبی پیدا ہوا، ہاں اگر طفل مذکور نہ مارا جاتا تو پھر تولد نبی کی کوئی صورت نہ تھی،

(صحابہ کرامؓ کی تعریف خدا نے قرآن میں بار بار کی ہے۔)

بالجملہ حضرات شیعہ کو اگر کلام اللہ کا اعتبار اور خدا کے قول و قرار پر اعتماد ہے۔ تو حضرات صحابہؓ کے اسی طرح معتقد ہو جائیں، جیسے خدا کے کہنے سے اپنی سمجھ کو ایک طرف طاق پر دھر، حضرت خضر کے معتقد ہوئے۔

تمہیں کہو اگر خداوند کریم حضرت خضر کی ان باتوں کی ھندی کی چندی نہ بتلا دیتا، تو پھر حضرت خضر سے زیادہ بُرا کون تھا، پھر جب خدا کا اتنا اعتقاد ہے، کہ حضرت خضر کے ایسے ایسے فعلوں کے معتقد ہوئے، تو صحابہ محمدی کے تو اس سے زیادہ ہی ہونا چاہیئے۔ اول رسول اللہ صلی اللہ علیہ علیہ وسلم کی اس میں تعریف کہ ان کی خوبی حضرت ہی کا فیض صحبت سمجھا جائے گا، ورنہ تم ہی کہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ کو کوئی کیا کہے گا، عجب صاحب تاثیر تھے جن سے ساری عمر پانچ چار سے زیادہ مسلمان نہ ہوئے اور ہوئے بھی تو ایسے دنیا دار کہ خدا پناہ میں رکھے، دوسرے خدا کی بات بھی بنی رہے گی، ورنہ آپ کی ان عیب چینیوں سے خدا کا بھی اعتبار نعوذ باللہ نہ رہے گا، اور کیا رہا ہے، خدا نے خضرؑ کی تعریف میں فقط اتنا فرمایا ہے۔

عَبۡدًا مِّنۡ عِبَادِنَاۤ اٰتَیۡنٰهُ رَحۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا وَعَلَّمۡنٰهُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا جس کا حاصل فقط

یہ ہے کہ ایک بندہ تھا ہمارے بندوں میں سے، جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت عطا کی تھی، اور اپنے یہاں سے علم تعلیم کیا تھا!

سو انصاف کر کے تم ہی فرماؤ کہ صحابہؓ کی ان تعریفوں سے جو اوپر، مذکور ہوئیں، ان دو باتوں کو کیا نسبت، پھر اگر اپنی غلط فہمی سے عار لگتی ہے، تو اوّل تو تم حضرت موسیٰ علیہ السّلام سے زیادہ نہیں، وہ کچھ کا کچھ سمجھ گئے، اگر تم الٹا سمجھ گئے ہو تو کیا قیامت ہے تس پر اگر تسکین نہ ہو، تو خدا کے اعتبار کے بھروسہ انہی روایات کی تکذیب کریئے، جن سے خطائے صحابہؓ سمجھ میں آتی ہے، اور اُن روایات کے بھروسہ سے خدا کی تکذیب تو کچھ ثواب کا کام نہیں، یہاں تک تو جواب اجمالی تھا اور اہل انصاف کو اس کے بعد انشاء اللہ اور کسی بات کی جانب سے پھر شک نہ ہوگا۔

ہاں کج فہمان ناانصاف کا جواب، جن کی بات وہی مرغے کی ایک ٹانگ ہو، ہم سے نہیں دیا جاتا، موافق مثل مشہور "گوہ کی دارو موت" خوارج سے اپنی تسکین فرمائیں، ہم کس کو بھلا کہیں کس کو بُرا۔

(صحابہؓ و اہل بیت رضی اللہ عنہم دونوں کی تعظیم فرض ہے)

اہل بیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب کرامؓ ہمارے حق میں تو دونوں مثل چشم و گوش قابلِ اتباع ہیں، اُن کی محبت ان کا اعتقاد ایمان کے لیے ایسے ہیں جیسے (اڑنے والے جانور کے دو پر اڑے تو دونوں سے اڑے اور ایک بھی نہ ہو تو گر پڑے، صاحبو! حضرات شیعہ اور اہل سنّت کا مقابلہ ایسا ہے، جیسے، نصاریٰ اور اہل اسلام کا مقابلہ۔ ہم تو جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت کے معتقد ایسے ہی حضرت عیسیٰؑ اور حضرت موسیٰؑ کی نبوّت کے مقر انہیں برا کہہ سکیں نہ اُن کو، پر نصاریٰ حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلّم کی نسبت گستاخیاں کر کر اپنے اعمال ناموں[1] کی درستی کر لیتے ہیں، ایسے ہی اہل سنت کو تو ایک سے ایک زیادہ، سبھی کے غلام، سبھی کے ثناخوان۔ پر شیعہ حضرات صحابہؓ کی نسبت وہی عمل کرتے ہیں، جو یہود و نصاریٰ بہ نسبت حضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلّم کے کرتے ہیں، اب یہاں سے جوابات تفصیلی بترتیب

(۱) لہ یعنی اپنے اعمال نامے سیاہ کرتے ہیں۔

سوالات لکھتا ہوں۔

سوال اوّل از جانب شیعہ

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لیے کوئی حکم پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوا یا نہیں؟

جواب: حضرت ابوبکرؓ صدیق کی خلافت کے لیے حکم خدائے تعالیٰ اور حکم پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم دونوں ہوئے، پر فہم کی ضرورت ہے، ورنہ کج فہمی ہے تو اس کے جواب کے لیے یہ شعر پیشگی مرقوم ہے۔

چوں بشنوی سخن اہلِ دل مگو کہ خطا است
سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا است

(حکم) خدا کا حوالہ مطلوب ہے تو لیجیے، خلافت کے لیے افضل ہونا افضل ہے، میانجیو کا خلیفہ بھی وہی ہوتا ہے جو اس کا شاگرد رشید ہوتا ہے، نبی کے خلیفہ میں یہ بات بدرجہ اولیٰ چاہیے، اور میانجیو اور لڑکوں کی مثال کی اس لیے ضرورت ہوئی کہ حضرات شیعہ کی عقل لڑکوں سے کچھ کم نہیں، شاید اگر سمجھیں تو مکتب کی بات سمجھ جائیں، بہرحال خلیفہ کا افضل ہونا افضل ہے، سو حضرت ابوبکر صدیقؓ کا افضل ہونا، دو طرح سے ثابت ہے، اور تنگی وقت اور جواب کا تقاضا نہ ہوتا تو شاید ہم اور بھی عرض کرتے، پر اب دو ہی باتوں پر ٹالتے ہیں۔

(افضلیت صدیق اکبرؓ پر دو قرآنی دلیلیں)

ایک یہ کہ بشہادۃ آیت اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ سب میں افضل وہ ہے جو سب میں زیادہ متقی ہو، پھر سورۃ واللیل[1] میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان میں آپ ہی ارشاد فرماتے ہیں وَسَیُجَنَّبُھَا الْاَتْقَی الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ بچایا جائے گا بھڑکتی ہوئی آگ سے وہ شخص جو سب میں زیادہ متقی ہے کون؟ جو اپنے مال کو پاک ہونے کے لیے دیتا ہے، کسی کے احسان کا بدلہ نہیں، یعنی حضرت بلالؓ کا آزاد کرنا محض للہ ہے۔ خدا کے لیے ہے، حضرت بلال کے کسی احسان کا بدلہ نہیں،

---

[1] شیعہ کی معتبر تفسیر مجمع البیان طبرسی میں ان آیات کا نزول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حق میں ذکر کیا ہے۔ (محمد)

تطویل سے ڈرتا ہوں، ورنہ میں بہت کچھ اس میں انشاء اللہ آپکی خدمت میں عرض کرتا، پھر کیا کروں، اُدھر موانع، اُدھر آپ، فقط اتنا ہی پوچھتے ہیں کہ کوئی حدیث ہو تو بتلاؤ، سو میں نے آیت بتلائی، ہاں یہ بات باقی رہی کہ یہ آیت ان کی شان میں ہے کہ نہیں؟ سو اس کی تصدیق کے لیے ساری تفسیریں موجود ہیں اور بھی نہیں، تو بیضاوی یا تفسیر عزیزی منگا دیکھئے، باقی آپنے یہ تخصیص ہی نہیں کی کہ حدیث ہو تو کن کی ہو، اور ظاہر بھی ہے، آپ ایسے دیوانے نہ تھے جو تخصیص کرتے حضرت صدیق رضؓ کے فضائل اگر ہوں گے تو سنیوں ہی کی کتابوں میں ہوں گے اور یہ نہیں تو پھر آپ ہی فرمایئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل، ہندوؤں کی پوتھیوں اور یہود و نصاریٰ کی کتابوں سے کیونکر نکالیے گا؟ یہ بسط و تفصیل کہاں ہے علیٰ ہٰذا القیاس فضائل مرتضوی سنیوں اور شیعوں کے اور کس کے پاس ہیں۔

دوسری آیت جو صدیق اکبرؓ کی افضلیت پر دلالت کرے وہ یہ ہے۔

اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السُّفْلٰى وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا ط وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ط (سورہ توبہ ع ۶)

حاصل یہ ہے اگر تم ہمارے رسول کی مدد نہ کرو گے تو کیا ہوگا اللہ نے ایسے وقت اسکی مدد کی ہے جس وقت اس کو کافروں نے نکالدیا تھا جس حال میں کہ ایک وہ تھا اور ایک انکے ساتھ میں فقط اور تھا جب کہ دونوں غار میں تھے، جب کہ وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا تو غمگین مت ہو اللہ ہم دونوں کے ساتھ ہے، پھر اللہ نے اپنی تسلی اس پر نازل فرمائی اور ایسے لشکروں سے تائید کی جو تم نے نہیں دیکھے اور اللہ نے کافروں کی بات نیچی کردی اور اللہ کا بول بالا ہے۔

اس میں دیکھئے حقائق و دقائق تو بہت ہیں، پر غرض مختصر یہ ہے کہ اللہ نے ان اللہ معنا فرمایا۔ اللہ معی و معک نہیں فرمایا، اس سے صاف ظاہر ہے، پر آنکھیں نہ ہوں تو کیا کیجیے کہ جس طرح کی معیت خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضؓ

---

[1] شیعہ تفسیر مجمع البیان صفحہ ۳۲ میں ہے ومعناہ فقد نصرہ اللہ منفرداً من کل شیٔ الا من ابی بکر۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی مدد بجز ابوبکر کے ہر ذریعہ سے الگ کر کے فرمائی۔ ۱۲۔ حافظ مہر محمد۔

کے ساتھ بھی ہاں اگر دونوں لفظ ہوتے تو یہ بھی احتمال تھا کہ یہ اور قسم ہے وہ اور قسم اس صورت میں بجز اس کے ممکن نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کا مقام برابر برابر ہو یا اوپر نیچے بہر حال فاصلہ کی گنجائش نہیں سو برابری تو ممکن نہیں یہی ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرحد اسفل اور صدیق اکبرؓ کی سرحد اعلیٰ دونوں ملے ہوئے ہوں سو ظاہر ہے کہ اس صورت میں حضرت ابوبکرؓ کا رتبہ اور تینوں سے بلند ہوگا۔ یہ دو آیتیں تھیں۔ اب حدیث سن لیجئے۔

(حدیث سے صدیق اکبر کی افضلیت پر تین دلیلیں)

(پہلی دلیل) پر پہلے سن لیجئے کہ کلام اللہ و حدیث میں یہ کہیں نہیں کہ ماں باپ کے جوتیاں مت مارو وہاں یہ ہے کہ فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا۔ یعنی ماں باپ کے روبرو اُف بھی مت کر، اور جھڑک بھی مت، مگر عاقل اتنی بات سے سمجھ جاتا ہے کہ جوتیاں مارنا بدرجہ اولیٰ منع ہے، ہاں دینداران شیعہ بوجہ کم عقلی کچھ متامل ہوں تو ہوں، مگر ہم جانتے ہیں وہ بھی نہ ہوں گے، ایسا بھی عقل کا قحط پڑ گیا، بہر حال ایسا ہی صدیق اکبرؓ کی خلافت کو بھی سمجھئے، یعنی قریب وفات حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبرؓ کو امام نماز بنایا، ہر عاقل نے پہچان لیا کہ جو دین کا امام ہو یعنی نماز پڑھائے وہی دنیا کا امام یعنی خلیفہ وقت بھی وہی ہوگا۔ کیوں کہ شیعوں کے طور پر تو سوائے اشرف و افضل کسی اور کا امام بنانا جائز نہیں اور سنیوں کے نزدیک گو جائز ہے پر افضل یہ ہے کہ افضل ہو تس پر اس اہتمام سے کہ اور لوگ اوروں کے لیے کہیں، اور آپ باصرار تمام صدیق ہی کو نماز پڑھانے کو فرمائیں، اب حضرات شیعہ انصاف فرمائیں، مرتے وقت تو عام لوگ بھی خوف خدا کرتے ہیں، کسی کا بار اپنی گردن پر نہیں لیجاتے اگر (امامت) حضرت علیؓ کا حق ہوتا تو اور کوئی دلاتا یا نہ دلاتا، پر سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور وہ بھی ایسے وقت میں ضرور ان کا حق دلا کر جاتے۔

حضرات شیعہ کچھ تو انصاف فرمائیں، جیسے جوتیوں کی نسبت صاف ممانعت سے یہ زیادہ ہے کہ اف کرنی اور جھڑکنے سے منع فرمایا ایسے صاف خلیفہ بنا دینے سے یہ زیادہ ہے کہ ان کو امام عام مقرر کر دیا۔ یہی وجہ ہوئی کہ حضرت علیؓ ہمیشہ ان ہی کے پیچھے نماز پڑھتے رہے، اور اگر بالفرض یہ آیتیں اور یہ حدیث نہ بھی ہوتی تو گیا تھا، خلافت کے لیے وحی کی

ضرورت نہیں، فقط اتنی بات دیکھ لینی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں اور مریدوں میں کون زیادہ لائق ہے کہ یہ بات تو معاملات سے اسی طرح معلوم ہو جاتی ہے، جیسے کسی کا بڑا عالم ہونا یا بڑا حکیم ہونا، یا بڑا بہادر ہونا، علیٰ ہذا القیاس چونکہ یہ بحث جوابات سوالات اربعہ میں کسی قدر بسط سے لکھ چکا ہوں، اور وہ بھی ساتھ ہی مرسل ہیں تو یہاں اتنے ہی پر اکتفا لازم ہے۔ غرض ایک جواب تو فقط جواب ہی ہوتا ہے، اور ایک جواب باصواب، جس کے ہر پہلو سے اطمینان ہو، سو امام بنا دینا خلیفہ بنا دینے سے زیادہ ہے، علیٰ ہذا القیاس ایک حکم تو فقط حکم ہی ہوتا ہے، اور ایک اصل مطلب سے بڑھا کر کہا کرتے ہیں جیسے لَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ سو یہ نماز کا امام بنا دینا بھی ایسا ہی ہے۔

(دوسری دلیل)

علاوہ ازیں بخاری شریف میں ایک حدیث ہے اس کو سب کو نہیں لکھتا پہ بقدر ضرورت اس میں سے ایک جملہ منقول ہے۔

لَقَدْ هَمَمْتُ اِذَا اَرَدْتُّ اَنْ اُرْسِلَ اِلٰى اَبِىْ بَكْرٍ وَّابْنِهٖ وَاَعْهَدَ اَنْ يَّقُوْلَ الْقَائِلُوْنَ اَوْ يَتَمَنَّى الْمُتَمَنُّوْنَ ثُمَّ قُلْتُ يَاْبَى اللّٰهُ وَيَدْفَعُ الْمُؤْمِنُوْنَ اَوْ يَدْفَعُ اللّٰهُ وَيَاْبَى الْمُؤْمِنُوْنَ۔

(بخاری ج ۱ ص ۸۴۶)

حاصل معنیٰ یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں تحقیق ارادہ کیا تھا میں نے اس بات کا کہ ابوبکر صدیق اور ان کے بیٹے کو بلاؤں اور عہد و پیمان کرا دوں تاکہ کل کو بولنے والوں کو کچھ گنجائش نہ رہے اور کسی تمنا والے کو تمنا نہ ہو، پھر میں نے کہا اللہ اور اہل ایمان دونوں سوائے ابوبکر کے اور کسی کے روادار ہی نہ ہوں گے۔

اور بخاری اور مسلم میں اس حدیث کی دوسری روایت میں بجائے لفظ اعہد الخ اکتب کتابا فانی اخاف ان یتمنی متمن و یقول قائل اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت ابوبکر صدیق رضی کا لکھوانا منظور تھا، پر یوں سمجھ کر کہ نہ خدا کو اور کوئی پسند آئے گا نہ مسلمانوں کو آپ چپ ہو رہے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ جس روز آپ نے قلم دوات منگایا، اور بزعم شیعہ حضرت عمر مانع ہوئے۔ کتابت خلافت صدیقی منظور تھی، پھر نہ جانے شیعہ کیوں برا مانتے ہیں اگر شکایت ہو تو سنیان صدیقی کو ہو، شیعوں کو حضرت عمر رض کی داد دینی چاہیئے کہ دلا دی سب سے پہلے

ہی حق مرتضوی ادا کیا۔

باقی اس کا جواب کہ حضرت نے منع کیا ہے یا نہیں، اور بجا کیا یا بیجا آگے آتا ہے۔ یہاں فقط اس قدر قابل عرض ہے کہ یہ فرمانا کہ میں لکھ دیتا پر کچھ حاجت نہ دیکھی خلیفہ کر دینا ہے یا نہیں؟

(تیسری دلیل)

دوسری حدیث بھی بخاری اور مسلم ہی کی لیجئے۔

عن جبیر بن مطعمؓ قال اَتَتْ رسولَ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اِمْرَأَۃٌ فَکَلَّمَتْہُ فِیْ شَیْءٍ فَاَمَرَھَا اَنْ تَرْجِعَ اِلَیْہِ قَالَتْ یَا رَسُوْلَ اللہ اَرَاَیْتَ اِنْ جِئْتُ وَلَمْ اَجِدْکَ قَالَ اَبِیْ کَاَنَّھَا تَعْنِیْ الْمَوْتَ قَالَ فَاِنْ لَّمْ تَجِدِیْنِیْ فَاْتِیْ اَبَابَکْرٍ۔

حاصل معنیٰ یہ ہیں کہ ایک عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئی اور کسی بات میں آپ سے کچھ عرض کی آپ نے فرمایا پھر آنا اس نے عرض کیا اگر آپ کو نہ پاؤں یعنی آپ کا انتقال ہو جائے آپ نے فرمایا ابوبکر کے پاس آنا۔

(مسلم ص ۲۷۳/۲ بخاری ص ۵۱۶/۱ ترمذی ص ۲۰۹/۲)

اب آپ ہی فرمایئے یہ خلیفہ بنا دینے سے زیادہ ہے یا نہیں؟۔ غرض اس قسم کے امور بہت ہیں، جو آپ کی خلافت پر دلالت کرتے ہیں، اور وقت استخلاف صدیق اکبرؓ، صحابہؓ کو ملحوظ ہے، شوق ہو تو کتاب ازالۃ الخفار کو ملاحظہ فرمائیں۔

جواب مولوی عبداللہ صاحب

بہت سی احادیث صحیحہ وارد ہیں کہ جن سے صراحۃً اور کنایۃً خلافت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، کی واضح اظہر من الشمس ہے، اس کا انکار بعینہ دوپہر کے وقت آفتاب کا انکار ہے چنانچہ ان میں سے چند احادیث مذکور ہوتی ہیں۔ حالانکہ بعض خاص امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ، سے مروی ہیں، اب نظر منصفانہ دیکھ کر تصدیق خلافت حضرت صدیقؓ کیجئے۔

(پہلی حدیث)

اخرج ابن سعد عن الحسن قال قال علی

ترجمہ:۔ تخریج کی ہے یہ حدیث ابن سعد نے حسنؓ

رضی اللہ عنه لَمَّا قُبِضَ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم نَظَرْنَا فِی اَمْرِنَا فَوَجَدْنَا النَّبِیَّ صلی اللہ علیه وسلم قَدْ قَدَّمَ اَبَابَکْرٍ فی الصَّلٰوۃِ فَرَضِیْنَا لِدُنْیَانَا عَنْ مَنْ رَضِیَ رسول اللہِ صلی اللہ علیه وسلم عنه لِدِیْنِنَا فَقَدَّمْنَا اَبَابَکْرٍ[1]

(ازالۃ الخفاء ص ۶۸ ج ۱ بحوالہ استیعاب)

سے حسنؓ نے کہا کہ فرمایا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہ دیکھا ہم نے اپنے امر میں اور پایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ تحقیق مقدم کیا ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے میں پس راضی ہو گئے ہم دنیاوی امور میں اس شخص سے کہ جس سے حضرت راضی ہوئے امر دین میں پس مقدم کیا ہم نے ابوبکرؓ کو۔

(دُوسری حدیث)

وقال البخاری فی تاریخه روی ابن جمهان عن سفینۃؓ ان النبی صلی اللہ علیه و سلم قال لِاَبِی بَکْرٍ وعُمَرَ و عثمانَ ھٰؤُلَاءِ الخلفاءُ بعدی

اور کہا بخاری نے اپنی تاریخ میں کہ روایت کی ابن جمہان نے سفینہ سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے واسطے کہ یہ خلیفے ہیں میرے پیچھے)

(تیسری حدیث)

الحدیث المذکور اخرجه ابن حبان قال حدثنا ابو یعلی حدثنا یحیی الحمانی

اور حدیث مذکور نکالی ہے ابن حبان نے اس نے کہا حدیث بیان کی ابو یعلیٰ نے اس نے کہا حدیث بیان کی یحییٰ الحمانی

---

[1] حضرت شاہ عبدالحقؒ صاحب محدث دہلوی نے اپنی کتاب ماثبت بالسنۃ میں ابن اثیر جزری کی اسد الغابۃ سے حسن بصریؒ کی روایت حضرت علیؓ کا مذکور قول ان الفاظ سے روایت کیا ہے۔

قَالَ قَدَّمَ رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اَبَابَکْرٍ وَاِنِّی صَحِیْحٌ وَغَیْرُ مَرِیْضٍ وَاِنِّی شَاھِدٌ غَیْرُ غَائِبٍ وَلَوْ شَاءَ اَنْ یُّقَدِّمَنِیْ رَضِیْنَا لِدُنْیَانَا مَنْ رَضِیَ اللہُ وَرَسُوْلُهٗ لِدِیْنِنَا۔

حضرت علیؓ نے فرمایا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کو امام بنایا اور انہوں نے لوگوں کو نماز پڑھائی میں بے شک موجود تھا غائب نہیں تھا۔ میں بھلا چنگا تھا بیمار نہیں تھا اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے (امامت کے لیے آگے کرنا چاہتے تو آگے کر دیتے پس ہم نے اپنی دنیا کے لیے اسی کو پسند کر لیا جس کو اللہ اور اس کے رسول نے ہمارے دین کیلئے پسند فرمایا (مضامین رئیس الاحرار ص ۳۲)

۱۲ سواتی۔

حدثنا حشرج عن سعید بن جمہان عن سفینة لما بنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المسجد وضع فی البناء حجرا وقال لابی بکر ضع حجرک الی جنب حجری ثم قال لعمر ضع حجرک الی جنب حجر ابی بکر ثم قال لعثمان ضع حجرک الی جنب حجر عمر ثم قال ھؤلاء الخلفاء بعدی۔

ئے اس نے کہا حدیث بیان کی سعد بن جمہان نے اس نے روایت کی ہے سفینہ سے، ہر گاہ مسجد بنائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے رکھا ایک پتھر اس کی بنیاد میں اور حضرت ابوبکر سے کہا کہ میرے پتھر کے برابر میں تم پتھر رکھو، حضرت عمرؓ سے کہا ابوبکر کے پتھر کے برابر تم اپنا پتھر رکھو، پھر عثمان رضی اللہ عنہ، کو فرمایا کہ تم عمر کے پتھر کے برابر اپنا پتھر رکھو، پھر فرمایا کہ یہ میرے پیچھے خلیفہ ہیں۔

( )

(چوتھی حدیث)

قال ابو زرعة اسنادہ لا بأس بہ وقد اخرجہ الحاکم فی المستدرک وصححہ البیہقی فی الدلائل وغیرھا علیکم بسنتی وسنة الخلفا الراشدین المھدیین من بعدی اخرجہ الحاکم من حدیث عرباض بن ساریة (ترمذی ص۹۲ ج۲ باب الاخذ بالسنة واجتناب البدعة)

کہا ابو زرعۃ نے اس حدیث کی اسناد میں کچھ نقصان نہیں اور لایا ہے اس کو حاکم مستدرک میں اور صحیح کہا ہے اس کو بیہقی نے دلائل وغیرہ میں۔ کہ لازم پکڑو طریقے میرے کو اور طریقہ خلفاء راشدین مہدیین کو میرے بعد۔ تخریج کی ہے حاکم نے حدیث عرباض بن ساریہؓ سے۔

فائدہ اس میں سوچنا چاہیئے کہ حضرت نے بلا تعیین کسی شخص کے خلفاء من بعدی کی اتباع کا حکم فرمایا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو خلفاء بعد وفات ہوں گے راشدین اور مہدیین ہوں گے، من اتبع فاھتدیٰ ومن خالف فغویٰ۔

پانچویں حدیث:-

اخرج الترمذی والحاکم من حدیث سلمة بن کھیل عن ابی الزعراء عن عبداللہ بن مسعود قال قال رسول اللہ صلی اللہ

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتباع کرو تم ان کا جو میرے بعد ہیں یعنی ابوبکرؓ اور عمرؓ کا حضرت عمارؓ کی عادت اپناؤ اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے

عليه وسلم اِقْتَدُوا بِالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِیْ مِنْ اَصْحَابِیْ اِبِیْ بَکْرٍ وَعُمَرَ وَاهْتَدُوا بِهَدْیِ عَمَّارٍ وَتَمَسَّکُوا بِعَهْدِ ابن مسعودؓ

(ترمذی ص۲۲۱ ج۲ مناقب عبد اللہ بن مسعودؓ)

عہد و پیمان کو مضبوط پکڑو۔

(چھٹی حدیث - ۵، روائتیں -)

۱ روی البُخَاری عن ابن عُمَرَ قال کُنَّا نُخَیِّرُ بَیْنَ النَّاسِ فی زمان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم، فَنُخَیِّرُ اَبَابَکْرٍ ثم عُمَرَ بن الخطاب ثم عثمان بن عَفَّانَ (بخاری ص۵۱۶ ج۱ باب فضل ابی بکر بعد النبی صلی اللہ علیه وسلم) و زَادَ الطبرانی فی الکبیر فَیَعْلَمُ بذالك النبی صلی اللہ علیه وسلم وَلَا یُنْکِرُهُ ۲ وَاَخْرَجَ ابن عساکر عن ابن عُمَرَ قال کُنَّا وَفِیْنَا رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم نُفَضِّلُ اَبَا بکر وعمر وعثمان ۳ وَاَخْرَجَ ابن عساکر عن ابی هُرَیْرَةَ قَالَ کُنَّا مَعَاشَرَ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم وَنَحْنُ مُتَوَافِرُوْنَ۔ نَقُوْلُ اَفْضَلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِیِّهَا اَبُوبَکْرٍ ثم عُمَرَ ثم عثمان ثم نَسْکُتُ ۴ وَاَخْرَجَ التِّرْمِذِیُّ عن جَابِرِ بن عبد اللہ قَالَ قَالَ عُمَرُ لِاَبِیْ بَکْرٍ یَا خَیْرَ النَّاسِ بعد رسولِ

ترجمہ:۔ بخاریؒ نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ حضرت کے زمانے میں ہم آدمیوں میں سے چھانٹتے تھے سو چھانٹتے تھے ابوبکرؓ کو پھر عمرؓ کو پھر عثمانؓ کو اور زیادہ کیا طبرانی نے کبیر میں کہ جانتے تھے اس بات کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور انکار نہیں فرماتے تھے

۲۔ اور روایت بیان کی ابن عساکر نے ابن عمرؓ سے کہا کہ جس زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں موجود تھے ہم فضیلت بیان کرتے تھے۔ ابوبکر اور عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کی۔

۳۔ اور روایت کی ابن عساکر نے ابی ہریرہؓ سے کہا ہم لوگ جماعت اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت میں کہ بہت تھے کہتے تھے افضل اس امت کے بعد نبیؐ اس امت کے ابوبکرؓ ہیں پھر عمرؓ پھر عثمانؓ پھر سکوت کرتے تھے۔

۴۔ اور روایت کی ترمذی نے جابر بن عبد اللہ سے کہا کہا عمرؓ نے ابوبکرؓ کے لیے اے بہتر آدمیوں کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس پر ابوبکرؓ نے کہا سنو اگر تم یہ کہتے ہو تو میں نے بھی حضرتؐ سے

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال ابوبکرؓ اما انک ان قلت ذالک فلقد سمعتہ یقول ما طلعت الشمس علی رجل خیر من عمر۔ (ترمذی ص ۲۰۹ ج ۲ مناقب ابی حفص عمر بن الخطاب)

سنا ہے اکہ فرماتے تھے طلوع نہیں ہوا آفتاب کسی شخص پر کہ عمرؓ سے بہتر ہو ۵۰۔ اور روایت کی بخاری نے محمد بن علیؒ بن ابی طالب سے کہا محمد بن علی نے کہ میں نے اپنے باپ سے یہ کہا کون آدمی بہتر ہے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہا ابوبکر میں نے کہا پھر کون کہا عمرؓ اور میں اس سے ڈرا کہ یوں کہیں پھر عثمانؓ میں نے کہا پھر تم کہا میں تو ایسا ہی ہوں جیسے ایک اور شخص مسلمانوں میں سے ہو۔

واخرج البخاری عن محمد بن علی بن ابی طالب قال قلت لابی ای الناس خیر بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ابوبکر قال قلت ثم من قال عمر وخشیت ان یقول عثمان قلت ثم انت قال ما انا الا رجل من المسلمین (بخاری ص ۵۱۸ ج ۱)

(ساتویں حدیث)

ترجمہ

واخرج احمد وغیرہ عن علی قال خیر ھذہ الامۃ بعد نبیھا ابوبکر والثانی عمر رضی اللہ عنہ قال الذھبی ھذا متواتر ھذا متواتر عن علی فلعن اللہ الروافض ما اجھلھم۔ (مسند احمد ص ۱۰۶ ج ۱)

اور روایت کی احمد وغیرہ نے حضرت علیؓ سے کہا حضرت علیؓ نے بہتر اس امت کا بعد نبی کے ابوبکر ہے اور عمر ہے۔ ذہبی نے کہا کہ یہ روایت حضرت علیؓ سے متواتر ہے سو اللہ روافض کو لعنت کرے کیسے جاہل ہیں۔

(آٹھویں حدیث)

اخرج الترمذی والحاکم عن بن الخطاب قال ابوبکر سیدنا وخیرنا واحبنا الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ترمذی ص ۲۰۶ ج ۲)

اور روایت کی ترمذی نے اور حاکم نے عمرؓ بن الخطاب سے کہا انہوں نے ابوبکر سردار ہمارے ہیں، اور بہتر ہمارے ہیں، اور ہم سب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ محبوب ہیں۔

فائدہ :۔ غور کی جگہ ہے کہ ان کی تعریف ان کے ہم چشم و ہم عصر کیسی کرتے ہیں۔

(نویں حدیث)

واخرج ابن عساکر عن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ ان عمر صعد المنبر ثم

اور روایت کی ابن عساکر نے، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ سے اکہ عمرؓ منبر پر چڑھے، پھر فرمایا اے لوگو

قَالَ اَلَا اِنَّ اَفْضَلَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّهَا اَبُوْبَكْرٍ فَمَنْ قَالَ غَيْرَ هٰذَا فَهُوَ مُفْتَرٍ عَلَيْهِ مَا عَلَى الْمُفْتَرِيْ

سنو بیشک افضل اس امت کے بعد حضرت کے ابوبکرؓ ہیں سو جو شخص اس بات کے برخلاف کہے، اس کی وہی سزا ہے جو بہتان باندھنے والے کی سزا ہو۔

(دسویں حدیث)

اخرج ابوالقاسم الطلحی فی کتاب السنته له من طریق سعید بن عروبة عن منصور عن ابراهیم عن علقمة قَالَ بَلَغَ عَلِيًّا اَنَّ اَقْوَامًا يُفَضِّلُوْنَهٗ عَلٰى اَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ فَصَعِدَ الْمِنْبَرَ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اَيُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ بَلَغَنِيْ اَنَّ قَوْمًا يُفَضِّلُوْنَنِيْ عَلٰى اَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ وَلَوْ كُنْتُ تَقَدَّمْتُ فِيْهِ لَعَاقَبْتُ فِيْهِ فَمَنْ سَمِعْتُهٗ بَعْدَ هٰذَا الْيَوْمِ يَقُوْلُ هٰذَا فَهُوَ مُفْتَرٍ عَلَيْهِ حَدُّ الْمُفْتَرِيْ وَقَالَ اِنَّ خَيْرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّهَا اَبُوْبَكْرٍ ثُمَّ عُمَرُ ثُمَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِالْخَيْرِ بَعْدُ قَالَ فِي الْمَجْلِسِ الْحَسَنُ بْنُ عَلِيٍّ فَقَالَ وَاللّٰهِ لَوْ سَمَّى الثَّالِثَ سَمّٰى عُثْمَانَ (ازالۃ الخفا بحوالہ کتاب السنۃ ص ۶۸/۱)

ترجمہ:۔ ابوالقاسم طلحی کتاب السنۃ میں بسند سعید بن عروبہ از منصور از ابراہیم از علقمہ روایت لاتے ہیں کہ حضرت علی کو یہ خبر ملی کہ کچھ لوگ ان کو حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ پر فضیلت دیتے ہیں تو آپ منبر پر چڑھ گئے تو اللہ کی تعریف و ثنا کے بعد فرمایا اے لوگو! مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ کچھ لوگ مجھے حضرت ابوبکر و عمر پر فضیلت دیتے ہیں اگر میں نے اس کے متعلق پہلے (سزا کا) اعلان کیا ہوتا تو ضرور سزا دیتا پس آج کے دن کے بعد جس کسی سے میں نے سُنا کہ وہ یہ کہتا ہے تو وہ بہتان باندھنے والا ہے بہتان تراش کی حد اسے ملے گی۔ اور فرمایا اس امت کے سب سے بہتر شخص حضرت ابوبکرؓ ہیں پھر عمرؓ ہیں پھر اللہ بہتر جانتا ہے۔ راوی کہتے ہیں اس مجلس میں حسن بن علیؓ بھی تھے فرمانے لگے اللہ کی قسم اگر تیسرے نمبر پر افضل کا نام لیتے تو عثمانؓ کا لیتے۔

فائدہ:۔ افسوس کی بات ہے کہ حضرات شیعہ حضرت امیر المومنین کے زمانہ میں نہ ہوئے جو انہی کے ہاتھ سے سوءادبی شیخین کا مزہ پائے۔

(گیارھویں حدیث)

واخرج عبد الرحمن بن حمید فی مسند وابونعیم وغیرھما من طرق ابی الدرداء ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال مَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ وَلَا غَرَبَتْ عَلٰی اَحَدٍ اَفْضَلَ مِنْ اَبِیْ بَکْرٍ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ نَبِیًّا وفی لفظ عَلٰی اَحَدٍ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ بَعْدَ النَّبِیِّیْنَ وَالْمُرْسَلِیْنَ اَفْضَلَ مِنْ اَبِیْ بَکْرٍ

اور روایت کی عبد الرحمٰن بن حمید نے اپنی مسند میں اور ابونعیم وغیرہ نے ابوالدرداءؓ سے کہ بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ آفتاب نہ طلوع ہوا نہ غروب ہوا کسی شخص پر جو بہتر ابوبکر سے ہو مگر یہ کہ نبی ہو، (اور ایک روایت میں یہ لفظ ہے کہ نبیوں اور رسولوں کے بعد کسی بھی مسلمان پر سورج طلوع وغروب ہوا جو ابوبکر سے افضل ہو۔

فائدہ:۔ اس حدیث سے فضیلت خلیفہ اولؓ کی ماسواء نبی ورسول کے تمام بنی آدم پر ثابت ہوتی ہے۔

(بارھویں حدیث)

فی الاوسط عن سعد بن زرارۃ قال قال رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ جِبْرِیْلَ اَخْبَرَنِیْ اَنَّ خَیْرَ اُمَّتِکَ بَعْدَکَ اَبُوْبَکْرٍ۔

(طبرانی کی اوسط میں حضرت سعد بن زرارہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا روح القدس جبریلؑ نے مجھے بتلایا کہ آپ کے بعد آپ کی امت کا سب سے بہتر شخص ابوبکر ہے)

فائدہ: سنت جماعت کے نزدیک خلیفہ اول کی اس حدیث سے کتنی فضیلت ثابت ہوئی کہ روح القدس جبرئیل بھی انکو بہتر وافضل تمام امت کا فرمائے پر شیعہ اس کو بھی روح القدس کی غلطی پر محمول کریں گے۔ نعوذ باللہ من ھذا الفرقۃ الطاغیۃ)

(تیرھویں حدیث)

اخرج الشیخان عن عمرو بن العاص قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ النَّاسِ اَحَبُّ اِلَیْکَ قَالَ عَائِشَۃُ قُلْتُ مِنَ الرِّجَالِ قَالَ اَبُوْھَا قُلْتُ ثُمَّ مَنْ قَالَ ثُمَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ (مسلم ص ۲۷۳ ج ۲ بخاری ص ۵۱۷ ج ۱ ترمذی ص ۲۰۸ ج ۲ فضل عائشہ)

ترجمہ:۔ بخاری اور مسلم نے عمرو بن العاصؓ سے روایت کی ہے، کہا عمرو بن العاصؓ نے کہ میں نے عرض کی یا رسول اللہ کون شخص آپ کو سب سے زیادہ محبوب ہے آپ نے فرمایا عائشہؓ میں نے عرض کی مردوں میں سب سے زیادہ کون ہے فرمایا اسکا باپ پھر میں نے عرض کی انکے بعد کون آپ نے فرمایا عمر بن الخطابؓ۔

فائدہ:۔ سوّد اللہ وجوہ الروافض، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو حضرت عائشہؓ اور ان کے باپ کو سب آدمیوں سے زیادہ چاہیں اور یہ ان کی شان میں کیا کچھ زبان درازیاں کریں۔

(چودھویں حدیث)

اخرج الترمذی وغیرہ عن انس قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لِاَبِیْ بَکْرٍ وَّعُمَرَ ھٰذَانِ سَیِّدَا کُھُوْلِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ مِنَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ (ترمذی ص۵۲۷)

اور ترمذی وغیرہ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ کے لیے یہ دونوں سردار ہیں بڑی عمر کے جنتیوں میں اولین اور آخرین کے۔

فائدہ:- اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روافض کی مطلقاً بیخ کنی کر دی ہے۔ کیونکہ شیخین کو سردار کھول جنت فرمایا معلوم ہوا کہ تادم واپسیں مومن کامل رہیں گے اور بعد انتقال کھول جنت کے سردار بنیں گے پر یہ فرقہ باغیہ پھر بھی نہیں شرماتا۔ کیا ڈر ہے اَلْمَرْءُ یَقِیْسُ عَلٰی نَفْسِہٖ اگر کوئی بے وقوف اندھا دن کو رات بتلائے، تو اس کا کیا علاج ہے۔

(پندرھویں حدیث)

اخرج ابن عساکر عن ربیعۃ بن کعب قَالَ کَانَ اِسْلَامُ اَبِیْ بَکْرٍ الصِّدِّیْقِ سَبَبُہٗ بِالْوَحْیِ مِنَ السَّمَاءِ وَذٰلِکَ اِنَّہٗ کَانَ تَاجِرًا بِالشَّامِ فَرَاٰی رُؤْیَا فَقَصَّھَا عَلٰی بُحَیْرَا الرَّاھِبِ فَقَالَ لَہٗ مِنْ اَیْنَ اَنْتَ قَالَ مِنْ مَکَّۃَ قَالَ مِنْ اَیِّھَا قَالَ مِنْ قُرَیْشٍ قَالَ اَیُّ شَیْءٍ اَنْتَ قَالَ تَاجِرٌ قَالَ صَدَقَ اللّٰہُ رُؤْیَاکَ فَاِنَّہٗ یُبْعَثُ نَبِیٌّ مِنْ قَوْمِکَ تَکُوْنُ وَزِیْرَہٗ فِیْ حَیَاتِہٖ وَخَلِیْفَتَہٗ بَعْدَ مَوْتِہٖ فَاَسَرَّھَا اَبُوْبَکْرٍ حَتّٰی بُعِثَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَجَاءَہٗ فَقَالَ یَا مُحَمَّدُ مَا الدَّلِیْلُ عَلٰی مَا تَدَّعِیْ قَالَ الرُّؤْیَا الَّتِیْ رَاَیْتَ بِالشَّامِ فَعَانَقَہٗ وَقَبَّلَ بَیْنَ عَیْنَیْہِ وَ

ابن عساکر نے ربیعہ بن کعب سے روایت کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے اسلام کا باعث وحی آسمانی تھی اور قصہ اسلام یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ شام کے ملک میں سوداگری کرتے تھے، آپ نے ایک خواب دیکھا، اس کو بحیرا راہب سے بیان کیا، اس نے کہا تو کہاں کا رہنے والا ہے، انہوں نے جواب دیا مکہ کا اس نے کہا کون سے قبیلہ سے ہے، انہوں نے کہا قریش میں سے اس نے پوچھا کیا کام کرتا ہے، انہوں نے کہا کہ سوداگر ہوں، اس راہب نے کہا اللہ تعالیٰ تیرا خواب سچا کرے، اللہ تعالیٰ تیری قوم میں ایک نبی بھیجے گا تو اس کا اس کی زندگی میں وزیر ہوگا اور بعد اس کی وفات کے خلیفہ ہوگا، اس بات کو حضرت ابوبکرؓ نے پوشیدہ رکھا، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی

قَالَ اَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰہِ

(الریاض النضرۃ صث بحوالہ فضائل)

اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے سو حضرت کی خدمت میں آئے اور یہ کہا اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کے دعویٰ پر کیا دلیل ہے فرمایا وہی خواب جو ملک شام میں تونے دیکھا تھا، یہ سنتے ہی حضرت کو گلے لگایا اور آپ کی پیشانی پر بوسہ دیا اور کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ بے شک اللہ کے رسول ہیں۔

فائدہ: خیال کرنے کی جگہ ہے کہ کتنی پیشتر حضرت کی تبلیغ رسالت کے، حضرت ابوبکر کو بشارت وزارت و خلافت کی مل گئی۔

(سولھویں حدیث)

واخرج الحاکم عن انس بن مالك قَالَ بَعَثَنِیْ بَنُو الْمُصْطَلِقِ اِلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِلٰی مَنْ نَدْفَعُ زَکٰوتَنَا اِذْ حَدَثَ لَكَ حَدَثٌ فَقَالَ اِدْفَعُوْهَا اِلٰی اَبِیْ بَکْرٍ فَقُلْتُ ذَالِكَ لَهُمْ قَالَ قَالُوْا اِسْئَلْهُ اِنْ حَدَثَ بِاَبِیْ بَکْرٍ حَدَثُ الْمَوْتِ فَاِلٰی مَنْ نَدْفَعُ زَکٰوتَنَا فقلت لَهٗ قَالَ اِدْفَعُوْهَا اِلٰی عُمَرَ قَالُوْا فَاِلٰی مَنْ نَدْفَعُهَا بَعْدَ عُمَرَ فَقُلْتُ لَهٗ قَالَ اِدْفَعُوْهَا اِلٰی عُثْمَانَ، (ازالۃ الخفا صفحہ ۸۶)

اور روایت کی حاکم نے حضرت انس بن مالک سے کہا بھیجا مجھ کو بنی المصطلق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کہ ہم زکوٰۃ کس کو دیں جب آپ کو کوئی حادثہ پیش آئے۔ آپ نے فرمایا ابوبکرؓ کو دو، سو میں نے یہی جا کر بنی مصطلق سے کہہ دیا انس کہتے ہیں انھوں نے کہا کہ یہ حضرت سے پوچھ کر اگر ابوبکر کو حادثہ موت پیش آئے تو کس کو زکوٰۃ دیں سو میں نے حضرت سے جا کر عرض کیا آپ نے فرمایا عمر کو دو انہوں نے کہا بعد حضرت عمرؓ کے کس کو دیں میں نے حضرت سے یہ جا کر کہا آپ نے فرمایا عثمان کو دو۔

(سترھویں حدیث)

عَنْ سَهْلِ بْنِ اَبِیْ حَثْمَةَ قَالَ بَایَعَ اَعْرَابِیٌّ اِلنَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ عَلِیٌّ لِلْاَعْرَابِیِّ اِئْتِ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ

سہل بن حثمہ رضی سے روایت ہے کہ ایک اعرابی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معاملہ (بیع کا) کیا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اعرابی سے کہا کہ حضرت کے پاس

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاسْئَلْهُ إِنْ أَتَى عَلَيْهِ
أَجَلُهُ مَنْ يَقْضِيهِ فَأَتَى الْأَعْرَابِيُّ النَّبِيَّ
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ فَقَالَ
يَقْضِيكَ أَبُوبَكْرٍ فَخَرَجَ إِلَى عَلِيٍّ فَأَخْبَرَهُ
فَقَالَ ارْجِعْ وَاسْئَلْهُ إِنْ أَتَى عَلَى أَبِي بَكْرٍ
أَجَلُهُ مَنْ يَقْضِيهِ فَأَتَى الْأَعْرَابِيُّ النَّبِيَّ
صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ فَقَالَ
يَقْضِيكَ عُمَرُ فَخَرَجَ إِلَى عَلِيٍّ فَأَخْبَرَهُ
فَقَالَ ارْجِعْ فَاسْئَلْهُ مَنْ بَعْدَ عُمَرَ
فَقَالَ يَقْضِيكَ عُثْمَانُ فَقَالَ عَلِيٌّ لِلْأَعْرَابِيِّ
ائْتِ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
فَاسْئَلْهُ إِنْ أَتَى عَلَى عُثْمَانَ أَجَلُهُ مَنْ
يَقْضِيهِ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ إِذَا أَتَى عَلَى أَبِي بَكْرٍ أَجَلُهُ وَ
عُمَرَ أَجَلُهُ وَعُثْمَانَ أَجَلُهُ فَإِنِ اسْتَطَعْتَ
أَنْ تَمُوتَ فَمُتْ .

(ازالۃ الخفاء ص ۲۹ ج ۱ بحوالہ اسماعیلی)

جا اور یہ پوچھ کہ اگر آپ کی وفات شریف ہو جائے
تو ادا کون کرے گا اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے
کے پاس آیا اور پوچھا آپ نے فرمایا ادا تجھ کو ابوبکر
کریں گے، وہ اعرابی حضرت علیؓ کے پاس آیا اور
ان کو خبر دی آپ نے فرمایا پھر جا اور پوچھ کہ ابوبکرؓ
کا بھی انتقال ہو جائے تو کون ادا کرے گا...
اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا اور پوچھا
آپ نے فرمایا ادا تجھ کو عمرؓ کرے گا۔ پھر حضرت علیؓ
کے پاس آیا اور ان کو خبر دی حضرت علیؓ نے کہا
پھر جا اور پوچھ کہ بعد حضرت عمرؓ کے کون ہے
آپ نے فرمایا عثمان ادا کرے گا، حضرت علیؓ نے اعرابی
سے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا
اور پھر پوچھ کہ اگر عثمانؓ کی وفات ہو جائے تو کون ادا
کرے گا اس پر حضرت نے فرمایا کہ جب ابوبکرؓ کی موت
اور عمرؓ کا انتقال ہو جائے اور عثمانؓ دنیا سے
رحلت کر جائے اگر تو مرنے کی طاقت رکھتا ہے
تو تو بھی مر رہ۔

فائدہ:۔ حضرات شیعہ خواہ مخواہ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی خلافت کے لیے اپنی
جان کیوں تباہ کرتے ہیں اور خلفاء ثلاثہ کی خلافت سے منکر ہو کر کیوں روسیاہ بنتے ہیں حضرت
امیر المومنین کرم اللہ وجہہ کو خود ان سے پہلے اپنی خلافت کا خیال تھا جو اس دیہاتی کو بار بار
بھیج کر خلفاء ثلاثہ کی خلافت ثابت کرائی اور خیال خلافت حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کو کس
واسطے نہ ہو۔ کیونکہ ایسی قرابت قریبہ اور خصوصیت خاصہ یعنی ازدواج حضرت فاطمہ زہراؓ
کا اور دوسرے کو کب حاصل تھا پر انہوں نے جو خلفاء ثلاثہ کے وقت میں دعویٰ خلافت

نہ کیا تو کچھ تو سوچا ہی ہوگا۔

(شیعہ تقیہ کا ازالہ)

اور حیلہ تقیہ حسب ظنون شیعہ کے ہم گوز شتر جانتے ہیں،

اوّل - تو اہل بیتؓ کے خلاف ہے، دوسرے بمقابلہ حضرت امیر معاویہؓ اور خوارج کے کیوں تقیہ نہ کیا، حتیٰ کہ شہید ہو گئے، اور کونسا وقت تقیہ کا ہوگا، اور جن لوگوں نے بمقابلہ امیر معاویہؓ کے امیر المومنینؓ کا ساتھ دیا وہ ہی بمقابلہ خلفاء ثلاثہ کے بھی ساتھ دیتے، اور یہ تقیہ کی بات ایسی مزخرفات ہے کہ ذرا بھی پاؤں نہیں چلتے، حضرت حسینؓ کے مقابلہ میں کیا کہیں گے، نعوذ باللہ منھا کیا دونوں سے ترک فرض علین ہوا - ایک بات ہم اور یہ کہتے ہیں کہ حضرت امیر المومنین اپنی خلافت میں خطبہ پڑھتے ہوئے خلفاء ثلاثہ کی تعریف اور فضائل بیان کرتے تھے، اگر وہ بھی تقیہ سے تھا تو ہم پوچھتے ہیں کہ امیر المومنین کیسے شیر خدا تھے کہ بعد انتقال سالہاسال کے بھی خلفاء کے خوف سے ان کی تعریف کرتے تھے؛ افسوس کہ شیر خدا ہو کر مردوں سے خائف ہو - علی بن ابی طالبؓ تو ایسے بزدل و نامرد نہ تھے کوئی اور علی ہوں گے کہ جن کے یہ شیعہ متبع ہوئے ہیں، اور ان کے متعلق ایسی ایسی نامردیاں بیان کرتے ہیں اور اگر بالفرض والتقدیر ان کے مقتداء علی بن ابی طالبؓ ہی ہیں تو یہ امور ان کی طرف نسبت کرنے صرف ان شیعہ کی حماقت ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے "دانا دشمن بہ از نادان دوست" مگر ان کا بھی کیا قصور ہے۔ الاناء یترشح بما فیہ (۱) - جیسے خود ہیں ویسی ہی باتیں کرتے ہیں۔

(اٹھارویں حدیث)

وعن جبیر بن مطعم ان امرأة اتت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکلمتہ فی شیٔ فامرھا ان ترجع الیہ قالت فان لم اجدک کانھا تقول الموت

ترجمہ اور جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ ایک عورت حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کسی امر میں آپ سے گفتگو کی آپ نے اس کو فرمایا کہ پھر آنا اس نے کہا اگر میں آپ کو نہ پاؤں گویا یوں کہتی

---

(۱) برتن سے وہی کچھ ٹپکتا ہے جو کچھ اس میں ہوتا ہے۔ مہر محمد

قال ان لم تجدینی فاتی ابابکر اخرجه البخاری ومسلم والترمذی و ابوداؤد وابن ماجه ؛ (بخاری ص۵۱۶ ج۱ مسلم ص۲۷۳ ج۲ ترمذی ص۲۰۸ ج۲)

تھی کہ اگر آپ کی وفات شریف ہوجائے آپ نے فرمایا اگر تو مجھ کو نہ پائے تو ابوبکر کے پاس آئیو۔ روایت کی اس کو بخاری اور مسلم اور ترمذی اور ابوداؤد اور ابن ماجہ نے۔

سوال دوم از جانب شیعہ

اجماع اہل حل وعقد کی صفت بیان کیجئے۔

جواب سوال دوم :-

اجماع اہل حل وعقد کی حقیقت اور صفت تو اتنی ہی ہے کہ سب اہل حل وعقد ایک بات پر متفق ہوجائیں اس میں پوچھنے ہی کی کون سی بات ہے جو حضرت شیعہ سنیوں کو دھکارا۔

(اہل حل وعقد کی تعریف :-)

ہاں یہ پوچھنا مد نظر ہے کہ اہل حل اور عقد کس کو کہتے ہیں تو اس کا جواب ہم سے لیجئے، آدمی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک ہم جیسے بے سروسامان نہ کوئی ہمارا نہ ہم کسی کے۔ ایک وہ لوگ جو تھوک دار ہوتے ہیں، جیسے آپ کے رئیس، یا چودھری، کم سے کم ایسے مجھو جیسے دیوبند کے منڈ، جن کے کسی کام میں کھڑے ہوجانے سے دس آدمی کھڑے ہوجائیں، بیٹھ جانے سے دس آدمی بیٹھ جائیں، سو ایسے آدمیوں کو اپنی اپنی حیثیت کے موافق اہل حل وعقد کہتے ہیں، حل کے معنی کھولنا، عقد کے معنی باندھنا، سو یہ لوگ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں، کہ ان کے باندھے بندھتی ہے، اور کھولے کھلتی ہے، ایسے لوگ اگر کسی کے ساتھ عہد وپیمان کر لیتے ہیں، تو ان کے ذریعہ اور ان کے منہ دیکھنے والوں اور پیچھے چلنے والوں اور تابعداروں کے ذمہ بھی وہ عہد لازم ہوجاتا ہے، علی ہذا القیاس اگر کوئی پیر یا کوئی مدرس کسی سے کچھ عہد یا پیمان کرے، تو اس کے مریدوں اور شاگردوں کے ذمہ بھی اس کی وفا لازم ہے، چنانچہ مشاہدہ اور تجربے سے بھی عیاں ہے کہ سارے جہان میں یہی دستور ہے، اور اس قانون کو ہر ایک نے تسلیم کر رکھا ہے، یہاں تک کہ اگر دو بادشاہوں میں لڑائی بھڑائی کے بعد صلح ہوتی ہے،

تو وہ لڑائی اور صلح ہر ہر سپاہی، اور ہر ہر منشی کی صلح، اور لڑائی کبھی جاتی ہے، مگر اہل عقل پر واضح ہو گیا ہو گا کہ جس قافلہ کا افسر کسی سے کچھ عہد و پیمان کریگا تو وہ عہد و پیمان اس کے اتباع اور تابعدیوں کے ذمہ لازم ہو گا، ایک کا عہد و پیمان دوسرے کسی قافلہ کے افسر یا اس کے اتباع و خدام کے ذمہ لازم ہو گا۔

(حضرت امام حسینؓ و زین العابدینؒ کا مقام)

اس سے حضرت سید الشہداء شہید کربلا رضی اللہ عنہ کی نسبت ان کو گنجائش حرف گیری نہیں کیونکہ وہ بجائے خود ایک سردار اعظم اور افسر عالم تھے، اوروں کی بیعت سے، یزید کی بیعت ان کے ذمے لازم نہ ہوئی تھی، جو کوئی عقل کا پورا جس کو دستر سے کے پینے کی حاجت نہیں، بوجہ بیعت اہل شام جو یزید پلید کے ہاتھ پر کر چکے تھے، حضرت امام ہمامؓ پر اعتراض کرے یا مذہب اہل سنت پر آوازہ پھینکے، ہاں اتنی بات باقی رہی کہ کبھی بعض بزرگ بوجہ کمال خاکساری اپنے آپ کو سب سے کمتر سمجھ کر گوشہ عافیت قبول کرتے ہیں، اور اپنی طرف ہرگز گمان نیک نہیں کرتے جیسے حضرت امام زین العابدین علیہ وعلی آباؤ الکرام۔ السلام، بوجہ خاکساری بوقت دعا اس قسم کے مضامین کہا کرتے تھے، کہ الٰہی شیطان نے میری باگ پکڑ لی ہے، اور میرے اوپر غالب آگیا ہے۔ چنانچہ صحیفہ کاملہ میں جو منجملہ کتب معتبرہ شیعہ میں ہے، اس قسم کی دعائیں موجود ہیں، سو اس قسم کے لوگ بوجہ خاکساری، اپنی بیعت کو ضروری نہیں سمجھتے، اور اوپر کے لوگ بوجہ کمال عقیدت، ان کی بیعت کو سب سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے۔ جیسے اہل دیوبند اپنے بیماروں پر کرم (دم دعا) کرنے کے لیے حاجی عابد حسینؒ کا قدم رنجہ فرمانا غنیمت سمجھتے ہیں، اور خود حاجی صاحب سے پوچھئے تو بوجہ خاکساری اپنے سے برا کسی کو سمجھتے نہیں۔

(دو دوستوں میں خفگی و شکر رنجی آنی جانی چیز ہے۔)

سو ایسے ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے اول بیعت نہ کرنے کو خیال فرمایئے، بایں ہمہ جہاں دوستی اور محبت ہوا کرتی ہے وہاں رنج بھی ہوا کرتے ہیں، پر اس رنج میں اور لعداء کے رنج میں زمین و آسمان کا تفاوت ہے، یہاں جوش محبت ہوتا ہے، وہاں زور عداوت اول جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کو لوگوں نے سقیفہ بنی ساعدہ میں بیعت کے لیے گھیر لیا، اور

اس وقت چار و ناچار ان کو بیعت کا (قبول) کرنا اسی طرح ضروری ہو لیا جیسے بارہا حاجی صاحب کو بوجہ منت سماحت، اہل دیوبند جامع مسجد کا اہتمام سر پر لینا ضروری ہو جاتا ہے، یا مولوی محمد یعقوب صاحب کو باوجود اس شدّت انکار کے وعظ کا فرمانا۔

تو اس وقت حضرت علیؓ کو ایسا رنج ہو گیا، جیسے دیوبند کی شادیوں غمیوں میں کسی بے خبری کے باعث بھائی روٹھ جاتے ہیں۔

(ایک مثال)

تھوڑے ہی دن گذرے مولوی ذوالفقار علی صاحب کے بڑے صاحبزادے کی شادی میں برادری کے بھائی اتنی بات پر روٹھ گئے کہ کھانے کا انتظام طالب علموں کے کیوں سپرد کر دیا، یہ کام ہم سے کیوں نہ لیا، سو جیسے ان صاحبوں کو خدانخواستہ مولوی صاحب سے کوئی رنج نہ تھا، ہاں ناز برداری کہیے، اس لیے تھوڑے سے تملق کے بعد شیر و شکر کی طرح دل مل کر ولیمہ کا کھانا نوش فرما گئے، اور اس سب کے تدارک و تلافی میں اتنی بڑی عزت لے گئے، ایسے ہی حضرت علیؓ کو خیال فرمائیے، اس سے ظاہر کی بے اعتنائی پر جس میں واقع میں ایسی ہی بے اختیاری تھی، جیسے مولوی صاحب کی بے اعتنائی کہ کچھ جان بوجھ کر بھائیوں کی ضد سے نہ تھی۔ حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ سے رنج ہو گیا، سو وہ رنج نہ تھا، ناز محبت تھا، اس لیے حضرت ابوبکر رضؓ کے عرض حال کے بعد وہ رنج مبدل بخوشی ہو گیا، اور علی الاعلان یہ فرمایا کہ ہم کو ابوبکر رضؓ کے فضائل میں کلام نہیں، ان کی بزرگی کا رشک نہیں، ہاں ہم کو یہ امید نہ تھی کہ بیعت کے وقت ہم کو پوچھنے کے بھی نہیں، اور پھر مجمع عام میں بیعت کی، ادھر حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے وہ قدر شناسی کی کہ کاہیکو ہوتی ہے، منبر پر کھڑے ہو کر بقسم یہ کہا کہ مجھ کو جتنی قرابت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا پاس و لحاظ اور انکے ساتھ محبت ہے اتنا اپنی قرابت کا پاس و لحاظ نہ اتنی محبت ہے اور اپنا عذر بیان کیا، غرض مثل شیر و شکر دونوں ہوگئے وہ مثل ہے کہ مدعی اور مدعی علیہ تو راضی ہو گئے پر ابراغیر بیچ کلیان راضی نہیں یہ تحقیق موافق مذہب اہل سنت تھی۔

(مذہب شیعہ کے اصول پر جواب)

پر موافق اصول شیعہ اس کا اور جواب ہے، یعنی اوّل اوّل حضرت علیؓ کا ارادہ ہی نہ تھا کہ بیعت کیجئے، اپنا حق کسی کو کیوں دیدیجئے، مگر آخر کار موافق سنّت خداوندی نعوذ باللہ بدا واقع ہوا، یعنی یہ سمجھ میں آیا کہ حق میرا نہیں، اس منصب کا مستحق میں نہیں ابوبکرؓ ہیں، اور کیونکر نہ سمجھتے شیعوں کی مانند بدفہم تو نہ تھے جس کو خدا اتقٰی کہے رسول اللہ علیہ وسلّم امام نماز بنائیں، پنچ ساری خلیفہ مقرر کریں، وہ بھی خلیفہ نہ ہو تو اور کون ہو، دنیا میں تین ہی حاکم ہیں، خدا، رسول، یا تیسرے پنچ جسے شریعت میں اجماع کہتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف تو ایک بھی نہ تھا، بہر حال اوّل سے معتقد خلافت اول کہو یا بعد میں سمجھو، حضرت علیؓ کے شریک بیعت ہونے میں کچھ شک نہیں۔

(تقیہ کے عذر لنگ کا ازالہ)

باقی یہ عذر پوچ کہ تقیہ تھا، ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی زبردستی تھی، قدر دانان مرتضوی کے سامنے گزشتہ کے بھاؤ بکتا ہے، اس متاع بے بہا اور گوہر یکتا کو پڑیا میں باندھ کر رکھ چھوڑیے لکھنو کی نوابی جب کبھی بحال ہوگی کام آئے گا، غضب نہیں کہ شیر خدا کو گیدڑ سے بھی پرے کر دیا، اور شاہ مرداں کو عورتوں سے بھی زیادہ بے عزت بنادیا، صاحبزادے ایسے غیرتمند کہ عراق کی تیسؔ ہزار فوج جرار دکرار سے بھی نہ چھپے جان نازنین پر کھیل گئے، خانماں کو غارت کرادیا عزت دنیا کو خاک میں ملادیا، پر اپنی بات سے نہ ٹلے، اور ادھر سے فقط اتنی درخواست کہ ایک بیعت کرلو پھر جو چاہو سو کرو اگر یہی تقیہ تھا تو کس دن کے لیے تھا، باپ کو چاہیے تھا کہ بیٹے سے دو چار نمبر زیادہ ہی رہتے، پھر اس قصہ اور اُس قصہ میں زمین و آسمان کا فرق نہیں؟ یزید فقط دشمن دنیا تھا، ابوبکرؓ و عمرؓ حسب مقولہ شیعہ دشمن دین، اس لیے تبرا کے وقت انہیں کو نشانہ بناتے ہیں، اور اپنی تعریفیں انکی شان میں سناتے ہیں۔

(شیعوں کا تقیہ قرآن کے مخالف ہے) ہم اور اس غیرت اور بے عزتی کی بات بھی جانے

لہ یہ مبالغہ یا شیعوں کی مشہور کردہ حکایت ہے، تاریخ سے تین چار ہزار لشکر کا پتہ چلتا ہے۔ ۱۲ مہر کہ

دو، حکم خدا بھی یہی ہے کہ خدا کی راہ میں جان پر کھیل جائے، عزت کا پاس فکر سے، کسی کے بھلا برا کہنے سے نہ ڈرے، چنانچہ اچھے بندوں کی تعریف میں فرماتے ہیں،

يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ (پ۶)

جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور کسی کی ملامت سے نہیں ڈرتے،

اس سے ہر کوئی سمجھ گیا ہوگا کہ اچھوں کو نہ خوف جان چاہیے نہ پاس آبرو ایسے ہی صحابہ کرام رضی کو فرماتے ہیں،

وَكَأَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا (پ۴ ع ۶)

(جس کے یہ معنی ہیں، بہت سے ایسے نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ ہو کے بہت سے اللہ والوں نے کافروں سے جہاد کیا، پھر نہ وہ سست ہوئے، نہ ہارے نہ گھبرا کر کافروں کے سامنے لجاجت کرنے لگے،

سو آپ ہی فرمایئے تقیہ میں سوا ان تین باتوں کے اور کیا ہوتا ہے۔ ہاں اگر کلام اللہ میں کہیں بھی نامردوں اور کم ہمتوں اور بے غیرتوں کی تعریف ہوتی، تو یوں بھی سہی، اور اگر یہی سچ ہے کہ خدانخواستہ تقیہ تھا، تو پھر اگر رسول اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رض کو امام کیا بھی ہو گا تو خدا نے معزول کر دیا، کیونکہ ایسے جان کے بچانے والوں سے آگے کو کیا امید اور بنظر امید ہائے دور دراز شیخین کو خلیفہ کر دیا۔ سو یہی سچ معلوم ہوتا ہے کیونکہ الحمد للہ ویسا ہی ظہور میں آیا روم و شام تو در کنار ایران کو بھی مسلمان کر دیا۔

جواب ثانی از مولوی عبد اللہ صاحب

مجتمع ہونا قضاۃ و امراء اور رؤساء اور علماء کا اجماع اہل حل و عقد کہلاتا ہے، یعنی ایسے لوگ مجتمع ہوں جن کے باندھے بندھے، اور کھولے کھلے، چنانچہ حضرت عمر رض و دیگر مہاجرین اور انصار رض تھے، کہ جن لوگوں نے حضرت ابو بکر رض سے بیعت خلافت کی اور وہی بیعت تا حیات حضرت ابو بکر صدیق رض کے بلا منازعت و تنازع و بلا انکار منکر قائم رہی اور تمام اہل حل و عقد کا مجتمع ہونا ضرور نہیں ہاں اکثر کا اجتماع ضرور ہے تاکہ للاکثر حکم الکل

ہوجاتے، جیسا کہ خلفاء اربعہ کی خلافت میں ہوا، اور ابوبکر کی خلافت و فضیلت کا کوئی بھی منکر نہ تھا، حتیٰ کہ تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ امام باقرؒ نے فرمایا

لَسْتُ بِمُنْكِرٍ فَضْلَ اَبِىْ بَكْرٍ وَفَضْلَ عُمَرَ وَلٰكِنْ اَبَابَكْرٍ اَفْضَلُ مِنْ عُمَرَ۔

ترجمہ:۔ میں حضرت ابوبکرؓ کی بزرگی کا منکر نہیں ہوں اور حضرت عمرؓ کی بزرگی کا منکر مگر ابوبکرؓ افضل ہیں عمرؓ سے۔

اخرج ابوالقاسم عن عبد خير صاحب لواء علي اَنَّ عَلِيًّا قَالَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِاَوَّلِ مَنْ يَّدْخُلُ الْجَنَّةَ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بَعْدَ نَبِيِّهَا فَقِيْلَ لَهٗ بَلٰى يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَ اَبُوْبَكْرٍ ثُمَّ عُمَرُ قِيْلَ فَيَدْخُلَانِهَا قَبْلَكَ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَقَالَ عَلِيٌّ اِيْ وَالَّذِيْ فَلَقَ الْحَبَّةَ وَبَرَءَ النَّسَمَةَ لَيَدْخُلَانِهَا وَاِنِّيْ لَمَعَ مُعَاوِيَةَ مَوْقُوْفٌ فِى الْحِسَابِ ؕ

(ازالۃ الخفا بحوالہ ابوالقاسم ص ۶۸/۱۲)

(ابوالقاسم نے حضرت علیؓ کے علمبردار عبدخیر سے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا کیا تم کو یہ نہ بتاؤں کہ سب سے پہلے جنت میں اپنے نبی کے بعد اس امت کا کون سا شخص جنت میں جائے گا۔ کہا گیا ضرور بتائیے تو حضرت علیؓ نے فرمایا وہ ابوبکر ہیں پھر عمر ہیں سوال ہوا کہ امیرالمومنین آپ سے بھی پہلے وہ داخل ہوں گے فرمایا ہاں! اس اللہ کی قسم جس نے دانہ پھاڑا اور روح بدن کو پیدا کیا وہ یقیناً داخل ہوں گے جب کہ میں معاویہ کے ساتھ حساب میں کھڑا ہوں گا)

فائدہ:۔ افسوس ہے کہ حضرت علیؓ اور امام باقرؒ تو ابوبکر صدیقؓ کی یہ کچھ فضیلت فرمائیں حتیٰ کہ حضرت عمرؓ پر بہ تصریح تمام فوقیت دیں اور روافض خذلہم اللہ ان کی خلافت سے منکر ہوں اور ان کے کیا منکر ہیں بلکہ اپنے ائمہ سے منکر ہیں۔

سوال سوئم ۳ از جانب شیعہ

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر جو اجماع ہوا وہ بموجب طریقہ معینۂ اہل اسلام کے واقع ہوا یا نہیں۔

جواب سوال سوم۔ واقعی حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر ایسا اجماع ہوا جیسا اہل اسلام میں

چاہیئے، بلکہ کسی اور بات میں ایسا اجماع ہوا ہی نہیں، یہاں تک کہ چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب متفق ہو گئے، حضرت علیؓ نے جب دیکھا کہ میری بیعت نہ کرنے سے لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ برحق نہیں جانتے، خود حضرت ابوبکر صدیقؓ کو بلا کر تنہا شکوہ و شکایت دوستانہ کر کے وعدہ بیعت کیا، اور اگلے روز مجمع عام میں آکر بیعت کی۔ اگر جی میں نہ تھی تو اس وقت تک کسی نے خدانخواستہ گلے پر چھری نہ رکھی تھی، اور رکھتے بھی تو کیا تھا، اماموں کی موت موافق عقیدہ شیعہ اور شہادت کلینی ان کے اختیار میں ہے۔ باقی شیعوں کا یہ رانڈوں کا سا رونا کہ یوں گلے میں رسی ڈال کر لائے اور یوں ظلم و ستم کیا شیطانی خواب ہے۔ جن حضرت علیؓ کا ہم ذکر کرتے ہیں وہ دس پانچ سے کیا سارے جہاں سے بھی در چھینو الے تھے؟

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

اجماع خلافت حضرت ابوبکرؓ پر بطریق معینہ (اہل اسلام ہی ہوا، کیونکہ اجماع دین میں اکثر علماء دینداران اور مسلمانوں کا معتبر ہے، جیسا کہ صاحب آیات بینات باقرار علماء شیعہ لکھتا ہے۔

"قولہ۔ یہ امر کہ سب مسلمانوں نے جو اس وقت تھے حضرت ابوبکرؓ سے بیعت کی، باقرار علماء شیعہ ثابت ہے کہ شریف مرتضیٰ کے قول سے ظاہر ہے، جو بحار الانوار کی جلد ۳ میں منقول ہے جس کا ترجمہ مجتہد صاحب نے بایں الفاظ فرمایا ہے

جمیع مسلمانان با ابوبکر بیعت کردند و اظہار رضا و خوشنودی باد۔ و سکون و اطمینان بسوئے او نمودند و گفتند کہ مخالف او بدعت کنندہ و خارج از اسلام است۔	(تمام مسلمانوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کی اور اپنی رضا و خوشی ظاہر کی اور ان پر اطمینان و سکون کا اظہار کیا اور یہ فیصلہ دیا کہ آپ کی مخالفت کرنے والا بدعتی اور اسلام سے خارج ہے)

سبحان اللہ کیا دین اور ایمان ہے حضرات شیعہ کا کہ حضرت صدیق اکبر کی عداوت سے دین محمدی کو باطل کرتے ہیں اور چار لاکھ مسلمانوں کو جو مہاجرین اور انصار اور مجاہدین تھے اور جن میں بنی ہاشم اور اہل بیت نبوی بھی داخل تھے ان سب کو صراحۃً و کنایۃً کافر بناتے ہیں۔

نعوذ باللہ من ذالک انتہی۔ میں کہتا ہوں کہ اجماع اہل حل و عقد کا یہ ہوا کہ اس قدر لوگوں نے

متفق اللفظ ہوکر بخوشنودی تمام حضرت ابوبکرؓ سے بیعت قبول فرمائی اور اس جگہ اولالباب کے
لیے غور کرنے کا مقام ہے کہ جب صاحب بحار الانوار کہ جس کا ترجمہ مجتہد صاحب نے بزبان فارسی
" جمیع مسلمانان باابوبکر صاحب بیعت کردند و اظہار رضامندی الخ" کیا ہے بلکھتا ہو حضرات شیعہ اگر
حیادار ہوں تو ڈوب مرنے کا مقام ہے ، کیونکہ ہم کہتے ہیں کہ جب جمیع مسلمانوں نے بخوشنودی
تمام حضرت ابوبکرؓ سے بیعت قبول کر لی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ابھی تو مسلمانوں میں ہی
شامل ہیں ، ورنہ یا بحار الانوار جو نہایت معتبر کتاب ہے اور مجتہد صاحب کی تکذیب کردیا نعوذ باللہ
حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جمیع مسلمانوں میں سے استثنا کردیا ۔ موجب عبارت بحار و ترجمہ مجتہد
کے تم خود بدعتی اور خارجی بنو فقط ،

سوال چہارم از جانب شیعہ

اجماع اہل حل و عقد جو اوپر خلافت حضرت ابوبکر صدیق کے واقع ہوا ہے اس میں کون
کون سے فضائل حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قابل امامت کے دیکھے ۔

جواب سوال چہارم

جتنی باتیں خلیفہ میں چاہیئں سب خلیفہ اوّل میں موجود تھیں ۔ اعلم الناس ۔ افضل الناس ۔
اشجع الناس ، اتقی الناس ، ازھد الناس ، ارحم الناس اعدل الناس ، اور سوائے اسکے جتنے وصف شیعوں نے
خلافت کے لیے تجویز کیے ، ہیں سب ان میں تھے سند مطلوب ہو تو جواب سوالات سوم کو
منجملہ جواب سوالات اربعہ کے جو ان ۲۸ جوابوں کے ساتھ مرسل ہے ، ملاحظہ فرمالیجیے ۔

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

فضل ابوبکر کا صحابہؓ کے نزدیک منجملہ متواترات تھا اور بہت سی احادیث ان کی افضلیت
کی زبان زد تھیں چنانچہ جو احادیث کہ فضائل حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سوال جواب اوّل میں مذکورہ
ہوئیں وہی فضائل موجب خلافت ہوئے اور ماسوا ان کے اور فضائل لاتعداد ولاتحصی ہیں
بخوف طوالت کے ذکر نہیں کیا ۔ نقل مشہور ہے آدمی کے لیے ایک بات کافی ہے اور عاقل کو

ایک اشارہ بس ہے اور آیات قرآنی سے بھی فضائل بے شمار ثابت ہوتے ہیں منجملہ ان کے یہ آیت :-

ثَانِیَ اثۡنَیۡنِ اِذۡ هُمَا فِی الۡغَارِ اِذۡ یَقُوۡلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (توبہ ع ٦)

ترجمہ :- دوسرا دو میں کا جب دونوں غار میں تھے جس وقت کہ اپنے ساتھی سے کہتا تھا غمگین مت ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

فائدہ :- اس میں دوسرے کا احتمال بھی نہیں اوّل تو ابوبکرؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صاحب فرمانا۔ دوسرے معیت خداوندی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شامل کیا سبحان اللہ وصل علی اس شخص کی بزرگی پر جس کے ساتھ خداوند دو جہان ہو! ایک فرقہ کیا اگر اس سے تمام عالم باغی ہو جائے تو بھی کیا ہو سکتا ہے ایسے شخص سے منحرف ہونا اپنی ذات بنانی ہے اور دوسری آیت یہ ہے۔

لَا یَسۡتَوِیۡ مِنۡکُمۡ مَّنۡ اَنۡفَقَ مِنۡ قَبۡلِ الۡفَتۡحِ وَ قٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعۡظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیۡنَ اَنۡفَقُوۡا مِنۡۢ بَعۡدُ وَ قٰتَلُوۡا

ترجمہ :- برابر نہیں ہو سکتے تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور جہاد کیا یہ لوگ مرتبہ میں بہت بڑے ہیں ان لوگوں سے جنہوں نے خرچ کیا بعد فتح کے اور جہاد کیا۔

(حمایت رسول میں ابوبکرؓ کی بہادری اور قتال)

اور قتال کرنا قبل فتح کے حضرت ابوبکرؓ کا بے انتہا روایت سے ثابت ہوتا ہے چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے۔

عَنۡ عَلِیٍّ اَنَّهٗ قَالَ اَیُّهَا النَّاسُ اَخۡبِرُوۡنِیۡ بِاَشۡجَعِ النَّاسِ قَالُوۡا لَا نَعۡلَمُ فَمَنۡ قَالَ اَبُوۡبَکۡرٍؓ۔ لَقَدۡ رَءَیۡتُ رَسُوۡلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ وَاَخَذَ قُرَیۡشٌ فَهٰذَا یُجَبِّئُهٗ وَهٰذَا یُتَلۡتِلُهٗ وَهُمۡ یَقُوۡلُوۡنَ اَنۡتَ الَّذِیۡ جَعَلۡتَ الۡاٰلِهَةَ اِلٰهًا

ترجمہ :- حضرت علیؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا اے لوگو مجھ کو بتلاؤ کہ سب سے زیادہ بہادر کون ہے لوگوں نے کہا ہم تو نہیں جانتے آپ ہی بتلایئے کون ہے ؟ کہا ابوبکرؓ ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے جب کہ قریش ایذاء دیتے تھے کوئی آپ کو گھیٹ کے بل گراتا تھا۔

وَاحِدًا قَالَ فَوَاللّٰهِ مَادَنَا مِنَّا اَحَدٌ اِلَّا اَبُوْبَكْرٍ يَضْرِبُ هٰذَا وَيُجْبِيْ هٰذَا وَيَتَلْتِلُ هٰذَا وَهُوَ يَقُوْلُ وَيْلَكُمْ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ ثُمَّ رَفَعَ عَلِيٌّ بُرْدَةً كَانَتْ عَلَيْهِ فَبَكٰى حَتّٰى ابْتَلَّتْ لِحْيَتُهٗ ثُمَّ قَالَ اَمُؤْمِنُ اٰلِ فِرْعَوْنَ خَيْرٌ مِّنْ اَبِيْ بَكْرٍ فَسَكَتَ الْقَوْمُ فَقَالَ اَلَا تُجِيْبُوْنِيْ فَوَاللّٰهِ لَسَاعَةٌ مِنْ اَبِيْ بَكْرٍ خَيْرٌ مِنْ مِثْلِ اٰلِ فِرْعَوْنَ وَذَالِكَ رَجُلٌ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ وَهٰذَا اَظْهَرَ۔ (اعلن)

(ازالۃ الخفاء ص ۲۲۹ ج ۱ وص ۲۹۸ ج ۱ بحوالہ الاستیعاب)

اور کوئی منہ کے بل اور یہ کہتے جاتے تھے تو ہی ہے وہ شخص کہ بہت سے معبودوں کے ایک ٹھہرایا۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں قسم اللہ کی ہم میں سے سوا ابوبکر کے اور کوئی حضرت کے قریب نہ ہوا اور ابوبکر کسی کو مارتے تھے۔ کسی کو کمر کے بل گراتے تھے اور کسی کو پیشانی کے بل۔ اور یہ کہتے تھے خرابی ہو تمہارے لیے کیا مارتے ہو تم ایسے شخص کو جو کہتا ہے پروردگار میرا اللہ ہے پھر حضرت علیؓ نے اپنی چادر جو اوڑھے ہوئے تھے۔ اٹھائی اور روئے یہاں تک کہ ریش مبارک تر ہوگئی پھر کہا قسم دیتا ہوں میں ساتھ اللہ کے آیا مومن آل فرعون کا بہتر ہے یا ابوبکر پر لوگ چپکے رہے۔ آپ نے کہا مجھ کو جواب کیوں نہیں دیتے قسم ہے اللہ کی البتہ ایک ساعت ابوبکر کی بہتر ہے مومن آل فرعون جیسے شخص سے وہ تو ایسا شخص تھا کہ ایمان اپنا پوشیدہ رکھتا تھا اور یہ ایسا شخص ہے کہ اپنے ایمان کو ظاہر کیا۔

(ابوبکر صدیقؓ کی غیرت ایمانی)

دیگر حدیث محبوب سبحانی مع آیت قرآنی

عن ابن جریج قال حدثت ان ابا قحافۃ سَبَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَصَكَّهٗ اَبُوْبَكْرٍ صَكَّةً فَسَقَطَ فَذَكَرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

ترجمہ ابن جریج سے روایت ہے کہ ابوقحافہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہا اس پر ابوبکر نے ایک طمانچہ ابوقحافہ کے مارا کہ ابوقحافہ زمین پر گر پڑے پھر حضرت نے اس کا ذکر فرمایا کہ ابوبکر کیا تو نے ایسا کیا۔ کہا قسم

فَقَالَ یَا اَبَا بَکْرٍ اَفَعَلْتَ ھٰذَا فَقَالَ وَاللّٰہِ لَوْ کَانَ السَّیْفُ قَرِیْبًا مِّنِّیْ لَضَرَبْتُہٗ فَنَزَلَتْ لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْا اٰبَآءَھُمْ (مجادلہ آخری آیت)

(ازالۃ الخفاء ص ۲۹۸ ج ۱)

اللہ کی اگر میرے پاس تلوار ہوتی تو بے شک اس کو مار تا تب یہ آیت نازل ہوئی نہ پاوے گا تو اس گروہ کو جو اللہ پر ایمان لائے ہیں اور قیامت کے دن پر کہ دوست رکھیں وہ ان لوگوں کو جو اللہ رسول سے دشمنی رکھتے ہیں اگرچہ ان کے باپ ہی کیوں نہ ہوں۔ الآیۃ

(بعد از رسول صلعم ابوبکرؓ و عمرؓ ہی کفار کے دل میں کانٹا تھے۔)

دیگر واقعہ غزوہ احد میں مذکور ہے کہ ابوسفیان نے ندا کی۔

ھَلْ فِی الْقَوْمِ مُحَمَّدٌ وَھَلْ فِی الْقَوْمِ ابْنُ اَبِیْ قُحَافَۃَ وَھَلْ فِی الْقَوْمِ ابْنُ الْخَطَّابِ

(بخاری غزوہ احد ص ۵۷۹ ج ۲)

ترجمہ:۔ آیا قوم میں محمد موجود ہے آیا قوم میں ابو قحافہ کا بیٹا ہے آیا قوم میں عمر بن خطاب ہے

فائدہ:۔ اس کا پوچھنا اس غرض سے تھا کہ اگر خدانخواستہ یہ اشخاص نہ ہوئے تو ہمارا کام بن گیا اور ہم نے میدان جیت لیا اس سے معلوم ہوا کہ کفار کی آنکھوں میں بھی یہ ہی لوگ اسی سبب سے کھٹکتے ہیں۔

سوال پنجم ۵ از جانب شیعہ

آیا کوئی فضیلت حضرت ابوبکر صدیق رضؓ میں ایسی تھی جو حضرت علی مرتضیٰ میں نہ تھی۔

جواب سوال پنجم

اس سوال کا اگر یہ مطلب ہے کہ اوصاف حمیدہ میں سے کوئی ایسا وصف بتاؤ جو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ میں ہو اور حضرت علیؓ میں نہ ہو تو ہم نہیں کہہ سکتے فلانی خوبی ان میں تھی اور ان میں نہ تھی پر اس سے سائل کو کوئی نفع نہیں اگر دو شخصوں میں برابر اوصاف ہوں تب جسے خلیفہ بنا دیں بجا ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ کمی بیشی کا فرق بتلاؤ تو یہ ہمارے ذمہ ہے مگر ہم جواب سوم میں منجملہ جوابات اربعہ میں بالاجمال اس کا جواب دے چکے ہیں۔ الغرض اوصاف میں بلکہ تمام اوصاف میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ صحابہ سے بڑھ کر تھے اس میں حضرت علی رضؓ

ہوں یا اور کوئی۔ چنانچہ خود حضرت علیؓ ہی فرماتے ہیں کہ سب میں افضل حضرت ابوبکرؓ ہیں سند مطلوب ہو تو بخاری میں دیکھ لیجئے بروایۃ محمد بن الحنفیہ فرزند ارجمند حضرت شیر خدا یہ روایت موجود ہے بالجملہ اور عالم تھے تو ابوبکر اعلم تھے اور زاہد تھے تو ابوبکر ازہد تھے اور راحم تھے تو ابوبکر ارحم تھے۔ علیٰ ھذا القیاس۔

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

چند فضائل تو درباب خلافت مذکور ہو ہی چکے اور دیگر فضائل بھی بہت ہیں۔

(سفر ہجرت میں حضرت ابوبکرؓ کا ایثار ضرب المثل ہے)

مثل قصہ اس رات کے جس رات کو تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بقصد ہجرت نماز میں تشریف لے گئے اور حضرت ابوبکر کا یہ حال ہوا کہ سب عیال و اطفال کو کفار میں چھوڑ کر حضرت کے ہمرکاب ہوئے اور باوجود تلاش شدید و دوا دید (دوڑ دھوپ) کفار کے حضرت کے ساتھ غار میں رہے اور اس غار میں حضرت کے آرام کیلئے اپنا کپڑا اپھاڑ کر سانپ بچھوؤں کے سوراخوں میں دیا جب کپڑا نہ رہا اور ایک سوراخ باقی رہ گیا اس پر اپنا پاؤں لگا کر بیٹھ گئے اور حضرت اپنے سر مبارک کو حضرت ابوبکر کے زانو پر رکھ کر بے فکر ہو کر آرام فرمانے لگے اس اثنا میں حضرت ابوبکرؓ کے پاؤں میں چند بار سانپ نے کاٹا، حضرت خلیفہ نے بسبب خیال بے آرامی حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ دم نہ مارا۔ حتیٰ کہ بے اختیار حضرت خلیفہ کے آنسو جاری ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک پر گرے حضرت نے فوراً بیدار ہوتے ہی کیفیت پوچھ کر اپنا لب مبارک لگا دیا فوراً شفا ہو گئی[1]

شیعوں کو اتنی ہی بات فرق مراتب کیلئے کافی و وافی ہے کہ حضرت علیؓ کی آنکھوں میں بوقت بھیجنے خیبر کے رسول مقبول نے لب مبارک لگایا اور حضرت ابوبکرؓ کے پاؤں میں۔ دوسرے یہ کہ حضرت امیر المومنین کی آنکھوں میں بغرض خیبر بھیجنے کے لب لگایا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاؤں میں بے غرض تاکہ ماسوائے فرط محبت کے دوسری وجہ نہ تھی۔

اور اس واقعہ ہجرت میں سواری حضرت ابوبکرؓ کی معرفت تیار ہوئی زادہ راہ ان کے

[1] (مشکوٰۃ ص ۵۵۶)

گھر یکا غلام ان کا غار میں دودھ لاتا تھا بیٹا ان کا خبر کفار کی اور تمام دن کے منصوبے رات کو آکر سُناتا۔ غلام ابُوبکرؓ کا رفیق راہ تھا اجیران کا رہبر تھا۔ غرضیکہ سفر ہجرت کو رفاقت صدیقی ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔ ماسوا ابو بکرؓ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو کمر پر لے کے کون ہاتھوں کے بل پہاڑ پر چڑھا تھا اور کس کی طرف ایسی مدد پہنچیں۔ شعر

دوست آں دانم کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی

(ابوبکر صدیقؓ سب سے بڑے عاشق رسولؐ تھے۔)

اور منجملہ فضائل کے گفتگو کرنا حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یوم بدر و یوم حدیبیہ کے اور رونا حضرت ابوبکرؓ کا بسبب غایت رازدانی کے بوقت فرمانے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

اِنَّ عَبْدًا خَیَّرَہُ اللہُ تَعَالٰی بَیْنَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ۔ (بخاری ص ۵۱۶/۱ مسلم ص ۲۷۲/۲)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو اختیار دیا چاہے دنیا پسند کرے چاہے آخرت۔

اور خطبہ پڑھنا حضرت ابوبکرؓ کا بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تسکین دینا لوگوں کو اور کھڑا ہونا مقدمہ بیعت میں واسطے خیر خواہی مسلمین کے۔ پھر اہتمام کرنا جیوش بھیجنے کا حسب ارشاد رسول مقبول کے ملک شام کی طرف اور قتال کرنا مرتدین سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کا "انت عَتِیْقُ اللہِ مِنَ النَّار فرمانا بے مثال فضیلت ہے"، اور طبرانی نے اسے عمدہ سند کہا ہے۔

(حضرت ابوبکرؓ خدا اور رسول کی شہادت سے صدیقؓ ہیں)

اخرج الطبرانی بسند صحیح جید عن حکیم بن سعد قال سمعت علیا و یحلف لانزل اللہ اسم ابی بکر صدیقا من السماء[1] (الریاض النضرۃ ص ۶۸/۱ بحوالہ سمرقندی وصاحب الصفوۃ)

ترجمہ:۔ حکیم بن سعد سے روایت ہے، کہا سنا میں نے علیؓ کو کہتے تھے اور قسم کھاتے تھے کہ بے شک اللہ نے حضرت ابوبکر کا نام صدیق آسمان سے اتارا ہے۔

---

[1] ابو اسحاق السبیعی ابو یحییٰ سے روایت فرماتے ہیں کہ میں شمار نہیں کر سکتا کہ میں نے حضرت علیؓ سے کتنی بار سنا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم ارشاد فرماتے اللہ تعالیٰ نے ابوبکرؓ کا نام اپنے نبی کی زبان پر صدیق رکھا۔ (۲) حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے آسمان کا معراج کرایا گیا فما رأیت شیئاً الا وجدت اسمی فیہ مکتوباً محمد رسول اللہ وابوبکر الصدیق خلیفتی (الریاض النضرۃ ص ۶۸/۱ بحوالہ ابن عرفۃ العبدی والثقفی الاصبہانی۔ ۱۲ محمد اشرف

غرضیکہ صدیق نام پانا اور جبل احد کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا اُسْكُنْ يَا اُحُدُ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ نَبِيٌّ وَصِدِّيقٌ وَشَهِيْدَانِ[1] اور سب مسلمانوں کا متفق ہو کر خلیفہ بنانا۔ اور لکھو کھا فضائل ہیں کہ احاطہ تقریر و تحریر سے باہر ہیں خدا کا فضل ہے اہل سنت جماعت کی کتابیں بہت ملتی ہیں۔ حضرات شیعہ کی کتابوں کی طرح مفقود و محجوب نہیں اگر کچھ سلیقہ کتاب بینی کا ہے تو دیکھ لیجئے ورنہ خواہ مخواہ دخل در معقولات نہ کیجئے اور بحث و مباحثہ کی ٹانگ نہ توڑئیے۔

(کتب شیعہ سے صدیق ہونے کا ثبوت)

اور اگر ہماری کتابوں کے دیکھنے کا شعور نہیں تو اپنی ہی کتابیں دیکھ کر ذرا تو شرمندہ ہو جیئے دیکھو کشف الغمہ کہ جو تمہارے یہاں نہایت معتبر ہے تمہارے کیسے پترے کھولتی ہے۔

سُئِلَ الْاِمَامُ اَبُوْجَعْفَرٍ عَنْ حِلْيَةِ السَّيْفِ هَلْ يَجُوْزُ فَقَالَ نَعَمْ قَدْ حَلّٰى اَبُوْبَكْرٍ الصِّدِّيْقُ بِسَيْفِهٖ فَقَالَ الرَّاوِيْ اَتَقُوْلُ هٰكَذَا فَوَثَبَ الْاِمَامُ عَنْ مَكَانِهٖ فَقَالَ نَعَمُ الصِّدِّيْقُ نَعَمُ الصِّدِّيْقُ نَعَمُ الصِّدِّيْقُ فَمَنْ لَمْ يَقُلْ لَهُ الصِّدِّيْقُ فَلَا صَدَّقَ اللّٰهُ قَوْلَهٗ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ

ترجمہ:- امام ابوجعفر (باقر) علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ تلوار کو زیور لگانا یعنی سونے چاندی سے آراستہ کرنا آیا جائز ہے آپ نے فرمایا ہاں ابوبکر صدیق نے اپنی تلوار کو زیور سے آراستہ کیا۔ راوی نے کہا تم ایسا کہتے ہو؟ یہ سن کر امام اپنی جگہ سے کود کر اٹھے پھر فرمایا ہاں صدیق۔ ہاں صدیق۔ ہاں صدیق۔ پھر جو شخص ان کو صدیق نہ کہے اللہ اس کی بات دنیا اور آخرت میں سچی نہ کرے۔

ف:- غور کرنے کا مقام ہے کہ اول تو خود بخود امام محمد باقر نے حضرت ابوبکر صدیق رض کو صدیق فرمایا دوسرے ان کے فعل کی سند ذکر فرمائی چونکہ سائل رافضی تھا اس نے تعجب سے کہا کہ کیا آپ بھی صدیق فرماتے ہیں حضرت امام محمد باقر یہ لفظ سنتے ہی طیش میں آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا ہاں صدیق، ہاں صدیق جو اس کو صدیق نہ کہے اللہ اس کو دین و دنیا میں سچا نہ کرے۔ اے حضرات امامیہ اس وقت میں تم سے بطور راز داری کے پوچھتا ہوں خدا کے لیے سچ تو بتاؤ کہ

---

[1] (بخاری ص 519 ج1 ابوداؤد ص 291 ج2 ترمذی ص 210 ج2) اے احد حرکت سے تھم جا کیونکہ تیرے اوپر ایک نبی ایک صدیق اور دو شہید (عمر و عثمان رض) جلوہ افروز ہیں۔ مہر محمد۔

تمہارے ائمہ تو اس قدر حضرت صدیق کے محب و متبع ہیں تم کس کے پیرو ہوئے ہو اور امام موت تک سے بھی تقیہ کر رکھا ہے اور ایک نصیحت بہ نظر دوستانہ کہتا ہوں کہ صاحب الحیاء والایمان سے اعراض نہ کرو تاکہ کچھ حصہ حیاء کا تم کو بھی مل جائے۔

سوال ششم ۶ ازجانب شیعہ

حضرت علی مرتضیٰ رضؓ میں کون سے ایسے فضائل ہیں جو حضرت ابوبکر یا دیگر صحابہ میں نہ تھے

جواب سوال ششم:۔ اس سوال میں سوال پنجم ہی کو الٹ لیا ہے سو اس کا جواب بھی اسی کے جواب میں موجود ہے۔

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

معلوم رہے کہ جمیع صحابہؓ میں فضائل جزئیہ میں یہ تفاوت موجود ہے کہ ایک بات ایک میں ہے اور دوسرے میں نہیں اسی قیاس پر حضرت علیؓ میں دامادی کی فضیلت ہے حضرت ابوبکر میں نہ تھی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں دوہری پائی جاتی تھی اور بروقت ہجرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا اس مکان میں تنہا رہنا بے شک فضیلت ہے لیکن حضرت ابوبکرؓ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم رکاب ہو لینا کچھ کم نہیں بلکہ بایں وجہ زیادہ ہے کہ بوجہ حمایت رسول صلی اللہ علیہ وسلم مخاصمت کفار کو حضرت صدیق سے زیادہ تھی کیونکہ جتنا کوئی اپنے دشمن سے مرتبط ہوتا ہے اتنا ہی خار گذرتا ہے۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے بسبب کم عمری کے کچھ مزاحمت نہ تھی دوسرے یہ کہ جس حال میں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نہ تھے۔ پھر ان سے کیا پرخاش تھی اسی لیے ان کو بھی کچھ نہ کہا اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے گھر جاکر ان کی بیٹی اسماء کے طمانچہ مارا۔

(حضرت علیؓ کے مخصوص فضائل)

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بھی بہت فضائل ہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک نہ لیجانے پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا یہ ملال یہ کہہ کر دور کیا۔

اَمَا تَرْضٰی اَنْ تَکُوْنَ مِنِّیْ بِمَنْزِلَۃِ هَارُوْنَ مِنْ مُّوْسٰی غَیْرَ اَنَّہٗ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔ (ترمذی ص ۲۱۴/ج۲ مسلم ص ۲۷۸/ج۲)	ترجمہ:۔ کہا تو اس بات سے راضی نہیں ہوتا کہ میری نسبت ایسا ہو جیسے حضرت ہارون موسیٰ کی نسبت تھے سوائے اس کے کہ وہ نبی تھے میرے بعد نبی نہیں۔

اور فتح خیبر کے لیے یہ کہہ کر جھنڈا حضرت نے امیر المومنین کو مرحمت فرمایا۔

لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَجُلًا یَفْتَحُ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْہِ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ، اخرجہ احمد والبزار عن سہیل بن سعید۔ (ترمذی ص ۲۱۴/ج۲ مسلم ص ۲۷۹/ج۲)	ترجمہ البتہ دوں گا میں جھنڈا کل کو اس شخص کو کہ اللہ تعالےٰ اسکے ہاتھ سے فتح دے گا دوست رکھتا ہے وہ اللہ کو اور اس کے رسول کو اور اللہ و رسول اس کو دوست رکھتے ہیں۔

اور ایک یہ فرمانا۔ مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوْلَاہُ اخرجہ الترمذی عن ابی سریحۃ وزید بن ارقم (ابی سریحۃ ھو حذیفہ ابن اسید صاحب النبی صلی اللہ علیہ وسلم) اور اہل بیت میں دعا کر کے داخل کیا جو قصہ عبا مشہور ہے اور مواخات کے وقت یہ فرمایا انت اخی فی الدنیا والآخرۃ اخرجہ الترمذی عن ابن عمر۔ تو میرا بھائی ہے دنیا اور آخرت میں۔ اور انا مدینۃ العلم وعلی بابھا وغیر ذالک اخرجہ الترمذی والحاکم عن علی ترجمہ:۔ میں شہر علم کا ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔ فضائل بے انتہا ہیں لیکن ایسے فضائل جزیہ خلفاء اربعہ میں بلکہ اکثر صحابہ میں پائے جاتے ہیں، بخوف درازی عجالہ کے ذکر نہیں کئے اور فضیلت جزوی سے فضیلت کلی ثابت نہیں ہوتی۔

(حضرت عمرؓ و عثمانؓ کے مخصوص فضائل)

جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شان میں یہ حدیث وارد ہوئی ہے۔

اخرج الترمذی عن ابن عمر ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِہٖ (ترمذی ص ۲۰۹ ج ۲)	ترجمہ ترمذی نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے کیا حق کو عمر کی زبان پر اور اس کے دل پر

واخرج الترمذی والحاکم وصححہ عن عقبۃ بن عامر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوکان نبی من بعدی لکان عمر (ترمذی ص۲۰۹ ج۲)

اور روایت کی ترمذی اور حاکم نے اور تصحیح کی عقبہ بن عامر سے کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر ہوتا نبی میرے بعد تو البتہ عمر ہوتا ۔

اور جیسے حضرت عثمانؓ بن عفان کی شان میں وارد ہوئی ہیں ۔

(حضرت عثمانؓ کی فضیلت میں احادیث)

اخرج الشیخان ۔ عَنْ عائشۃؓ قَالَتْ اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ جَمَعَ ثِیَابَہٗ حِیْنَ دَخَلَ عُثْمَانُ وَقَالَ اَلَا اَسْتَحِی مِنْ رَجُلٍ تَسْتَحِی مِنْہُ الْمَلَائِکَۃُ (مسلم ص۲۷۷ ج۲)

۲ اَخْرَجَ التِّرْمِذِیُّ عَنْ اَنَسٍؓ وَالْحَاکِمُ وَصَحَّحَہٗ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَۃَ قَالَ جَاءَ عُثْمَانُ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِاَلْفِ دِیْنَارٍ فِیْ کُمِّہٖ حِیْنَ جَہَّزَ جَیْشَ الْعُسْرَۃِ فَنَثَرَھَا فِیْ حِجْرِہٖ قَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ فَرَاَیْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُقَلِّبُھَا فِیْ حِجْرِہٖ وَ یَقُوْلُ مَا ضَرَّ عُثْمَانَ مَا عَمِلَ بَعْدَ الْیَوْمِ مَرَّتَیْنِ (ترمذی ص۲۱۱ ج۲)

ترجمہ امام بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کپڑے درست کئے جب آپ کے پاس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آئے اور آپ نے فرمایا کہ شرم کروں میں اس شخص سے کہ جس سے فرشتے شرم کرتے ہیں ۔ ترمذی اور حاکم نے انسؓ سے روایت کی ہے اور تصحیح کی اس کی عبد الرحمن بن سمرہ سے کہا آئے عثمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہزار دینار لے کر جب کہ جیش العسرۃؓ کا سامان کیا اور لاکر آپ کی گود میں ڈال دیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان دیناروں کو الٹتے پلٹتے تھے اور فرماتے تھے ۔ نقصان نہیں کرتا عثمان کو ۔ کوئی عمل بعد کا آج کے دن دو بار فرمایا۔

وَاَخْرَجَ التِّرْمِذِیُّ عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ لَمَّا اَمَرَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِبَیْعَۃِ الرِّضْوَانِ کَانَ عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ رَسُوْلَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ

اور روایت کی ترمذی نے انسؓ سے کہا جب کہ حکم فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیعت رضوان کا تو عثمان بن عفان حضرتؐ کی طرف سے مکہ والوں کے پاس قاصد گئے تھے لوگوں نے حضرت

وَسَلَّمَ اِلٰی اَهْلِ مَکَّةَ قَالَ فَبَایَعَ النَّاسُ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ عُثْمَانَ فِیْ حَاجَةِ اللّٰهِ وَحَاجَةِ رَسُوْلِهٖ فَضَرَبَ بِاِحْدٰی یَدَیْهِ عَلَی الْاُخْرٰی فَکَانَتْ یَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِعُثْمَانَ خَیْرًا مِنْ اَیْدِیْهِمْ لِاَنْفُسِهِمْ	سے بیعت کر لی آپ نے فرمایا کہ عثمان اللہ اور اس کے رسول کے کام کے واسطے گئے ہیں اور اپنے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مارا سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ہاتھ جو حضرت عثمان کے واسطے تھا بہتر تھا اور لوگوں کے (سب) ہاتھوں سے جو ان کے لیے تھے۔[1]

(ترمذی ص ۲۱۱/۲۶)

غرضیکہ اکثر احادیث فضائل میں وارد ہوئی ہیں کہ وہ فضائل ایک کے دوسرے میں نہیں پائے جاتے فضائل جزئیہ سے علو مرتبہ نہیں ہوتا ہاں جس طرح اجماع امت خلافت پر مرتبہ بمرتبہ چلا آیا ہے۔ اسی طرح فرق مراتب بھی ہے کیونکہ مجموعہ فضائل سے فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

سوال ہفتم از جانب شیعہ

سوائے حضرت مرتضیٰؓ کے کسی اور صحابی کے لیے کبھی رد شمس واقع ہوا؟

جواب سوال ہفتم

(رد شمس کی روایت شیعہ کے لیے مفید نہیں)

آفتاب کا غروب ہو کر پھر نکل آنا طبرانی اور طحاوی نے بایں طور نقل کیا ہے کہ خیبر کی راہ میں بعد عصر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ کے زانو پر سر مبارک رکھ کر سو گئے بعد غروب آفتاب آنکھ کھلی تو حضرت علیؓ سے پوچھا تم نے عصر کی نماز پڑھی آپ نے عرض کیا

---

[1] مورخین شیعہ بھی صلح حدیبیہ کے قصہ میں حضرت عثمانؓ کی اس فضیلت کا اقرار کرتے ہیں بروایت کلینی حضرت رسولؐ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر عثمانؓ کی بیعت لینے کیلیے مارا۔ جب مسلمانوں نے کہا کہ عثمان بڑے خوش نصیب ہیں کہ طواف و عمرہ کر لیا ہوگا آپ نے فرمایا حضرت عثمانؓ ہمارے بغیر طواف نہیں کریگا۔ چنانچہ جب واپس آئے تو حضورؐ نے پوچھا کیا تو نے طواف کیا؟ عثمانؓ نے کہا جب آپ طواف نہ کر سکے میں نے بھی نہیں کیا (حیات القلوب ص ۴۲۰/۲ مترجم)

کوئی نہیں آپ نے دعا فرمائی خدا تعالیٰ نے آفتاب کو پھر لوٹایا پہاڑوں پہ دھوپ نظر آنے لگی۔ اس روایت کا ہر چند صحاح ستہ میں پتہ نہیں اور ابن جوزی نے جو بڑے محدث ہیں اس روایت کو منجملہ موضوعات یعنی جھوٹی حدیثوں میں شمار کیا ہے پر اور محققوں نے اس کی تصحیح[1] بھی کی ہے۔ سو ہمیں بھی یہی بات

---

[1] بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ ردِ شمس کا معجزہ، مرجعِ خیبر سے واپسی پر مقام صہبا میں ظاہر ہوا۔ اور یہ حدیث۔ حضرت اسماء بنت عمیسؓ سے دو سندوں کے ساتھ مروی ہے۔ اس حدیث کے بارے میں امام طحاویؒ نے مشکل الآثار، علامہ زرقانیؒ نے شرح مواہب اور حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ میں، قاضی عیاضؒ شرح شفا میں، مولانا بدر عالم صاحب نے، حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ سے فیض الباری کتاب الجہاد میں اور دوسرے حضرات نے بھی ذکر فرمایا ہے امام طحاویؒ فرماتے ہیں ھذان حدیثان ثابتان ورواتھما ثقات" شرح امانی الاحبار کے مقدمہ ص۵۵ تا ۵۷ میں بھی اس حدیث پر مفصل بحث ہے اور اس حدیث کا صحیح ہونا ثابت کیا ہے شیخ جلال الدین سیوطیؒ نے اس حدیث کے بارے میں ایک مستقل رسالہ کشف اللبس عن حدیث رد الشمس لکھا ہے جس میں اس حدیث کے طرق و اسانید پر بحث کی ہے اور اس کا صحیح ہونا ثابت کیا ہے۔ علامہ زرقانیؒ نے بھی شرح مواہب میں اس کا صحیح ہونا ثابت کیا ہے علامہ عینیؒ نے بیہقی سے مبسوطاً نقل کیا ہے ضحاکؒ نے اپنی تفسیر کبیر میں بھی اس کا ذکر کیا ہے گویا کہ امام طحاویؒ اس حدیث کی تصحیح کرنے میں متفرد نہیں بلکہ متقدمین و متاخرین میں بہت سے حضرات نے امام طحاویؒ کی موافقت کی ہے اور امام ابن تیمیہؒ کے قول پر ترجیح دی ہے۔ المعتصر من المختصر من مشکل الآثار میں ہے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث لم ترد الشمس منذ ردت علی یوشع بن نون سے معارضہ صحیح نہیں اس لیے کہ منذ ردت کے یہ الفاظ ہو سکتا ہے کہ اس ردِ شمس کے واقعہ سے پہلے ہوں اور ردِ شمس بعد میں۔ تو دونوں میں تطبیق ہو گئی۔ خفاجی مصریؒ شرح شفا میں لکھتے ہیں اس حدیث پر بعض شراح نے اعتراض کیا ہے کہ یہ حدیث موضوع ہے اس کے رواۃ مطعون ہیں۔ دراصل یہ مغالطہ ابن جوزیؒ کے کلام کی وجہ سے ہے حالانکہ اس کی اس کتاب کا اکثر حصہ مردود ہے۔ وقد قال خاتمۃ الحفاظ السیوطیؒ وکذا السخاویؒ ان ابن الجوزیؒ فی موضوعاتہ تحامل تحاملاً کثیراً۔ یہاں تک کہ بہت سی احادیث صحیحہ بھی اس میں ذکر کر دی ہیں جیسا کہ ابن صلاحؒ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور تعدد طرق اس کی صحت پر شاہد ہیں۔ مصنف نے بھی اس کی تصحیح کی ہے اور اس سے پہلے امام طحاویؒ ابن شاہینؒ، ابن مندہؒ، ابن مردویہؒ اور طبرانیؒ نے معجم میں اس کو حسن کہا ہے۔ ابن جوزیؒ نے جن پر کلام کیا ہے ان میں احمد بن صالح بھی ہے جو ابو جعفر طبری ہے حالانکہ وہ الحافظ الثقۃ ہے۔ اصحاب سنن نے اس سے روایت کی ہے اور اس کی توثیق کے لیے یہی کافی ہے کہ بخاریؒ نے صحیح میں اس سے روایت نقل کی ہے تو امام ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ اور ابن جوزیؒ یا دوسرے حضرات جنہوں نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے ان کی یہ بات قابلِ توجہ نہیں۔ احمد بن صالح المصری ابو جعفر ابن طبری ثقہ حافظ من العاشرۃ، امام نسائیؒ نے بھی اوہام قلیلہ کی وجہ سے اس پر کلام کیا ہے۔ ابن معین سے اس کی تکذیب نقل کی ہے ابن حبان پورے یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ جس پر کلام کیا گیا ہے وہ احمد بن صالح الشمونی ہے اور امام نسائیؒ نے اس کو احمد بن صالح مصری سمجھا حالانکہ وہ احمد تو بخاری، ترمذی، اور ابوداؤد کے رواۃ میں ہے۔ کذا فی التقریب۔ واللہ اعلم محمد اشرف۔

پسند ہے کچھ اپنی محبت کا تقاضا کچھ شیعوں کی خاطر اس پر بھی وہ نہ سمجھیں تو انہیں خدا سمجھے۔

(دعائے نبوی سے ہونے والا کام معجزہ رسول ہے)

پر ہمیں معلوم نہیں اس سوال میں سائل نے کیا فائدہ سمجھا ہے اگر یہ تمنا ہے کہ یہ معجزہ حضرت علیؓ کے نام لگ جائے تو اس کی امید بے جا ہے۔ اگر ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے ہاں حضرت علیؓ کی کارگذاری اور خاطرداری البتہ باعث دعا مذکورہ ہوئی سو یہ کون سی بڑی بات ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ ادنیٰ بات ہے۔ اس سے پہلے مکہ میں کفار کی استدعاء سے معجزہ شق القمر ہوا تھا تو کفار کی کیا فضیلت نکلتی تھی۔ اور اگر اس میں کچھ فضیلت ہے تو فقط اتنی ہے کہ ان کی یہ خدمت پسند آئی سو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابوبکرؓ کی خدمت گذاریاں اس سے زیادہ پیش نظر تھیں۔

(حضور کی ابوبکرؓ کی احسان شناسی)

بخاری اور مسلم وغیرہ صحاح میں موجود ہے کہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں ارشاد فرمایا کہ جتنا ابوبکرؓ کا احسان میرے ذمہ ہے اتنا کسی کا نہیں پر ان کو قضاء نماز کا اس (خدمت) کی وجہ سے کبھی اتفاق نہ ہوا تھا ورنہ ان کے لیے دعاء کرتے تو مغرب چھوڑ مشرق سے آفتاب نکل آتا بایں ہمہ یہ دعا تھی۔ اور دعاء میں بے اختیاری ظاہر ہے خدا کو اختیار ہے چاہے قبول کرے چاہے قبول نہ کرے اور قبول کرے تو خدا کے نزدیک بڑی بات نہیں پر قابل تعریف یہ بات ہے کہ خدا ساتھ ہو جائے سو تم بھی جانتے ہو کہ ان اللہ معنا کے کیا معنی ہیں اور یہ کس کی شان میں ہے یار غار کون تھا اور سکینت خداوندی کس پر نازل ہوئی اور اس کو بھی جانے دیجیے اگر یہ آفتاب کا لوٹ آنا حضرت علیؓ کی خاطر ہوا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر نہ تھا آپ کی دعاء کا اس میں اثر نہ تھا اور تھا تو برائے نام تھا ظاہر کا بہانہ تھا ورنہ اصل میں حضرت علیؓ ہی کی خاطر تھی تو پھر کیا اس سے کچھ فضیلت لازم نہیں آتی ورنہ حضرت علیؓ اور صحابہ تو درکنار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل ہو جائیں گے۔ ادھر یہ معجزہ اول حضرت سلیمان علیہ السلام کی خاطر واقع ہوا ہے۔ اس صورت میں حضرت سلیمان سوا حضرت علیؓ اور سب سے افضل ہو جائیں گے۔ مگر تمہیں فرماؤ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو درکنار حضرت نوح حضرت ابراہیم حضرت

موسیٰ حضرت عیسیٰ علیہم السلام ہیں یا حضرت سلیمان شفاعت کی حدیث تو سُنی ہوگی اس میں دیکھیے خلائق کس کس کی طرف بغرض شفاعت جائیں گے اس میں کہیں سلیمان (علیہ السلام) کا ذکر نہیں

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

یہ بھی فضیلت جزوی ہے اور یہ فضیلت بہ نسبت فضیلت حضرت ابوبکرؓ کے کہ حضرت نے فرمایا مردوں میں سب سے زیادہ مجھ کو ابوبکر محبوب ہے۔ اور بہ نسبت فضیلت حضرت عمرؓ کے کہ لَوْ کَانَ نَبِیٌّ مِنْ بَعْدِیْ لَکَانَ عُمَر۔ اگر میرے بعد نبی ہوتا تو عمر ہوتا اور بہ نسبت فضیلت حضرت عثمانؓ اَلَا اَسْتَحِیْ مِنْ رَجُلٍ تَسْتَحِیْ مِنْہُ الْمَلَائِکَۃُ (کیا میں اس شخص سے حیا نہ کروں جس سے فرشتے حیا کرتے ہیں) کچھ معتدبہا نہیں اور اصل بات یہ ہے کہ ردّ شمس فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعا سے ہوا ہے اس میں کوئی فضیلت حضرت علیؓ کی نہ حاصل ہوئی کیونکہ حضرت رسول مقبول جس کے واسطے دعا فرماتے ردّ شمس ہو جاتا پر چونکہ ان سے کبھی درباب صوم وصلوات مداہنت نہ ہوئی اس لیے ان کے لیے دعا ردّ شمس بھی وقوع میں نہ آئی درحقیقت امیرالمومنین کی فضیلت اس میں ظاہر ہوتی کہ خاص ان کی ہی دعا سے ردّ شمس ہوتا اور کسی کی دعا سے نہ ہوتا اور یہ کہیں ثابت نہیں سائل کو شرم نہیں کیا حضرت علیؓ کے فضائل تھوڑے سے تھے جو اس کو بڑے اہتمام سے جداگانہ سوال قرار دیا اور ایک قاعدہ اور بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے کہ جو معجزہ نبوی ہے اس سے خواہ مخواہ غیر کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی اور اگر اس کو تم نہ مانو تو اکثر معجزوں سے کفار کی فضیلت نکل آئے گی۔ تتبع فضائل جمیع صحابہؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ سب صحابہ حضرت کے مرغوب و محبوب تھے لیکن بمقتضای آیت کریمہ۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ الخ (کہ اللہ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور عمل صالح کرنے والوں سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ان کو ضرور بضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا۔ الخ)

کے خلفاء ایمان اور اعمال صالحہ سے مشرف ہوکر بہرہ اندوز خلافت جہات اربعہ ہوئے۔ جاننا چاہیئے کہ خداوند کریم نے خود ان کے ایمان اور اعمال صالحہ اور خلیفہ بنانے کے لیے اتنی مدت

پیشتر خبر دی افسوس ہے کہ جو امر خداوند تعالیٰ کی مرضی سے ہو روافض اس کو نہ مانیں یہ وہ مثل ہے کہ بادشاہ کا مال صرف ہوا اور خزانچی کی جان سوکھی۔ یہ کیسے مسلمان ایماندار ہیں کیا اس بات پر ایمان لائے ہیں کہ حکم خداوندی نہ مانیں گے اگر یہ بات ہے تو بیشک پختہ مومن ہیں۔

سوال ہشتم[۸] از جانب شیعہ

حضرت علی کے لیے پیغمبر خدا نے یہ فرمایا یا نہیں کہ وہ خدا اور رسول خدا کو دوست رکھتے ہیں اور خدا اور رسول خدا اس کو دوست رکھتے ہیں یا یہ کہ لڑائی خندق کے دن کی حضرت علیؓ کی افضل ہے تمام امت کے اعمال سے جو قیامت تک کریں۔

جواب سوال ہشتم۔

واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کی شان میں فرمایا کہ وہ اللہ کو دوست رکھتے ہیں اور اللہ ان کو دوست رکھتا ہے اور یہ ہمارا عین ایمان ہے پر اس سے افضلیت کا ثابت کرنا ایسا ہے جیسا کسی نے کہا ہے۔

چہ خوش گفت ست سعدی در زلیخا — کہ عشق آسان نمود اول ولے افتاد مشکلہا[۱]

صاحبو اوّل تو خدا تعالیٰ ہر متقی کی نسبت فرماتا ہے ان اللہ یحب المتقین۔ دوسرے متبعان سنّت کو ہدایت ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (آل عمران ع ۴) — جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو اللہ کو تم سے محبت ہو جاویگی اور اللہ تمہارے سب گناہ بخش دے گا اور اللہ غفور رحیم ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ بات ہر مومن کو نصیب ہو سکتی ہے ورنہ ہدایت کے کیا معنی ہیں۔ اگر یہ بات ممکن نہ ہوتی تو پھر یہ ارشاد ایسا تھا جیسے یوں کہتے تم خدا ہو جاؤ اور یہ ناممکن ہے اور ہم

---

[۱] یعنی مقصد اصلی پر دلالت بالکل نہ ہو زبردستی کھینچ تان کی جائے شاعر کے شعر میں تین غلطیاں ہیں۔ زلیخا کتاب مولانا جامی کی ہے سعدی کی نہیں پھر مصرعہ ثانی دیوان حافظ کا ہے۔ ۱۲ مہر محمد

نے دبالفرض، مانا کہ یہ امر اوروں کو حاصل نہیں یا بدشواری حاصل ہے پر اس کو کیا کیجیے۔ خدا تعالیٰ حضرت ابوبکرؓ اور ان کے ہمراہیوں کی شان میں اس سے زیادہ فرماتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ لا اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (پ المائدہ ع ۸)

حاصل معنیٰ یہ ہے کہ اے ایمان والو اگر تم مرتد ہو جاؤ گے تو اللہ تعالیٰ اور ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے خدا کو محبت ہوگی اور خدا سے ان کو محبت ہوگی مومنوں کے سامنے ذلیل۔ کافروں کے روبرو بڑے عزت (غلبے) والے خدا کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی کے برا کہنے سے نہ ڈریں گے اللہ کا فضل ہے جسے چاہے وہ دے اور بہت وسعت والا دانا ہے۔

اوّل تو یہی فرق دیکھئے کہ وہ حدیث ہے اور یہ آیت دوسرے اس میں فقط محبت طرفین ہی کا ذکر نہیں یہ اتنے لمبے چوڑے فضائل اور بھی ہیں اور پھر کس انداز سے فرماتے ہیں یہ ہمارا فضل ہے ہر کسی کو نہیں ملتا جس کو ہمارا جی چاہتا ہے اس کو دیتے ہیں۔ بہر حال یہ آیت حضرت ابوبکر صدیقؓ اور ان کے ہمراہیوں کی شان میں پہلے سے نازل فرمائی گئی ہے دلیل مطلوب ہے تو سنئے۔ اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو کچھ لوگ مرتد ہو جائیں گے دوسرے یہ کہ ان سے وہ لڑیں گے جو خدا کے پیارے اور ایسے ہوں گے سو آپ ہی فرمایئے کس کے زمانے میں لوگ مرتد ہوئے اور کون ان سے لڑا باقی حضرت ابوبکرؓ کو اگر نعوذ باللہ مرتد کہتے ہو تو یہ فرمایئے بجز کفار ان سے اور کون لڑا حضرت علیؓ لڑے یا حسینؓ لڑے اور اگر آپ کے نزدیک کفار ہی خدا کے پیارے اور موصوف باوصاف مذکورہ ہیں تو مبارکباد ہم ہارے تم جیتے۔

(خوارج بدعتی تھے)

صاحبو۔ باقی خوارج کو مرتد نہیں کہہ سکتے وہ بدعتی تھے مرتد جب ہوتے جب کہ کلام اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے منکر ہو جاتے۔ سو کلام اللہ کی نسبت ان کا اعتقاد تو انہیں حدیثوں سے ثابت ہے جن سے ان کی مذمت نکلتی ہے۔ ہاں یہ بات جدی رہی کہ وہ بدعت کس درجہ کی تھی کفر کے درجہ کو پہنچ گئی تھی یا ابھی سرحد اسلام ہی میں تھی بہر حال مرتد ہونا

اور ہے اور بدعتی ہونا اور جیسے شرابی ہونا اور ہے اور زانی ہونا اور۔ اور اگر بالفرض اس کو ارتداد ہی کہتے ہیں تو وہ ارتداد اس ارتداد کے برابر نہیں اسی لیے خوارج کے قاتل ایسے عظیم المرتبہ نہ ہوں گے جیسے قاتلان مرتدان زمانہ صدیق اکبرؓ اور حق یہ ہے کہ خوارج بدعتی ہیں پر پرلے درجے کے بدعتی جیسے شیعہ ویسے ہی خوارج۔

(شیعہ خارجیوں سے بدتر ہیں)

ہاں بوجہ سب وشتم افضل الصحابہؓ اگر روافض کو خوارج سے بڑھ کر کہیے تو بجا ہے۔ چنانچہ حدیثوں میں جو روافض کی مذمتیں ہیں وہ خوارج کی مذمتوں سے بڑھ کر ہیں۔ ہائے افسوس یہ فرقہ بھی اگر اسی طرح لشکر آرائی کرتا اور صحابہؓ سے برسرپرخاش ہو کر سر قلم کراتا تو کیا اچھا ہوتا۔ یہ جھگڑا ہی چک جاتا۔

اب رہی یہ بات کہ ایک جہاد خیبر تمام اعمال امت سے بڑھ جائے یاروں کی گھڑی ہوئی بات ہے۔ حدیث اور کلام اللہ میں اس کا کہیں پتہ نہیں۔

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

(حضرت ابوبکر صدیقؓ کا جہاد وانفاق)

قول اس کا کہ وہ خدا اور رسول کو دوست رکھتے ہیں الخ یہ الفاظ بعینہ اس قوم کے حق میں خداوند تعالے نے فرمائے ہیں جو مرتدین کے مقابلے کے لیے اللہ تعالیٰ قائم کرے گا۔ قال اللہ تعالیٰ

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ۔

(اے ایمان والو اگر تم مرتد ہو جاؤ گے تو اللہ تعالے اور ایسے لوگوں کو لے آئے گا جن سے خدا کو محبت ہو گی مومنوں کے سامنے نرم۔ کافروں کے روبرو بڑے سخت)

---

[1] شیعہ کی معتبر تفسیر مجمع البیان صفحہ ۲۱ جلد ۲ میں ہے۔ ان اوصاف والوں میں کئی اقوال ہیں سب سے پہلا قول یہ ہے کہ حضرت ابوبکر اور آپ کے ساتھی مراد ہیں جو مرتدوں کے ساتھ لڑے۔ حسن بصری۔ قتادہ۔ ضحاک (شاگردان عبداللہ بن عباسؓ) کی یہی تفسیر ہے دوسرا قول (سدی کا) یہ ہے کہ انصا[illegible] ہیں الخ [illegible]

مصداق اس آیت کے خلیفہ اوّل اور ان کے معاون ہیں اور وجہ فرق کی کچھ نہیں حضرت امیر المومنین کرم اللہ وجہہ بھی ان کے شامل مورد ان الفاظ کے ہیں علاوہ بریں جیسے دو حدیثیں حضرت علیؓ کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں۔ ویسی ہی ایک آیت اور ایک حدیث ابوبکرؓ کی فضیلت میں منجملہ چند آیات واحادیث کے بیان کی جاتی ہیں۔

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۭ أُولٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۔ (پ۲۷ الحدید ع۱)

(ترجمہ:- برابر نہیں تم سے وہ لوگ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا۔ یہ لوگ بڑے ہیں درجے میں ان لوگوں سے جنہوں نے خرچ کیا اس کے بعد اور جہاد کیا اور اللہ نے ہر ایک سے بھلائی (جنت) کا وعدہ کیا ہے۔)

اسکے مصداق حضرت ابوبکرؓ ہیں جب اللہ تعالیٰ اعظم تمام صحابہؓ کی جانب خطاب فرما کر اعظم ہونا فرمائے تو پھر کیا حجت باقی رہ گئی اور حدیث یہ ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَعِنْدَهُ أَبُوْبَكْرٍ الصِّدِّيْقُ عَلَيْهِ عَبَاءَةٌ قَدْ خَلَّهَا فِيْ صَدْرِهِ بِخِلَالٍ فَنَزَلَ عَلَيْهِ جِبْرِيْلُ فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ مَالِيْ أَرَى أَبَابَكْرٍ عَبَاءَةٌ قَدْ خَلَّهَا فِيْ صَدْرِهِ بِخِلَالٍ فَقَالَ يَا جِبْرِيْلُ أَنْفَقَ عَلَيَّ قَبْلَ الْفَتْحِ فَقَالَ فَإِنَّ اللّٰهَ يَقْرَءُ عَلَيْهِ السَّلَامَ وَيَقُوْلُ قُلْ لَهُ أَرَاضٍ أَنْتَ عَنِّيْ فِيْ فَقْرِكَ هٰذَا أَمْ سَاخِطٌ فَقَالَ أَبُوْبَكْرٍ أَأَسْخَطُ عَلٰى رَبِّيْ؟ أَنَا عَنْ رَبِّيْ رَاضٍ۔ أَنَا عَنْ رَبِّيْ رَاضٍ۔ أَنَا عَنْ رَبِّيْ رَاضٍ (ازالۃ الخفاء ج۱ ص۲۹۷)

(حضرت ابن عمرؓ روایت فرماتے ہیں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھا ہوا تھا آپ کے پاس ابوبکر صدیقؓ بیٹھے تھے آپ پر ایک چوغہ تھا جسے سینے پر کانٹے سے ٹانک رکھا تھا تو جبریل علیہ السلام اتر آئے اور فرمایا اے محمد! ابوبکر کو کیا ہو گیا کہ اپنا چوغہ سینے پر کانٹے سے ٹانک رکھا ہے تو آپ نے فرمایا اے جبریل اس نے (سارا مال) فتح مکہ سے پہلے مجھ پر خرچ کر دیا ہے تو جبریل فرمانے لگے بلاشبہ اللہ تعالیٰ ابوبکر کو سلام دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ابوبکر سے پوچھیں کیا وہ اس فقر میں مجھ پر راضی ہے یا ناراض؟ ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کیا میں اپنے رب پر ناراض ہو سکتا ہوں؟ میں اپنے رب سے راضی ہوں۔ رب سے راضی ہوں۔ رب سے راضی ہوں۔)

غور کرنے کی جگہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ جس کو صحابہؓ سے اعظم درجہ کا فرمائے اور سلام کہہ کر بھیجے اور رضا جوئی کا طالب ہو اس کا کیا کچھ مرتبہ ہوگا وہ بہت محبّ و محبوب ہے اور جو کہ آپ نے حدیث خندق کی تحریر فرمائی ہے اہل سنت کی کتب معتبرہ میں پتہ ہی نہیں ایسے تو بے ٹھکانے

کی بات نہ فرمایئے یہ دین کا مقدمہ ہے۔

سوال نہم ۹ از جانب شیعہ

شیخین یا دیگر صحابہ داخل امت ہیں یا نہیں؟

جواب سوال نہم ۹ (صحابہ کرام رض افضل ترین امت محمدی ہیں۔)

شیخین اور دیگر صحابہ داخل امت محمدی کیا سر دفتر امت محمدی ہیں اعتبار نہ آئے تو کلام اللہ کی سند لیجیے خداوند کریم سورت تحریم (آیت نمبر ۸) میں فرماتا ہے۔ یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ۔ اس آیت کے معنی اوپر کے ٹکڑے سمیت یہ ہیں اے ایمان والو! اللہ کی طرف خالص توبہ کرو شاید تمہارے گناہوں کا بھی اللہ کفارہ کر دے اور داخل کر دے تم کو ایسی جنتوں میں جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی کس دن جس دن کہ نہ رسوا کرے گا اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے پھر اس کے بعد اور تعریف فرماتے ہیں مگر ہمیں اختصار منظور ہے مطلب یہ ہے کہ عام مومنوں کو یہ ارشاد ہے کہ اگر توبہ خالص کر کے لاؤ گے تو شاید تم بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضوان اللہ عنہم اجمعین کے ساتھ جنتوں میں داخل ہو جاؤ اب دیکھیے اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ کا ترجمہ بھی ہے کہ جو لوگ ایمان لائے نبی کے ساتھ سو تم ہی فرماؤ وہ صحابہ ہیں یا نہیں۔ ہاں اگر فقط اٰمَنُوْا فرماتے تو یہ بات سب کو عام ہو جاتی مگر اس صورت میں یہ کلام اللہ لغو ہو جاتا۔ اس وقت میں اس مثل کے کیا معنی تھے۔ عام لوگوں کا جو حال ہو گا ——— وہ عام لوگوں کے لیے تو یقینی ہے دور کر اتنی بات کے لیے اور توبہ کرانے کی کیا ضرورت تھی تیسرے عام لوگوں کو نبی کے ساتھ اتنی مشارکت کی امید کہاں ہے بہت سے نام کے مسلمان اس روز رسوا ہوں گے اور بہت سی رسوائیوں کے بعد کہیں جنت میں جائیں گے۔

بہر حال امنو معہ، کے مصداق صحابہ کرام رض ہیں اور وہ بایں وجہ سر دفتر امت ہیں کہ ان کے لیے روز قیامت رسوائی کا اندیشہ نہیں اور دوسروں کو ان کی معیت بشرط توبہ خالص میسر آئے تو آئے ورنہ استحقاق کی تو کوئی صورت نہیں چنانچہ اس لیے عسیٰ کے لفظ کو بیچ میں لائے

ورنہ فقط اس میں کیا کمی تھی کہ یوں فرما دیتے تُوبُوا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا يكفر عنكم سَيِّاٰتِكُمْ جس سے خواہ مخواہ بھی تا تبان مشار الیہم ثابت ہو جاتا اور بیچ میں ایک لفظ بے معنیٰ نہ آتا اور کلام قدیم یوں غیر فصیح و بلیغ مثل کلام احمقان بے عقل نہ ہو جاتا ؟

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

جاننا چاہیے کہ قیامت تک جو شخص اتباع کرنے والا طریقہ رسول مقبول کا ہو گا وہ امتی ہو گا چہ جائیکہ صحابہ کرامؓ کہ وہ تو ماسوائے اطاعت خدا اور رسول کے مصاحبت کا بھی درجہ لے کر کسی نے درجہ صدیقیت اور کسی نے فاروقیت اور کسی نے ذی النورینیت اور کسی نے اسدیت کا اڑایا علی رغم انوف المخالفین۔

(عشرہ مبشرہ کا ذکر خیر)

اَخْرَجَ اَبُوْيَعْلٰى مِنْ حَدِيْثِ قُتَيْبَةَ بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ مالك بن انس عن عبد العَزِيْزِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ حُمَيْدٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ قَالَ رسول الله علیه وسلم عَشَرَةٌ فِي الْجَنَّةِ اَبُوْبَكْرٍ فِي الْجَنَّةِ وَعُمَرُ فِي الْجَنَّةِ وَعُثْمَانُ فِي الْجَنَّةِ وَعَلِيٌّ فِي الْجَنَّةِ وَطَلْحَةُ فِي الْجَنَّةِ وَالزُّبَيْرُ فِي الْجَنَّةِ وَعَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ عَوْفٍ فِي الْجَنَّةِ وَسَعْدُ بْنُ اَبِي وَقَّاصٍ فِي الْجَنَّةِ وَسَعِيْدُ بْنُ زَيْدِ بْنِ عَمْرٍو فِي الْجَنَّةِ وَاَبُوْعُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ فِي الْجَنَّةِ ۔ ازالۃ الخفاء ج ۱ ص ۱۷ بحوالہ مسند ابو یعلی

(ترمذی، صفحہ ۲۱۶/۱)

ترجمہ:۔ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس آدمی جنت میں ہیں ابوبکر جنت میں ہیں اور عمر جنت میں ہیں اور عثمان جنت میں ہیں اور علی جنت میں ہیں، طلحہ جنت میں ہیں اور زبیر جنت میں ہیں اور عبدالرحمٰن بن عوف جنت میں ہیں اور سعد بن ابی وقاص جنت میں ہیں اور سعید بن زید بن عمرو جنت میں ہیں اور ابوعبیدہ بن الجراح جنت میں ہیں۔

(ہر مسلمان امتِ نبی میں داخل ہے)

یہ سب لوگ عشرہ مبشرہ اور دیگر صحابہ متبعین سنت رسول امین امتی اور جنتی ہیں رضوان اللہ علیہم اجمعین اور جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لائے وہ امتی ہیں اور امتی ہونے میں ازواج مطہرات اور دیگر اہل بیت اور صحابہ سب برابر ہیں اور اس کو امت اجابت کہتے ہیں۔

صحاح میں یہ حدیث موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے وقت نازل ہونے وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ (اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈرائیے) سب قریش کو عام خاص کر کے پکارا اور سب سے یہ ہی فرمایا۔

اَنْقِذُوْا اَنْفُسَکُمْ مِنَ النَّارِ فَاِنِّیْ لَا اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا۔ ترجمہ :۔ اپنی جانوں کو بچاؤ آگ سے میں نہیں بے پرواکر سکتا تم سے اللہ کے معاملے میں اور یہ بعینہٖ حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کو فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ابلاغ میں سب برابر ہیں اور خاص کر شیخین کی شان میں تو امام محمد باقر سے صاحب نصوص کی روایت ہے۔

اَنَّہٗ قَالَ لِجَمَاعَۃٍ فَاضُوْا فِیْ اَبِیْ بَکْرٍ وَّ عُمَرَ وَعُثْمَانَ اَلَا تُخْبِرُوْنِیْ ھَلْ اَنْتُمْ مِنَ الْمُھَاجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاَمْوَالِھِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا وَّ یَنْصُرُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ قَالُوْا لَا قَالَ فَاَنْتُمْ مِّنَ الَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِھِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ ھَاجَرَ اِلَیْھِمْ قَالُوْا لَا قَالَ اَمَّا اَنْتُمْ فَقَدْ تَبَرَّءْتُمْ اَنْ تَکُوْنُوْا اَحَدَ ھٰذَیْنِ الْفَرِیْقَیْنِ وَ اَنَا اَشْھَدُ اَنَّکُمْ لَسْتُمْ مِّنَ الَّذِیْنَ

ترجمہ :۔ انہوں نے ایک جماعت سے جو ابوبکر اور عمر اور عثمان کے معاملہ میں کھود کرید کر رہے تھے کہا بتلاؤ تم مجھ کو تم ہو مہاجرین میں سے جو نکالے گئے اپنے گھروں سے اور جدا کئے گئے اپنے مالوں سے تلاش کرتے ہیں اللہ کے فضل کی اور خوشنودی کی اور مدد کرتے ہیں اللہ کی اور اس کے رسول کی کہا انہوں نے ہم ان میں سے نہیں کہا امام نے تم ان لوگوں میں سے ہو جنہوں نے ٹھکانہ دیا اور ایمان کو اپنے دلوں میں دوست رکھتے ہیں ان لوگوں کو جو ان کی طرف ہجرت کر آئے انہوں نے کہا ہم ان

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (حشر ع ۱)

میں سے بھی نہیں کہا امام نے تم تو بری ہو چکے ان دونوں فریقوں میں شامل ہونے سے اور میں گواہی دیتا ہوں نہیں ہو تم ان لوگوں میں سے جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور جو لوگ آویں گے بعد ان کے کہیں گے اے رب ہمارے بخش دے ہمارے لیے اور ہمارے ان بھائیوں کے لیے جو ایمان میں ہم سے پہلے گذرے اور ہمارے دلوں میں کینہ مت کر ان لوگوں کا جو ایمان لائے بے شک تو مہربان ہے بخشنے والا۔

فائدہ:۔ خیال کرنے کی جا ہے کہ امام محمد باقر نے آیات کی سند لاکر شیخین رضی اللہ عنہما کے فضائل ثابت کئے اور تمہارے دلوں میں غل یعنی کینہ ثابت کیا اور آیات بالا کے عدم مصداق ہونے کا خود تم سے اقرار لے لیا اور تمہارے دائرہ اسلام سے خارج ہونے پر گواہ بنے تو اب بتاؤ کہ تمہارا کیا دین وایمان رہا۔

سوال دہم از جانب شیعہ

شیخین جمیع غزوات نبوی میں ثابت قدم رہے یا کبھی پس پا ہونے کا اتفاق ہوا؟

جواب سوال دہم ویازدہم

حضرت علیؓ کسی غزوہ میں فرار نہیں ہوئے اور نہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمرؓ ہاں غرض سائل کو ہم سمجھتے ہیں اس لیے گو وہ صاف نہیں پوچھتا پر ہم صاف جواب دیتے ہیں۔

سائل حضرت عثمانؓ پر آوازہ کستے ہیں مگر اس بیہودہ وسست و پا زنی سے کیا فائدہ ہوا۔ حقیقت حال ہم سے سنیئے۔

جنگ احد میں لشکر ظفر پیکر جا بجا معرکہ آرا تھا بامداد خداوندی و برکت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آثار فتح نمایاں ہوئے مشرکین بھاگے اہل ایمان نے غنیمت پر ہاتھ مارنا شروع کیا مشرکین نے کمینگاہ سے نکل کر پیچھا لیا، مارا اور ادھر شیطان نے باآواز اَلَا اِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ کہہ سنایا

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مارے گئے۔ ادھر تو یہ وہ بلائے ناگہانی ادھر یہ صدمہ جانی اس بیتابی میں معرکہ آرائی بے حاصل نظر آئی۔ مصرعہ۔

جس کے ہم عاشق ہوئے تھے اب وہ جاناں ہی نہیں

اس رنج وغم میں خادمان دور افتادہ کا پاؤں اکھڑ گیا اور نہ اکھڑتا تو ان کی محبت پر تف اور ان کی جانبازی پر حرف تھا اگر وہیں جمے رہتے تو ہم جانتے کہ ان کو صدمہ ہی نہ تھا۔ غرض وہ ایمان دار تھے ایمان داروں کو یہ صدمہ ایسا ہی ہونا چاہیئے جیسا ان کو ہوا پر بے ایمانوں کو محبت کی کیا قدر محبّت نبوی ہوئی ہو تو جانیں۔ بہر حال جو لوگ دیدار مبارک سے مشرف تھے جیسے حضرت علیؓ ابوبکر حضرت عمرؓ ان کے دل ٹھکانے تھے اور جو لوگ دور کے مورچوں پر تھے اس خبر ہوشربا سے بیہوش ہو کر افغاں وخیزاں مدینہ کی طرف رواں ہوئے ان میں ایک حضرت عثمانؓ بھی تھے۔

(اللہ نے تو معاف کر دیا پر شیعہ نے نہ کیا۔)

پر چونکہ یہ حرکت قابل ترحم اور لائق قدر شناسی تھی نہ موجب عتاب سرزنش۔ خداوند کریم نے اس ظاہری خطا سے درگذر فرمایا اور بہر تسکین یہ ارشاد فرمایا۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ (پ ۴ ع ۷)

جس کا حاصل یہ ہے کہ شیطان نے ان کو بھلا دیا تھا پر اللہ نے معاف فرما دیا۔

پر اس کو کیا کیجیے حضرات شیعہ خدا کی بھی نہیں سنتے خیر وہ نہیں سنتے تو اہل ایمان تو ان (شیعہ) کی نہ سنیں ورنہ اللہ سے لڑائی ٹھہری وہ معاف کیے جائیں تم نہیں کرتے۔ صاحب اور صاحب ہوتے کون ہیں۔ خدا نہیں خدا کے بیٹے پوتے بھائی برادر نہیں ایک راندہ درگاہ حق ہیں جو الٹی ہی بکے جاتے ہیں اور خدا سے نہیں شرماتے۔ بالجملہ نہ یہ قصور حقیقت میں قصور ہے نہ یہ خطا حقیقت میں خطا یوں خدا کے سامنے ہماری عبادت بھی خطا ہے نہ اس سے کوئی فضیلت ہاتھ سے جاتی ہے نہ لیاقت خلافت میں بٹا لگتا ہے ورنہ ہم تو نہیں کہتے حضرت یونس علیہ السلام جو بے وجہ بھاگ گئے ان کی شان میں حضرات شیعہ شاید

اور بھی کچھ زیادہ کہیں اور منصب نبوت سے معزول فرمائیں کوئی پوچھے کہ خدا کا واسطہ نبوت تو اتنی باتوں سے ہاتھ سے نہ جائے اور خلافت کی لیاقت چھن جائے فقط۔

جواب ثانی از جانب مولوی عبد اللہ صاحب

(حنین میں ثابت قدم صحابہؓ)

شیخین کسی غزوہ میں پسپا نہیں ہوئے سب غزوات میں ثابت قدم رہے یہ اشاعت دین ان کی ثابت قدمی کا ثمرہ ہے کہ بعد فتح ملک عرب ملک شام و روم و ایران و توران میں اسلام شائع ہوا اور مسلمان ان ملکوں کے عمدہ نشان ہیں غزوہ احد اور حنین میں اول ضعفا مسلمین کے قدم اٹھ گئے تھے پر اکثر صحابہؓ خاص کر شیخین نے میدان جنگ نہیں چھوڑا اور شمشیر زنی سے منہ نہیں موڑا اور بے ترتیبی صفوف کے ہو جانے سے بھاگنا نہیں کہلاتا چنانچہ حنین میں یہی واقعہ ہوا کیونکہ حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ و حضرت ابن مسعودؓ و حضرت علیؓ و حضرت عباسؓ و حضرت ابوسفیانؓ بن الحارث و حضرت ربیعہؓ بن الحارث بن عبد المطلب و حضرت عقیلؓ بن ابی طالب و دیگر از اہل بیت اس جگہ موجود تھے حضرت عباسؓ رکاب راست تھامے ہوئے تھے۔ اور حضرت ابوسفیانؓ رکاب چپ یا حضرت ابوسفیان باگ بغلہ کی تھامے ہوئے تھے اور یہ سب لوگ دائیں بائیں موجود تھے چونکہ اس غزوہ میں صحابہ نے اپنی کثرت اور کفار کی قلت دیکھ کر خیال کیا تھا کہ ان کو طرفۃ العین میں ہزیمت دے دیں گے۔ اپنی کثرت دیکھ کر استمداد خداوند کریم سے غفلت ہوئی اللہ تعالیٰ کو یہ تغافل پسند نہ آیا اور ان کے متنبہ کرنے کے لیے قدرے تزلزل اور تفرق ڈالدیا جب اس غفلت سے ہوشیار ہو گئے۔ حضرت عباسؓ کے پکارنے کی آواز سے لبیک لبیک کہتے ہوئے بجانب رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم دوڑے اور کفار کو زیر و زبر کر دیا[1]

---

[1] شیعہ تفسیر مجمع البیان میں ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (پھر اللہ نے رحمت و تسلی اتاری اپنے رسول پر اور مومنین پر) کے مصداق میں لکھا ہے حِيْنَ رَجَعُوْا اِلَيْهِمْ وَقَاتَلُوْهُمْ یعنی اللہ نے مومنین پر تسلی اور رحمت اسوقت اتاری جب وہ کفار کی طرف پھر پلٹ آئے اور ان سے جنگ کی معلوم ہوا کہ ایسے صاحب سکینہ مومنوں کو بھاگنے کا طعنہ دینا قرآن کا انکار اور اپنے ایمان کا خاتمہ کرنا ہے (معاذ اللہ) ۱۲ مجمد

اللہ تعالیٰ نے مدد بھیجی جیسا کہ کلام میں مذکور ہے ۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِي مَوَاطِنَ كَثِيرَةٍ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا

ترجمہ۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہاری مدد کی بہت سی جگہ اور حنین کے دن جب کہ خوش کیا تم کو تمہارے زیادہ ہونے نے سو نہ تمہارے کام نہ آئی

ثُمَّ أَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا۔ (توبہ ع ۴)

پھر اللہ نے ٹھنڈک اتاری اپنے رسول پر اور سب مومنوں پر اور اتارا ایسا لشکر جس کو تم نے نہیں دیکھا۔

فائدہ (برائے ازالہ طعن) خیال کی جائے کہ جب خداوند کریم کو صحابہؓ کرام کی اتنی بھی غفلت گوارا نہ ہو تو حضرات شیعہ ان کو کفر و فسق کی کس منہ سے تہمت لگاتے ہیں چاند پر خاک ڈالے سے کیا ہوتا ہے آپ ہی غبار سے اندھے بنتے ہیں۔ اور اگر یہ اعتراض اشارہ حضرت عثمان کی طرف ہے تو بڑی ہی حماقت ہے، سلمنا اگرچہ ان سے خطا صادر ہی ہوئی کیا حرج ہے۔ ہم امام کی معصومیت کے قائل نہیں جو تم وہ ان اعتراض تو کرو بلکہ ہم بہ نسبت خلیفہ کے ان شرائط کے قائل ہیں۔ مسلم[1] حر[2] مذکر[3] عاقل[4] بالغ[5] قریشی[6]۔ قادر بر احیاء علوم دینیہ[7] و اقامت[8] ارکان اسلام و امر[9] بالمعروف و نہی[10] از منکر و قیام[11] امر جہاد و قضا[12] و اقامت حدود۔ علاوہ بریں جب اللہ تعالیٰ کے یہاں سے اُن کی معافی ہوگئی پھر کیا جھگڑا باقی رہ گیا اور نیز تائب بھی مثل بے گناہ کے ہوتا ہے۔ التائب من الذنب کمن لا ذنب لہ (گناہوں سے تائب اس شخص کی طرح ہے جس نے گناہ نہ کیا۔)

ومن تاب وعمل صالحا فانہ یتوب الی اللہ متابا (جو توبہ کرے اور اچھے عمل کرے وہ اللہ کی طرف لوٹ رہا ہے) سے واضح ہے جب کہ ہمارے نزدیک امامت کے واسطے معصومیت کی شرط نہیں اس لیے گناہ عثمانی موجب عدم قابلیت خلافت نہ ہوا لیکن بمقابلہ حضرت امیر معاویہؓ و یزید کے حضرت علی کرم اللہ وجہہ و حضرت حسنؓ ترک فرض عین کرنے سے حسب ظنون شیعہ کے قابل عہدہ امامت نہ رہے اس بات کا کیا علاج کریں گے۔ کس منہ سے ان کو قابل امامت کہتے ہیں اور دوسروں کی عدم قابلیت منہ پہ لاتے ہیں۔

سوال یازدہم از جانب شیعہ

حضرت علیؓ بھی کسی غزوہ میں پس پا یعنی فرار ہوئے یا نہیں۔

جواب از جانب مولوی عبد اللہ صاحب

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کسی غزوہ میں فرار نہیں ہوئے وہ کیوں فرار ہوتے وہ تو اسد اللہ الغالب تھے اپنا یہ مذہب نہیں کہ خواہ مخواہ کسی کو برا کہیں خصوصاً ایسے اکابر کو نعوذ باللہ منہا۔

یہ کمال حضرات شیعہ ہی میں ہے کہ نہ ہوئی بات کو اپنے عقیدہ فاسد کی تائید کے لیے جس طرح چاہیں بنالیں۔

(ثابت قدمی کی فضیلت سنی مذہب میں ہے شیعہ میں نہیں)

ہمارے ظنون و کتب کے بموجب تو جان بازی کے معرکوں میں استقامت کرنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ و خلفاء ثلاثہ رضؓ کی فضیلت ہے۔ پر بروایت کلینی و دیگر کتب معتبر شیعہ کے بموجب کہ ائمہ اپنی موت و حیات پر قادر ہیں کچھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فضیلت ثابت نہ ہوگی اور خلفاء ثلاثہ رضؓ کی فضیلت ثابت ہو جائے گی۔ کیونکہ ان کو شیعہ امام ہی نہیں جانتے۔ باوصف حسب ظنون شیعہ خلفاء ثلاثہ رضؓ امام نہ تھے اور بایں جہت اپنی موت و حیات پر قادر نہ تھے پھر جانبازی کی لڑائیاں لڑتے تھے کس قدر مطیع حکم خدا و رسول تھے اسی واسطے آیت اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔

(ترجمہ:۔ بیشک اللہ نے مومنوں کے مالوں اور جانوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا۔)

(پ ۱۱ ع ۳) کے مصداق تھے

(ایک شبہ کا ازالہ)

اور اگر حضرات شیعہ اپنے خیال خام کے یعنی ائمہ کے موت و حیات پر قادر ہونے پر اسی آیت سے استدلال پکڑیں اس طرح کہ بیع و شراء اپنی ہی ملک میں جاری ہوا کرتی ہے دوسرے کی ملک میں نہیں ہوتی بے شک ہم بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں پر اول تو ہم یہ کہتے ہیں کہ خداوند کریم نے مومنین کا لفظ فرمایا اور یہ وصف قرار دیا یقاتلون فی سبیل اللہ تو

اس میں کچھ تخصیص تمہارے اماموں کی نہیں یہ منصب جلیلہ دور تک پہنچتا ہے۔ دوسرے یہ کہ (آدمی) جس چیز کا مالک ہوتا ہے قادر ہونا کچھ ضرور نہیں چنانچہ باندی غلام یا بیل بکری کا مالک ہوتا ہے قادر نہیں ہوتا اگر یہ بات ہوتی تو کوئی اپنی باندی غلام یا بیل بکری کو مرنے ہی نہ دیا کرتا۔ پس معلوم ہوا کہ ملک اور قدرت میں بہت فرق ہے اور آیت مذکورہ سے ملک ثابت ہوتی ہے نہ قدرت۔ ملک بھی مانگے پھر نہ تلنگے[1] جیسے کوئی بادشاہ ایک شخص کو کسی ضلع کا عامل بنا کر کہہ دے کہ اس کا محصول تو ہی کھا جب ہمارا دل چاہے گا تجھ کو معزول کر دیں گے۔ فقط

سوال دوازدہم[12] سیزدہم[13] از جانب شیعہ (بحث فدک)

نبیؐ کو غصہ دلانا کیسا ہے۔ اور عدول حکمی کرنے کی کیا جزا ہے۔

جواب سوال دوازدہم وسیزدہم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بے وجہ جان بوجھ کر غصہ دلانا اور خفا کرنا کفر ہے۔ سو الحمد للہ کوئی صحابی اس جرم میں مبتلا نہیں ہوا۔ اور اگر حضرت ابوبکر صدیقؓ سے کچھ چھیڑ چھاڑ ہے اور یہ غرض ہے کہ حضرت فاطمہ ان پر غصہ ہوئیں اور بہ شہادت حدیث[2] فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّیْ وَمَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِیْ ان کے غصہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غصہ سمجھے ہو تو یہ بات دل سے دور رکھے حضرت صدیقؓ تو اس میں داخل نہیں ہو سکتے۔

(حضرت صدیق حدیث "صدقہ ترکہ" کی وجہ سے معذور تھے)

ہاں حضرات شیعہ کی فہم کے موافق نعوذ باللہ حضرت علیؓ اس میں داخل ہوئے جاتے ہیں حضرت ابوبکر صدیقؓ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے ناچار تھے۔ لا نورث ما ترکنا صدقۃ جس کا حاصل یہ ہے کہ نبی کا کوئی وارث نہیں ہوتا اس کا سب ترکہ صدقہ ہے اس صورت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کو کچھ غم نہیں بلکہ امید اتباع ارشاد نبوی ہے پر حضرت فاطمہ زہرا (رضی اللہ عنہا) کے بے وجہ غصہ ہونے کا شیعہ جواب دیں کہ وہ ناحق کیوں

---

[1] یعنی مانگنے پر واپسی کا انکار نہیں کر سکتا۔ ۱۲ مہر محمد [2] بخاری ص ۵۳۲ ج ۱ و ص ۷۸۱ ج ۲ مسلم ص ۲۹۰ ج ۲

غصہ ہوئیں اہل سنّت تو ان کے غصہ ہونے کے قائل ہی نہیں ہاں جیسے دوستوں میں کچھ بحث و تکرار معمولی دیکھ کر بعض سادہ لوح یوں سمجھ جاتے ہیں کہ ان میں آپس میں رنج ہو گیا - سوال فدک کے بعد جو حضرت فاطمہ رضؓ بوجہ ندامت طلب ناحق شرمندہ ہوئیں اور آمد و شد کم اور ربط و ضبط سابق کم ہو گیا - ادھر حضرت ابو بکر صدیق رضؓ بوجہ کمال نیاز مندی در دولت پر حاضر ہوئے اور اس احتمال پر کہ آپ خفا ہی ہو گئی ہیں جو وہ بات نہ رہی عذر معذرت کی عفو تقصیر چاہا وہاں رنج ہی کیا تھا جو جھگڑا پھیلتا راضی رضا ہو کر اپنے گھر کو چلے آئے اس قصہ کو ظاہر بینوں نے رنج پر محمول کیا حقیقت شناسان دانشمند نے اس طرف ندامت مذکور کا خیال کیا اس طرف احتیاط اور ادب نبوی کا احتمال جمایا سو آپ ہی فرمایئے کہ اس صورت میں طرفین کا کیا قصور رہا حضرت فاطمہ زہرہ رضؓ کا بوجہ لاعلمی فدک کا سوال کر لینا کیا برا ہے ہاں بعد طلب البتہ ندامت عمدہ اوصاف میں سے ہے جو سوا اہل کمال اور کسی سے متصور نہیں ادھر حضرت ابو بکر رضؓ نے ادب اور احتیاط فرمائی یہ بے جا کیا یا یہ بے جا تھا کہ ویسے ہی اپنے غرور افضلیت اور نخوت خلافت میں پڑے رہتے اور خبر نہ لیتے بہر حال یہ بات اچھی ہے جس میں ممدوح خدا یعنی ابو بکر صدیق پر بھی حرف نہ آیا اور جگر گوشہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی تعریف نکل آئی یا یہ کہ ان پر ظلم کا داغ لگے جس سے اتمام کار نعوذ باللہ فہم و فراست خداوندی کو بٹہ لگے - اور ان پر حبِّ دنیا کا احتمال ہو جس سے سیدۃ النساء ہونے میں شک و شبہ پیدا ہو -

(مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

اور اگر یہ عذر ہے کہ حدیث مذکور غلط ہے تو یہ دوسرا اعتراض ہے بلکہ اس صورت میں یہ اعتراض بھی اس حدیث کے غلط ہونے ہی پر موقوف ہو گا سو پہلے اس کو غلط ٹھہرائیں جب کہیں اس بات کے لیے منہ پھیلائیں -

مگر یہ یاد رہے کہ حدیث مذکور غلط ہو جائے گی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حیات النبی ہونا اور قبر میں اسی بدن سے زندہ ہونا پہلے غلط ہو گا سو تم ہی کہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی قدر دانی ہے کہ جیسے اور شیعہ مر کر ناپاک ہو جاتے ہیں اور پھر طعمہ مور و مار بن جاتے ہیں کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے ہی جسم بے جان ہو گئے ؟ اور جیسے اور اینٹ

پتھر میں آپ کا بدن بھی بے جان ہو گیا۔ ہمارا تو عقیدہ ہے کہ آپ کی حیات زیر پردہ موت اسی طرح مستور ہے جیسے چراغ کو ہنڈیا میں رکھ کر سر پوش ڈھک دیجیے یہ نہیں کہ جیسے چراغ روشن ہنڈیا میں ہو یا ہنڈیا کے باہر اس کے روشن ہونے میں کچھ کلام نہیں بلکہ ہنڈیا میں ہو تو نور منتشر اکٹھا ہو جاتا ہے اور اس کے اندر ہی سما جاتا ہے جس سے بہ نسبت سابق ہم تو زیادہ سمجھتے ہیں آپ اپنی کہیے آپ کیا سمجھتے ہیں۔

بہر حال ہمارے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قبر شریف میں زندہ ہیں اس لیے آپ کے مال میں میراث جاری نہیں ہو سکتی۔

(حضرت فاطمہؓ کا سوال بے خبری سے تھا)

ہاں حضرت فاطمہؓ کو اس (حدیث ماترکنا صدقۃ) کی خبر نہ تھی بوجہ غلطی اول بار طلب فدک میں قدم بڑھایا جب معلوم ہوا اور حضرت علیؓ و حضرت عباسؓ نے بھی گواہی دی چپ ہو رہیں اور پھر اس بات میں کلام نہ کی سو یہی حدیثوں میں موجود ہے کہ مرتے دم تک پھر گفتگو نہ آئی جس کو حضرات شیعہ نے موافق مثل مشہور کے بھوکے کو دو اور دو چار روٹیاں ہی نظر آتی ہیں ترک کلام پہ محمول کیا اور یہ نہ سمجھا کہ اس صورت میں فقط ممدوح خدا یعنی صدیق اکبرؓ ہی کو عیب نہیں لگتا بلکہ خدا تک اور ادھر حضرت فاطمہؓ تک پہنچتا ہے حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کا اس حدیث پر گواہی دینا بجا ہے اور مسلم میں موجود ہے اور حضرت فاطمہؓ کے غلط سمجھ جانے سے گھبراتے ہو تو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضرؑ کا قصہ پہلے ہی پیش کر چکا ہوں۔ اس سے نبیوں کا غلط سمجھ جانا ثابت ہوتا ہے حضرت فاطمہؓ تو ولی ہیں بالجملہ حضرت ابوبکر صدیقؓ پر کوئی اعتراض ممکن نہیں حدیث مذکور غلط کہو گے تو بہت سے ارکان دین ڈھانے پڑیں گے۔

(حدیث مَنْ اَغْضَبَھَا کا شان ورود حضرت علیؓ کے حق میں ہے)

اب رہی بات کہ اگر حضرات شیعہ کا مسلک اختیار کیجیے تو البتہ حضرت علیؓ تک یہ اعتراض جاتا ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرت علیؓ نے ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا تھا حضرت فاطمہؓ نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ اصحابہ وسلم سے شکایت

فرمائی اس پر آپ نے خطبہ فرمایا اور یہ ارشاد کیا۔

فَاطِمَۃُ بَضْعَۃٌ مِّنِّی مَنْ اَغْضَبَھَا فَقَدْ اَغْضَبَنِیْ (فاطمہ میرے بدن کا حصہ ہے جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا)

اب فرمایئے یہ کس کو سناتے ہیں ابوبکر صدیق رضؓ کو یا حضرت علی رضؓ کو پھر ابوبکر کے پاس ارشاد نبوی لا نورث ما ترکناہ صدقۃ کا بھی سہارا تھا حضرت علی رضؓ کو ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کے لیے کس نے کہا تھا علاوہ بریں بارہا معاملات خانگی میں باہم رنج کا اتفاق ہوتا تھا چنانچہ جس روز لقب ابوتراب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ کو مشرف فرمایا اس روز بھی رنج باہمی کے باعث حضرت امیر خفا ہو کر مسجد میں آ لیٹے تھے۔

جواب سوال سیزدہم ۱۳

نبی کی عدول حکمی کو کون نہیں جانتا کہ بری ہے اگر بطور مقابلہ ہو تو کفر ہے اور بطور دیگر، دیگر ہے تو فسق پر بحمد اللہ صحابہ کرام رضؓ خصوصاً چار یار اور عشرہ مبشرہ وغیرہ مشاہیر صحابہ رضؓ میں سے کوئی شخص اس بلا میں مبتلا نہیں ہوا ہاں بطور شیعہ البتہ کسی قدر الزام حضرت امیر کو لگ سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات تہجد کے لیے حضرت امیر کو اٹھایا حضرت نے جواب دیا پر مخالف طبع نبوی دیا عرض کیا جب خدا کو منظور ہو گا ہم تو جبھی اٹھیں گے ابھی نہیں اٹھتے سو آپ ناچار یہ کہتے ہوئے چلے آئے۔ وَکَانَ الْاِنْسَانُ اَکْثَرَ شَیْءٍ جَدَلًا یعنی انسان بھی بڑا جھگڑالو ہے۔ (بخاری ص ۱۱۱۲ ج ۲ نسائی ص ۱۹۳ ج ۱)

(قصہ قرطاس میں حکم عدولی نہیں)

باقی حضرت عمر رضؓ کی طرف اگر عنایت ہوئی ہے اور اس پیرایہ میں کچھ قصہ قرطاس کے اشارے کنائے تو اس کا مفصل جواب تو آپ ہدیۃ الشیعہ میں ملاحظہ فرمائیں آیت وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ کے ذیل میں بحث مفصل مرقوم ہے۔ ”پر ور مردان خالی نزود“ یہاں بھی کچھ بالاجمال سن لیجیے۔

مشورہ دینے کو عدول حکمی کہنا انہیں کا کام ہے جن کو سر و دم کی تمیز نہ ہو۔ رہی یہ بات کہ حکم معلوم مشورہ طلب تھا یا نہ تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات میں

بھی گنجائش مشورہ ہے یا نہیں۔ سو اوّل کا جواب تو یہ ہے کہ بشہادت آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ بروز حجۃ الوداع نازل ہو چکی تھی۔ دین میں تو کمی اور کسر باقی ہی نہ تھی جو اس حکم کو (دیا) حکم خداوندی تصور فرمائیں اور یوں کہیں کہ حکم قابل مشورہ نہ تھا۔ اور دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ قابل مشورہ ہونا تو در کنار خدا تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ یعنی مشورہ کر لیا کرو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ سے اور یہی وجہ ہوئی کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ تحریر حکم معلوم تا وقت وفات کچھ نہ فرمایا ورنہ حکم خدا ہوتا تو ہم تو نہیں کہہ سکتے کہ رسول اللہ علیہ وسلم کے ذمہ خدا کی عدول حکمی کا شیعوں کو منسوب کرنا پڑے گا۔ بالجملہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے بھی پسند خاطر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہوئی اور امر قوموا حضرت عمرؓ کی نسبت نہ تھا بلکہ اوروں کے اختلاف کے باعث تھا جو رد و بدل ہوئی اور جھگڑا کھڑا ہو گیا۔ تو آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا۔ اور اکثر شیعہ اس پر بھی نہیں مانتے تو یہ کہنا ہی پڑے گا کہ حضرت عمرؓ کی یہ رائے بھی اور رایوں کی مانند خدا کو منظور ہوئی ورنہ حضرت عمرؓ بندہ تھے خدا نہ تھے اور نعوذ باللہ شیعوں کے (اعتقاد میں) خدا ہی تھے چنانچہ شیر یزدں کا ان سے ڈر کر تقیہ کرنا کچھ اسی کا پتہ دیتا ہے تو (ہمارے اعتقاد میں) خدا سے بڑے نہ تھے چھوٹے تھے مگر وحی ہوتی اور تاکید فرماتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں نہ جانے دیتے۔ لیکن کوئی صاحب انصاف کریں کہ حضرت علیؓ کے جواب میں تاویل مشورہ کی گنجائش نہیں ورنہ آپؐ یہ نہ فرماتے وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا تب یہ بات کوئی مشورہ طلب نہ تھی اس کی بھلائی برائی کو کون نہیں جانتا۔

(دوبارہ نہ لکھوانے کے مصالح)

ہاں کتاب معلوم کے لکھوانے میں یہ احتمال تھا کہ کلام اللہ کی نسبت پھر یہ اعتقاد نہ رہے گا۔ جیسا خود فرماتے ہیں وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ جس کا حاصل یہ ہے کہ اتاری ہم نے تیری طرف وہ کتاب جس میں ہر چیز کا بیان ہے ادھر پہلے فرما چکے۔ اِنِّي تَارِكٌ فِيكُمُ الثَّقَلَيْنِ[1] مَا اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا لَنْ تَضِلُّوا بَعْدِي۔

---

[1] حدیث ثقلین مسلم صفحہ ۲۷۹ جلد ۲ میں ہے اس کو تین حضرات تابعین یزید بن حیان۔ حصین بن سبرہ عمر بن مسلم
بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۱ پر

جس کا حاصل یہ ہے کہ میں تم میں کتاب اللہ اور عترت کو چھوڑے جاتا ہوں اگر دونوں کو پکڑے رہو گے تو گمراہ نہ ہو گے۔ سو اب وہ تیسری چیز تھی تو کتاب اللہ کا تبیان لکل شئی ہونا اور یقین کا مایہ ہدایت ہونا دونوں غلط ہو جائیں گے اور اگر انہی دونوں کی تائید تھی تو اب ہی کیا کمی رہ گئی باقی شرح حدیث ثقلین زیادہ مطلوب ہو تو جواب سوم منجملہ جوابات اربعہ مشار الیہا کو ملاحظ فرما دیکھیں۔

بقیہ حاشیہ :- روایت کرتے ہیں۔ اس کی ایک سند ابی حیان عن یزید بن حیان ہے۔ دوسری سند محمد بن فضل عن ابی حیان عن یزید بن حیان۔ تیسری سند جریر عن ابی حیان اور چوتھی سند سعید بن مسروق عن یزید بن حیان ہے۔

یہ حضرت زید بن ارقم رض صحابی کے پاس پہنچتے ہیں حصین بن سبرہ۔ زید بن ارقم رض صحابی سے کہتے ہیں کہ زید آپ نے بہت بھلائی پائی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے آپ سے احادیث سنی ہیں آپ کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے ہیں آپ کی اقتدار میں نمازیں پڑھی ہیں بے شک آپ نے خیر کثیر حاصل کی ہے۔ اے زید آپ ہمیں حضور کی کوئی حدیث سنائیں جو آپ نے حضور سے سُنی ہو۔ زید نے کہا اے بھتیجے بخدا میری عمر زیادہ ہو گئی ہے اور حضور کے ساتھ جو میرا زمانہ تھا وہ پرانا ہو چکا ہے۔ اور بعض باتیں جو میں حضور سے یاد رکھتا تھا وہ بھول گیا ہوں۔ اب میں جو بات بیان کروں اس کو قبول کرو اور جو نہ بیان کروں اس کی مجھے تکلیف نہ دو۔ (اس کا مطلب یہی ہے کہ جو بات مجھے محفوظ ہو گی میں اس کو بیان کروں گا اور جو بات مجھے محفوظ نہ ہو گی میں اس کو بیان نہ کروں گا۔ پھر انہوں نے حدیث ثقلین بیان کی جو انہیں یاد تھی۔ فافہم) پھر حضرت زید رض نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام میں جس کو خم کہتے ہیں کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی وعظ و نصیحت فرمائی پھر آپ نے فرمایا۔ اما بعد اے لوگو بے شک میں انسان ہوں قریب ہے کہ میرے پاس میرے رب کا قاصد آ جائے اور میں اس کی بات کو قبول کر لوں (یعنی عالم آب و گل سے چلا جاؤں) اور میں تمہارے درمیان دو وزنی چیزیں چھوڑ چلا ہوں ان میں سے پہلی چیز اللہ کی کتاب ہے (قرآن کریم) اس میں ہدایت اور نور ہے۔ پس اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑو اللہ تعالیٰ کی کتاب کے بارے میں آپ نے برانگیختہ کیا اور ترغیب دلائی۔ پھر فرمایا (یعنی دوسری وزنی چیز) کہ میں اپنے اہلبیت کے بارے میں تمہیں اللہ تعالیٰ کو یاد دلاتا ہوں یہ بات آپ نے تین مرتبہ فرمائی۔ حصین نے کہا اے زید حضور کے اہل بیت کون ہیں کیا آپ کی بیویاں اہل بیت نہیں زید نے کہا آپ کی بیویاں تو اہل بیت ہیں لیکن آپ کے اہل بیت (باقی ص ۱۱۱)

(حسبنا کتاب اللہ سے حضرت عمرؓ کا مقصد تکلیف کتابت سے بچانا تھا)

اور اگر حضرت عمرؓ کی اس عرض کو کہ حسبنا کتاب اللہ جس کو شیعہ عدول حکمی سمجھتے ہیں ممانعت تکلیف سمجھی جائے اور اہل عقل یہی سمجھتے ہیں تو پھر اعتراض کی یہ بات اور قابل تعریف ہو جائیگی بلکہ جن لوگوں نے آپ کی اس تکلیف کو اور وہ بھی اس شدت مرض میں باوجودیکہ کتاب اللہ

بقیہ حاشیہ - وہ ہیں جن پر آپ کے بعد صدقہ حرام ہے حصین نے کہا وہ کون ہیں؟ زید نے کہا وہ آل علی - آل عقیل آل جعفر آل عباس ہیں۔ حصین نے کہا کیا ان سب پر صدقہ حرام ہے؟ زید نے کہا کہ ہاں - جریر کی روایت میں کتاب اللہ کے بارے میں یہ الفاظ بھی ہیں۔ اس میں ہدایت اور نور ہے۔ جس نے اس سے تمسک کیا وہ ہدایت پر ہوگا اور جو اس سے چوک گیا وہ گمراہ ہوگا۔ اور سعید کی روایت میں یہ بھی ہے کہ سنو! میں تمہارے درمیان دو وزنی چیزیں چھوڑے چلا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب ہے یہ حبل اللہ ہے جس نے اس کا اتباع کیا وہ ہدایت پر ہوگا اور جس نے اس کو ترک کر دیا وہ گمراہی پر ہوگا۔ اور اس روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ہم نے زید بن ارقم سے کہا۔ آپ کے اہل بیت کون ہیں آپ کی ازواج؟ زید نے کہا کہ نہیں۔ بخدا عورت ایک زمانہ تک مرد کے پاس ہوتی ہے پھر مرد اس کو طلاق دے دیتا ہے اور وہ اپنے خاندان اور قوم کی طرف واپس لوٹ جاتی ہے۔ درحقیقت آپ کے اہل بیت آپکے اصل اقرباء اور آپ کا عصبہ ہے جن پر صدقہ حرام ہے، حدیث کا مطلب یہ ہے کہ حصین بن سبرہ وغیرہ کو اصرار تھا کہ آپکے اہل بیت صرف آپ کی ازواج ہی ہیں تو زید نے ان کا انکار کیا کہ نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج بے شک اہل بیت ہیں لیکن اہل بیت صرف یہ ہی نہیں بلکہ آپ کا عصبہ اور خاندان کے لوگ بھی اہل بیت ہیں تم صرف عورتوں میں ہی اہل بیت کو بند کرتے ہو یہ درست نہیں۔ عورتوں کا اہل بیت ہونا تو منفک بھی ہو سکتا ہے۔ اور عصبہ کا اہل بیت ہونا غیر منفک ہے حضور کی نساء تو نص قرآنی سے اہل بیت میں داخل ہیں لیکن اہل بیت ہونا صرف ان میں ہی منحصر نہیں دوسری روایت میں زید کا انکار سائل کے اصرار کے مقابلہ میں ہے جو صرف نساء کے اندر ہی اہل بیت کو منحصر مانتا ہے اب یہ بات کہ موطا کی روایت یا دوسری روایات میں دو وزنی چیزیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا گیا ہے۔ ان میں اور مسلم کی اس روایت میں بظاہر تعارض سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حدیث کی تاویل توجیہ اور اس کا مفہوم معلوم کر لینے کے بعد یہ تعارض نہیں رہتا۔ کتاب اللہ کے ساتھ سنت کا ذکر اور اہل بیت کا ذکر اس میں تعارض نہیں۔ کیونکہ کتاب اللہ کو قانون کی اساسی حیثیت حاصل ہے۔ سنت رسول اللہ دراصل کتاب اللہ کی شرح ہے جیسا کہ امام شافعیؒ امام ابن تیمیہؒ شاہ ولی اللہؒ مولانا گنگوہیؒ اور دیگر محققین محدثین نے بیان کیا ہے باقی صفحہ

موجود اہل بیت موجود کسی اور ہدایت نامہ کی حاجت نہیں گوارا کیا البتہ ان کو کچھ کہا جائے تو کہا جائے پر ہمارا یہ مشرب نہیں ہمارے نزدیک مشورت میں کبھی صحت کبھی غلطی ہوتی رہتی ہے ہاں حضرات شیعہ برا کہیں تو کہیں پر انہیں برا کہیں گے تو حضرت عمرؓ کو بھلا کہنا بھی ذمہ رہے گا۔ ادا کریں تو فبہا ورنہ قیامت کو دیندار رہیں گے۔

باقی حضرت عمرؓ کے حسبنا کہنے سے جس کے یہ معنی ہیں کہ ہمیں کتاب اللہ ہی کافی ہے یہ سمجھ لینا کہ حضرت عمرؓ نے عترت کو جواب دیا یہ بھی طرفہ خوش فہمی ہے اجی صاحب! اگر کوئی میزبان کسی مہمان کے سامنے دو چار روٹیاں رکھ کر اور روٹی لینے جائے اور وہ مہمان یہ کہے کہ بس یہی بہت ہیں تو عاقل کے نزدیک تو اس کے یہی معنی ہیں کہ اور روٹی کی ضرورت نہیں۔ پانی کا انکار اس سے نہیں نکلتا۔ ہاں بیوقوفوں کی زبان اور اصطلاح میں اگر اس کے یہی معنی ہوں تو ہوں اور اگر کسی اور بات پہ یہ ناک منہ چڑھایا جاتا ہے تو اس کو اوّل بیان کریں ورنہ ہمارا کیا قصور؟ بایں ہمہ جواب اجمالی جو اوّل معروض ہو چکا گفتہ ناگفتہ سب اعتراضوں کے بدلے دندان شکنی کے لیے کافی ہے۔

جواب سوال سیزدہم ۱۳

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی حکم عدولی اگر بطور مقابلہ و انکار ہے تو ہمیشہ کے لیے جہنم میں جلنا

بقیہ حاشیہ: اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تو شرح قرآن ہے اس کو معلوم کرنے کے لیے تمام بعد میں آنے والی امت کے لیے خلفاء راشدینؓ اور تمام صحابہ کرامؓ ہیں بالعموم جس پر حدیث علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المہدیین اور ما انا علیہ واصحابی دال ہے لیکن اس کے ذرائع میں سب سے اہم اور قریبی ذریعہ آپکے اہل بیت ہیں۔ جیسا کہ وتر کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کو تمام اہل ارض میں عائشہؓ سے بڑھ کر کوئی جاننے والا نہیں تو اہل بیت کا قرب اور تعلق اور مشاہدہ جو دوسروں سے زیادہ ان کو حاصل تھا اسی بنا پر سنت کا معلوم کرنا بہ نسبت دوسرے لوگوں کی نسبت اہل بیت ہی زیادہ ہیں تو آپکے کسی مقام میں شرح قرآن یعنی سنت کا ذکر کیا ہے اور کسی مقام میں شارحین سنت کا اطلاق کیا ہے یعنی اہل بیت کا، دونوں کا مطلب ایک دوسرے کے ساتھ مطابق ہے اس میں تعارض نہیں ہے اور اسی پر لن یتفرقا کی روایت بھی زیادہ چسپاں معلوم ہوتی ہے کہ قرآن اور شارحین قرآن دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونگے۔ یہاں تک کہ حوض کوثر کی منزل آ جائے یعنی قیامت برپا ہو جائے۔ واللہ اعلم۔ عبدالحمید سواتی عفا اللہ عنہ

ہے ورنہ خدا کو اختیار ہے چاہے بخشے چاہے چھوڑے باقی اس پر سوال سے غرض اصلی جو ہے اس کی جڑ پہلے جواب میں کٹ چکی ہے مکرر تیشہ زنی کا دماغ نہیں۔

جواب ثانی از طرف مولوی عبداللہ صاحب

(اطاعتِ حکم کی کئی صورتیں ہیں)

نبی کو غصہ دلانا بہت برا ہے اور نافرمان کا ماویٰ جہنم ہے۔ مگر ماننا چاہیئے کہ در باب امتثال امر قاعدہ اصول کا یہ ہے کہ جیسا امر ہو ویسا ہی اس کا امتثال کبھی تو امر وجوب کے لیے ہوتا ہے جیسے اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ اور کبھی نہی بصورت امر ہوتی ہے اس کا عدم امتثال بہتر ہے اور کبھی تو امر شفقت رحمت کا ہوتا ہے اس کا بھی امتثال وجوبی نہیں جیسا کہ کھانے میں مکھی گرنے کے باب میں فرمایا فَامْقُلُوْہُ (ڈبو کر پھینک دو) غرضیکہ ایک امر کا دوسرے امر سے بہت فرق ہے اللہ کریم امر فرماتا ہے۔

مَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْیَکْفُرْ ترجمہ (جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر ہو جائے)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا ظاہر ہے کہ یہ الفاظ امر کے ہیں اور مراد امتثال امر نہیں۔ باعتبار صیغہ کے امر اور بدلالت حال کے نہی ہے ——— اور صحابہ کرام رض کو بحکم آیت وشاورھم فی الامر کے حضرت کی خدمت میں اپنی رائے ظاہر کرنے کی اجازت تھی اور بعد ارشاد عرض و تکرار کی گنجائش تھی اس کو کوئی عدول حکمی نہیں کہہ سکتا۔

(حضرت علی رض سے بظاہر کئی دفعہ عدول حکمی ہوئی)

کیونکہ ایسے ایسے خلاف امر تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف بھی نسبت ہو سکتے ہیں اول تو خاص اسی مقدمہ میں لیجیئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے والوں کو عام حکم فرمایا تھا اس میں حضرت علی رض بھی شامل تھے۔ دوسرے رسول اللہ علیہ وسلم کے قول کو مقابلہ قول حضرت عمر رض کے نہ مانا۔

تیسرے لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا لَہٗ بِالْقَوْلِ (بلند نہ کرو اپنی آوازوں کو نبی کی آواز پر اور اس سے بہت چلا کے بات مت کہو) کے کیوں خلاف

کیا وہ تو (بقول شیعہ) معصوم خطا سے تھے نص صریح کا خلاف کیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تہجد کی نماز کے لیے جگایا اور تاکید کی حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے نہ مانا اور یہ فرمایا۔

وَاللّٰہِ مَا نُصَلِّیْ اِلَّا مَا کُتِبَ لَنَا اِنَّمَا اَنْفُسُنَا بِیَدِ اللّٰہِ۔ (نسائی ص ۱۹۳/۱)

قسم ہے اللہ کی ہم تو وہی نماز پڑھیں گے جو اللہ نے ہمارے لیے فرض کی ہے اور ہماری جانیں اللہ ہی کے قبضہ میں ہیں

تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ران مبارک پر ہاتھ مار کر یہ فرمایا کان الانسان اکثر شیء جدلا (آدمی بہت جھگڑالو ہے) اور یہ کہ صلحنامہ حدیبیہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت کے القاب میں لفظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھ دیا تھا کفار کو ناگوار گزرا حضرت نے فرمایا علی رضی اللہ عنہ کو اس کو محو کر دو مکرر سہ کرر فرمایا پر ایک نہ مانی اور یوں کہا وَاللّٰہِ لَا اَمْحُوْکَ اَبَدًا (بخاری ج ۱ ص ۶۱/۲) قسم ہے اللہ کی میں کبھی آپ کا نام محو نہیں کروں گا۔ الامر فوق الادب کو بھی کار نہ فرمایا۔ ناچار ہو کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے محو کیا۔ پس معلوم ہوا کہ انکار و اصرار کسی مصلحت سے ہو بلا تعنت و اعوجاج قلب کے تو کچھ حرج نہیں۔[1]

سوال چہارم دہم ازجانب شیعہ

کبھی پیغمبر خدا نے شیخین کی شان میں کوئی ایسا کلمہ بیان کیا کہ جو ان کی خلافت پر دلیل ہو مثل وصیی وخلیفتی و ولی کل مومن ومومنۃ سید المومنین امام المتقین سید العرب وغیرہ اگر بیان کیا تو مفصل مع پتہ و نشان کے تحریر فرمائیے۔

جواب سوال چہاردہم (شیخین کو خلیفہ ماننے پر نبوی ہدایات)

شیخین کے حق میں یہ لفظ تو نہیں فرمائے کہ وہ میرے وصی یا میرے خلیفہ یا ہر مومن اور مومنہ کے ولی ہیں پر اس سے بڑھ بڑھ کر الفاظ فرمائے ہیں ایک تو یہی فرمایا ہے۔

---

[1] بغیر ضد اور بدنیتی کے ۔ حاصل یہ ہے کہ جب ان مقامات پر تاکید نبوی کے باوجود حضرت علیؓ کی خلاف ورزی کو ہم سب مسلمان ادب اور عشق نبوی پر محمول کرتے ہیں تو اسی طرح قصہ قرطاس میں حضرت عمرؓ کا مشورہ حضورؐ کو بحت تکلیف ہے، قلم دوات لاکر لکھوانے کی تکلیف نہ دو ہمیں کتاب اللہ کافی ہے کو عشق و محبت کا مظہر جاننا چاہیئے۔ اور صلح حدیبیہ کے وقت حضرت عمرؓ کی بے قراری اور بے باکانہ گفتگو کو غیرت ایمانی اور بغض فی اللہ کا مظاہرہ جاننا چاہیئے۔ کیونکہ آپ ۱۵سو مومنین صحابہ کرامؓ کی نمائندگی کر رہے تھے تا آنکہ اللہ نے سب پر تسلی اور اطمینان کی چادر ڈال دی جیسے سورت فتح میں ارشاد ہے۔ هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِہِمْ وہی تو ہے جس نے مومنین کے دلوں میں تسکین نازل فرمائی تاکہ ان کے ایمان کے ساتھ اطمینان کو اور بڑھائے (ترجمہ مقبول ص ۶۱۲) ۱۲ مہر محمد

اِقْتَدُوْا بِالَّذِیْنَ مِنْ بَعْدِیْ اَبِیْ بَکْرٍ وَ عُمَرَ (ترمذی ص۲۰۷ ج۲ ازالۃ الخفاء ص۸۹ ج۱ بحوالہ حاکم) یعنی اقتدا کیجو ان دو شخصوں کا جو میرے بعد ہوں گے ابوبکرؓ اور عمرؓ۔

دوسرے علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الرّاشدین المھدیین من بعدی (ابوداؤد ص۲۸۷ ج۲ ترمذی ص۹۲ ج۲) یعنی میری سنت اور میرے خلفاء راشدین کی سنت کے اتباع کو لازم سمجھنا۔

بایں ہمہ یہ بھی فرمایا کہ آسمان میں تو میرے وزیر جبریل و میکائیل اور زمین میں ابوبکر اور عمر علیٰ ہذا القیاس یہ بھی ارشاد ہے کہ جوانانِ جنت کے سردار تو حسنین ہیں اور زیادہ عمر والوں کے سردار ابوبکر اور عمرؓ ہیں۔ باقی آیات سے جو حضرت ابوبکرؓ کی افضلیت ثابت ہے وہ علاوہ رہی اب آپ کلام اللہ اور حدیث کو تو لیے پھر یہ بولیے کہ یہ ارشاد جو خلفاء راشدین کے حق میں فرمائے ہیں (مقصد استخلاف میں) زیادہ ہیں یا ولی کل مؤمن۔

اسے تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اولیاء اللہ خدا کے دوستوں کو کہتے ہیں خدا کے حاکموں کو نہیں کہتے ہم بھی حضرت (علیؓ) کو تمام اہل ایمان کا دوست اور محبوب سمجھتے ہیں چنانچہ بخاری وغیرہ اور صحاح میں ایسی حدیثیں موجود ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ سوا مومن حضرت علیؓ سے کوئی محبت نہ کرے گا اور سوا منافق کوئی ان سے بغض نہ رکھیگا۔ سو بفضلہٖ تعالیٰ یہ دولت نصیب اہل سنت ہو ہی رہی ہے۔

(حضرت علیؓ سے شیعہ کی محبت نصاریٰ جیسی ہے)

شیعہ کی محبت ان سے ایسی ہے جیسے نصرانیوں کو حضرت (عیسیٰ علیہ السلام) سے محبت۔ کون کہہ دے گا کہ نصرانیوں کو حضرت عیسیٰ سے محبت ہے ہاں اپنے خیال سے محبت ہے۔ البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام (معاذ اللہ) خدا کے بیٹے ہوتے تو پھر یہ محبت ان کے ساتھ (درست) ہوتی۔ اب تو قصہ ایسا ہے جیسے اندھیرے میں کوئی شخص غیر کے لڑکے کو اپنا فرزند سمجھ کر گود میں اٹھا کر چومے چاٹے بیٹا بیٹا کہے اور پھر چاندنا ہو تو پہچان کر گود سے پٹک دے ایسے ہی نصرانی اور شیعہ اس ظلمتکدہ جہل میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت علیؓ کو کچھ کا کچھ سمجھ کر عجز و نیاز کرتے ہیں بروزِ حشر موافق ارشاد فیض بنیاد فَکَشَفْنَا عَنْکَ غِطَاءَکَ فَبَصَرُکَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ ؕ (ترجمہ) جس کے معنی یہ ہیں کہ دور کر دیا ہم نے پردہ تیرا سو آج تیری آنکھ بہت تیز ہے۔ یہ پردہ جہل مرکب اٹھایا

جائیگا۔ اس روز معلوم ہو گا کہ نہ حضرت علی رضؓ ایسے امام تھے جیسے شیعہ کہتے ہیں کہ وحی آتی تھی اور نسخ احکام کا اختیار تھا نہ ان کو علم غیب تھا جیسے حضرات شیعہ کہتے ہیں۔ نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی اور خلیفہ بلافصل تھے۔ علی ہذا القیاس۔

(حضرت علی رضؓ کی صفات بعقائد شیعہ قرآن وسنت میں نہیں)

باقی امام کا قرآن میں مسطور و مذکور نہ ہونا اور علم غیب کا نہ ہونا تو کلام اللہ ہی میں صاف صاف مذکور ہے چنانچہ بشہادت جملہ خاتم النبیین اور آیت

قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ (ترجمہ: آپ فرمایئے کوئی بھی غیب نہیں جانتا جو آسمان و زمین میں ہے سوائے اللہ کے)

جوابات اربعہ[1] مشار الیہا میں مذکور ہو چکا۔

غرض ولی کل مومن و مومنۃ وغیرہ الفاظ سے تو یہ مطلب نکالنا ایسا ہے جیسا کسی نے ہجوں سے اپنا نام بتایا تھا۔ عین فے زبر عف عین فے زبر عف، میرا نام محمد یوسف"۔ باقی لفظ وصی اور خلیفتی سنیوں کی کتاب میں اور کسی روایت میں نہیں پھر کاہے کے لیے تین پانچ کی جاتی ہیں بایں ہمہ اگر ثابت بھی ہو تو وصی کے یہ معنی ہوں گے کہ آپ کو کوئی وصیت کی ہو گی۔ دم وفات اکثر آدمی اپنوں بیگانوں کو وصیت کر جاتے ہیں پر اتنی بات سے وہ خلیفہ نہیں بن جاتے ہم بھی کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے درباره تجہیز و تکفین۔ مراعات ازواج مطہرات رضؓ کے وصیت کی ہو گی جن میں سے یہ بھی ہو کہ تم مستحق خلافت نہیں۔

چنانچہ امام جلال الدین سیوطی نے امام احمد یا کسی اور امام کی تخریج سے یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضؓ سے یہ ارشاد فرمایا کہ تمہارے لیے (میں نے) تین دفعہ یہ عرض کیا کہ علی رضؓ سب میں مقدم رہیں پر عرض منظور نہ ہوئی باقی نام کتاب ہی تعین مطلوب ہو تو

---

[1] یعنی کتاب ہذا کا حصہ دوم۔ ۱۲ مہر محمد

انتباہ المومنین[1] دیوبند میں بہت ہیں مطالعہ کر کے نام کتاب دریافت کرلیں۔ مجھ کو اس وقت یاد نہیں پہ یہ یاد ہے کہ وہ حدیث صحیح ہے۔

رہی یہ بات کہ دعا قبول نہ ہوئی سو اس میں کچھ قباحت نہیں اور بھی بعض مواقع میں ایسا ہوا۔ چنانچہ امت کی خانہ جنگیوں کے نہ ہونے کی استدعا مقبول نہ ہوئی بخاری وغیرہ معتبر کتابوں میں موجود ہے۔ معہذا نبی[2] بندہ خدا ہوتا ہے خدا کا حاکم نہیں ہوتا اگر کوئی استدعا قبول نہ ہو تو کیا حرج ہے بلکہ یہ نہ ہو تو پھر امتیوں کا ان کی طرف اور گمان ہونے لگے اس لیے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا بیٹے کے حق میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا باپ کے حق میں مقبول نہ ہوئی۔ کلام اللہ موجود ہے علیٰ ہذا القیاس۔

(حضرت علیؓ کی وصایت[2] و خلافت کا مطلب)

خلیفہ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ میرے بعد ہی متصل تم خلیفہ ہو بلکہ اول تو یہ ارشاد آئینہ خلافت خاصہ ہے یعنی جب آپ غزوہ تبوک میں تشریف لے گئے اور حضرت علیؓ کو گھر پہ چھوڑ گئے سو یہ گھر کی خلافت تھی نماز تک بھی آپ کے سپرد نہ تھی جماعت عبداللہ بن ام کلثومؓ ہی کراتے تھے۔ دوسرے اگر خلافت عامہ ہی مراد ہے تو پھر کیا آپ بھی اس وقت میں خلیفہ ہوئے؟ اور اس وقت میں غرض یہ ہوگی کہ میرے اقارب میں تم ہی خلیفہ ہو گے[3] حضرت عباس یا حضرت عقیلؓ یا حضرت

---

[1] یہ حضرت حجۃ الاسلام بانیِ دارالعلوم دیوبند علامہ محمد قاسم نانوتوی کی اپنی تصنیف ہے [2] چنانچہ ایسی وصیت و خلافت شیعہ کے خاتم المحدثین ملا باقر علی مجلسی نے حیات القلوب ج۲ ص۶۸۲ اور جلاء العیون ص۵۹ پر بایں الفاظ نقل کی ہے۔ کلینی ابن بابویہ، شیخ طوسی، شیخ مفید اور دیگر سنی و شیعہ محدثین نے معتبر سندوں سے حضرت امام زین العابدین، امام محمد باقر اور امام جعفر صادق سے روایت کی ہے کہ اپنی وفات کے وقت حضور نے اپنے چچا عباسؓ سے فرمایا کہ اے چچا میرے اہل خانہ اور بیویوں کے متعلق میری وصیت قبول کرو میری میراث لو میرا قرض ادا کرو اور میرے وعدوں پر عمل پیرا ہو اور مجھے سبکدوش کرو۔ حضرت عباسؓ نے کہا اے رسول اللہ میں بوڑھا بال بچے دار ہوں آپ آندھی اور ابر بہاری سے زیادہ سخی تھے میرا مال پورا نہ ہوگا۔ پھر علیؓ کو بلا کر فرمایا اے علی تو میری میراث لے تیرے ساتھ کسی کا جھگڑا نہ ہوگا میری وصیت مان تو میرے وعدوں پر عمل کر میرے قرضے ادا کر یا علی خلیفہ من باش در اہل من و تبلیغ رسالت من بعد از من بمردم بکن۔ کہ اے علی میرے گھر والوں پہ میرے خلیفہ بنو اور میرا پیغام (وصیت) بھی لوگوں تک پہنچاؤ۔ ۱۲ مہر محمد

عبداللہ بن عباس نہ ہوں گے باقی رہے الفاظ باقیہ سید المومنین امام المتقین۔ سید العرب وغیرہ نہ کسی صحیح روایت میں ہے نہ ضعیف میں یہ مفتریان مذہب شیعہ کی تراشی ہوئی باتیں ہیں۔

جواب ثانی از جانب مولوی عبداللہ صاحب

(حضرت ابوبکر و عمر رض کی مؤید خلافت احادیث)

سبحان اللہ آنکھیں کھولو ہوش میں آؤ صدہا احادیث جو ان الفاظ سے بڑھ چڑھ کر ہیں بیان فرمائی ہیں ایسے تو غافل مت بنو سوال کے جواب میں بھی اس قسم کی احادیث بہت کچھ بیان کردی ہیں پر اور بھی لیجئے یہ امر تو نہایت ظاہر و باہر ہے اس میں شبہ کرنا بعینہ اپنے آپ کو بھول جانا ہے۔

حدیث نمبر ۱

عَنْ اَبِي سَعِيْدِنِ الْخُدْرِيِّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَا مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا وَلَهٗ وَزِيْرَانِ مِنْ اَهْلِ السَّمَاءِ وَوَزِيْرَانِ مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ فَاَمَّا وَزِيْرَايَ مِنْ اَهْلِ السَّمَاءِ فَجِبْرَئِيْلُ وَمِيْكَائِيْلُ وَاَمَّا وَزِيْرَايَ مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ فَاَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ

(ترمذی ص ۲۰۸ ج ۲)

ترجمہ:۔ ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نبی ہوتا ہے اس کے دو وزیر آسمان والوں میں سے ہوتے ہیں اور دو وزیر زمین والوں میں سے لیکن میرے دو وزیر آسمان والوں میں سے جبرئیل اور میکائیل ہیں اور زمین والوں میں سے ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔

(حدیث نمبر ۲)

اَخْرَجَ الْبَزَّارُ وَالْحَاكِمُ عَنْ اَبِي اَرْوَى الدَّوْسِيِّ قَالَ كُنْتُ جَالِسًا عِنْدَ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم فَاطَّلَعَ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ رضی اللہ عنہما فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَيَّدَنِيْ بِهِمَا۔

(ازالۃ الخفاء ص ۹۳ ج ۱ بحوالہ حاکم)

ترجمہ:۔ روایت ہے ابو اروی دوسی سے کہا تھا میں بیٹھا ہوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو ابوبکر رض اور عمر رض آئے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے میری مدد کی ان دونوں کے ساتھ۔

(حدیث نمبر ۳)

عَنْ حُذَيْفَةَ الْيَمَانِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم يَقُولُ لَقَدْ هَمَمْتُ اَنْ اَبْعَثَ اِلَى الْاٰفَاقِ رِجَالًا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السُّنَنَ وَالْفَرَائِضَ كَمَا بَعَثَ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ الْحَوَارِيِّيْنَ قِيْلَ لَهٗ فَاَيْنَ اَنْتَ عَنْ اَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ قَالَ اِنَّهٗ لَا غِنٰى لِيْ عَنْهُمَا اِنَّهُمَا مِنَ الدِّيْنِ كَالسَّمْعِ وَالْبَصَرِ

(ازالۃ الخفا ص ۸۹ ج ۱ بحوالہ حاکم)

اور حذیفہ بن الیمانؓ سے روایت ہے کہ سنا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے تھے میں نے قصد کیا اس بات کا کہ آدمیوں کو اطراف و جوانب میں بھیجوں تاکہ وہ سنتیں اور فرض لوگوں کو سکھلائیں جیسا حضرت عیسیٰ بن مریم نے حواریین کو بھیجا تھا۔ کیا آپ کا ابوبکر اور عمر سے کیا حال ہے فرمایا مجھ کو ان دونوں سے بے پروائی نہیں یہ دونوں دین میں مثل کان اور آنکھ کے ہیں۔

(حدیث نمبر ۴)

اَخْرَجَ التِّرْمِذِيُّ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم مَا لِاَحَدٍ عِنْدَنَا يَدٌ اِلَّا وَقَدْ كَافَيْنَاهُ مَا خَلَا اَبِيْ بَكْرٍ فَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا يَدًا يُكَافِيْهِ اللّٰهُ بِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمَا نَفَعَنِيْ مَالُ اَحَدٍ قَطُّ مَا نَفَعَنِيْ مَالُ اَبِيْ بَكْرٍ (ترمذی ص ۲۰۷ ج ۲)

ترجمہ:۔ اور روایت ہے ابوہریرہؓ سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی کا ہم پر احسان ہے ہم نے اس کا بدلہ (ادا) کر دیا ہے سوا ابوبکرؓ کے کیونکہ اس کا ہم پر احسان ہے (کہ) اللہ قیامت کو اس کو بدلا دیگا اور کسی کے مال نے مجھ کو ایسا نفع نہیں دیا جیسا ابوبکرؓ کے مال نے نفع دیا ہے۔

(حدیث نمبر ۵)

وَعَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللّٰه علیه وسلم قَالَ اللّٰهُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِاَحَبِّ هٰذَيْنِ الرَّجُلَيْنِ اِلَيْكَ بِاَبِيْ جَهْلٍ اَوْ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ قَالَ وَكَانَ اَحَبَّهُمَا اِلَيْهِ عُمَرُ

(ترمذی ص ۲۰۹ ج ۲)

اور ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اے اللہ عزت دے اسلام کو ساتھ اس کے جو زیادہ محبوب ہے تجھ کو ان دونوں میں سے ابوجہل کے ساتھ یا عمر بن الخطاب کے ساتھ فرمایا عمرؓ زیادہ عزیز تھے اللہ کو ان دونوں میں۔

(فائدہ اور موازنہ)

جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنون و مشکور ہونا حضرت ابوبکرؓ کا اور عزت دینا اسلام

کا حضرت عمرؓ سے اور حضرت ابوبکر و عمرؓ کو رضی اللہ عنہما انہما من الدین کالسمع والبصر فرمایا

اور زمین والوں میں دو وزیر فرمایا۔ خلیفتی و وصی وغیرہ فلک کے الفاظ معدودے کیا کچھ کم

ہیں ؟ اور ان الفاظ کا پتہ تو فرمایئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیرالمومنین کے حق

میں یہ الفاظ کب فرمائے اگر سنیوں کی کتابوں میں ہیں تو اطلاع فرمایئے کہ ہم مشکور ہوں اور جب

اہل سنت کے نزدیک سرے سے ثبوت خلافت کے لیے حاجت نص نہیں تو ایسے الفاظ

سے سوال کرنا بے حاصل ہے ثَبِّتِ الْعَرْشَ ثُمَّ النَّقْشَ (پہلے تختہ قائم کرو پھر نقش و نگار کھینچو)

سوال پانزدہم[15] از جانب شیعہ

کبھی شیخین نے مثل حضرت علیؓ کے یہ دعوےٰ کیا کہ میں وصی رسول اللہ ہوں اگر کہا ہو تو

بیان کیجیے۔

جواب سوال پانزدہم۔

نہ حضرت علیؓ نے کبھی وصی ہونے کا دعویٰ کیا نہ شیخین نے، اور کرتے بھی تو کس بھروسے

پر کرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو وصی کیا ہی نہ تھا ہاں ابوبکر صدیق کو یوں سمجھ کر کہ

میرے بعد خلیفہ ہوں گے اپنے ترکہ کا جمع خرچ بتلا گئے تھے یعنی یہ ارشاد فرما گئے۔

رہی اس کی صحت تو نسخہ ھدیۃ الشیعہ کو مطالعہ فرمائیں۔ بسط سے بحث کو لکھا ہے کہ قیامت

تک انشاء اللہ جواب نہ آئے گا ہاں ویسا جواب جیسا جاٹ نے دیا تھا کہ تیرے سر پہ کولہو"

اگر دیں تو دیں۔

لہ وصی اس شخص کو کہتے ہیں جسے مرنے والا آخری وقت بندوبست وغیرہ کے متعلق اہم باتیں بتا کر جائے۔ اس لحاظ سے حضرت ابوبکر

صدیقؓ کا وصی رسول ہونا کتب شیعہ سے ثابت ہے مثلاً جلاء العیون کشف الغمہ وغیرہ میں روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض کی سنگینی

میں حضرت ابوبکرؓ حضور علیہ السلام کے پاس آئے۔ تو منجملہ اور باتوں کے پوچھا آپ کو غسل کون دے گا؟ فرمایا میرے اہل خانہ کا قریب ترین آدمی۔

پوچھا آپ کو کن کپڑوں میں دفن کریں؟ فرمایا انہی پہنے ہوئے کپڑوں میں یا مصری سوٹ میں یا مصر کے بنے ہوئے سفید کپڑوں میں پوچھا آپ پر نماز

جنازہ کیسے پڑھیں اس وقت لوگ شدت غم سے چلا کر رونے لگے تب آپ نے فرمایا صبر کرو خدا تمہیں معاف کرے (جلاء العیون ص ۶۹) ۱۲ مہ محمد

جواب ثانی از مولوی عبد اللہ صاحب

(وصی ہونے کا دعویٰ حضرت علیؓ نے نہیں کیا)

چونکہ شیخین کی شان میں خاص لفظ وصی نہیں آیا وہ کیوں جھوٹا دعویٰ کرتے مگر یہ فرمایئے کہ امیر المومنین کرم اللہ وجہہ نے یہ دعوےٰ کب کیا اور جو کچھ اس کا ثبوت ہو کتب معتبرہ سنیہ سے بیان فرمایئے اگر بالفرض حضرت علیؓ وصی تھے تو ان کو کیا وصیت تھی اگر بعد حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلافت کی وصیت تھی تو بعد انتقال سید الاصفیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) کے کیوں نہ اظہار وصیت کیا اور وصیت کو شاہد گزار کر کیوں اتمام حجت نہ کی اگر یہ ہوتا تو خلیفہ اوّل ہو جاتے باوجودیکہ ان کو اسد اللہ الغالب کا خطاب تھا اور ان کے ذوالفقار کے وار کی ہفت زمین کو تاب نہ تھی ان کو کس بات کا خوف تھا آیت ..

لَنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا (پ) اور اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (پ)

ترجمہ: جو اللہ نے ہمارے واسطے لکھ دیا ہے ہم کو اس کے سوا اور کچھ نہ پہنچے گا اور جب وقت ان کا آجاتا ہے تو ایک ساعۃ تاخیر اور تقدیم اس سے نہیں کر سکتے۔

کی آپ کو یاد نہیں جو ہر قسم کے ضرر سے بےخوف کرتی ہے۔

اور تائید دین میں کلفت و مشقت اٹھانا انبیاء اور ان کے خلفاء کی خوب اختیار رہا کرتی ہے اور شیعوں کے مسلمات کے بموجب؟ کہ وہ عالم ما کان و ما یکون تھے اور اپنی موت و حیات باختیار خود ہونا علاوہ بریں ہے۔ بایں ہمہ خلفاء ثلاثہ سے درباب خلافت کیوں مخاصمت نہ کی اگر ان کو وصی خلافت بامر خدا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا تو اس کی طلب میں مداہنت کرنے سے گنہگار ہوئے۔

اور عذر تقیہ کی یہاں گنجائش نہیں کیونکہ مقصود اتمام حجت ہے اگر وصیت درباب امر خلافت نہ تھی بلکہ مثل قربانی ذبح کرنے کے یا ایسے ہی امور دنیاوی کی وصیت تھی تو سنیوں پر کیا الزام ہے۔

سوال شانزدہم[16] از جانب شیعہ

امامت اور خلافت کی کیا شرط ہے یعنی وہ امور کون کون ہیں جو خلیفہ اور امام میں ضرور ہونے چاہئیں سوائے اکٹھا ہونے آدمیوں کے۔

جواب سوال شانزدہم (خلافت کے لیے تین اہم اوصاف)

نبی میں تین باتیں ضرور ہیں۔

ایک تو یہ کہ دنیا کی ذرہ بھر محبت اس کے دل میں نہ ہو ہاں خدا کی محبت سے اس کا دل لبریز ہو۔ دوسرے بلند ہمت اولوالعزم ہو۔ تیسرے علم ہدایت میں یکتا ہو۔

اوّل کی ضرورت تو اس لیے ہے کہ راز دار خدا بے اسباب کے نہیں ہو سکتا سو اس بات میں حضرت ابوبکرؓ و بشہادت حدیث مشکوٰۃ جس کی شرح میں رسالہ انتباہ المومنین اس ہیچمدان نے لکھا ہے یکتائے روزگار تھے۔ دوسرے وصف کی ضرورت بایں غرض ہے کہ جہان سے مقابلہ ہو گا اگر کم ہمت بزدل ہو گا تو کیا کام چلے گا۔ اس میں حضرت عمرؓ یگانہ آفاق تھے۔ تیسری بات کی ضرورت کی یہ وجہ ہے کہ یہ نہ ہو تو پھر ہدایت ہی کیا ہو گی اس میں حضرت علیؓ کا قدم آگے بڑھا ہوا تھا غرض امور ثلثہ نبی میں ضروری ہیں جو ان کا خلیفہ ہو اس میں یہی باتیں مدنظر ہوں گی ورنہ پھر خلافت نہیں ناخلفی ہے۔ باقی مضامین متعلقہ حدیث مذکور جو اس جواب کے قابل تھے بنظر اختصار اور نیز بایں نظر کہ سائل اس سے زیادہ پوچھتا ہی نہیں کہ ان لوگوں میں بھی یہ وصف تھی کہ نہیں۔ ادھر رسالہ انتباہ المومنین میں تفصیل تمام مرقوم ہو چکی ہیں دیکھ لو

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

(فقہ کی روشنی میں امامت کے شرائط) فقہ کی کتابوں میں ہے

اَلْاِمَامَۃُ ھِیَ صُغْرٰی وَکُبْرٰی فَالْکُبْرٰی اِسْتِحْقَاقُ تَصَرُّفٍ عَامٍّ عَلَی الْاَنَامِ وَتَحْقِیْقُہٗ فِیْ عِلْمِ الْکَلَامِ وَنَصْبُہٗ اَھَمُّ الْوَاجِبَاتِ

ترجمہ۔ (امامت کی دو قسمیں ہیں صغری اور کبری، امامت کبریٰ مستحق ہونا تصرف عام کا خلقت پر اور تحقیق اس کی علم کلام میں ہے اور اقامت اس کی اہم واجبات

فلذا قدموہ علی دفن صاحب المعجزات
ویشترط کونہ مسلما حرا ذکرا عاقلا بالغا
قادرا قرشیا لا ھاشمیا علویا معصوما
قولہ لا ھاشمیا الخ ای لا یشترط کونہ
ھاشمیا ای من اولاد ھاشم بن عبد مناف
کما قالت الشیعۃ نفیا لامامۃ ابی بکر
وعمر وعثمان رضی اللہ تعالی عنھم ۔
(ولا شبھۃ لھم فضلا عن الحجۃ)
وقولہ علویا ای لا یشترط کونہ من
اولاد علی بن ابی طالب کما قال بہ
بعض الشیعۃ نفیا لخلافۃ بنی العباس
وقولہ معصوما ای لا یشترط ان یکون
معصوما کما قالت الاسماعیلیۃ
والاثنا عشریۃ ای الامامیۃ ۔
من طحطاوی

میں سے ہے اس لیے مقدم کیا اس کو (صحابہ کرامؓ) نے
دفن صاحب معجزات پر اور شرط ہے امام کا مسلمان ہونا ۔
آزاد ۔ مرد عاقل بالغ قدرت رکھنے والا ۔ قبیلہ قریش
سے ہونا ۔ ہاشمی علوی اور معصوم ہونا شرط نہیں ۔
لا ہاشمیاً یعنی شرط نہیں ہے اولاد ہاشم سے ہونا
جیسے شیعہ کہتے ہیں بسبب باطل کرنے امامت
حضرت ابوبکرؓ کے اور عمرؓ کے اور عثمانؓ کے اور ان کو
(دلیل کا) شبہ بھی نہیں حجت ہونا تو درکنار ۔ لا علویاً
یعنی شرط نہیں ہے ہونا امام کا اولاد علی بن ابی طالب
سے جیسا شیعہ کہتے ہیں بسبب باطل کرنے خلافت
بنی عباس کے اور معصوماً یعنی شرط نہیں ہے
امام کا معصوم ہونا جیسا اسماعیلیہ اور امامیہ کہتے
ہیں ۔ نقل ہے اس کی طحطاوی سے
(مذکورہ بالا حوالہ طحطاوی کے علاوہ فتاوی شامی ص ۵۱۲ طبع مصر
میں بھی بعض تغیر کے ساتھ مذکور ہے)

(۱۲ ۔ مہر محمد)

(لاینال عھدی الظالمین سے شیعہ استدلال عصمت کا رد)

یہ جو بعض کم فہم معصومیت امام کی لاینال عھدی الظالمین سے کہتے ہیں قرآن کے مذاق
سے غافل ہیں کیونکہ جملہ لاینال عھدی الظالمین (میرے عہد کو ظالم نہیں پائیں گے) لفظاً خبر
ہے اور معنیً امر جیسے فان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین (اگر تم میں
بیس صابر ہوں دو سو پر غالب ہوں گے) معنی اس کے یہ ہیں کہ جو ظالم ہو اس کو عہدہ امامت نہ پہنچے گا ۔
یعنی وہ اس بات کے قابل نہیں کہ وہ متولی امور خلق اللہ بنایا جاوے ۔ اور آیت ....

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یَعْبُدُوْنَنِیْ لَا یُشْرِكُوْنَ بِیْ شَیْــٴًـا (نور ع ۷)

اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور عمل اچھے کیے کہ ان کو زمین کا خلیفہ بنا دیگا جیسے خلیفہ بنایا ان لوگوں کو جو ان سے پہلے تھے اور برقرار کر دیگا ان کے واسطے ان کا وہ دین جو ان کیلئے پسند کیا ہے اور البتہ بدل دیگا ان کے لیے بعد ان کے خوف کے امن اللہ کی عبادت کریں گے کسی کو میرا شریک نہیں کریں گے۔

اس کے ساتھ ملانے سے یہ ثابت ہوا کہ جب خلفائے ثلاثہ رضہ کو عہد امامت پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ ظالم نہ تھے بلکہ وہ عادل تھے۔

سوال ہفدہم از جانب شیعہ

وہ پوری پوری شرائط حضرت علی رضہ میں موجود تھیں یا شیخین میں۔

جواب سوال ہفدہم کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ شرائط مذکورہ حضرت علی رضہ میں بھی موجود تھیں اور شیخین رضہ میں بھی، یہ ایسا فرق تھا جیسے ملا محمود بھی عالم اور مولانا محمد یعقوب بھی عالم پر مولانا محمد یعقوب صاحب ان سے زیادہ عالم اور کامل ہیں اسی واسطے شیخین رضہ کو اول خلیفہ کیا حضرت (علی رضہ) کو بعد میں پھر اس میں یہ بھی عمدگی نکل آئی کہ سب کے سب خلیفہ بھی ہو گئے اگر پہلے حضرت علی رضہ ہی کو خلیفہ کرتے تو جو جو ان سے زیادہ مستحق تھے محروم رہ جاتے رہی وجہ تقدیم اور تاخیر شوق ہو تو رسالہ انتباہ المومنین بغور و انصاف دیکھیں سمجھ میں نہ آئے تو شرم نہ کریں کسی ذی استعداد عالم سے پڑھ لیں اگر انصاف اور فہم ہو گا تو انشاء اللہ اطمینان ہو جائے گا۔ ورنہ ہم تو کس شمار میں ہیں خدا اور رسول کے کلام سے بھی ایسوں کو تو اثر نہیں ہوا۔

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

وہ شرائط شیخین رضہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر صحابہ رضہ میں پوری پوری موجود تھیں پر چونکہ اجماع

حل و عقد کا لبسبب دلالت آیات اور احادیث مذکورۃ الصدور کے اولاً حضرت ابوبکرؓ کی خلافت پر ہو گیا اس لیے وہ خلیفہ اوّل ہوئے۔ اور افضلیت ابوبکر صدیق رضؓ کی مسئلہ دوسرا ہے کہ اس کا ثبوت بھی اجماع سے ہے ثبوت خلافت میں اس کا کچھ دخل نہیں بوقت تقرر اس امر کے سب صحابہؓ نے ان کو افضل پایا لیکن معصومیت امام کی کہیں سے ثابت نہیں ہوتی چنانچہ نہج البلاغہ میں جو معتبرات امامیہ سے ہے نص صریح حضرت امیر المومنین سے موجود ہے۔

لَابُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِيْرٍ بَرًّا اَوْ فَاجِرًا الخ فقط — آدمیوں کے واسطے امیر لازم ہے نیک ہو یا بد۔

سوال ہژدہم[18] از جانب شیعہ

حجۃ الوداع اور غدیر کے دن صحابہ کرامؓ کو پیغمبر نے یہ ہدایت کی یا نہیں کہ میرے بعد تم قرآن اور میری عترت کی پیروی کرنا۔

جواب :۔ یہ تو معلوم نہیں کہ آپ نے یہ ارشاد بھی اسی روز فرمایا ہے پر اس میں شک نہیں کہ یہ فرمایا اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔ شعر ؎

تمہیں ہو قبلہ و کعبہ ہمارے دین و دنیا میں — اگر تم سے پھریں حق سے پھریں اور انکے فرماں سے

پر مشفق من سمجھ کا پھیر ہے اگر ہر کوئی ایسی باتوں کو سمجھ لیا کرتا تو اہل فہم کی کیا قدر رہ جاتی منجملہ جوابات اربعہ مشار الیہا ایک جواب خاص اسی حدیث کی شرح میں ہے آپ دیکھیں گے تو انشاء اللہ محظوظ ہی ہوں گے۔ ہاں انصاف اور سینہ صاف کی ضرورت ہے

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

(حدیث ثقلین میں تمسک عترت سے مراد اُن کی محبت ہے۔)

یہ حدیث جو مذکور ہوئی بنام حدیث ثقلین مذکور ہے اور اس میں لفظ تمسک واقع ہوا ہے ان تمسکتم بھما۔ اور تمسک بالقرآن تفسیر فرمایا ہے اتباع کے ساتھ۔ اور تمسک بعترت کو تفسیر کیا ہے محبت و الفت کے ساتھ جو شخص تمام اس حدیث اور وجہ اس کے فرمانے کی ملاحظہ کریگا اس کو بخوبی واضح ہو جائے گا کہ اس حدیث سے حکم اتباع کلام مجید کا اور تعظیم و محبت اہل بیت کی

ثابت ہوتی ہے خلیفہ بنانے سے اور وہ بھی کہ بعد وفات متصل ہوں اس مسئلہ کو اس حدیث سے لگاؤ بھی نہیں۔

اور اس حدیث سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دوستی کا حکم اور دشمنی کی نہی نکلتی ہے فعلی الرأس والعین۔ لیکن ایسے الفاظ تنہا کچھ حضرت علیؓ ہی کے واسطے ثابت نہیں بلکہ حضرت عباسؓ اور ان کی اولاد کے حق میں اور ازواج مطہراتؓ اور حضرت فاطمہؓ کے وارد ہوئی ہیں اور نیز حضرت ابوبکرؓ کی بھی شان میں وارد ہوئی ہیں۔

عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ فِیْ قِصَّۃِ مُشَاجَرَۃٍ مَعَہٗ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم اِنَّ اللہَ بَعَثَنِیْ اِلَیْکُمْ فَقُلْتُمْ کَذَبْتَ وَقَالَ اَبُوْبَکْرٍ صَدَقَ وَوَاسَانِیْ بِنَفْسِہٖ وَمَالِہٖ فَہَلْ تَارِکُوْا لِیْ صَاحِبِیْ (بخاری ۱۴۹)

ترجمہ:۔ ابوالدرداء سے روایت ہے کہا فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ نے مجھ کو تمہاری طرف بھیجا تم نے کہا جھوٹا ہے اور ابوبکرؓ نے کہا سچا ہے اور میری مدد کی اپنے جان و مال سے پس چھوڑ دو تم میرے لیے میرے ساتھی کو۔

اور شیعہ کے نزدیک بھی اتباع عترت سے یہ مراد نہیں۔ کہ نعوذ باللہ اگر عترت مُضل و گمراہ ہو تو بھی اطاعت کرو غرضیکہ عترت کی اطاعت مادامیکہ وہ مطیع کلام اللہ و سنت رسول اللہ ہوں ضرور ہے۔

اب جاننا چاہیے کہ اہل سنت و جماعت تمام اہل بیت کے بہزار دل و جان محبت و تعظیم کرنے والے ہیں جتنی محبت اہل بیت کی ہو سکے فخر و عزت ہے غرضیکہ وہ کسی کے اہل بیت میں سے منکر نہیں جیسا کہ حضرات شیعہ ماسوا بارہ اماموں کے اکثر عترت کو برائی سے یاد کر کے مخالف اس حدیث کے ہو گئے ہیں اور قرآن شریف کے باب میں جو کچھ ان صاحبوں نے کہا ہے قابل ذکر نہیں کوئی بیاض عثمانی کہتا ہے کوئی کمی بیشی تبدیل و تحریف کا قائل ہے۔ لایاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ (قرآن میں باطل نہ آگے سے آ سکتا ہے نہ پیچھے سے) کو باور نہیں رکھتے۔ تعجب ہے کہ قرآن کو امام مہدی کے ساتھ کہتے ہیں اور حدیث ثقلین کے الفاظ کو دھیان نہیں کرتے۔

سوال نوزدہم از جانب شیعہ

بعد انتقال پیغمبر خدا کے صحابہ اور نیز اس زمانہ میں اہل سنت اس حکم کے پابند ہیں یا نہیں

جواب سوال نوزدہم ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے لے کر آج تک اہل سنت اس حکم کے غلام ہیں ہاں شیعہ نہیں یہی وجہ ہے کہ نہ کلام اللہ کی سنتے ہیں اور نہ اہل بیت کے فیوض باطنی سے بہرہ ور ہیں یہ دولت بحمد اللہ نصیب اہل سنت ہوئی قرآن اور اہل بیت دونوں سے اپنی اپنی قسم کا فیض لیا اور دونوں کو ہاتھ سے نہ چھوڑا چونکہ تفصیل اس اجمال کی جواب سوال سوم مشار الیہا میں مرقوم ہے مکرر لکھنے کی حاجت نہیں۔

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

(صحابہ اہل سنت متمسک بالقرآن اور محب اہل بیت ہیں)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تمسک بالقرآن تو ایسا ظاہر ہے کہ اس میں کسی کو جائے شک نہیں۔ جمع قرآن شریف اور پھیلانا اس کا اور تلاوت کا عمدہ انتظام اور تعلیم قرآن کے تمام اسباب صحابہ کے مقرر فرمائے ہوئے ہیں اور اسی پر آج تک اہل سنت قائم ہیں چنانچہ لاکھوں حافظ قرآن اور ہزاروں قاری اس زمانہ آخری تک میں کہ انتہائی کوتاہی کا (زمانہ) ہے موجود (ہیں)۔ اور تمسک بالعترت کا حال یہ ہے کہ خدمت ازواج مطہرات اور اولاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رشتہ داروں کی تعظیم و تکریم ۔ اور توسل ان کے ساتھ اپنی دعاؤں میں اور درود بھیجنا ان پر اپنی نمازوں میں زمانہ صحابہ میں معمول و مروج تھا اور شبہات اس باب میں اسلاف شیعہ نے نکالے اور آج تک ان کے متبعین انہیں خیالات کو دستاویز اپنے صحت مذہب کی گردانتے ہیں علماء اہل سنت نے چہ سلف اور چہ خلف جواب شافی دے کر بیخ و بنیاد ان شبہات کی اکھاڑ دی چنانچہ جو کچھ اس عجالہ میں مذکور ہے یہ بھی ایک دانہ اسی خرمن کا ہے اور اہل سنت آج تک محبت اہل بیت میں متبع وہی قاعدہ مستمرہ کے ہیں چنانچہ درود صلوٰۃ اللھم صل علی محمد و علی آل محمد معمول متواتر ہے اور مودت فی القربیٰ کو ضروریات سے جانتے ہیں۔

(شیعہ علماء ثقلین سے منحرف ہیں)

مگر حضرات شیعہ ہداہم اللہ الی الصواب جو مدعی تمسک بالعترت ہیں ان کا حال کچھ تو جواب سابق میں تحریر ہوا اور کچھ یہاں معروض ہوتا ہے یہ امر متفق علیہ ہے کہ حضرت امیر المومنین علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے لے کر تا تمامی آئمہ سب حضرات بظاہر طریق اہل سنت رکھتے تھے یعنی اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی الخصوص شیخین اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے مداح اور ثناخواں ہیں اور جن ناعاقبت اندیشوں نے کوئی کلمہ بے ادبی کا بھی کہا اور ان کے سمع شریف تک اس کی خبر پہنچی تو نہایت منع فرمایا ہے شیعہ کے نزدیک یہ سب محمول تقیہ پر ہے جو ضروریات دین سے ہے ہمیں اس سے کام نہیں مقصود یہ ہے کہ ظاہر ان کا ایسا تھا اور باطن کی کیفیت ان کی اللہ جانے کیا تھی۔ کاملین اور اکابر کا حال ہم جیسے قاصر ہمت اور کوتاہ بینوں کو سوا استدلال آثار کے معلوم نہیں ہو سکتا اس لیے جب ان کے احوال پر نظر ہوتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ زہد اور تقویٰ اور اعراض دنیا اور ابناء دنیا سے اور تنفر تکلف اور تصنع سے اور گوشہ نشینی اور خلوت گزینی اور کثرت عبادات اور مدام ذکر خداوندی اور خشیت الٰہی اور کمال اظہار عبودیت جو بعینہ طریقہ ان کے جد امجد یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا وہ بزرگوار اس کے نمونہ تھے اب ہم نے اپنے زمانہ کے شیعوں کا حال دیکھا ہے اور ان کے اسلاف کا سنا ہے سوا اس کے کہ وظیفہ تبرا اور طعن تشنیع اہل سنت کوئی امر ان امور میں ان پر غالب نہیں معلوم ہوتا۔

منصف انصاف کر کے فرمائیں کہ شیعوں کا دعوے اتباع کس وجہ سے درست ہے نہ طرز ظاہر ملتا ہے اور نہ وضع باطن پھر یہ دعویٰ سراسر دروغ بے فروغ ہے اور تمسک قرآن شریف کا تو یہ حال کہ اول تو اس قرآن موجود کی نسبت عقیدہ ہی صاف نہیں[1] اور اگر بسبب بعض مصالح کے ان کے اسلاف نے اسکا پورا کلام اللہ ہونا بے تحریف مان بھی لیا تب بھی خدمت قرآن یعنی حفظ کتاب اللہ سے علماً و عملاً محروم ہیں حافظ ہونا کسی کو نصیب نہیں

---

[1] شیعہ کا قرآن کو نقلی، غیر اصلی اور محرف و بدلا ہوا ماننا ایک بنیادی عقیدہ ہے جو محتاج ثبوت نہیں اصول کافی ج۱ ط جدید ایران میں ص۲۱۲ سے ص۶۳۴ تک تحریف قرآن کا باب پھیلا ہوا ہے۔ ترجمہ مقبول کے حواشی میں دسیوں آیات کی لفظی تحریف کی نشان دہی کی گئی ہے شیعہ کے صرف چار مندرجہ ذیل علماء قرآن کو پورا اور بے تحریف مانتے ہیں۔ الشیخ الصدوق۔ والشریف المرتضیٰ۔ الشیخ ابو جعفر الطوسی۔ الشیخ ابو علی طبرسی صاحب مجمع البیان۔ ۱۲ مہر محمد

اور قاری باوجودیکہ قراۃ فرض جانتے خال خال کوئی ہوتا ہے اور عمل تو جیسا قرآن پر ہے شیعہ کے مجموعہ عقائد اور مسائل سے بخوبی واضح ہوتا ہے جس کا جی چاہے مقابلہ کر کے دیکھ لے علماء اہل سنت نے خاص کر مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب تحفہ (اثنا عشریہ) میں ایسے مطلب کو بہت اچھی طرح ثابت کیا ہے کہ عقائد اور فقہیات میں یہ گروہ مخالف ثقلین ہے۔ فقط۔

سوال بستم ۲۰ از جانب شیعہ

عقبہ پر کون کون صحابی بارادہ قتل پیغمبر خدا کے لیے آئے تھے ان کے نام اور وجہ آنے کی بیان کیجیے اور یہ کہ وہ صحابی تھے یا نہیں؟

جواب سوال بستم

(ارادہ قتل پیغمبرؐ کا صحابہؓ پر بہتان ہے) —— عقبہ پر کوئی صحابی بارادہ قتل پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نہیں گیا آپ تو بفضل الٰہی عاقل ہیں ایسا سوال مہمل جاہلانہ بھی کوئی کیا کرتا ہے اجی صاحب کیا آپ کو اتنی بھی خبر نہیں کہ صحابی معتقد باایمان کو کہتے ہیں سو آپ ہی فرمائیے اہل اعتقاد بھی کہیں اپنے بزرگوں کے قتل کا ارادہ کرتے ہیں ورنہ یزیدیوں کو یہ گنجائش ہوگی کہ حضرت سید الشہداء رضی اللہ عنہ کو شہید کیا یا کرایا تو کیا! پر شمر اور یزید اور عبداللہ بن زیاد وغیرہ سب معتقدان بالاختصاص اور مریدان خاص تھے تمہاں میں بھی چوکا۔ شیعے باوجود اس دعوئے محبت کے حضرت سید الشہداء رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمراہیوں کے خون کے پیاسے ہیں وہ خود نہ ملے تو ان کی نعشوں کی تصویروں کے ساتھ وہ کرتے جو سوا یزیدیوں کے اور کوئی نہ کرے۔

غرض کہ صحابہ کرامؓ میں سے کوئی نہیں گیا نام کس کا بتایا جائے یہ کام منافقوں اور کافروں کا تھا باقی آپ کو اپنا مطلب پوچھنا منظور ہے تو جیسا آپ گو مگو پوچھتے ہیں ہم بھی رلا ملا جواب دیتے ہیں پر اتنا فرق ہے کہ ہمارے رلاؤ کا تو یہ فائدہ ہے کہ ایک اعتراض کے ساتھ آپ کے سارے اعتراضات اور شیعوں کے سارے وسوسوں کا جواب دیتا ہوں سو آپ ہی کہیے کہ کیسا اچھا رلاؤ ملاؤ ہے اور آپ کے گول مول کہنے کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر ہم بہت چھان بین نہ کریں تو بروئے انصاف ہمارے ذمہ اس سے زیادہ جواب وہی نہیں جتنی ہم کر چکے۔

خیر مطلب کی بات سنیئے صحابہ کرامؓ کی شان میں کچھ آیتیں جواب اجمالی میں مرقوم ہوئیں اور ایک آیت جواب سوال نہم میں مرقوم ہوئی اور ان کا ترجمہ بھی بقدر ضرورت معروض ہو چکا اس کو دیکھئے اور پھر ہماری طرف منہ کرکے فرمائیے۔ تمہیں خدا کی قسم! کیا تمہارے خیال میں آسکتا ہے کہ خدا کی اتنی تعریفوں کے بعد بھی شیخین کو یہ خیال باقی رہے اور اگر پھر بھی یہ بات متصور ہے تو یوں کہو تمہارے نزدیک نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واجب القتل اور خدا کے دشمن تھے جو ان کے دشمنوں کی اتنی لمبی چوڑی تعریفیں کیں کہ العظمۃ للہ۔

جناب من! ہم تو فقط اس بھروسے پر کہ منشی شیخ احمد مولوی وجیہ الدین صاحب مرحوم کے فرزند ارجمند ہیں دیوبند کے رئیس زادے چال چلن کے اچھے راہ روش کے عمدہ۔ اگر کوئی یوں کہے کہ بلند شہر کے ڈاکہ میں شریک تھے تو تصدیق نہیں کر سکتے بلکہ دل وجان سے تکذیب کرتے ہیں آپ خدا کے بھروسے بھی اس بات کی تکذیب نہیں کرتے جو چند شیطانوں نے مل کر آپ کے کان میں پھونک دی ہے۔

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

غزوہ تبوک سے واپس آتے ہوئے بارہ منافقوں نے چاہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برائی سے پیش آئیں عمار بن یاسرؓ وحذیفہ بن یمانؓ کو اس بھید سے آگاہی ہوئی انہوں نے اس وقت جاکر ان خبیث طینتوں کو دفع کیا اور شیخین کو اصحاب عقبہ میں شامل کرنا عین حماقت ہے کیونکہ نعوذ باللہ منہا اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو برائی منظور ہوتی تو وہ غار میں یا عریش بدر کے روز کرتے اس وقت کیا کچھ موقعہ تھا اور اگر خدانخواستہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں خرابی ہوتی تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بمقتضائے فلعرفتھم بسیمٰھم ط ولتعرفنھم فی لحن القول ط حضرت عمرؓ کی دلی خرابی معلوم کرکے مثل اخبار دیگر منافقین کے واشگاف فرمادیتے اور سب کو احتیاط کا حکم فرمادیتے اور خود بھی احتیاط بدرجہ کمال ہر وقت رکھتے حالانکہ برخلاف اس کے بہت سی آیات اور احادیث سے ان کے فضائل اور اتحاد حضرت سے کمال درجہ کا ثابت ہوتا ہے چنانچہ ان کو وزیر فرمانا اور بسبب ان کے اسلام کے عزت اسلام کی سمجھنا اور لو کان نبی

من بعدی لکان عمر فرمانا وغیرہ ذٰلک۔

پس جاننا چاہیئے کہ جن لوگوں کو یہ رسوخیت اور یہ اتحاد ہو پھر وہ کیوں موقعہ ڈھونڈیں گے ان کے لیے تو ہر وقت موقعہ ہی تھا۔ وائے بر افہام ناکسان ایسے متحدین (محبّین) کی نسبت یہ تہمت اللہ سے ڈرنا چاہیئے ان اخذہ الیم شدید۔

(اس اتہام میں بصیرت نبوی پر حملہ اور آیت اظہار دین کا انکار ہے)

ایسا الزام شیخین کی طرف نسبت کرنا درپردہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی کم فہمی ثابت کرنی ہے نعوذ باللہ منہا۔ کوئی شخص کیسا ہی بے وقوف ہو حتیٰ کہ وحوش وطیور جو حیوان مطلق ہیں وہ بھی اپنے دوست دشمن کو پہچانتے ہیں کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم شیخین کی دوستی یا دشمنی کو نہ جانتے ہوں گے اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ باوصف ان کی طبائع کو جان کر چشم پوشی فرماتے تھے تو گویا اپنی جان اور دیگر دوستوں کی جان کے حضرت دشمن گویا (معاذ اللہ) کفار کی تعظیم وتکریم اور اختلاط ومحبت با دشمنان خدا رکھتے تھے اور یہ فعل اس آیت کے سرا سر مخالف ہے۔

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ (فتح ۴) (وہی خدا ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت دے کر اور سچا دین دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دینوں پر غالب کرے)

جب بزعم شیعہ کفار کے ساتھ خلا ملا ہوا تھا ہدایت وغلبۂ دین حق کا کہاں ہوا اور كَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا کے بھی معارض ہوا کیونکہ بزعم امامیہ کفار وفجار کا عمل دخل رہا نعوذ باللہ من ھٰذہ العقیدۃ الفاسدۃ۔

شیخین کی برائی کرنے میں کچھ تو آگے پیچھے کی خبر رکھا کرو جاننا چاہیئے کہ اوّل تو منافقین کی شناخت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آیت مذکورہ سے ثابت ہو چکی اس کو بھی جانے دیجئے نعوذ باللہ منہا۔ کیا خدا کو اپنے حبیب خاص اور محبوبان دیگر سے عداوت تھی کہ وہ ان کے دشمن جان سے نہ آگاہ کر دیتا کیا حضرت جبریلؑ کو بار بار آنے میں تھکان ہوتا تھا یا کچھ حکم خداوندی میں عذر تھا سو اوّل بات کو تو ان کی قوت بازو کے حالات قطع کرتے ہیں اور دوسری بات کو آیت لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (وہ فرشتے اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور کر گذرتے ہیں جس کام کا ان کو حکم دیا جاتا ہے) قطع کرتی ہے

دوسرے یہ کہ جو آیت اس قصہ والوں کے حق میں نازل ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ دنیا میں ذلیل وخوار ہوں گے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا یہ تو سب امور سوائے منافقین کے اور کس کس کے لیے ہوئے بلکہ شیخین کے لکھوکھا متبعین ومعین ہوئے اور ہوتے چلے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ تم کو بھی ہدایت کرے آمین ثم آمین فقط

سوال بست[۲۱] ویکم وبست ودوم[۲۲] از جانب شیعہ

حضرت پیغمبر خدا نے ان لوگوں کے نام حذیفہ رضؓ کو بتلائے تھے یا نہیں اور حضرت عمر رضؓ نے حذیفہ رضؓ سے یہ سوال کیا یا نہیں کہ پیغمبر خدا نے میرا نام تو نہیں لیا۔ فقط

جواب سوال بست ویکم۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ صاحب سر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھے جو جو باتیں بعضے ان کو معلوم نہیں وہ کسی کو معلوم نہ تھیں نہ حضرت علی کو نہ حضرت ابوبکر۔ نہ حضرت عمر نہ حضرت عثمان وغیرہم (رضی اللہ عنہم) اور اگر ان اصحاب کبار کو بھی وہ باتیں معلوم ہوں۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضؓ کی دیر دیر کی نشت برخاست سے جو بوجہ دوستی اور خلت اسلامی جس پر احادیث صحیحہ شاہد ہیں یہ بات مترشح بھی ہوتی ہے۔ تو پھر حضرت حذیفہ رضؓ کے صاحب السر ہونے کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ اپنے ہم قسم لوگوں میں اس بات میں ممتاز تھے بہر حال راز کی باتوں کو کوئی کیا جانے پھر وہ بھی ہیں اور آپ۔ اب تک یہ بھی خبر نہیں کہ ایمان کس کا نام ہے باقی یہ نام کا ایمان کس کام کا اور اگر ثابت ہے تو اس قدر ثابت ہے کہ بعض صحابہؓ کو اسماء منافقین اور سلاطین جور معلوم تھے پر آپ کو اس سے کیا مطلب؟ آپ کو ان باتوں سے اپنے مطلب پنہانی کی امید رکھنی ایسی ہے جیسے بیل کے پیٹ سے مرغی کے انڈے کی امید۔

جواب سوال بست ودوم

(علماء اور کاملین انجام سے خائف رہتے ہیں!!) ہم نے آج تک اپنی یاد میں کوئی روایت اس مضمون کی نہیں دیکھی جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت عمر رضؓ نے حضرت حذیفہ رضؓ سے یہ پوچھا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا نام تو نہیں لیا۔ یہ پوچھ لیا ہو تو حضرت عمر رضؓ کے

قربان جانا چاہیے۔ ایسا خدا کا خوف کس کو ہوگا جو یوں خدا کی بے نیازی سے ڈر کر اپنے خاتمہ سے اندیشہ مند ہے۔ جناب من! کلام اللہ میں سورۃ مومنون میں تو اچھے بندوں کی تعریف میں یہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ هُمْ مِنْ خَشْیَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُوْنَ — جس کے معنی یہ ہیں تحقیق وہ لوگ جو خدا کے خوف سے ڈرتے ہیں۔

پھر اس کے بعد ان کا انجام بیان فرماتے ہیں

اُولٰٓئِكَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ — یعنی ایسے ہی لوگ خیرات میں دیر نہیں کرتے اور وہی لوگ خیرات کو لے بھاگے۔

ادھر سورت فاطر میں یہ ارشاد فرمایا ہے۔

اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ جس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ خدا سے وہ ہی ڈرتے ہیں جو خدا کے جاننے والے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اور سارے کلام اللہ میں ایک جا نہیں بیسیوں جا یہی باتیں ہیں سو حضرات شیعہ کی ہم نہیں کہتے سوا ان کے جس سے چاہیئے پوچھ لیجیئے ان باتوں کو بشہادت کلام اللہ منجملہ کمالات ایمانی ہی سمجھے گا ہاں شیعہ اگر خوف خدا کو کفر سمجھتے ہوں تو دور نہیں۔ ورنہ پھر حضرت علی رضؓ کی محبت ہی کی کیا قدر رہ جائے گی۔

بہر حال یہ بات تو اس قابل تھی کہ آپ زنار دلی کو توڑ کر حضرت عمر رضؓ کی زیارت کا احرام باندھتے۔ توبہ استغفر اللہ احرام نہیں صاحب زیارت کا سامان کرتے پر الٹے آپ تو منہ کے آئے مگر اَن کہیاں سنانے لگے سو اس کا جواب بجز اس شعر کے اور کیا دیا جائے۔ شعر۔

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد — عیب نماید ہنرش در نظر

غرض جواب تو بندہ نے عرض کیا آگے اس کی ضرورت نہیں۔ یہ روایت صحیح ہے یا غلط بایں ہمہ اگر اسی کا شوق ہو تو مولانا محمد یعقوب صاحب۔ مولانا سید احمد، ملا احمد صاحبوں سے دریافت فرمالیں زیادہ سمع خراشی ہے۔

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

(قصہ عقبہ اور حضرت حذیفہ رضؓ) ——— بڑے افسوس کی بات ہے

کہ سائل کو قصص تک کی بھی خبر نہیں علی الاکمل زمین اور آسمان کے قلابے ملاتا ہے کجا قصہ عقبہ اور کجا حضرت حذیفہ رض کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا علامت نفاق بتانا اور کجا حضرت عمر رض کا اپنے باب میں دریافت کرنا۔ قصہ عقبہ کا تو ذکر جواب ستم میں بہ تفصیل تمام مذکور ہے نہ اس بارہ میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ کو اسمار منافقین بتلائے اور نہ حضرت عمر رض نے کچھ ان سے اپنے باب میں پوچھا بلکہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بطور قواعد کلیہ کے حضرت حذیفہ رض کو علامت نفاق کی فرمائی تھی تاکہ وہ معلوم کرلیں اور حضرت عمر رض کا ان سے اپنے لیے پوچھنا یہ کمال حضرت عمر رض کے خوف خدا اور کمال ایمان پر دلالت کرتا ہے اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ اور بدرجہ غایت تقویٰ و پرہیزگاری پر دلالت کرتا ہے کہ اگر حسب اتفاق کوئی مجھ میں برائی ہو گی بھی تو اس کے درپے اصلاح و استیصال کے ہوں گا گے یہ سائل کی فطرتیں ہیں کہ تین قصوں کا ایک قصہ بنا دیا۔ تاکہ ناواقف دھوکے میں آجائے چنانچہ مدارج النبوۃ میں حضرت حذیفہ رض کے فضائل میں لکھا ہے اور اس کو قصہ عقبہ سے کچھ علاقہ نہیں۔

وھکذا عبارۃ مدارج النبوۃ بالاختصار حذیفہ الیمانی کنیت ابوعبداللہ از کبار صحابہ است صاحب سر رسول اللہ بود و نزد وی علم منافقین تعلیم کردہ بعد از اں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم او را صفات نفاق دانانیدہ بود و اشخاص منافقاں و اسمار ایشاں را کہ کدام اند۔ و بود عمر کہ سوال میکرد او را از حدیث فتنہ و سوال میکرد از علامات نفاق و میگویند کہ یک بارے پرسید عمر از حذیفہ آیا چیزے کہ میبینی تو از علامات نفاق در من؟ گفت نمی بینم۔

(مدارج النبوۃ کی عبارت مختصراً یہ ہے کہ حذیفہ یمانی رض کی کنیت ابوعبداللہ ہے اکابر صحابہ رض سے ہیں حضور علیہ السلام کے راز دان تھے حضور علیہ السلام نے ان کو منافقین کا پتہ بتلایا تھا اور نفاق کی علامات جتلائی تھیں اور منافقین کے اشخاص اور ان کے نام بھی بتائے تھے کہ کون کون ہیں۔ حضرت عمر رض ان سے فتنوں کی حدیث کے متعلق پوچھا کرتے تھے اور نفاق کی علامات کے متعلق بھی کہتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت عمر رض نے حذیفہ رض سے پوچھا کہ کیا نفاق کی علامات میں سے کوئی میرے اندر بھی آپ پاتے ہیں؟ فرمایا میں آپ میں کوئی علامت نفاق نہیں دیکھتا)

غور کرنے کا مقام ہے کہ سائل نے دھوکہ بازی کرکے کیا جوتی سے کان گانٹھے تھے پھر کیا ہوا۔

جاء الحق وزھق الباطل

(حضرت حذیفہ رض کو منافقین کے نام اور علامات کلیہ بتلائی تھیں۔)

جاننا چاہیے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حذیفہ رض کو منافقین عقبہ ہی کا نام نہیں بتایا بلکہ تمام منافقوں کے نام بتائے اور چند نشانیاں بطور کلیہ جیسے کہ حدیث میں منافق کی وارد ہوئی ہیں یعنی

اِذَا حَدَّثَ کَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ اَخْلَفَ وَاِذَا خَاصَمَ فَجَرَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ۔ (منافق جب بولتا ہے جھوٹ کہتا ہے جب وعدہ کرتا ہے خلاف ورزی کرتا ہے اور جھگڑتا ہے تو گالی بکتا ہے جب امین بنایا جاتا ہے تو خیانت کرتا ہے۔)

(بخاری ج ۱ ص ۱۰ مسلم ص ۵۶ ج ۱)

فرمائیں تا دم مرگ منافقین کو پہچان لیں حضرت عمر رض کا ان سے اپنے باب میں دریافت کرنا عین حقانیت و پاک طینتی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ انہوں نے بطمع اصلاح اپنے حال کو دریافت کیا نہ بوجہ شبہ کیونکہ وہ لوگ بسبب کمال عرفان ذات باری کے باوجود ہزارہا بشارت کے ہر وقت اسی شان بے نیازی سے لرزاں و ترساں رہتے تھے کہ مبادا کوئی خرابی نہانی خلاف مرضی ربانی ہم میں ایسی نہ ہو کہ جس سے انحطاط مرتبہ کا ہو جائے۔ حضرت حذیفہ رض کے جواب سے معلوم ہوا کہ ان میں کوئی علامت نفاق کی نہ تھی اور بایں وجہ حضرت حذیفہ رض نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیعت بھی قبول کی فقط (یعنی ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی)

سوال بست سوم ۲۳ از جانب شیعہ (بسلسلہ حدیث قرطاس)

حضرت عمر رض نے آخری وقت میں پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو وصیت کرنے سے کیوں منع کیا۔

جواب سوال بست و سوم:۔ حضرت عمر رض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وصیت کرنے سے کہاں منع کیا ہے اور ان کی کیا مقدور تھی جو منع کرتے اتنا طوفان بھی کہیں سنتا ہے پہلے تو آپ ہی فرمائیں کہ وہ وصیت ہی کب تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دستور العمل کے طور پر کچھ لکھوانا چاہا تھا چنانچہ یہ ارشاد اَکْتُبْ لَکُمْ کِتَابًا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ اس پر

شاید ہے اس لیے کہ اس کا حاصل ماقبل سمیت یہ ہے کہ دوات قلم لاؤ ایسی کتاب لکھوا دوں جو تم پھر کبھی گمراہ نہ ہو مگر اس وقت آپ کو مرض کی شدت تھی کسی نے یہ سمجھ کر کہ کتاب اللہ کے بعد بشہادت آیۃ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (اور ہم نے آپ پر کتاب اتاری جو ہر چیز کو بیان کرنے والی ہے)

اور نیز بدستاویز حدیث ثقلین جس کے الفاظ اور معنیٰ جواب سوال سوم منجملہ سوالات اربعہ میں مرقوم ہے اور کس چیز کی حاجت ہے۔ یہ رائے دی کہ کیا حاجت ہے کہ ایسے وقت میں یہ تکلیف دی جاتی ہے آپ بوجہ کمال شفقت فرماتے ہیں بطور ایجاب نہیں فرماتے کسی نے امتثال ارشاد کو مقدم سمجھا آخر کار حضرت عمر رضؓ بھی یہ بولے حسبنا کتاب اللہ۔

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحضرت علیؓ کی رائے حضرت عمر رضؓ کے موافق ہوگئی)

سو حضرت پیغمبر صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی اسے برقرار رکھا اور حضرت امیر رضؓ نے بھی اسی رائے کو عمدہ سمجھا ورنہ حکم ایجابی ہوتا ہے۔ اور یہ رائے (لکھوانے کی) ناپسند ہوتی تو جناب رسالت مآب تو بحکم يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (اے رسول تبلیغ کیجیے ان امور کی جو آپ پر رب کی طرف سے نازل کیے گئے) ضرور اس کام کو کر کے چھوڑتے اور حضرت امیر دوات قلم لے آتے نافرمانوں کے زمرہ میں داخل نہ ہوتے بہرحال حضرت عمر رضؓ کے اتنے کہنے سے نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھوٹ سکتے ہیں نہ حضرت امیر رضؓ کی رستگاری متصور ہے۔ اگر یہ نہیں تو پھر ہم یہی کہیں گے سب حضرت عمر رضؓ کے ساتھ ہی ہیں اس رفاقت پر تو خیال کرو کہ خدا کا خلاف کیا (بقول شیعہ) پر حضرت عمر کا خلاف نہ کیا جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت امیر رضؓ کا اتنا پیارا ہو کہ اس کے سامنے خدا کا بھی لحاظ نہ کرتے ہوں پھر تم کس منہ سے برا کہتے ہو۔ استغفر اللہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

شاید یہ پیار اور محبت اس وجہ سے ہو گا کہ آخر کار داماد مرتضوی ہونے والے تھے۔

(تقیہ کے عذر لنگ کا ازالہ:)

اکثر ایسے مقاموں میں اکثر حضرات شیعہ وہ عذر تقیہ، جس کو عذر گناہ بدتر از گناہ کہیے پیش کیا کرتے ہیں سو یہ ہار جانے کی باتیں ہیں تقیہ کی رد سے تو کلام اللہ بھرا ہے پر تقیہ کا اثبات

کہیں نہیں دو چار دلیلیں تقیہ کے ابطال کی بہت بسط کے ساتھ ہدیۃ الشیعہ میں بھی موجود ہیں اگر طلب حق ہے تو وہ بھی لازم ہیں باقی بقدر ضرورت تو اوراق گذشتہ میں بھی مذکور ہو چکا ہے۔
بایں ہمہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت امیرؓ نے تقیہ کیا تو کیا بشر تھے اگرچہ شیعوں کے طور پہ خدا سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں اور کم بھی ہیں تو اتنے نہیں کہ تقیہ کی ضرورت ہو چنانچہ علم کی یہ وسعت علم ما کان و ما یکون ہو کلینی اسپر شاہد ہے اور قدرت کی یہ زور کہ در خیبر چھوڑ آسمانوں کو ہلا ڈالیں پر یہ تو فرمایئے کہ خدا تعالیٰ نے بھی تقیہ ہی کیا جو چپ چاپ ہو کے بیٹھ رہے پھر خبر ہی نہ لی کہ ہمارا حکم امت محمدی کو پہنچایا نہیں۔ میں پوچھتا ہوں اگر حکم مشار الیہ پہنچ چکا تھا۔ تو حضرت عمرؓ کی یہ گذارش ایسی تھی۔

(حضرت عمرؓ نے حضورؐ کے ادب و احترام کی خاطر یہ کہا)

جیسے حضرت علیؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ میں لفظ رسول اللہ کے مٹانے کو فرماتے تھے اور نہ مانا تمہیں کہو ایسے حکموں کا نہ ماننا بے ادبی ہے؟ یا عین ادب۔ اگر آپ کی والدہ ماجدہ خدانخواستہ بوقت شدت بیماری آپ سے اس بات کی خواستگار ہوں کہ تمہارے کام میں ہی کروں گی تو گویا ان کا ارشاد بوجہ محبت سہی پر کیا آپ کی یہی سعادت مندی ہے کہ بے ضرورت ان سے کام لینے کو تیار ہوں۔ اگر حضرت عمرؓ کی اس عرض کو بھی اسی قسم سے سمجھ لیتے تو کیا گناہ تھا بہت ہوگا تو اتنا ہوگا کہ ایک ممدوح خدا کی بات بنادی[1] تم ہی کہو یہ بات بری ہے یا بھلی اگر بری ہے تو پھر اس کا کیا جواب کہ اگر عمرؓ ایسے تھے تو خدا نے کس بھروسہ پر تعریف کی تھی اور کہا تھا۔ والذین معہ اشداء علی الکفار الخ۔ والسابقون الاولون الآیۃ۔ الذین اٰمنوا وھاجروا الخ یوم لا یخزی اللہ النبی الخ

(قلم دوات لانا گھر والوں کا کام تھا)

ہاں اگر یہ معنیٰ اور یہ احتمال اس احتمال سے عمدہ نہ ہو جب ہی کہو آپ ہی فرمائیں اوّل تو وصیت کو اس سے کیا علاقہ اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدی۔ پھر کئی روز حضرت

---

[1] یعنی اچھی توجیہہ کر کے اعتراض سے بچالیا۔ ۱۲ مہر محمد

بقیہ حیات سے ہے حضرت عمرؓ کیا اسی در کے دربان تھے جو نہ ملے اور گنجائش نہ ملی پھر بیمار کے خطاب تو اپنے تیمار داروں کی نسبت ہوا کرتے ہیں جو کار خدمت ہوا کرتے ہیں اہل وعیال کو کہا کرتے ہیں۔ آنے جانے والوں عیادت کرنے والوں کو کوئی نہیں کہا کرتا۔ یہ حضرت علیؓ کا کام تھا انہوں نے کیوں نہ کہا۔ حضرت عمرؓ نے بھی انہیں ہی دیکھ کر ان کی پیروی کی سو اس میں کیا برائی ہے اگر حکم مذکور قبل ارشاد مذکور اعنی اکتب لکم کتابا لن تضلوا بعدہ امت کو پہنچانا تھا اور پھر بدستور بات وہ نہیں رہی[1] تو یہ دور تک پہنچتی ہے تمہارے خیال کے موافق نہ حضرت امیرؓ بچیں نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بچیں نہ خود خداوند کریم سالم ہیں نعوذ باللہ من ھذا المذھب۔ ایسے مذہب پر کیا کہوں تم سمجھ جاؤ۔ اور اگر یہ وصیت ہی تھی اور وصیت بھی خلافت ہی کی اور آپ کو اس چھیڑ چھاڑ سے غرض یہی ہی ہے تو آپ کو یہ الہام کیونکر ہوا کہ حضرت علیؓ کے لیے وصیت تھی ہم کہتے ہیں حضرت ابوبکرؓ کے لیے لکھواتے تھے چنانچہ حدیث ویابی اللہ ویدفع المومنون جو سوال اول کے جواب میں مرقوم ہو چکی۔ اس پر شاہد ہے اس سے زیادہ تفصیل منظور ہو تو کچھ اوراق گذشتہ کو پلٹ کر مطالعہ فرمائیں یا ہدیۃ الشیعہ کو مطالعہ سے مشرف فرمائیں۔ پر غور کی حاجت ہے انصاف کی ضرورت ہے فہم وفراست بکار ہے ورنہ ہدیۃ الشیعہ کیا چیز ہے وحی آسمانی بھی بے کار ہے۔

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

(قرآن وسنت اور اہل بیت سے شیعہ کی محرومی)

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کب وصیت کی اور حضرت عمرؓ نے کہاں منع کیا کچھ پتہ تو کیا ہوتا۔ رنج ہے کہ باوجود بزعم خود محبان عترت ہونے کے خدمت قرآن سے تو بدولت حضرت عثمانؓ کے محروم رہے اور اکثر اشخاص عترت سے بدولت

---

[1] یعنی امت ہدایت سے محروم ہو گئی۔ ۱۲ میر محمد

عقیدہ فاسدہ اپنے کے اور قرطاس آخری سے بدولت حضرت عمرؓ کے محروم ہے یہ ہی تین چیزیں
ہدایت کی تھیں انہیں سے محروم ہو کر خسر الدنیا والآخرۃ ہو گئے افسوس ہے کہ ان کے لیے کوئی صورت
ہدایت کی نہ ہوئی وادی جہل میں ٹکراتے رہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون. کسی کی کیا خطا خیالات
خام کو مقتدیٰ و پیشوا بنانے کا یہ ہی ثمرہ ہے وَذُوقُوا عَذَابَ الْخُلْدِ بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (پ ۲۱ السجدۃ ع ۲)

چونکہ حضرت عمرؓ کی رائے اکثر امور میں موافق وحی کے ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ چند قصص سے معلوم
ہوتا ہے اگر اس مقدمہ میں بھی دخیل ہو گئی تو کیا برا، کیا یہ رد وحی نہیں ہے۔

اور اگر نہیں مانتے تو حضرت علیؓ نے أَتُخَلِّفُنِي فِي النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ (مسلم ص ۲۷۸ ج ۲، ترمذی ص ۲۱۴ ج ۲)
(کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں جانشین بنا کر جا رہے ہیں) حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ
لیجانے پر کیوں فرمایا باوجود صدور حکم کے خلش کیوں نہ رہے[2] اور نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغرض

---

[1] کہ سادات واہل بیت میں سے صرف بارہ کو قابل اتباع مانا اور پھر ان کے تقیہ کرنے کی وجہ سے انکے فیوض سے محروم ہے اور آخری حجت خدا امام العصر
تو ۱۲ سو سال سے غائب ہیں اور شیعہ ان کی اتباع و ہدایت سے یکسر محروم ہیں قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین ص ۵۶ ج ۱
میں شیعہ اہل بیت عترت کو کتے سے بھی بدتر کہا ہے ترجمہ نقل کفر کفر نباشد اذا العلوی تابع ناصبیا۔ بمذہبہ
فما هو من ابيه ۔ وكان الكلب خيرا منه طبعا ۔ لان الكلب طبع ابيه فيه ۔
حضرت علی کی اولاد جب سنی مذہب پر چلے تو وہ اپنے باپ کی نہیں۔ اس سے تو کتا مزاج کے لحاظ سے اچھا ہے کیونکہ
اس میں اپنے باپ کی عادت پائی جاتی ہے۔

[2] اہل سنت عیب جوئی اور خردہ گیری کی نیت سے کسی شخصیت کا مطالعہ نہیں کرتے ورنہ شیعی ذہن سے ذرا کام
لیا جائے تو ان کے ممدوح آفاق اکابر بھی ایسے الزام سے بچ نہیں سکتے مجبوراً چند مثالوں کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے
۱۔ حضرت علیؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہوا کہ لفظ رسول اللہ مٹادو لیکن انہوں نے تعمیل نہ کی (قصہ حدیبیہ
عمدۃ البیان ص ۲۶۲ ج ۲)۔ حضرت علیؓ کو حضور علیہ السلام کا حکم تھا کہ میرے ذمہ جو لوگوں کی امانتیں ہیں ادا کر کے میرے
اہل بیت کو ہمراہ لے کر مدینہ آنا لیکن انہوں نے سرانجامی نہ کی بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حارث اور ابو رافع
کو ۵۰۰ درہم اور دو اونٹ دیکر مدینہ سے مکہ کو امانتیں ادا کرنے کی خاطر بھیجا اور عبداللہ بن ابی بکرؓ اہل بیت کو ہمراہ
لے کر مدینہ پہنچے (شیعہ حضرات کی کتاب سیر الائمہ ص ۱۴، ۱۵ ج ۲)۔ ۲۔ حضرت فاطمہؓ کو آپ نے فرمایا میں سفر کو جاتا ہوں۔
میرے آنے تک جو تمہارا بیٹا ہونے والا ہے اسے دودھ نہ دینا مگر حضرت فاطمہؓ نے تین دن تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (بقیہ حاشیہ
ص ۱۴۳ پر)

مصلحت و دفع مشقت امتیوں کی بمشورہ حضرت موسیٰ (علیہ السلام) تو بارکیوں حکم الٰہی (معاذ اللہ)
میں ردّ بدل رکھا اگر ایسے امور خدا نخواستہ رد وحی ہوتے تو معاذ اللہ انبیاء علیہم السلام سب سے اول اس گناہ
میں شامل ہوتے۔ معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کا فرمانا بخیال رفاہت اور آرام رسول اللہ صلی
اللہ علیہ وسلّم تھا جیسا کہ خود حضرت ؐ نے بسبب شفقت و محبت امت مذبہ کے کیا۔

سوال بست ۲۴ و چہارم از جانب شیعہ

بیمار پر آخری وقت میں وصیت کرنی واجب ہے یا نہیں اور خصوص پیغمبر خدا پر؟

جواب سوال بست و چہارم

بیمار کے ذمہ پر کسی کا لینا دینا ہو تو وصیت واجب ہے نہیں تو نہیں۔ پر رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ تھا ہی نہیں جو وصیت فرماتے اور جو کچھ تھا اس کی نسبت سنا دیا
۱۔ نَحْنُ مَعَاشِرَ الْاَنْبِيَاءِ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ (بخاری ص ۹۹۶/ج۲ ابوداؤد ص ۵۶/ج۲ ترمذی ص ۱۹۲/ج۱) (ہم گروہ انبیاء کسی کو وارث نہیں بناتے ہمارا ترکہ صدقہ بن جاتا)

باقی درباره دین بہت سی وصیتیں فرما گئے ہیں منجملہ یہ بھی ہیں۔

۲۔ اِقْتَدُوْا بِالَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ اَبِيْ بَكْرٍ وَّعُمَرَ (میرے بعد دو شخصوں ابوبکر اور عمرؓ کی پیروی کرنا)
(ترمذی ص ۲۰۷/ج۲ ازالۃ الخفاء ص ۸۹/ج۱ بحوالہ مستدرک حاکم)

۳۔ فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ۔ (ابوداؤد ص ۲۸۷/ج۲ باب فی لزوم السنۃ ترمذی ص ۹۲/ج۲) (تم پر لازم ہے کہ میری سنّت پکڑو اور میرے بعد خلفاء راشدین کی۔)

۴۔ اِنِّيْ تَارِكٌ فِيْكُمُ الثَّقَلَيْنِ الخ (مسلم ص ۲۸۰/ج۲) (میں تمہارے اندر دو بھاری چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں)

بقیہ حاشیہ

کے آنے کی انتظار کی جب آپ تشریف نہ لاتے تو حضرت فاطمہؓ نے اپنے بیٹے حسنؓ کو دودھ دے دیا آپ ہی بتلائیں
کہ حضورؐ کے حکم کی تعمیل ہوئی یا نہ (جلاء العیون شیعہ)۔ ۱۲ مہر محمد۔ ۴۔ حضرت حسنین رضی اللہ عنہما کو حضرت علیؓ نے
وصیت فرمائی تھی کہ اے حسن و حسین! لاتخلوها ما بقیتم یعنی جب تک تم زندہ رہو مکہ معظمہ سے نہ نکلنا نہج البلاغہ
ص ۲۲ کیا آپ نے مکہ کو خالی کر کے شہید ہو کر اپنے والد کے ارشاد کی تعمیل کی؟ ۱۲ مہر محمد۔

۵ لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَاءِ هِمْ مَسَاجِدَ.

یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو انہوں نے اپنے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔

(مسلم ص ۲۰۱ ج ۱ بخاری ص ۶۲ ج ۱)

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

(تفسیر مدارک (البقرہ کی آیت وصیت) میں ہے۔)

(کُتِبَ) فُرِضَ (عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ) اَیْ اِذَا دَنَا مِنْهُ فَظَهَرَتْ اَمَارَاتُهٗ (اِنْ تَرَكَ خَيْرًا) مَالًا كَثِيْرًا لِمَا رُوِیَ عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اِنَّ مَوْلًى لَهٗ اَرَادَ اَنْ يُوْصِیَ وَلَهٗ سَبْعَمِائَةٍ فَمَنَعَهٗ وَقَالَ: قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: اِنْ تَرَكَ خَيْرًا وَالْخَيْرُ هُوَ الْمَالُ الْكَثِيْرُ وَلَيْسَ لَكَ مَالٌ وَفَاعِلُ كُتِبَ (الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ) وَكَانَتِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَارِثِ فِیْ بَدْءِ الْاِسْلَامِ فَنُسِخَتْ بِاٰيَةِ الْمَوَارِيْثِ كَمَا بَيَّنَّاهُ فِیْ شَرْحِ الْمَنَارِ، وَقِيْلَ هِیَ غَيْرُ مَنْسُوْخَةٍ لِاَنَّهَا نَزَلَتْ فِیْ حَقِّ مَنْ لَيْسَ لِوَارِثٍ بِسَبَبِ الْكُفْرِ لِاَنَّهُمْ كَانُوْا حَدِيْثِیْ عَهْدٍ بِالْاِسْلَامِ يُسْلِمُ الرَّجُلُ وَلَا يُسْلِمُ اَبَوَاهُ وَقَرَائِبُهٗ وَالْاِسْلَامُ قَطَعَ الْاِرْثَ فَشُرِعَتِ الْوَصِيَّةُ فِيْمَا بَيْنَهُمْ قَضَاءً

یعنی تمہارے اوپر فرض کیا گیا ہے جب تم میں سے کسی کو موت آئے اور نشانیاں ظاہر ہو جائیں اگر وہ مال چھوڑے (یعنی) مال بہت کیونکہ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ان کے آزاد کردہ غلام نے وصیت کا ارادہ کیا کہ ۷۰۰ درہم اس کے پاس تھے تو آپ نے منع فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ کہ وہ بہت مال چھوڑ کر مرے (تب وصیت کرے) تیرا مال زیادہ نہیں کتب کا فاعل الوصیہ ہے۔ کہ فرض کی گئی ہے ماں باپ کے لیے اور رشتہ داروں کے لیے۔ وصیت ابتدائے اسلام میں (لازم) تھی تو آیت وراثت سے منسوخ ہو گئی جیسا کہ ہم نے شرح منار میں بیان کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ منسوخ نہیں ہے کیونکہ یہ ان لوگوں کے حق میں اتری جن کا کفر کی وجہ سے کوئی وارث نہ بن سکتا تھا۔ کیونکہ وہ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے ایک شخص مسلمان ہوتا تو اس کا باپ یا رشتہ دار مسلمان نہ ہوتے اور اسلام نے ان کو وراثت سے محروم کر دیا تو وصیت اسی دوران جائز کر دی گئی

لِحَقِّ الْقَرَابَةِ نَدْبًا وَعَلٰی هٰذَا الْمُرَادُ بِكُتِبَ فُرِضَ ۔ (تفسیر مدارک ص ۹۲ ج ۱)

تاکہ بطور استحباب رشتہ داری کا حق ادا کیا جائے اس صورت میں کتب سے فُرِضَ (فرض کیا گیا ہے) امر اور نہ ہوگا ۔

معلوم ہوا کہ وصیت مال کثیر میں جاری ہوتی ہے اوّل تو حضرتؐ کے پاس مال ہی کہاں تھا اور پھر کثرت کی بھی شرط ۔ اذا فات الشرط فات المشروط ۔ اور بایں ہمہ ہم یوں کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پاس خواہ مال قلیل تھا یا کثیر اس کو تو وہ صدقہ کر ہی چکے تھے چنانچہ نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقۃ " سے یہ ہی ثابت ہوتا ہے بایں وجہ مدعی کا دعوئے وراثت بھی غلط اور وصیت بھی کس جگہ جاری ہو ۔

(حضور علیہ السلام کی متروکہ اشیاء)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے صرف یہ چند اشیاء چھوڑی ہیں جو اس حدیث سے ثابت ہوتی ہیں ۔

مَا تَرَكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عِنْدَ مَوْتِهٖ دِرْهَمًا وَلَا دِيْنَارًا وَلَا عَبْدًا وَلَا اَمَةً وَلَا شَيْئًا اِلَّا بَغْلَتَهُ الْبَيْضَاءَ وَسِلَاحَهٗ وَاَرْضًا جَعَلَهَا صَدَقَةً

(حضور علیہ السلام نے موت کے وقت نہ درہم چھوڑا نہ غلام باندی چھوڑی اور نہ کوئی اور چیز بجز سفید خچر کے اور ہتھیاروں کے اور وہ زمین جو صدقہ کر دی تھی ۔) (بخاری ص ۳۸۲ ج ۱)

(حضرت علیؓ کے لیے خلافت کی وصیت بالکل نہیں کی)

اور وصیت خلافت حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی طرح ثابت نہیں ۔ کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں ۔

مَتٰی اَوْصٰی اِلَيْهِ وَقَدْ كُنْتُ مُسْنِدَتَهٗ اِلٰی صَدْرِیْ اَوْ قَالَتْ حَجْرِیْ فَدَعَا بِالطَّسْتِ فَلَقَدِ انْخَنَثَ فِیْ حَجْرِیْ فَمَا شَعُرْتُ اَنَّهٗ قَدْ مَاتَ فَمَتٰی اَوْصٰی اِلَيْهِ ۔

(بخاری ص ۳۸۲ ج ۱)

(حضرت علی رضؓ کے نام آپ نے کب وصیت کی حالانکہ آپ میرے سینے کے ساتھ یا میری گود میں ٹیک لگائے بیٹھے تھے ایک تھال منگایا تھا آپ کی روح مبارک میری گود میں قبض ہوئی مجھے پتہ نہ چلا آپ وفات پا گئے تو کب حضرت علیؓ کو وصیت کی تھی ۔)

خاص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی وصیت کا پتہ بھی نہیں ہاں دو تین باتیں بطور وصیت عامہ فرمائی ہیں ایک تو یہ کہ مشرکین کو جزیرہ عرب سے نکال دینا۔ دوسرے یہ کہ جو جماعت وفد کی تمہارے پاس آئے اس کی خاطر داشت کرنا اور جائزہ سے پیش آنا جیسے میں پیش آتا تھا۔ تیسری وصیت راوی سے فراموش ہو گئی غالباً وہ تجہیز جیش اسامہ تھی ہاں بالخصوص حضرت علی رضؓ کو عید الاضحیٰ میں ہر سال اضحیہ کا فرمایا کہ تم میری طرف سے کر دیا کرو چنانچہ امیر المومنین تا دم زیست اس پر قائم رہے اگر کوئی اور بھی وصیت درباب خلافت ہوتی کیا ایسی بڑی وصیت کو چھوڑ دیتے اور بروقت خلافت شیخین مدعی نہ ہوتے یہ بات ان کی علو ظرفی اور بلند ہمتی سے بعید ہے کیا حدیث مَنْ قُتِلَ دُوْنَ حَقِّہٖ فَھُوَ شَھِیْدٌ بھی یاد نہ ہو گی۔

سوال بست و پنجم ۲۵ ازجانب شیعہ

اس وصیت کی تحریر نہ ہونے سے اسلام میں رخنہ واقع ہوا یا نہیں

جواب سوال بست و پنجم

(عدم تحریر سے اسلام میں رخنہ نہ پڑا ہاں مذہب شیعہ مردود ثابت ہوا۔)

اوّل تو ارشاد مشار الیہ یعنی اکتُبُ لکم کتابا لن تضلوا بعدی وصیت نہیں۔ اور درباره دین وصیت کہیے تو کچھ رخنہ نہیں پڑا ہاں کلام اللہ باقی نہ رہتا یعنی سنی یاد نہ کرتے اور شیعوں کی طرح اس کے عوض مرثیہ کتاب سوز نوحہ مقرر کر لیتے تو البتہ دین میں رخنہ پڑ جاتا کتاب مفصل کے ہوتے کتاب مجمل کی کچھ ضرورت نہیں ہاں یہ کہیے شیعہ بگڑ گئے مگر جیسے احول (بھینگے) کو ایک کے دو نظر آتے ہیں اور وقت ہجوم استفراغ لڈو پیڑے بھی نہیں بھاتے۔ حضرت عمر رضؓ کی ایسی اچھی بات جو خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت امیر سب کو پسند چنانچہ عرض کر چکا ہوں شیعوں کو بری لگتی ہے سو یہ اُن کا قصور ہے حضرت عمر رضؓ کا قصور اور وصیت کے نہ لکھنے کا قصور نہیں جیسے احول کا قصور ہے اس شے کا قصور نہیں مرد بیمار کا قصور ہے لڈو پیڑوں کا قصور نہیں۔ یہاں بھی شیعوں کی آنکھوں کا قصور ہے اور ذوق و فہم کا فتور نہ دین میں رخنہ نہ حضرت عمر رضؓ کا کچھ گناہ غرض جیسے یہاں لڈو پیڑوں میں کچھ رخنہ نہیں پڑا وہاں دین میں کچھ رخنہ نہیں پڑا۔

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

سنیوں کے اسلام میں تو کچھ رخنہ واقع نہیں ہوا مگر ہاں جو تحریر ہو جاتی تو آگہ ہدایت کا شیعوں کے بھی ہاتھ آجاتا یوں چوہے کی طرح کورے گھڑے میں نہ رہ جاتے اے حضرات امامیہ قرطاس وصیت نہ ہونے پر اتنے کیوں بگڑتے ہو سنیان سلمہم اللہ تعالیٰ کو اس وصیت، قرطاس کی حاجت بعد واقع غدیر کیا تھی جنہوں نے بزعم شیعہ ہزاروں کے سامنے کی بات کو چھپا لیا ان سے ایک کاغذ کا خلاف نہ ہو سکتا نعوذ باللہ من ھذہ الھفوات۔

اور اس وصیت کی تحریر کے نہ رخنہ انداز ہونے پر یہ دلیل ہے کہ امام احمد سے روایت ہے۔

عَنْ سَفِینَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَقُوْلُ اَلْخِلَافَۃُ ثَلَاثُوْنَ عَامًا ثُمَّ یَکُوْنُ بَعْدَ ذٰلِکَ الْمُلْکُ (مسند احمد ج ۵ ص ۲۲۰ ترمذی ج ۲ ص ۴۵)

(حضرت سفینہ رض کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے ہیں خلافت تیس سال ہوگی اس کے بعد حکومت ہوگی۔)

فرمایا علماء ہمارے نے کہ تیس برس تک خلافت خلفاء اربعہ رض اور امام حسن تھی اور بعض بعض روایات میں ثم یکون ملکا جبریۃ ہے[1]۔

معلوم ہوا کہ بالفرض اگر حضرت لکھ بھی دیتے تو کیا ہوتا بعد خلافت کے ملک جبریت کا

---

[1] اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ خلافت علی منہاج النبوۃ تیس سال تک ہوگی اور یہ بھی خلفاء کے ذاتی مناقب و فضائل کی حیثیت سے ورنہ رعایا میں امن و امان اور استحکام خلافت کے لحاظ سے ۲۵ برس حضرت عثمان رض کی شہادت تک رہی پھر فتن کا دور شروع ہو گیا۔ مگر اس کے بعد جو خلافت ہو گی اس میں باقی صفحہ ۱۴۵ پر

تو ظہور رہوتا ہی تھا کہ جس کی خبر اتنی مدت پیشتر حضرت نے بطور پیشن گوئی فرمائی غرضیکہ نہ لکھے جانے سے بھی جب تک خداوند تعالیٰ نے چاہا بات بنی رہی سب باہم شیر و شکر کی طرح ملے رہے اور جب کسی قسم کا فتنہ اور فساد منظور ہوا صدہا آیات قرآنی اور احادیث رسول سبحانی در باب اتحاد و ایتلاف فی مابین کے رکھے رہ گئے ایک وصیت بیچاری کیا بگاڑ کرتی۔

سوال بست و ششم [۲۶] از جانب شیعہ

شیخین اور دیگر صحابہؓ نے جیش اسامہ سے تخلف کیا یا نہیں باوجود تاکید اشد حضرت پیغمبر خدا کے۔

بقیہ حاشیہ :- ملوکیت کی آمیزش بھی ہوگی اور وہ خلافت راشدہ علی منہاج النبوۃ سے کم درجہ ہوگی۔ اس حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت معاویہؓ کی خلافت ہی نہ تھی مطلق العنان بادشاہت اور حکومت تھی کیونکہ بعض دفعہ مرتبہ کمال کی نفی کو اصل چیز کی نفی سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے احادیث میں آتا ہے کہ مسجد کے پڑوسی کی نماز سوائے مسجد کے نہیں ہوتی، اور بے امانت آدمی کا کوئی ایمان نہیں ہوتا۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور آپ کی خلافت عادلہ کے سلسلہ میں مرفوع احادیث بھی آئی ہیں چند یہ ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ هَادِيًا مَهْدِيًّا وَّاهْدِبِهٖ هٰذا حدیث حسنٌ (ترمذی ص ۲۲۵/۲ج)

اے اللہ معاویہ کو ہدایت دینے والا اور ہدایت پانے والا بنا اور اس سے لوگوں کو ہدایت دے۔

اَللّٰهُمَّ عَلِّمْهُ الْكِتَابَ وَالْحِسَابَ وَمَكِّنْ لَهٗ فِى الْبِلَادِ (طبرانی مجمع الزوائد ص ۳۵۶/۹ج)

اے اللہ اسے کتاب اللہ اور حساب (مجھ) سکھا اور اسے شہروں میں اقتدار عطا کر۔

يَا مُعَاوِيَةُ اِنْ وُلِّيْتَ اَمْرًا فَاتَّقِ اللّٰهَ وَاعْدِلْ وفی روایة اِذَا مَلَكْتَ فَاَحْسِنْ (تطہیر الجنان ص ۱۵)

اے معاویہ اگر تو حاکم بن جائے تو اللہ سے ڈرنا اور عدل کرنا اور ایک روایت میں ہے کہ جب تو بادشاہ بنے تو عمدہ سلوک کرنا۔

حضرت ابن عباسؓ سے ایک مرفوع حدیث یہ ہے کہ امت کے انتظام کا آغاز نبوت اور رحمت سے ہوا پھر خلافت اور رحمت ہوگی پھر سرداری اور رحمت ہوگی پھر اس کو کاٹ کھانے کے لیے قبیلہ حمیر کی طرح بادشاہ لڑیں گے تم پر اس وقت جہاد ضروری ہوگا (رواہ الطبرانی رجالہ ثقات، تطہیر الجنان ص ۱۹)۔

اس حدیث سے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بادشاہی اور حکومت، صاف، عادلہ اور ظلم سے پاک دکھائی دیتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ازالۃ الخفاء ص ۱۶۷/۲ج پر رقمطراز ہیں۔ بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۶ پر

جواب سوال بست و ششم

نہ شیخینؓ حضرت اسامہؓ کے ساتھ گئے نہ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ سو شیخین کے نہ جانے کی آپ کو وجہ چاہیئے وہ ہم سے وجہ لیجیئے پر پہلے یہ آیت سن لیجیے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاِذَا کَانُوْا مَعَہٗ عَلٰٓی اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰی یَسْتَاْذِنُوْہُ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَاْذِنُوْنَکَ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْکَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ

ترجمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ مومن وہی ہیں جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے اور جب کسی ہنگامہ میں اس کے ساتھ ہوں تو جب تک اجازت نہ لیں ٹلتے نہیں سو اگر وہ لوگ اپنے کسی کام کے لیے اجازت مانگیں تو جسے چاہو اجازت دے دو اور ان کے لیے اللہ سے دعائے مغفرت کرو بیشک اللہ غفور رحیم ہے۔

اس آیت میں اول تو ان لوگوں کی تعریف ہے جو بے اجازت ٹلتے نہیں پھر تعریف بھی کیسی کہ سوا ان کے کوئی مومن ہی نہیں اس کے بعد خداوند کریم اپنے رسول سے ان کی سفارش کرتا ہے اجازت کی جدا اور استغفار کی جدا۔

حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے اجازت لی۔

اب ہماری یہ غرض ہے کہ شیخینؓ نے حضرت اسامہؓ کی معیت میں تقصیر نہیں کی حضرت ابوبکر

بقیہ حاشیہ

تنبیہ باید دانست کہ معاویہ بن ابی سفیانؓ عمریکے از اصحاب آنحضرت بود صلی اللہ علیہ وسلم و صاحب فضیلت جلیلہ در زمرہ صحابہ رضوان اللہ علیہم زنہار در حق او سوء ظن نکنی و در ورطہ سب او نہ افتی تا مرتکب حرام نشوی۔

(بحوالہ عدالت صحابہ کرام صفحہ ۳۱۹ مولفہ مہر محمد میانوالوی)

معلوم ہونا چاہیے کہ حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے محترم اور بڑے صاحب فضیلت صحابی تھے اور صحابہ میں ایک خاص مقام رکھتے تھے کبھی ان کے حق میں بدظنی نہ رکھنا اور آپ کی بدگوئی کے ورطہ ضلالت میں نہ پڑنا تاکہ حرام کام کے ارتکاب سے بچ سکو۔ ۱۲ مہر محمد۔

صدیق رضؓ نے اپنے اور حضرت عمرؓ کے لیے اجازت لی حضرت عمرؓ کے لیے اجازت کا لینا صاف حدیثوں میں موجود ہے اس پر اپنے لیے اجازت کو قیاس کیجئے آخر اتنا تو آپ بھی سمجھے ہوں گے کہ اگر رنگروں اور ڈھینگا دھینگی ہے تو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کو حضرت عمرؓ کے لیے اجازت ہی کی کیا ضرورت تھی خلیفہ ہو کر اجازت مانگی اطاعت اسامہؓ پر چنداں دلالت کرتا ہے اتنا تعزیہ بنانا حُبِ اہل بیت پر دلالت نہیں کرتا مرثیہ پڑھنا سننا غم حسینؓ کی خبر نہیں دیتا پھر جس شخص کو باوجود اس دبدبہ خلافت کے کہ (اس میں) حضرت امیر جیسے شیر خدا کو بھی تقیہ ہے۔ کہتے ہیں حضرت اسامہؓ کی اطاعت اس قدر منظور ہو اس نے اپنے واسطے بھی ضرور ہی اجازت لے لی ہوگی (تحفہ اثنا عشریہ ص۲۱۸ مترجم اردو)

بعد ازیں یہ گذارش ہے کہ آپ کو اجازت لینے میں کلام ہے تو اس کا جواب تو بحوالہ احادیث مرقوم ہو چکا اگر جواز طلب اجازت میں گفتگو ہے تو اس کے لیے خداوند کریم گواہ ہیں ابھی آیت سورت نور سنا چکا ہوں اور اگر اس میں خلجان ہے کہ حضرت اسامہؓ نے کیوں اجازت دی تو اول یہ اعتراض شیخین پہ نہیں حضرت اسامہؓ پر ہے معہٰذا حضرت اسامہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کا اتباع کیا جس کے لیے عالم بالا سے ارشاد ہوا ادھر درگاہوں سے پروانہ آ چکا تھا۔

دوسرا جواب

یہ ہے کہ حاکم بالادست اگر کسی ملازم کو ایک کام کے لیے نوکری لے اور پھر اس کام کو آپ ہی منسوخ کر دے اور اس کی جا دوسرا کام سپرد کر دے تو کیا پھر بھی وہ نوکر بوجہ تعمیل نہ کرنے حکم اوّل کے مستوجب عتاب رہے گا؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھیے آخر ایام حیات میں ابوبکر کو امامت نماز پہ مامور فرمایا اول تو (یہ) جواب عام فہم بھی بہت ہے دوسرے لبشارت جواب سوال اوّل (یعنی) بہ تقرر امامت نماز امامت کبریٰ کا تقرر تھا جس کو خلافت کہتے ہیں اب اس غلام خاندان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی آپ کی خدمت میں اور سوائے آپ کے جو صاحب اہل انصاف ہوں ان کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ آخر حضرت اسامہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تو زیر حکم ہی تھے۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو ایسی طرح اپنا قائم مقام کیا کہ صاف کہنے سے بڑھ کر چنانچہ آیت فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا اس کے اثبات کے لیے

پیش کی تھی۔ اب فرمایئے حضرت اسامہؓ زیر حکم حضرت صدیقؓ ہو گئے یا ہنوز حضرت صدیقؓ ہی زیر حکم اسامہؓ رہے آپ ہی فرمایئے اگر اطلاق نویس وغیرہ ملازمان محکمہ تحصیل جو زیر حکم پیش کار رہتے ہیں قائم مقام تحصیلدار ہو جائے اور ہوئے جاتے ہیں سب کے نصیب ایسے ہی نہیں ہوتے جیسے کسی کم نصیبوں کے نصیب تو کیا اب بھی وہ اطلاق نویس زیر حکم حضرت پیش کار ہی رہا؟

شیخ صاحب! جب یہ باتیں تو تمہارے آپ سے سمجھ لینے کی تھیں۔ ہائے افسوس آپ ہم سے پوچھتے ہیں اس صورت میں حضرت عمرؓ کے لیے اجازت لینی بھی بتقاضائے ادب ظاہر امر نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی تھی ورنہ حاجت نہ تھی دیکھئے جواب ایسے ہوا کرتے ہیں۔

جواب ثانی از مولوی عبداللہ صاحب

(جیش اسامہؓ کا اصل واقعہ)

جب اصل اس قصہ کی معلوم ہو جائے گی تو یہ تخلف کا خدشہ رفع ہو جائے گا اصل یہ ہے۔

۲۶ صفر (۱۱ھ) روز شنبہ کو حضرت ؐ نے لشکر کی تیاری کا حکم بقتال رومیوں کے صادر فرمایا اور بروز سہ شنبہ اسامہؓ بن زیدؓ کو سردار لشکر کا بنایا اور چار شنبہ کو مرض حضرت کو لاحق ہوا اور روز پنج شنبہ کو باوجود علالت طبع شریف اپنے ہاتھ سے ایک نشان بنا کر اسامہؓ کو دیا۔ اسامہؓ نے بریدہؓ کو اپنا نشان بردار بنایا اور وہ نشان ان کے سپرد کر دیا اور موضع جرف میں بانتظار اجتماع لشکر کے قیام کیا اور حضرت ابوبکر حضرت عمرؓ اور عثمان اور سعد بن ابی وقاص اور ابوعبیدہ بن الجراح اور سعید بن زید اور قتادہ بن نعمان و سلمہ بن اسلم رضی اللہ عنہم نے اپنا سب سامان بمقام جرف بھیج دیا تھا اور خود چلنے پر تیار تھے کہ آخر روز چار شنبہ، اول شب پنجشنبہ حضرت کا مرض بڑھ گیا اور وقت عشاء شب پنج شنبہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو خلیفہ نماز پڑھانے کا بنایا چونکہ روز شنبہ کو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قدرے افاقہ ہو گیا جو لوگ کہ ہمراہی اسامہؓ کے متعین ہوئے تھے (انہوں نے) رخصت چاہی پھر دوبارہ شدت مرض نے عود کیا حتیٰ کہ جرف میں اسامہؓ کو حالت نزع کی خبر پہنچی بمجرد استماع اس خبر کے حضرت اسامہؓ اور دیگر صحابہ افتاں و

خیزاں[1] حضرت کے پاس آئے اور نشان دروازہ حجرہ مبارک پر نصب کر دیا ہر گاہ کہ دفن سے فارغ ہوئے اور امر خلافت کا حضرت ابوبکر رض پر قرار پایا حضرت ابوبکر رض نے اسی دم روانگی جیش اسامہ رض کا حکم فرمایا جب وہ جرف تک پہنچے بسبب انتقال حضرت کے بعض قبائل مرتد ہو گئے بعض اصحاب نے حضرت خلیفہ اول کو یہ رائے دی" درصورتیکہ بغل میں دشمن پیدا ہو گئے ہیں لشکر سنگین کا دور دراز بھیجنا خلاف مصلحت ہے۔ حضرت ابوبکر رض نے فرمایا کہ اگر مدینہ میں درندے میرا لقمہ کر لیں تو بھی میں خلاف فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ کرونگا۔ یعنی جیش اسامہ رض کو نہ واپس کروں گا حضرت ابوبکر رض نے باجازت اسامہ رض حضرت عمر رض کو اپنے پاس بلا لیا اور غرہ ربیع الثانی کو اسامہ رض نے بسوئے ابنی کہ ایک مقام ہے کوچ کیا۔

(حضرت ابوبکر و عمر رض سے طعن تخلف کا ازالہ)

اب جاننا چاہیے کہ حضرت ابوبکر رض کی طرف اس بات کا طعن ہے کہ وہ حسب فرمودہ حضرت تیار نہ ہوئے تو یہ بھی سب غلط ہے کیونکہ وہ سب سامان جُرف میں بھیج چکے تھے۔

اور اگر ان کی طرف یہ اعتراض ہے کہ بعد وفات کے انہوں نے تجہیز جیش نہ کی تو یہ بھی صریح غلط ہے کیونکہ بسبب ارتداد قبائل عرب کے بعض اصحاب کی تو یہ رائے ہی ہو گئی تھی پر حضرت ابوبکر رض نے تسلیم نہ کر کے اسی دم لشکر کو روانہ کیا اور اگر اعتراض حضرت ابوبکر کی طرف تخلف جیش کا ہے تو یہ بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ تخلف ان کا بامر الرسول بخلافۃ الصلوٰت تھا کیونکہ ایک امر دوسرے سے ماقبل کا ناسخ ہوتا ہے اور یہاں دونوں امروں کا تقدم و تاخر واضح ہو چکا ہے اور بعد وفات کے اس وجہ سے تشریف نہ لے گئے کہ تمام امت کے امور کے متولی ہو گئے تھے

---

[1] جیش اسامہ کے سلسلے میں شیعوں نے ایک ظلم عظیم یہ بھی کیا کہ حضور علیہ السلام کی نیک نیتی اور جذبہ جہاد پر (نفاق کا) بدترین الزام لگایا ملاحظہ ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض اسامہ رض کو اور اس جماعت (چار ہزار مہاجرین و انصار) کو محاذ جنگ پر بھیجنے سے تھی کہ مدینہ ان سے خالی ہو جائے اور کوئی منافق مدینہ میں نہ رہے حضرت بہت زیادہ اہتمام اس لشکر کے روانہ کرنے میں کرتے تھے اور ان کو خوب ترغیب اور شوق دلاتے تھے کہ اچانک آپ (مرض) وفات میں بیمار ہو گئے جب منافقوں نے حضور کی بیماری دیکھی تو باہر جانے میں دیر لگائی (حیات القلوب ج۲ ص۵۵۹ جلاء العیون ص۳۹ منتہی الآمال ج۱ ص۱۰۲ جہد ۱۲)

اگر ان کو چھوڑ کر وہاں تشریف لے جاتے تو اوّل تو قبائل عرب مرتدین کے ازدحام کا خوف دوسرے امر خلافت میں رخنہ پڑھے تیسرے یہ کہ کوئی متخیز یعنی جہان پناہ بناسہے تاکہ دفعتہً واحدۃً استیصال دین کا نہ ہو اور دار السلطنت بالکل خالی نہ ہو جائے۔

۲۷

سوال بست و ہفتم از جانب شیعہ (سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابو بکرؓ کا انتخاب)

شیخین اور دیگر صحابہ پیغمبر کو بلا تجہیز و تکفین چھوڑ کر سقیفہ بن ساعدہ میں واسطے قرار داد امر خلافت کے چلے گئے یا نہیں؟

جواب سوال بست و ہفتم

(خلافت کا بوجھ اٹھانا کار نبوت کی تعمیل تھی۔)

شیخین کا سقیفہ بنی ساعدہ میں جانا بغرض نفسانی نہ تھا جو آپ اتنا بُرا مانتے ہیں وہ بھی رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی کا کام تھا۔ تجہیز و تکفین میں حضرت وہ بات نہیں جو سقیفہ بنی ساعدہ کے جانے میں پر جیسے کہا کرتے ہیں، دیکھنے کو چشم بینا چاہیئے ایسی باتوں کو سمجھنا ہر کسی کا کام نہیں عقل صائب ذہن رسا چاہیئے مگر ہر چہ بادا باد ہم کو آپ کو سمجھانا ہے۔ انشاء اللہ بال کی بلی بنا کر دکھاتے ہیں تس پر بھی آپ (نہ) دیکھیں تو ہماری قسمت اوقات کھوئے قلم گھسایا کاغذ سیاہ کیا انگلیاں تھکائیں اور پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ قائم! یہ کیا بات ہے۔ منشی شیخ احمد صاحب مرد ہوشیار ہیں کہہ تو سہی کچھ جائیں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

منشی صاحب آپ سنیئے کچہری میں نوکری کر آئے ہیں کچہری کی بات آپ خوب سمجھیں گے ایک سرکار کے بہت سے کارخانے (محکمے) ہوتے ہیں پھر ہر کارخانے میں مختلف کام ہوتے ہیں۔ ہر کام پر ایک جدا نوکر ہوتا ہے دیکھیئے کلکٹری کا کارخانہ بھی سرکار ہی کا ہے فوجداری کا کارخانہ بھی سرکار ہی کا ہے۔ عدالت کا اسٹام کا، ڈاک کا، نہر کا ایک ہو تو گناؤں سب کارخانے سرکار انگلشیہ ہی کے ہیں پھر ہر کارخانے میں دیکھیئے کیا کیا کام ہیں ایک کارخانہ میں کوئی تحصیلدار ہے کوئی پیشکار کوئی پٹواری کوئی خزانچی کوئی کچھ کوئی کچھ یہاں تک کہ ایک سطر ایسی اسامی محرر آمد محصول منشیات بھی ہے۔ غرض مختلف کام ہیں ہر کام پر ایک ایک جدا ملازم تعینات ہیں ہاں کوئی معزز کام ہے

ہلکا، سو ایسا ہی تجہیز و تکفین بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا کام ہے اور نہلانا اور نماز جنازہ بھی آپ ہی کا کام ہے قبر کھودنی بھی آپ ہی کا کام ہے امامت نماز بھی آپ ہی کا کام ہے انتظام خلافت بھی آپ ہی کا کام ہے اس میں گھٹ کر تو قبر کنی ہے اور بڑھ کر امامت نماز اور انتظام خلافت۔

حضرت علی رضؓ نے تو تجہیز و تکفین کو سنبھالا اور حضرت ابوبکر رضؓ اور حضرت عمر رضؓ نے خلافت کا انتظام کیا اس میں تقدیر سے حضرت ابوبکر رضؓ ہی کو لوگوں نے گھیر لیا اور خلیفہ بنالیا اس میں ان کا کیا قصور وہ بیچارے تو بہت کچھ ٹالتے رہے پر ان کے ہوتے کوئی نظروں ہی میں نہ جچا اس کی ایسی مثال ہے کسی بادشاہ پر کسی غنیم نے تلوار چلائی سپاہی کوئی حاضر نہ تھا رعیت کے ایک آدمی نے بنظر خیر خواہی وہ وار اپنے سر پر لیا اور پھر غنیم کا سر قلم کیا۔ بادشاہ قدر شناس تھے اس خدمت کے انعام میں منصب سپہ سالاری پر اسے مامور کر دیا۔ دیکھیے اس شخص کے خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ میں اور سپہ سالار ہوں گا پر تقدیر کی الٹا پلٹی نے کہاں سے کہاں پہنچایا ظاہر میں خدمت مذکورہ بالا بہانہ ہو گیا۔ سو ایسے ہی لشہادت قصہ بیعت۔ ابوبکر رضؓ کو خلافت کا خیال تک نہ تھا ہاں دفع مفسدہ مدنظر تھا۔

(شیخین کا جانا ہی حضرت علی رضؓ، قریش اور مہاجرین کیلئے سودمند ہوا)

اگر یہ دونوں وہاں نہ جاتے تو انصار سعد بن عبادہ کو (خلیفہ) کر چکتے پھر حضرت امیر رضؓ کو اوّل بار ملتی نہ چوتھی بار شیخین چاہے نہ ہو سکتے پر ناشکری کا کیا علاج حضرات شیعہ تس پر بھی نہیں مانتے غرض کارپردازان تقدیر نے اُن کی حسن نیت اور حسن خدمت کے جلو میں کہ دین کے سر سے شیطان ایسا بھاری وار ٹالا ان کو خلیفہ بنا دیا بایں ہمہ وہ لوگ کچھ خلافت کو ایسا بڑا کام نہیں سمجھتے تھے جس کے واسطے یہ انتظار کرتے کہ فلانے کو آجانے دو اور فلانے کو بھی تشریف لانے دو یہ تو حضرات شیعہ نے غل مچا مچا کر اس کا انتظام کر دیا ورنہ حضرت علی رضؓ اور حضرت ابوبکر رضؓ تو اس کو اتنا بھی نہ سمجھتے تھے جتنا یہاں پٹواری کا یا چوکیدار کا عہدہ ہے۔ جو آپ کو کوئی پٹواری یا چوکیدار بنا دے تو آپ کیا خوش ہوں گے اور کوئی نہ بنائے تو آپ کیا شکایت کریں گے۔

بہرحال سقیفہ بنی ساعدہ میں جانا خدا ہی کے لیے تھا اس (تجہیز) کو چھوڑ کر جانا سمجھنا ایسا ہی ہے جیسا کفن کو چھوڑ کر قبر کھودنے کو جانا سو جیسے اس کام میں لگنے والے کو بوجہ بے غرضی اس کام کا چھوڑ کر چلے جانے والا اور میت کا دشمن کوئی عاقل نہیں سمجھتا یہاں بھی اہل عقل، انکار فرمایا (و،

انتظام خلافت کو یوں نہیں کہہ سکتے کہ بوجہ بے غرضی تجہیز و تکفین کو چھوڑ کر چلے گئے اور جو یوں ہی دھینگا دھینگی ہے تو یوں ہی سہی حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ اگر تجہیز چھوڑ کر چلے گئے تو پھر آ بھی گئے نماز پڑھی[1] دفن میں شریک رہے پر حضرت علیؓ انتظام مذکورہ میں بالکل شریک ہی نہیں ہوئے۔ پھر آپ جانتے ہیں کہ خلافت اور امامت کیا بڑا کام ہے اور تجہیز و تکفین کو اس سے کیا نسبت ہے امامت تو وہ کام ہے جس پر بقاء دین کا مدار ہے اور دین وہ چیز ہے جس کے لیے خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے بھیجا یہ کام عام نہیں۔ ہاں مرنا جینا کفن کاٹھی قبر کنی ایسی عام باتیں ہیں جس میں مسلمان کافر نیک و بد سب شریک ہیں سو اگر حضرت ابو بکر صدیقؓ ایک دو عام کام میں (بقول شیعہ) شریک نہ ہوئے تو حضرت علیؓ ایسے خاص کام میں شریک نہ ہوئے جس پر مدار کار دین و ایمان تھا اگر یہ کام درست نہ ہوتا تو دین کا پتا بھی نہ تھا اور اگر یہ عذر ہے کہ حضرت علیؓ کو کسی نے پوچھا نہ بلایا تو حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بھی کسی نے پوچھا نہ بلایا[2]

جواب ثانی از مولوی عبید اللہ صاحب

(مسلمانوں کے لیے والی ناگزیر تھا۔)

جاننا چاہیے کہ تجہیز و تکفین اہل بیت کے متعلق تھے اور تمام صحابہ کرامؓ کا اس میں شریک ہونا

---

[1] طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے حضور پر جنازہ پڑھا اور صف اول میں تھے۔ شیعہ کتاب حیات القلوب ج۲ ص۶۹۷ اور جلاء العیون ص۷۰ میں ہے کہ کلینی، شیخ طوسی نے بسند حسن حضرت صادق سے روایت کی کہ حضرت عباسؓ حضرت علیؓ کی خدمت میں آئے اور عرض کی کہ تمام لوگوں نے اتفاق کیا ہے کہ حضرت رسولؐ کو بقیع میں دفن کریں اور ابو بکرؓ پیش امام بن کر حضور پر نماز جنازہ پڑھائے الخ پتہ چلا کہ شیخین یقیناً حاضر جنازہ تھے۔ شیخ طبرسی نے امام محمد باقر سے روایت کی ہے کہ دس دس آدمی حجرہ میں داخل ہوتے تھے اور بغیر امام کے (بصورت دعا) آپ پر جنازہ پڑھتے تھے پیر کے دن منگل کی رات صبح تک اور پھر صبح سے شام تک حتی کہ تمام چھوٹوں بڑوں مردوں عورتوں مدینہ والوں اور مدینہ کے آس پاس والوں نے تمام لوگوں نے حضورؐ پر نماز اسی طرح پڑھی (حیات القلوب ج۲ ص۶۹۷) [2] یعنی رفع تنازعہ کے لیے ایک شخص کو بلا کر طے کیا۔ خلیفہ بننے بنانے کا پروگرام کسی کا نہ تھا وہاں کی صورت حال سے مجبور ہو کر سب صحابہؓ نے آپ کو خلیفہ چن لیا۔ ۱۲ مہر محمد

لازم نہ تھا۔ پس جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دار فانی سے بملک جاودانی انتقال فرمایا اور جمیع مہمات دینی اور دنیوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر موقوف تھے اور کفار بھی بسبب تسلط حضرت کے مغلوب تھے اب اگر ان کے بعد کوئی ان مہمات کا متولی نہ ہوتا تو طرفۃ العین میں کارخانہ ریاست اسلام کا درہم برہم ہو جاتا سالہا سال کی محنت و مشقت رائیگاں جاتی نئے سرے سے کفر کا جھنڈا کھڑا ہو جاتا اور شیطان علیہ اللعنۃ سب کو اپنی راہ لگا لیتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو چکی تھی اگر پھر ویسے ہی تاریکی جہل پھیل جاتی پھر کہاں سے آفتاب ہدایت کا نکلتا لہذا ضرور ہوا کہ کوئی شخص بمجرد وفات حضرت کے متولی تمام امور کا ہو جائے تاکہ جوں کی توں بات بنی رہے اور ریاست و سیاست کا کام بدستور جاری رہے اس میں اصلاح تمام امت کی مقصود تھی۔ بایں وجہ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ نے اس امر میں مبادرت کی اس لیے کہ تجہیز و تکفین کی طرف سے تو بسبب اہل بیت کے بےفکر ہو گئے تھے اور یہ بھی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت ہی تھی جیسا کہ نائب کا بڑھانا عین مدرس کی خدمت ہے۔ اور اگر بالفرض والتقدیر تجہیز و تکفین ان پر ہی موقوف ہوتی تو بھی بوجوہات مذکورہ بالا امر خلافت میں مبادرت کرنی ضرور تھی پس جس حالت میں تجہیز و تکفین کے متولی دیگر شخص ہوں تو ان کا امر خلافت میں مبادرت کرنا اولیٰ ہوا۔

(اگر انتخاب خلیفہ صحیح نہ ہوتا تو امت کا بڑا المیہ ہوتا۔)

کیونکہ اگر تجہیز و تکفین میں دیر ہو جاتی جیسا کہ تدفین میں تین روز لگ گئے تو کچھ حرج نہ ہوتا پر امر خلافت میں کچھ دیر کرنے سے کچھ کی کچھ بات ہو جاتی شعر

سدا دور دوراں دکھاتا نہیں ۔۔۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

تکفین و تدفین بھی حلاوت سے نہ ہوتی خدا جانے کیا کیا خرابیاں دم کے دم برپا ہو جاتیں چنانچہ بعد وفات نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انصار اس بات پر آمادہ تھے کہ سرداری ہم کو ملے بہت سے بہت یہ ہو کہ ایک ہم میں سے سردار ہو اور ایک تم میں سے پس اگر وہ مبادرت نہ کرتے اور بیعت کسی انصاری کے ہاتھ پر منعقد ہو جاتی تو اب اس میں دو صورتیں تھیں۔ یا تو مہاجرین بھی اسی شخص کی بیعت اور اطاعت قبول کرتے یا کوئی اور جداگانہ اپنا خلیفہ بناتے در صورت اول کے اس حدیث شریف کے مخالف ہوتا۔ الملك في قريش والقضاة

فی الانصار والاذان فی الحبشة الخ بعض روایات میں الخلافة فی قریش صراحۃً آیا ہے جب انصار کو ہی خلافت مل جاتی پھر کہاں سے مہاجرین کو خلافت نصیب ہوتی اور دوسری صورت میں یعنی مہاجرین کا خلیفہ جداگانہ بنا لینے میں تفرق کلمہ لازم آتا اور منشاء خدا و رسول اتحاد و اتفاق کو چاہتا ہے۔ چنانچہ آیت

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِہِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَہُمْ۔ (اگر آپ زمین کے سب خزانے خرچ کر دیتے تو بھی ان کے دلوں کو نہ جوڑ سکتے۔ لیکن اللہ نے ان کے درمیان الفت ڈالدی)

اور حدیث تطویل قراۃ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہ باوجود ان پر عنایت بے حد کے حضرت کا اَفَتَّانٌ یَا مُعَاذُ فرمانا دلالت کرتی ہے اس صورت میں وہ بات ہاتھ سے نکل جاتی اور کار ریاست و سیاست کا بخوبی انجام نہ ہوتا اور باہمی منازعت کا بھی خوف تھا چنانچہ لَوْکَانَ فِیْہِمَا اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا سے مستفید ہے کہ اگر ایک سلطنت میں دو حاکم ہوں تو وہ برباد ہو جاوے گی معلوم ہوا کہ ایک امر خلافت میں دو خلیفہ کا ہونا موجب خرابی کا ہے بایں نظر شیخین نے اس کی تاسیس و توثیق میں مبادرت کی۔

حضرات شیعہ جیسے خود ملوث بطمع دنیا دنیہ اور سگ دنیا ہیں ویسے ہی خیالات معاذ اللہ اکابر و ارکان دین کی طرف بھی نسبت کرتے ہیں کیسے کج فہم ہیں اس موٹی بات کو نہیں جانتے کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتی ہیں۔

سوال بست و ہشتم ۲۸ از جانب شیعہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ اہل حل و عقد ہیں یا نہیں اگر داخل ہیں تو ان کو کیوں شامل نہیں کیا اجماع میں

جواب سوال بست و ہشتم (اجماع کیلئے بر وقت تمام اہل حل و عقد کی حاضری ضروری نہیں)

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ اوّل جیسے کے اہل حل و عقد میں سے تھے پر اجماع کے انعقاد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ سارا جہان ایک آن واحد اور ایک ہی لحظہ میں ایک بات منہ سے کہیں

یہ تو آپ کے نزدیک بھی ممکن نہ ہوگا ہاں یہ باتیں بتدریج آگے پیچھے ہوا کرتی ہیں حضرت علیؓ سے جو بیعت ہوئی تو وہ بھی ایک دفعہ نہیں ہوئی بلکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر سب نے ایک ساتھ ہی بیعت نہیں کی جب کبھی کوئی آجاتا تھا بیعت کر جاتا تھا اور بیعت تو درکنار اسلام بھی سب کا ایک ساتھ نہیں کوئی آج مسلمان ہوا کوئی دس برس کے بعد کوئی بیس برس کے بعد سو ان کی بیعت تو آپ بھی جانتے ہیں جبھی ہوئی ہوگی جب وہ مسلمان ہوئے ہوں گے یا اس کے بھی بعد یا یوں کہو انہوں نے بیعت کی ہی نہ ہو بہر حال یہ تو ممکن ہی نہیں کہ قبل اسلام بیعت کر گئے ہوں سو جو نسے احتمال پر آپ جمیں ہمارا ادھر ہی لکھا ہے۔ غرض ہمارا مطلب کسی طور ہاتھ سے نہیں جاتا بہت سے آدمی تو سقیفہ بنی ساعدہ ہی میں دست بیعت ہوئے پر بیعت عام دوسرے روز ہوئی اس میں حضرت علیؓ نے اور بھی بعد میں بیعت کی[1] پر یہ بعد میں رہ جانا باین معنیٰ نہ تھا کہ ان کی خلافت کے منکر تھے اور اگر بالفرض انکار خلافت حضرت صدیق اکبرؓ ہو تو پھر حضرت علیؓ کی روز کی نمازوں اور جمعہ کے خطبوں کے سننے اور جہادوں کے باندھنے میں مال اسباب کے تصرف میں لانے کی کوئی وجہ متصور نہیں بلکہ شیعوں کا یہاں ایسا قافیہ تنگ ہوگا کہ بزبر بزتر ہی کرنی پڑے گی۔

(کلمۂ امامت کو اصولی ماننے سے سب دنیا کافر ٹھہرتی ہے)

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ تو حضرت امیرؓ کی خلافت بلا فصل کے منکر کیا مزاحم ہی تھے ہم بھی جانتے ہیں تم بھی جانتے ہو پھر اگر حضرت امیرؓ بھی حضرت صدیقؓ کی خلافت کے معتقد نہ ہوں یعنی سنی نہ ہوں شیعہ مذہب ہوں تو یہ معنیٰ ہوں گے کہ حضرت صدیقؓ اور عمرؓ

---

[1] حضرت علیؓ کا صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت کرنا ایک تاریخی حقیقت اور احادیث میں مذکورہ مسلمہ طرفین مسئلہ ہے۔ معتبر کتب شیعہ سے چند حوالہ جات ملاحظہ ہوں۔ ۱۔ کافی کے کتاب الروضہ ص ۲۳۶ طبع ایران و ص ۱۱۵ طبع لکھنؤ میں حدیث ارتداد میں ہے امام باقرؒ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب لوگ سوائے تین کے مرتد ہو گئے مقدادؓ ابوذرؓ سلمانؓ فارسی ان پر چکی پھری اور یہ (ابوبکر کی) بیعت سے منکر ہے حتی کہ لوگ امیر المومنین علیؓ کو لے آئے فبایع آپ نے بیعت کی تو تین حضرات نے بھی کر لی۔ ۲۔ احتجاج طبرسی ص ۴۸ میں ہے مَا مِنَ الْاُمَّۃِ اَحَدٌ بَایَعَ مُکْرَھًا غَیْرَ عَلِیٍّ وَاَرْبَعَتِنَا امت میں ایک بھی فرد ایسا نہیں جس نے (ابوبکر کی) بیعت ناخوشی سے کی ہو سوائے علیؓ اور ہمارے چار صحابیوں کے) تقیہ اور مجبوری کا عذر پہلے رد کیا جا چکا ہے۔ ۱۲ مہر محمد۔

کافر تھے نعوذ باللہ۔ کیونکہ جیسے ہمارے نزدیک ایمان کے دو جز ایک لا الہ الا اللہ، دوسرا محمد رسول اللہ (ہے) شیعوں کے نزدیک ایک تیسری شاخ امامت کی اور بھی ہے۔ جیسے ہمارے نزدیک آدمی انکارِ لا الٰہ الا اللہ یا انکار محمد رسول اللہ سے کافر ہو جاتا ہے ان کے نزدیک انکار امامت حضرت امیر وغیرہ ائمہ ھدیٰ سے بھی کافر ہو جاتا ہے۔ بہر حال اگر حضرت علیؓ شیعہ مذہب ہوں تو ان کو بھی اپنی امامت پر ایمان لانا ایسا ہی ضرور ہو گا جیسے بشہادت آیت اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اور نیز بشہادت آیت قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ۔ (فرمایئے میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا سب اللہ کی رضا کے واسطے ہے جو رب العلمین ہے اس کا کوئی شریک نہیں مجھے اسی کا حکم ہوا میں پہلا ماننے والا ہوں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رسالت پر ایمان ضرور ہے۔ اور ظاہر بھی تو ہے اگر رسول اور امام ہی کو اپنی رسالت اور امامت کا انکار ہو تو پھر دوسروں کو کیونکر کہہ سکتا ہے کہ مجھ پر ایمان لاؤ اس صورت میں حضرت امیر منکران امامت کو ایسا ہی کافر سمجھتے ہوں گے جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم منکران رسالت کو۔ پھر فرمایئے حضرت علیؓ جو ہمیشہ ان منکران امامت کے پیچھے نماز پڑھتے رہے تو کیا باعث تھا؟ کافروں کے پیچھے نماز درست ہو جاتی ہے؟ یا یہ لوگ امامت پر ایمان رکھتے تھے اور شیعان پاک میں سے تھے یا امامت کی شاخ ایسی ہے جیسا کسی نے کہا ہے شعر۔

عریاں ہی دفن کرتا تھا زیر زمین مجھے | اک اور دوستوں نے لگا دی کفن کی شاخ

ہم سے اگر پوچھتے ہیں تو یہی صحیح ہے۔ ورنہ پھر مذہب امامیہ کی خیر ہے نہ حضرت امیر کی امامت اور بزرگی کے صحیح سالم رہنے کی کوئی تدبیر بالجملہ تین پانچ کرنے کو تو بہت سی باتیں ہیں اس بات کا جواب نہ مجتہد صاحب سے آئے نہ امام زمان کے پاس سے کوئی جا کر لائے یہ بات لاجواب ہے اور کیوں نہ ہو دروغ گو را حافظہ نباشد بانیانِ مذہب شیعہ یہاں آکر چوکڑی بھول گئے۔

آگے سنئے یہی نہیں کہ نمازیں پڑھیں حضرت امام زین العابدینؒ کی والدہ بلکہ حضرت امیرؓ کی حرم محترم انہیں خلیفوں کے جہاد میں آئی تھیں جن کو کافر نہ کہیئے تو مذہب شیعہ اڑ جاتا ہے اور کافر کہیئے تو پھر جہاد کی کوئی صورت نہیں جو کچھ ہوا پھر ان حرموں کے مالک ہوئے تو کیونکر ہوئے جو آگے زیر تصرف

رکھنے کی گنجائش ہو اگر یوں ہوتا کہ مسلمان کر کے آگے پیچھے نماز ہی پڑھوا لیتے تب بھی ایک بات بھی یہ بھی نہ ہوا، کیسے توسہی کیا ہوا۔ اور (رہا) یہاں نکاح کا بہانہ کر لینا تو مال کا تو نکاح ہی نہیں ہوتا۔

اس سے آگے بڑھ کر اور سنیئے۔ طاہرہ مطہرہ جگر گوشۂ رسول سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرۃ العینین، حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی راحت جان۔ حضرت حسنینؓ کی قوت دل تمام اہل ایمان کے دین و ایمان کو حضرت ام کلثومؓ دختر شکم خاص حضرت بتولؓ کو حضرت عمرؓ سے بیاہ دیا ایسی پاک طاہر پاک باطن کو سن خورد سالی میں ایسے کافر کہنہ سال کے کوئی حوالہ کرتا ہے؟۔ ذرا سی بات پر فوج شام و عراق سے تو لڑ مرے اور ایسی پاک دامن کو یوں بے چون وچرا عمرؓ کے حوالے کر دیا یہ مسلمان کا کام تو نہیں کہ ایسے افسانوں کو بے موقع احتمالوں محمول کیجے خدایا میرا تو بال بال کانپتا ہے۔ یہ خبیث کس طرح ایسی بے ہودہ باتیں بک دیتے ہیں۔ اگر حضرت عمرؓ کا لحاظ نہیں تو ننگ و ناموس اہل بیت نبوت کا تو لحاظ کیا ہوتا۔ دیکھئے اس نکاح سے زید بن عمر پیدا ہوئے اور پھر بقضائے الٰہی اپنی والدہ کے انتقال ہی کے دن خانہ جنگی میں مارے گئے یہاں تک کہ اکھٹی دونوں جنازوں کی نماز پڑھی گئی۔

بہرحال حضرت علیؓ و حضرت عباسؓ دونوں معتقد خلافت حضرت صدیقؓ تھے اور انعقادِ اجماع کے لیے اتنی بات کافی ہے ہر ہر شخص کی بیعت کی ضرورت نہیں یوں تو بہت سے چھوٹے بڑے نزدیک و دور کے لوگ رہ گئے ادھر آج کل کے اہل سنت سب اجماع میں داخل ہوتے چلے جاتے ہیں اور بیعت کا کچھ حساب نہیں۔

(کچھ دن بعد بیعت کر کے حضرت علیؓ نے تمام شبہات کا ازالہ کر دیا۔)

الغرض اعتقاد دلی اور شہادت حالی یا مقالی چاہیے۔ سو بحمد اللہ یہ بات قبل بیعت بھی حضرت علیؓ کو حاصل تھی اور بعد بیعت بھی باقی رہی پر جب حضرت امیرؓ نے دیکھا کہ مردمانِ ظاہر بین اور سادہ لوحانِ صحرا نشین اس بیعت کے نہ کرنے کو اور بات پر محمول کرتے ہیں۔ ادھر موافق مزعوم شیعہ علم ما کان و ما یکون حاصل تھا یہ سمجھ کر کہ آخر زمانے کے ہمارے نادان دوست جن کو شیعہ کہیں گے کچھ اور دست کشی کے پتے بہت ہاتھ پاؤں پھیلائیں گے زبان کے سستے اور بہت کچھ کہیں

گے۔ حضرت صدیق رضؓ کے ہاتھ پر بیعت کر کے شبہ مکنون مترددین کے دل سے مٹا دیا پر جن کے دل کو یہ خیالات فاسدہ ایسی طرح کھا گئے تھے جیسے تلوار یا کسی اور ہتھیار کو مورچہ ان کی اصلاح نہ ہوئی وہ اسی لکیر کو پیٹتے جاتے ہیں اور حضرت امیر کی راہ پر نہیں آتے۔

(اعتذار و دعائے مؤلف)

اب بس۔ کیجیے اور جانے دیجیے یا اللہ تیرا شکر ہے یہ تیری عنایت ہے کہ مجھ۔ جیسے ہیچمدان بلکہ نادان سے ایک دن اور کچھ اوپر آدھی رات میں اکھٹے اٹھائیس سوالوں کا جواب لکھوا دیا تیرا شکر کس زبان سے ادا کروں ہر بن و مو میں بھی زبان ہو تو پھر بھی ایک ادنیٰ سے ادنیٰ احسان کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ اے میرے اللہ! میری نیت تو ویسی ہی ہے جیسا میں ہوں تو اپنے کرم سے اس کو قبول فرما کر میرے لیے ذریعہ آخرت کر دے اور اس تحفہ محمدہ کی بدولت حضرات اہل بیت اور صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم (ورضی اللہ عنہم) کی خوشنودی میرے نصیب کر پھر ان کے طفیل سے اپنے حبیب پاک سید لولاک کی عنایت میں اس کمینہ عالم کو شامل کر اور مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور تمام احباب کو بخش کر مجھ کو مسرور کر آمین ثم امین فقط۔

التماس بخدمت منشی شیخ احمد صاحب

منشی صاحب! میری کم فرصتی اور کم توجہی کا حال اگر نہ سنا ہو تو حاجی ظہور الدین احمد صاحب سے دریافت فرمائیں آپ کے لیے یقین جانئے انگلیاں تھک گئیں کل شام بیٹھ کر آدھی رات تک لکھا آج صبح سے اسی خیال میں تھا اس وقت بعد عشاء فراغت پائی اب بھی انگلیاں نہ تھکیں تو اور کیا ہو گا بار بار یہ شعر یاد آتا ہے۔ شعر۔

حال دل لکھوں کب تک جاؤں اس کو دکھلا دوں انگلیاں افگار اپنی خامہ خون چکا اپنا

آپ نہ مانیں تو بجز اس کے اور کیا لکھوں مصرع۔ "جو اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو پھر اس کو خدا سمجھے"۔ خیر یہ تو آپ کے حسن اخلاق کے بھروسے عرض معروض تھی۔ دوسری عرض یہ ہے کہ آپ نے وہی پرانے سوالات کیے جو اوّل سے شیعوں نے ایجاد کیے اور صدہا جواب اس کے سینوں کی طرف سے ہو چکے۔ بروئے انصاف! یہ تو تنگ کرنا ٹھہرا۔ آپ کو تو نہیں

کہہ سکتا۔ شیعوں کو تو ڈوب مرنے کی جا ہے جواب دندان شکن سنتے چلے جاتے ہیں اور پھر بھی اپنی گالی گفتار سے باز نہیں آتے۔ بھلے مانسوں کو تو منہ پر کھا کر تاب مقابلہ نہیں رہتی۔ ہاں بیجا البتہ پٹتے جاتے ہیں اور گالی گفتار سے باز نہیں آتے۔ آپ نے یا جس نے یہ سوال کیا یہ سمجھا ہوگا کہ سنیوں میں ایسا کون فارغ بیٹھا ہے جو اپنا نماز روزہ چھوڑ کر اس طومار کا جواب لکھے گا ہمیں کہنے کو جگہ ہو جائے گی۔ یہ نہ سمجھا ہوگا کہ قاسم سے گنہگار بھی بہت ہیں جن کو (نفلی) نماز روزہ کی چنداں توفیق نہیں پھر تس پر ایسے ویسے صدائے بے معنی کو یوں ہی چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں اور اوروں کا وار بھی نہیں آتا، سو آپ خدا کے لیے غور فرمائیں،

اور پھر بھی راہ پر نہ آؤ تو مجتہدان ضلع سہارن پور و مظفر نگر سے ان جوابوں کا جواب اور میرے سوالات مرسلہ کا جواب لکھوا کر بھجواؤ پر جواب ہو تو ایسا بے ٹھکانہ ہو جیسا جاٹ رے جاٹ تیرے سر پر کھاٹ کے جواب میں کہا تھا۔ "تیرے سر پر کولہو! اگر بوجھ ہی میں دبانا منظور ہو تو آپ ہی بہت ہیں مگر ہمیں کون سکھلائے۔ ہم دونوں علم پڑے ہیں بے تکی کہنی بھی آتی ہے، غرض ان اٹھائیس ۲۸ سوالوں کا بوجھ جیسے مجھے یاد ہے گا ان شاء اللہ اس سے زیادہ جناب مجتہدین چکر میں آئیں گے فقط۔

جواب ثانی از جانب مولوی عبداللہ صاحب

یہ دونوں صاحب داخل حل و عقد ہیں پر تمام اہل حل و عقد کا آن واحد میں اجتماع محال ہے اور نیز انعقاد بیعت کے لیے تمام کا موجود ہونا ضروری ہی نہیں ہاں اکثر کا مجمع ہونا ضرور ہے سو اکثر لوگ مہاجرین اور انصار جمع ہو ہی گئے تھے اور حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ اگرچہ بضرورت مشغولی تجہیز و تکفین اجماع میں شامل نہ تھے مگر حضرت ابوبکرؓ کی خلافت و فضیلت کے منکر بھی نہ تھے افضلیت حضرت ابوبکرؓ کی ہر صغیر و کبیر کی زبان زد تھی کس نے بایں وجہ بیعت میں تاخیر نہیں کی کہ حضرت ابوبکرؓ لائق امامت و خلافت کے نہیں یہ تو شیعہ ہی سمجھ کر اپنا دونوں جہاں کا برا کرتے ہیں۔

(حضرت علیؓ کا ملال و عتاب دوستانہ تھا)

صرف حضرت علیؓ کو اسی بات کا ملال تھا کہ باوجود اس اتحاد باہمی کے پھر مجھ کو کیوں نہ شامل

کیا کس لیے ایسی جلدی کی چونکہ حضرت امیر اسد اللہ الغالب تھے بسبب کمال شجاعت کے ان کے خیال شریف میں برہمی درہمی سلطنت کا کچھ خطرہ نہ گزرا اور بے وجہ حضرت ابوبکر و عمر رضہ کی مبادرت کو پسند نہ فرمایا حالانکہ ان کے نزدیک امر سلطنت کا اہتمام پیشتر کر لینا اولیٰ و اقدم ہوا تاکہ دفن حضرت اور دیگر امور بجمع خاطر ہوں اور اگر خدانخواستہ اس امر کا پیشتر سے اہتمام نہ کیا جاتا اور انصار بعد سردار مقرر کر لیتے تو حضرت عباس و حضرت علی (رضی اللہ عنہما) کیونکر روکتے بیٹھے بٹھائے طرفۃ العین سلطنت اسلام جاتی رہتی۔ اور حضرت علی رضہ کی اتنی شکایت کچھ بے موقع نہ تھی بلکہ اپنوں ہی کی شکایت کیا کرتے ہیں غیر کا کون شاکی ہوتا ہے شعر:

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے　　　بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

اگر ان کو شکایت تھی تو محبت بھی تھی کبھی قبل خلافت یا بعد خلافت حضرت ابوبکر رضہ کی حضرت علی رضہ نے برائی نہیں کی بلکہ تتبع احادیث سے تعریف کرنی ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ خاص اس قصہ میں بھی کی ہے۔

اِنَّهُ لَمْ يَحْمِلْهُ عَلَى الَّذِي صَنَعَ نَفَاسَةً عَلَى اَبِي بَكْرٍ وَلَا اِنْكَارَ لِلَّذِي فَضَّلَهُ اللّٰهُ بِهِ۔ (بخاری ص ۶۰۹ ج ۲)

(حضرت ابوبکر رضہ کے بیعت لینے پر حسد کے طور پر تاخیر نہیں کی اور نہ اس فضیلت سے انکار کی بدولت جس کا شرف اللہ نے ابوبکر رضہ کو بخشا ہے)

اور حضرت صدیق رضہ نے جو مرتدین بنو حنیفہ سے جہاد کیا وہاں کی سبایا میں سے ایک لونڈی خولہ نامی حضرت علی مرتضیٰ کو بھی ملی اور آپ نے اس پر تملک یمین تصرف فرمایا اور محمد بن حنفیہ اس کے بطن سے پیدا ہوئے اور شہر بانو یزدگرد بادشاہ شاہ ایران کی بیٹی کہ حضرت عمر رضہ کے وقت میں پکڑی ہوئی آئی اور حضرت امام حسین رضہ کو ملی اور امام زین العابدین اس کے بطن سے پیدا ہوئے۔

اور جو کچھ باہم اتحاد اور رشتہ و قرابت پیش رہا ہر چند اصول شیعہ پر تقیہ کی رو سے تھا مگر (تعلق مذکور) ان خیالات کو بیخ و بن سے اکھاڑتا ہے اور تقیہ بقدر ضرورت ہوتا ہے نہ ہر امر میں۔ تردید تقیہ کے لیے تو اتنی ہی بات کافی ہے کہ حضرت علی رضہ کے دل میں جب تک ملال رہا بیعت نہ کی اور جب صاف ہو گئے فوراً کر لی اگر خدانخواستہ تقیہ کرتے تو بیعت میں اتنی مدت کیوں لگاتے معلوم ہوا جو کرتے تھے بے باکانہ صاف دلی سے کرتے تھے۔ فقط۔

مادہ تاریخ از مولوی عبداللہ صاحب

قال تعالیٰ ۔ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ط

مادہ تاریخ تبیعتہا از فکر رسا عزیزم حافظ مولوی معین الدین صاحب خلف الرشید مولوی محمد یعقوب صاحب

مولوی میرے بھائی عبداللہ — جن میں حق نے سبت بھرے ہیں گُن
ان سوالوں کے ایسے لکھے جواب — جن سے شیعوں کی اکھڑی بیخ و بُن
سن روافض نے ان جوابوں کو — سر کو اپنے کہا یہ سنی وُھنن
یوں تو بودا تھا پہلے ہی مذہب — ان جوابوں سے لگ گیا اور گُھن
ہاتف غیبی نے ندا تب کی — سال تاریخ میں یہ آیت سُن
یوں ازل میں ہی اے معینؔ حق نے — کہدیا فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ

ایضاً منہ سلمہ

مَنْ تَوَاضَعَ وُقِرَ — وَمَنْ تَعَاظَمَ صُغِرَا

۲۴ سوالات از جانب اکمل الکملا افضل الفضلا نُخبۃ الاکارم

جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب بخدمت علمائے اہل تشیع

۱ ۔ عقیدۂ امامت جزو ایمان ہے اس کا ثبوت یقینی چاہیئے پر نہ کلام اللہ میں اس کا پتہ نہ احادیث متواترہ میں اس کا ذکر ۔ جواب موجہ بیان فرمایئے اور آئیں بائیں نہ اڑایئے ۔

۲ ۔ اگر آیت انما ولیکم اللہ سے امامت حضرت امیر علیہ السلام ثابت ہوتی ہے تو اس سے اور اماموں کی امامت باطل ہوتی ہے ۔ چنانچہ لفظ انما سے ظاہر ہے ۔

۳ ۔ لفظ ولی کے بمعنی حاکم ہونے پر کون سی کتاب لغت شاہد ہے اور اگر کوئی کتاب اس پر دلالت کرتی ہے تو کون سی ضرورت ہے کہ معنی مشہور "محبوب" چھوڑ کر یہ معنی لیتے ہیں بایں ہمہ جب احتمال آگیا تو پھر کلام مشتبہ ہو گئی قابل استدلال نہ رہی وہ بھی ایسی ضروریات دین کے لیے ۔

۴ ۔ امام زمان باہر کیوں نہیں آتے اور تشریف لاکر دین نبی کی تائید کیوں نہیں کرتے اگر عذر

تقیہ تھا تو بھی شیعان ایران و ہند و مخلصان دکن و سندھ کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہاں اگر شیعوں کو حضرت امام ایماندار نہیں سمجھتے اور بظاہر ہوگا تو یہی ہوگا ویسی فرمایئے۔

۵۔ اگر امام کا تقرر اس غرض سے ہے کہ امتیوں کو غلطی نہ ہو تو حضرت امام روپوش رہتے ہیں خطاوار ہیں اور اگر کوئی اور غرض ہے تو ضرورت ہی کیا تھی جو ایمان میں ایک تیسری امامت کی آچر لگائی اور پھر سینوں پر بوجہ خلافت خلفاء کے جو معصوم نہیں کیا اعتراض رہا؟

۶۔ کلام اللہ بعینہٖ محفوظ ہے۔ تو اول احادیث کلینی اور اتفاق مذہب کا کیا جواب؟ دوسری آیات مدح صحابہؓ مثل والسابقون الاولون اور الذین امنو وھاجرو وجاھدو الخ اور والذین معہٗ اشداء علی الکفار وغیرہ پر ایمان میں کیا دیر ہے۔ اور اگر صحابہؓ کے ایمان میں کلام ہے تو سوا ان کے جو کوئی ان آیات کا مصداق ہے اس کے ایمان پر کیا دلیل ہے۔ ایسی دلیل جس سے خوارج کو ساکت کر سکو پیش کرو۔

۷۔ اگر کلام اللہ غیر محفوظ ہے تو اول تو اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ (ہم نے ہی ذکر (قرآن) اتارا اور ہم ہی اس کے یقیناً محافظ ہیں) وغیرہ کا کیا جواب دو گے بشہادت حدیث ثقلین شیعوں کو ثقلین کے ساتھ تمسک باقی نہ رہے گا۔

۸۔ حضرت امام حسن عسکریؒ نے جو اسی کلام اللہ کی تفسیر لکھی باقی کلام اللہ کی نہ لکھی تو کیا ان کو بھی مثل اور شیعوں کے کلام اللہ یاد نہ تھا۔

۹۔ تقیہ کی کیا سند ہے یعنی کہیں کلام اللہ میں حکم ہے یا ارشاد نبوی ہے کہ کیا کرو۔

۱۰۔ تقیہ کس غرض سے دین میں داخل ہوا اگر نبی و امام دین بتانے کے لیے آئے ہیں تو چھپانے کے کیا معنیٰ اور چھپانے کے لیے ہیں فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ (پ۱۴ ع۶) (جو تم آپ کو ملے واشگاف سناؤ اور مشرکوں سے اعراض کرو) کے کیا معنیٰ ہیں۔

۱۱۔ غار میں آپ کے ساتھ کون تھا حضرت ابوبکر صدیقؓ تھے؟ اور یہی کہو گے تو بعد اس کے کہ خدا ان کو بشہادت لفظ "صاحبہ" صحابی کہتا ہے، تم کیوں نہیں کہتے۔

۱۲۔ حضرت ابوبکرؓ کی شان میں کلام اللہ میں اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا فرمایا ہے خدا تو ان کا ساتھ دے تم کیوں نہیں دیتے۔

۱۳- حضرت علی یا ائمہ اہل بیت کی شان میں کہیں ان اللہ معنا ہے۔

۱۴- حضرت ابوبکر رضؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے امام بنایا اگر وہ کافر تھے یا فاسق تھے (معاذ اللہ) تو کیوں بنایا؟

۱۵- حضرت امیر رضؓ نے شیخینؓ اور حضرت عثمانؓ کے پیچھے نمازیں کیوں پڑھیں اور ان کے زمانے کے جہادوں کی باندی غلام کیوں اپنے تصرف میں رکھے اگر وہ کافر تھے تو یہ نماز نہ ہوئی نہ جہاد پھر نہ مال حلال ہوا نہ باندیاں اور مسلمان تھے تو بے اقرار امامت کیوں کر مسلمان ہو گئے۔ جواب معقول دیجیے۔

۱۶- موافق ارشاد آیت۔ الذین اٰتینٰھم الکتٰب یتلونہ حق تلاوتہ الخ (جن کو ہم نے کتاب دی وہ اس کو کما حقہ پڑھتے ہیں وہی اس کے مومن ہیں البقرہ ع ۱۴) جو منجملہ علامت ایمان ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس فرقہ کے لوگ بحضرت تلاوت قرآن کریں گے وہ تو مومن ہوں گے باقی کافر اب فرمایئے کہ ایسے لوگ شیعہ ہیں یا اہل سنت جواب معقول لکھئے اور اگر حق تلاوت سے خشوع و خضوع مراد لیتے ہو تو شیعوں میں وہ بھی نہیں اس لیے کہ خشوع کے لیے اعتقاد چاہیے شیعہ کلام اللہ کو بیاض عثمانی سمجھتے ہیں بایں ہمہ حق تلاوت مفعول مطلق ہے اور عامل اس کا یتلونہ ہے اس لیے ضرور ہے کہ وہ بھی از قسم تلاوت ہو۔ سو خشوع و خضوع امر قلبی ہے اور تلاوت امر لسانی۔

۱۷- آیت اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ حفظ کلام اللہ خدا کا کام ہے اس صورت میں سنی بندگان خاص ٹھہرے کہ خدا کا کام کرتے ہیں اور ان کا کیا خدا کی طرف ایسی طرح منسوب ہو جاتا ہے جیسے راج مزدوروں کا بنایا ہوا مکان صاحب مکان کا بنایا کہا کرتے ہیں۔

۱۸- شیعوں کو کلام اللہ یاد کیوں نہیں ہوتا اگر یہ وجہ ہے کہ صحابہ استاذ کلام اللہ ہیں اور استاذ کا بُرا کہنے والا کامیاب نہیں ہوتا تو بہ کیجیے باقی یہ جو کہیں کہیں شیعہ ملقب بحافظ ہیں یا ایک دو کا کہیں کہیں نشان دیتے ہو البتہ اوّل تو کہنے کی باتیں ہیں اور اگر سچ بھی ہو تو اہل سنت کے مقابلہ میں ایک دو کا حافظ ہونا بہت شرمانے کی بات ہے۔

۱۹- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم حیات النبی ہیں تو حضرت فاطمہؓ نے ترکہ کیوں مانگا زندوں کے مال میں میراث جاری نہیں ہوتی اور شہیدوں کی نظیر دو تو یہ نظیر کام کی نہیں کیونکہ شہداء یہاں کے

بدن سے زندہ نہیں اس بدن کے حساب سے تو مردہ ہیں ہاں جنت میں ان کو دوسرا بدن مل جاتا ہے اور موت کا جواب بھی کام کا نہیں کیونکہ موت سے حیات جاتی رہتی ہے تو آپ حیات النبی نہیں اور نہیں جاتی تو میراث کی کوئی صورت نہیں۔

۲۰۔ کلینی وغیرہ کتب شیعہ سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ فدک منجملہ اموال فے ہے اور آیت ما افاء اللہ علی رسولہ الخ[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ اموال فے مملوک نبوی نہ تھے اس لیے کہ اول تو بشہادت آیت ذوی القربیٰ یتامیٰ، مساکین وغیرہ شریک جن کی کوئی تعداد معین نہیں جو ان سب کو پہنچاتے دوسرے بشہادت آیت والذین جاء و امن بعدھم سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ منجملہ مصارف وہ لوگ بھی ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے اور قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے سو ان کی شرکت تک کی کوئی صورت نہیں کیونکہ مالک بالفعل موجود ہونا چاہیے بایں ہمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انواع کے ہر ہر فرد کو نہ زمین فدک بانٹی نہ اس کی آمدنی بانٹی اگر ملک ہوتی تو ان سب ہی کی ملک ہوتی اور آپ ضرور تقسیم کرتے۔ ہو نہ ہو وقف ہو اس صورت میں حضرت فاطمہؓ نے کیوں طلب کیا کیونکہ وقف میں نہ میراث جاری ہو نہ ہبہ۔

۲۱۔ اگر خطاب فانکحوا عام ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چار سے زیادہ نکاح کرنے کی وجہ بیان فرمایئے اور خاص ہے تو خطاب یوصیکم اللہ بھی خاص ہوگا۔ اس صورت میں حضرت فاطمہؓ نے دعوئ میراث کیوں کیا اور اگر آیت یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَحْلَلْنَا لَكَ سے تخصیص فانکحوا کرتے ہو اول تو بعد ثبوت تاخر نزول آیت یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ یہ بات متصور ہے اور ثبوت تاخر معلوم۔ دوسری ایسی تخصیص بلکہ اس سے بھی زیادہ تو بوسیلہ اُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ

---

[1] مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ الخ (حشر پ ۲۸ ع ۴)

دیہات والوں کا جو مال اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو بدون جہاد عنایت کیا وہ اللہ کا ہے اور رسول کا اور رسول کے قرابت مندوں کا اور یتیموں مسکینوں اور مسافروں کا تاکہ وہ مال غنیمت تمہارے دولت مندوں کے مابین چکر کھاتا نہ پھرے الخ۔ ۱۲ مہر محمد

سب کے لیے متصور ہے

۲۲ ۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کافر تھے (العیاذ باللہ) تو حضرت علیؓ نے دختر مطہرہ حضرت ام کلثوم کا نکاح ان سے کیوں کیا اور نہ تھے تو باوجود اسلام کے تبرا کی کیا وجہ ؟

۲۳ ۔ تبرا کی کوئی کلام اللہ یا حدیث متواترہ میں سند ہے یا نہیں اگر ہے تو پیش کیجئے نہیں تو ایسے وسوسہ اندازوں کی جھوٹی سچی باتوں پر ان قطعی نصوص کو جو مثل روز روشن کے ، رذیلہ اور کبیرہ ہونے پر سب وشتم کے دلالت کرتے ہیں کسی کو برا کہنا کیوں ثواب جانتے ہو؟

۲۴ ۔ اگر تقیہ فرض یا مستحب یا مباح تھا تو حضرت سید الشہداءؓ نے کیوں نہ کیا اور اس تھوڑی جماعت کو کہ دشمن کے عشر عشیر بھی نہ تھے کیوں مظلوموں کو قتل کرایا اور ان کا بار اپنی گردن پر لیا۔ اور نہ تھا تو حضرت امام حسنؓ نے باوجود فوج کثیر کے کیوں صلح کی اور جہاد نہ کیا اور دین کو برباد کیا ۔ اگر عذر علم انجام ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ امام تھے تو کیا حضرت امام حسینؓ کو علم انجام نہ تھا یا اس وقت امام نہ تھے ۔

۲۵ ۔ اماموں کو علم ماکان و مایکون ہوتا ہے تو اس آیت کے اور سوا اس کے اور ایسی ہی آیتوں کے کیا معنی ہوتے ہیں ۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ — تم یہ کہدو کہ جو جو آسمانوں میں اور زمین میں ہیں (ان میں سے) غیب کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ (ترجمہ مقبول

اور اگر نہیں تو پھر اس عقیدہ کی کیا وجہ اور کلینی کی روائتوں کا کیا جواب ہے ۔

۲۶ ۔ اماموں کی موت ان کے اختیار میں ہے تو اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (جب ان کی موت کا وقت آجاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے ہو سکتے ہیں نہ آگے) کا کیا جواب ہے اور نہیں تو اس عقیدہ فاسدہ کی کیا بنا ہے ۔

۲۷ ۔ متعہ اگر جائز ہے تو آیت اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ (کہ مومن اپنی دائمی بیویوں اور باندیوں کے ماسوا سے اپنی شرم گاہ کی حفاظت کرتے ہیں) کے مخالف ہوتا ہے کیونکہ متعہ کی عورت باتفاق علماء شیعہ نہ منجملہ ازواج ہے اور نہ منجملہ ما ملکت ایمانہم اور اگر جائز نہیں تو پھر یہ فضائل کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں ۔ اور قصہ خیبر سے استدلال کرتے ہو تو

وہ حدیث متواتر نہیں جو ناسخ کلام اللہ ہو دوسرے وہ حکم منسوخ ہو چکا. نہیں تو اس سے تو کم نہیں کہ احتمال ہے بہر حال تمہارے پاس کیا دلیل ہے کہ وہ حکم باقی ہے احتمال یہ بھی تو ہے کہ اس آیت کا حکم جوں کا توں ہو فقط برائے چندے بوجہ ضرورت رخصت ہو گئی ہو۔

علاوہ بریں آیت وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ کو بوجہ حلتِ متعہ منسوخ نہیں کہہ سکتے کیونکہ بزعم شیعہ۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ (پس جب تم عورتوں کے خاص حصہ سے فائدہ اٹھا أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (پ۵ نساء ع۱) لو تو تم ان کو مقررہ مہر دیدو)

اس آیت پر متفرع ہے اور یہی آیت (بزعم شیعہ) دستاویز متعہ ہے مگر ہم پوچھتے ہیں کہ عدت والی عورت محصنات میں داخل ہے یا نہیں اگر داخل ہے تو یہ ممانعت بجے احصان کیئے بوجہ بقائے نکاح کے تو کہہ بھی نہیں سکتے کیونکہ نکاح ایک امر اضافی ہے جو وجود ناکحین پر موقوف ہی ہوگی تو بوجہ محافظت نسبت ہوئی لیکن اس صورت میں محصنین غیر مسافحین کے معنی میں بھی یہی احصان ملحوظ رہے گا. پھر آپ ہی فرمایئے متعہ میں یہ بات کہاں ہے اگر ہوتی تو یہاں بھی عدت ہوتی۔ اور اگر معتدہ داخل محصنات نہیں تو فرمایئے پھر کس وجہ سے اس کا نکاح ممنوع ہے حالانکہ یہ ارشاد موجود ہے واحل لکم ماوراء ذالکم (ان مذکورہ کے علاوہ عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں) اس صورت میں یوں نہیں کہہ سکتے کہ معتدہ محصنات میں تو داخل نہیں مگر آیت والذین یتوفون منکم سے اس کی حرمت ثابت ہے۔

چنانچہ اہلِ عقل پر ظاہر ہے جواب معقول عنایت ہو ورنہ حرمت متعہ کا اقرار کیجیے۔

۲۸۔ منکوحہ الاب سے یا ام ولد الوالد سے متعہ جائز ہے یا نہیں اگر جائز نہیں تو کیا دلیل ہے. آیت ولا تنکحوا ما نکح آباءکم سے تو فقط ممانعت نکاح ثابت ہوتی ہے اور جائز ہے تو نکاح ہی میں کیا نقصان تھا۔

۲۹ - لواطت زنان جو مذہب شیعہ کے موافق جائز ہے[1] اور دینوں میں بھی جائز ہوئی ہے یا یہ پاکبازی اور سنّت قوم لوط خاص مذہب شیعہ ہی کے لیے رکھی ہوئی تھی۔

۳۰ - لواطت کے جواز کی کیا دلیل ہے۔ اگر لفظ فَأْتُوا حَرْثَكُمْ أَنَّىٰ شِئْتُمْ پر اعتماد ہے تو اس سے تو تعمیم مقام ثابت نہیں ہوتی وقت معہود زوجہ کی روپشت اپنی طرف رکھنے کی اجازت نکلتی ہے بایں ہمہ جملہ نساءکم حرث لکم سے صاف یہ ثابت ہے کہ عورتیں اولاد کی کھیتی ہیں پھر آپ ہی فرمائیں کہ بچہ دبر زن میں سے نکل سکتا ہے یا نہیں اگر کوئی خاص کرامت زنان مذہب شیعہ میں ہو تو مطلع فرمایئے۔

۳۱ - باندیوں کی فرجوں (شرمگاہوں) کا عاریت دیدینا[2] جو علامہ حلی کی کتاب ارشاد میں موجود ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے پھر آیت الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم کی مخالفت کا کیا جواب ہے۔

۳۲ - لواطت سے ثبوت نسب کی وجہ تعلیم فرمائیں تو بڑی عنایت ہو۔

۳۳ - وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ (اس دن بہت سے چہرے تر و تازہ ہوں گے اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے) دیدار خداوندی پر شاہد ہے اور لفظ الی کو بمعنی نعمت لینا جوتیوں سے کان گانٹھنا ہے۔ کیونکہ اوّل تو ناضرۃ فرمایا اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ نعمائے خداوندی کے استعمال کی نوبت آگئی اس کے بعد پھر نعمتوں کے دیکھنے کی کیا حاجت تھی

---

[1] مثلاً حدیث ۱۔ عبداللہ بن ابی یعفور نے امام صادقؑ سے اس شخص کے متعلق پوچھا جو اپنی بیوی سے لواطت کرتا ہے۔ قال لا بأس اذا رضیت (اگر عورت خوش ہو تو کوئی حرج نہیں) (الاستبصار ج۳ ص۲۴۳)۔ ۲۔ امام رضاؒ سے راوی نے عورت کے ساتھ لواطت کرنے کا مسئلہ پوچھا تو فرمایا۔ اللہ کی کتاب میں لوط علیہ السلام کے قول نے (معاذ اللہ) حلال کر دیا ہے کہ میری لڑکیاں تمہارے لیے حلال ہیں حالانکہ معلوم تھا کہ وہ آگے کی راہ سے جماع نہیں کرنا چاہتے۔ (ایضاً)۔

[2] مثلاً حدیث ۱۔ محمد بن مسلم نے امام باقرؒ سے اس شخص کے متعلق پوچھا جو اپنے بھائی کے لیے اپنی باندی کی شرمگاہ حلال کر دے۔ یہ اس کیلئے حلال ہے (استبصار ج۳ ص۱۳۶) ۲۔ ابن مضارب کہتے ہیں مجھ سے امام جعفر صادق نے فرمایا یہ باندی لے لو آپ کی خدمت کرے اور آپ جماع کریں پھر ہمیں واپس لوٹا دینا (ایضاً) ۳۔ حسن عطار کہتے ہیں میں نے امام صادق سے فرج مانگنے کا مسئلہ پوچھا تو فرمایا کوئی حرج نہیں (استبصار ج۳ ص۱۳۹)۔ ۱۲۔

مہر محمد

جو یہ ترقی معکوس ایسے کلام معجز نظام میں آئی بایں ہمہ آیت
كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ (ہرگز نہیں اس دن وہ اپنے رب کی زیارت سے محروم رہینگے)
کا کیا جواب دو گے اور آیت لاتدرکہ الابصار پر نظر ہے تو وہ سالبہ جزئیہ ہے بایں ہمہ
سلب ادراک پر دلالت کرتا ہے نفی رؤیت پر دلالت نہیں کرتا علی ہذا القیاس لن ترانی سے
عدم قابلیت ابصار دنیوی حضرت موسیٰؑ ثابت ہوتی ہے عدم دیدار ثابت نہیں ہوتا ہاں اگر
لن اُرٰی بصیغہ متکلم مجہول ہوتا تو یہ خیال بجا تھا اور اگر رؤیت اور ابصار کے لیے خواہ مخواہ تقابل کی
ضرورت ہے اور وجہ سے تامل ہے تو اوّل تو خدا کے بصیر ہونے کے لیے جہاں سے تقابل لاؤ
گے وہیں سے اس کے دیدار کے لیے سہی۔ اگر ضرورت ہوگی تو ابصار کے لیے خدا کو بھی ہوگی
کیوں کہ تقابل تو طرفین ہی سے ہوتا ہے بایں ہمہ سامنے کا مکان سامنے کی جہت جس طرح
بے جہت اور بے مکان سامنے ہے ایسے ہی خدا (بے جہت و مکان) بھی ہو تو کیا عجب ہے
پھر کلام اللہ کی تکذیب کیوں کی جاتی ہے۔

۲۴۔ آیت وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم میں جو خلافت کا وعدہ[1] ہے پورا ہونا تو اس
کا ضرور ہے کیونکہ خدا کا وعدہ ہے اور ادھر دیکھتے ہیں تو خلیفہ موصوف باوصاف مندرجہ آیت
مسطورہ سوا چار یار اور کوئی نہیں ہوا خاص کر وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا
(میں ضرور بر ضرور ان کے خوف کو امن سے بدل دوں گا) سے تو روشن ہی ہوگیا حضرت امیر معاویہؓ
کو کفار سے کبھی خوف ہی نہیں ہوا اور اگر خاص حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو مراد لیجے تو مخالفت

---

[1] سورت نور ع ۷ کی آیت استخلاف کا ترجمہ مقبول شیعہ کا یہ ہے۔ ان سب لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے اللہ نے یہ وعدہ کیا ہے کہ ضرور ان کو اس زمین میں جانشین بنائیگا جیسا کہ ان سے پہلوں کو جانشین بنایا تھا اور ضرور ان کے دین کو جو اس نے ان کے لیے پسند کرلیا ہے ان کی خاطر سے پائیدار کردیگا اور ضرور ان کے خوف کو امن سے بدل دیگا اس وقت وہ میری ہی عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھرائیں گے اور جو اس کے بعد ناشکری کرے گا پس نافرمان وہی ہیں حضرت عمرؓ کے دور میں خلافت راشدہ کی صداقت اور موعود خداوندی ہونے پر خود حضرت علیؓ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے ملاحظہ ہو شرح نہج البلاغہ فیض الاسلام نقی زیر خطبہ مشورہ فارس دنحن علی موعود من اللہ۔ ۱۲ مہر محمد

وعدہ الذین اٰمنُوا لازم آتی ہے اس لیے کہ اس سے جمعیت ثابت ہوتی ہے نہ وحدت اور امام زمان کو مراد لیجئے تو وہ منکم کے مخالف ہے اس لیے کہ اس کے موافق تو ان خلیفوں کا صحابی ہونا بھی ضرور ہے ورنہ یہ لفظ بے کار ہوگا۔ اس کا لغو ہونا لازم آئے گا اس صورت میں کیا وجہ ہے کہ ان کو خلیفہ راشد نہیں سمجھتے۔

۳۵۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْکُمْ عَنْ دِیْنِہٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰہُ بِقَوْمٍ سے یہ بات ثابت ہے کہ جو لوگ مرتدین سے جہاد کریں گے وہ اللہ کے پیارے اور بڑے ہی کامل ہوں گے مگر سوا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کے ہمراہیوں کے اور کسی نے مرتدین سے قتال نہیں کیا اور خوارج کو مرتدین کہنا ہی نہایت بے جا ہے ان کو بدعتی کہیئے نہایت کار کافر بدعتی غرض اسی دین اسی نبی کے معتقد ہیں

۳۶۔ خدا کے ذمہ عدل واجب ہے تو آیت لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ (جو وہ کرتا ہے اس سے پوچھ نہیں اور سب کے کاموں کی پوچھ ہوگی) کا کیا جواب ہے۔

۳۷۔ بندہ اپنے افعال کا خالق ہے تو وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ (تم نہیں چاہتے مگر جب اللہ چاہے) کا کیا جواب؟

۳۸۔ حدیث اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِھْتَدَیْتُمْ (میرے صحابہ تاروں کی مانند ہیں جس کی پیروی کروگے ہدایت پاؤگے) بشہادت رسالہ المکاتیب آپکی کتابوں میں موجود ہے اس سے صاف مذہب اہل سنت ثابت ہے۔

۳۹۔ آیت یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ بشہادت سباق وسیاق ازواج کے حق میں نازل ہے اس کا کیا جواب؟ باقی حدیث اہل عبا اہل البیت سے یہ اعتراض نہیں اٹھ سکتا کیونکہ اس سے اتنا ثابت ہوتا ہے کہ برکت دعائے نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہما بھی اہل بیت ہوگئے علی ھذا القیاس ضمیر مذکر سے استدلال کرنا غلط ہے۔ اول تو یہی کلمہ کُمْ جو ضمیر مذکر ہے دوسری جا حضرت سارہ کے خطاب میں موجود ہے علاوہ بریں یہ اعتراض خدا پر ہوگا۔ شہادت سیاق اور سباق

کا جواب نہیں

۴۰ - آیت الطیبات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں نازل ہے اس کا شیعہ بھی انکار نہیں کر سکتے یہ لفظ جس قدر ان کی پاکیزگی پر دلالت کرتا ہے اتنا لفظ لیذهب عنکم الرجس اهل البیت ویطهرکم تطهیرا دلالت نہیں کرتا کیونکہ لفظ طیبات صفت مشبہ ہے جو اصلی پاکیزگی پر شاہد ہے اور یُذْهِبَ و یُطَهِّرَ تجدد پر دلالت کرتے ہیں جس سے اول سے اتنا پاکیزہ ہونا ثابت نہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آیت تطہیر کے بھروسے اہل بیت کو معصوم کہو حالانکہ وہ بھی اصلی نہیں بلکہ ازواج کی شان میں عارضی ناپاکی زائل ہو جانے پر دستاویز ہے اور باعتبار آیت الطیبات حضرت عائشہ صدیقہ اور سوا ان کے اور ازواج کو معصوم نہیں کہتے اگرچہ مورد خاص ہے پر الفاظ عموم پر دلالت کرتے ہیں۔

۴۱ - شیعہ کی عورتوں کو مثلاً بوجہ متعہ جو فضائل[1] ملتے ہوں تو وہ مل سکتے ہیں یا نہیں۔ چوتھے متعہ میں بشارت، تفسیر میر فتح اللہ شیرازی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رتبہ میسر آجاتا ہے۔ پانچویں متعہ میں خدائی مل سکتی ہے یا نہیں فقط

۴۲ - زمانہ میں جو یہ حکم رہا کہ زمانہ واحد میں ایک شوہر سے زیادہ سے عورت نکاح نہ کرے تو فقط بغرض محافظت نسب ہے اور جب نسب پر نظر ہی نہیں جیسے متعہ میں ہوتا ہے چنانچہ جواب متعلق متعہ سے خوب واضح ہے۔ تو متعہ دوریہ[2] بلکہ نکاح دوریہ اور ہبہ زن منکوحہ

---

[1] متعہ کے فضائل۔ ۱۔ تفسیر منہج الصادقین پ۵ کے اول میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جو ایک مرتبہ متعہ کرے اسکا درجہ امام حسینؓ جیسا ہوگا اور جو دو دفعہ کرے اس کا درجہ امام حسنؓ کا سا ہوگا اور جو تین دفعہ متعہ کرے اس کا درجہ علی بن ابی طالب جتنا ہوگا اور جو چار مرتبہ متعہ کرے اس کا مرتبہ میرے مرتبے جیسا ہوگا۔ ۲۔ جو شخص دنیا سے رخصت ہوا اور اس نے متعہ نہ کیا تھا وہ قیامت کے دن ناک اور کان کٹا اٹھایا جائے گا (ایضاً)

[2] قاضی نور اللہ شوستری نے مصائب النواصب میں لکھا ہے کہ نواں الزام ہم شیعوں پر یہ ہے کہ کئی آدمی بیک وقت ایک عورت سے متعہ (دوریہ) کر سکتے ہیں اگرچہ وہ حیض والی ہو یہ نسبت افترا اور جھوٹ ہے۔ ہاں اس وقت (متعہ دوریہ) بعید نہیں ہے جب کہ عورت کا حیض بند ہو چکا ہو کیونکہ مقصود تو رحم کو دو مردوں کے نطفہ سے بچانا ہے جس طرح کہ عدت میں یہی حکمت مقصود ہوتی ہے تو آئسہ (بند حیض والی) میں یہ حفاظت خود بخود حاصل ہوتی ہے (تو بیک وقت کئی مردوں کے متعہ کرنے سے نہ نطفہ ٹھہرتا ہے نہ خلط ملط کا اندیشہ ہے) ۱۲۔ مہر محمد

اور عاریت تران منکوحہ و زن متعہ کیوں جائز نہیں فقط۔

(۱۵) پندرہ سوالات از جانب مولوی عبد اللہ صاحب

التماس بخدمت علماء شیعہ کہ ان سوالوں کے جواب معقول مرحمت فرمایئے اور ناحق زمین و آسمان کے قلابے نہ ملایئے ورنہ خلفاء اربعہ کی خلافت و مرتبہ پر ایمان لایئے۔

۱۔ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابو سفیانؓ نے حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کو کہا تھا کہ اگر تم چاہو تو میں مدینہ کو سوار پیادہ سے بھر دوں، اگر مہاجرین و انصار نے بیوفائی کی اور عہد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپایا تو باوجود اس سامان کے پھر وجہ تقیہ کی کیا تھی اور اگر بنو امیہ کا اعتبار نہ تھا تو بقول شیعہ مانعین زکوٰۃ کی وجہ منع زکوٰۃ کی یہی تھی کہ ابو بکرؓ خلیفہ برحق نہیں اس صورت میں مالک بن نویرہ اور اس کی مانند سردار بنی تمیم اقوام وغیرہ مدد کو موجود تھے اور اتباع امام برحق کے مشتاق پھر اس سب خرابی اٹھانے اور گمراہی کی جڑ جمانے کی کیا وجہ ہوئی اگر بالفرض حضرت امیر جہاد فرما کر مثل اپنے زمانہ خلافت کے غالب نہ آتے یا مثل حضرت امام حسینؓ شہادت پاتے حجت تو تمام ہو جاتی۔

۲۔ امیر المومنین اور جملہ ائمہ کے تقیہ کرنے کے راوی وہ لوگ ہیں جو آپ ہی خادم خاص ان حضرات کے بنتے تھے مگر یہ حضرات ان لوگوں کے حق میں بیزاری ظاہر فرماتے تھے اگر کوئی ثبوت تقیہ کا بایں نہج کہ جان بچانے کے لیے دین اور آبرو سب کچھ برباد ہو جائے تب بھی تقیہ ہی کیجیے اگر کچھ سند قرآن و حدیث سے ہو تو بیان فرمایئے یا عقل سلیم کا تقاضا ہو تو کہیئے۔

۳۔ انبیاء اور امام ہدایت خلق کے واسطے ہوتے ہیں، جب انہوں نے تقیہ کیا اور حق بخوف دشمنوں کے چھپایا تو حق کا پھیلانے والا کون ہوا۔ اور آپ لوگوں تک کیوں کر حق پہنچا۔ اور جب دو زبانی ہوئی اور دو رنگ تو تمیز حق کی کیا ہے اور اب لوگوں نے کس نہج سے حق پہچانا۔

۴۔ اس زمانے کے بعضے علماء شیعہ یا عوام جو تقیہ نہیں کرتے اب ان کو کیا امن حاصل ہو گیا ہے اور اگر وہ ایسے مامون ہیں کہ تقیہ کی حاجت نہیں تو حضرت امام مہدی کیوں غار سُر مَن رَأیٰ میں اب تک غیبت کبریٰ میں مصروف ہیں یا حضرت امام خطا پر ہیں۔ یا یہ لوگ خلاف امام عمل کر رہے ہیں۔

۵۔ بعد گذرنے زمانہ عباسیوں کے تسلط چنگیز خانی میں جس میں علماء شیعہ کو نہایت فروغ ہوا اور زمانہ سلاطین ایران اور امراء ہندوستان میں حضرت امام نے خروج کیوں نہ فرمایا اور اگر دعوت سلطنت میں امید بہبود نہ تھی تو بطور ائمہ سابق ان ممالک میں ظہور فرماکر محبین کو ہدایت فرماتے اور اعداء پر حجت قائم کرتے طول عمر امام کا ایک ایسی کرامت ہوتی کہ سنی تو سنی یہود و نصاریٰ اور کفار چین و ہند پر حجت تمام ہوتی کوئی وجہ معقول ارشاد ہو۔

۶۔ شیخین کے باب میں علماء شیعہ کے اقوال مختلف ہیں بعضوں نے منافق اصلی اور بعض نے مرتد بعد واقع غدیر اور بعض نے مرتد بعد وفات اور بعض نے ایمان سے خارج اور اسلام میں داخل اور بعض نے مرتکب اکبر کبائر یعنی حق چھپانے والا کہا ہے۔ ان وجوہ پر یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ نادان یا نہایت عاجز تھے اور خداوند کریم بھی ڈرتا اور ان کی نجات پر قادر نہ ہوتا ان باقی صورتوں میں (لازم آیا کہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نہایت بے تاثیر تھی کہ سوا دو ایک کے کوئی مخلص نہ رہا اور حضرت امیر المومنین کو خمس اور فے ان کے جہاد و ل کا لینا اور لونڈیوں پر تصرف کرنا کیونکر جائز ہوا اور نہ ان کا لڑنا جہاد تھا اور نہ وہ دین کے مددگار تھے نہ یہ کچھ غنیمت اور فے تھی۔

۷۔ مذہب شیعہ خلاف ظاہر ہے اس لیے کہ حضرت امیر سے لیکر تا جملہ ائمہ بظاہر اہل سنت تھے اور شیعہ کو اس میں گنجائش انکار کی نہیں دعوئ تقیہ جو بہت سے امور کا جواب ہے اسی پر مبنی ہے اور اثبات خلافت کے واسطے دلیل یقینی چاہیئے وہ کیا دلیل عقلی یا نقلی ارشاد ہو۔

۸۔ آیت انما ولیکم اللہ ورسولہ نص نہیں ہو سکتی اور شان نزول اگر خاص ہو تو حکم عام ہوتا ہے اور الذین امنوا صیغہ جمع کا ہے۔ اور انگشتری دینی نماز میں اس روایت کا کیا ثبوت ہے اور سوائے حضرت امیر رض کے اور کوئی مراد نہ ہو اس کی کیا دلیل ہے۔ اور انگشتری دینا زکوٰۃ تھا جیسا ظاہر لفظ قرآن سے معلوم ہوتا ہے تو اس میں کیا وجہ کمال کی ہے کیونکہ فرض ادا کرنا ہر مسلمان کا کام ہے۔

۹۔ حدیث ثقلین یعنی خطبہ غدیر وہ بھی پوری حجت نہیں مولیٰ کا لفظ مشترک ہے اور اَللّٰھُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاہُ وَعَادِ مَنْ عَادَاہُ (اے اللہ اس سے محبت رکھ جو علی رض سے محبت

رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علیؓ سے دشمنی رکھے) قرینہ محبت کے معنی کا موجود ہے پھر شیعہ کے پاس کیا حجت ہے کہ امر ضروری کو کہ مثل اقرار توحید و رسالت ہے ایسے چیستان کی طرح ثابت کرتے ہیں۔

۱۰۔ آذان کے اندر جو "اشہد ان امیر المومنین علی ولی اللہ" مذہب شیعہ میں زائد ہوا ہے اور معمول ہے۔ اگر ایسی آذان زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی طرح مروج اور مروی ہوتی آئی ہے تو اس کی سند ارشاد ہو اور اگر بعد میں ارشاد ہوئی تو کون سے امام وقت میں یہ صورت اعلان مذہب کی ہوئی۔

۱۱۔ حضرات! امیر المومنین امام حسین رضی اللہ عنہ نے جو گردن تقیہ کی میدان کربلا میں ماردی علی الخصوص جب سب رفقاء شہید ہو چکے تھے۔ تو اس کی کوئی وجہ معقول ارشاد ہو اور فسق یزید کیا کفر و ارتداد و نفاق خلفاء سے کچھ بڑا ہوا تھا جو حضرت امام نے ایسا کیا۔

۱۲۔ اولاد ائمہ نے جیسے حضرت زید شہید اور یحییٰ بن زید اور اسماعیل نے دعوئے امامت کیا شیعہ کے اصول پر ناصبی بلکہ اسلام سے خارج ہوتے ہیں اور چاہیئے یوں تھا کہ اہل البیت ادریٰ بما فیہ (گھر والا گھر کی چیز سے زیادہ واقف ہوتا ہے) (کے تحت) نص امامت سے ان کو زیادہ آگاہی ہوتی اور آیت تطہیر کا اثر اور عترت کے متمسک ہونے کی کچھ تو تاثیر ان میں باقی رہتی۔ علاوہ بریں ائمہ نے جو اس زمانہ ہی میں تھے ان کے فعل کو گناہ تک نہ گنا اس کا کیا جواب ہے۔

۱۳۔ یہ زمانہ بزعم شیعہ امام سے خالی نہیں اور امام سے یہ غرض ہے کہ حجت قائم ہو اور طالب حق کو حق مل سکے اب امام کی یہ غیبت کہ آشنا و بیگانہ کسی کو رسائی نہیں اب سارے جہان میں موافق و مخالف میں کوئی طالب حق نہیں یا دین میں کوئی حاجت پیش نہیں ہوتی یا یہ صورت امام سے خالی ہونے کی نہیں ہوتی اگرچہ یہ وجود عدم کے برابر ہے

۱۴۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں شیخین کے مناقب بر سر منبر بیان فرمائے بلکہ تفضیل (کہ علیؓ ابوبکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ سے افضل ہیں) پر حد افترا سے تہدید کیا اگر یہ تقیہ تھا تو ان مردے لوگوں سے تھا یا زندوں سے زندے تو آپ کے سب شیعہ

تھے اور جاں نثار تھے اور بعض منافق بھی ہوں گے تو ایسے لوگوں کا کیا ڈر تھا اور مردوں سے اتنا ڈر خارج قاعدہ سے ہے بہت ہوتا سکوت فرماتے یا قلیل سی کچھ تعریف کر دیتے اس کی کیا وجہ ہے ارشاد ہو۔

۱۵۔ جب اپنی خلافت کے وقت میں حضرت امیر المومنین کو حاجت تقیہ تھی تو فرمایئے شیخین کے زمانہ میں اگر خلافت ہو بھی جاتی تو کیا کام نکلتا اس سے معلوم ہوا کہ بجز وعدہ موہوم خروج مہدی (علیہ وعلی آبائہ السلام زمانہ غلبۂ حق کا کوئی نہیں ہوا جب گیارہ امام اس رنگ کے ہوئے اب بارہویں امام سے باوجود اتنی غیبت کے کوئی عاقل کیا توقع رکھ سکتا ہے اس مخافت کی کوئی وجہ معقول بیان فرمایئے فقط۔

خط شکایت امیر منشی شیخ احمد صاحب

مع حال صفائی عقیدہ خود بجانب مولوی عبداللہ صاحب

حضرت مولوی صاحب، اجوابات جو آپ نے بھیجے ہیں وہ واقعی نہایت عمدہ اور قابل تعریف ہیں جس جس معاملہ میں مجھ کو شک واقع ہوا تھا وہ معاملات طے ہو گئے اور جو کچھ معاملات اور شک سے باقی ہیں وہ بوجہ برہمی مزاج خدام میں پوچھ نہ سکا مگر عالم و فاضل کو سوال کے جواب دینے میں سختی اور برہمی کرنی واجب نہیں۔ کیونکہ علماء کا یہی کام ہے اور سائل جس کو پوچھنا کسی امر کا منظور ہوتا ہے وہ کس سے پوچھے سوائے عالم کے مگر افسوس کہ یہاں برخلاف معاملہ ہوتا ہے۔ کہ آئندہ سائل سوال نہ کرے فقط بندہ شیخ احمد

خط مولوی عبداللہ صاحب بجواب خط منشی شیخ احمد صاحب

مہربان والاشان حسناتہ لاتعد منشی شیخ احمد صاحب سلمہ اللہ تعالے

خاکسار عبداللہ بن مولوی محمد انصار بعد سلام مسنون الاسلام مظہر مرام ہے کہ خط فرحت پہنچا باعث فرحت بے غایت کا ہوا جو کہ آپ نے شکایت برہمی مزاج کی تحریر فرمائی۔ یہ تحریر بسبب ناواقفیت کتب مناظرہ کی ہے جب آپ داب مناظرہ سے واقف ہو گئے

یہ بڑا ہی بے موقع اور خلاف طبع معلوم نہ ہو گی خصوصاً مذہبی مناظرہ میں کہ ایک دوسرے کو گمراہ اور ناحق شناس جانتا ہے اس کی تصدیق آپ کو ان تحریرات سے۔ جو کہ سید احمد خان کی طرف بطور فتویٰ ہوئی ہیں۔ ایسے ہو جاوے گی اور واللہ ثم باللہ آپ ہمارے کلام کے مخاطب نہیں بلکہ ہمارے کلام کے مخاطب وہ ہیں کہ جس کی مجاورت سے تم کو یہ شبہات دین متین میں پڑ گئے اور وہ لوگ درحقیقت عند المسلمین خصوصاً نزد علماء ایشاں ایسے ہی ہیں جیسا کہ ہم نے ان کو لکھا ہے۔

(شیعہ تبرا باز کا حکم)

کیونکہ سہارنپور میں علماء شیعہ نے اظہار دیا کہ ہمارے مذہب میں تبرا فرض عین ہے اور جس طرح بن پڑے کرتے ہیں یہاں تک کہ دہلیز اور فرش کے نیچے خلفاء کے نام لکھ کر توہین کے لیے رکھتے ہیں (معاذ اللہ)

جب ان کا یہ حال ہے تو علماء سنیہ موافق قول فقہاء سب الشیخین کفر (شیخین کو گالی دینا کفر ہے) کفر کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اور ہم نے تمہارے اس شبہ کی پیش بندی کر دی تھی چنانچہ عبارت سوال سے واضح ہے کہ ہم نے مخاطب علماء شیعہ کو بنایا ہے آپ نے اس کا کچھ خیال نہ فرمایا۔ کہ جو سوالات آپ نے کیے تھے وہ درحقیقت ہم نے شیعوں کی طرف سے سمجھے اور تم کو سفیر محض جانا اس لیے ہم نے انہی سے سوال کیے ورنہ خاص تم سے سوال کرتے۔ مگر واللہ ہم تم کو سفیر جانتے ہیں کیونکہ درحقیقت آپ کو پوچھنا مدنظر ہوتا تو آپ کو یہاں آنے سے کیا پرہیز تھا جلسے اور لوگ مسئلہ پوچھ جاتے ہیں آپ بھی پوچھ لیتے پر چونکہ آپ نے لکھ کر بھیجے ہیں ہم نے جانا کہ یہ اور ہے در پردہ سوال کرتا ہے۔ کیونکہ آپ کا تو عقیدہ ایسا نہیں اس لیے ہم نے اس کو ہدف بنایا آپ کو کیوں ایسا برا معلوم ہوتا ہے۔ ہرگز ہرگز آپ کی طرف خطاب نہیں شوق سے جو چاہو پوچھو تم ہمارے مہربان اور کرم گستر ہو آپ کے حسن ظن سے نہایت بعید ہے کہ جو آپ ایسے خطاب اپنی طرف جانیں اور ہماری عین خوشنودی ہے کہ جو شبہات تم کو اور باقی ہوں وہ بھی پیش کرو تاکہ مذبذبین

میں نہ رہو اور اپنے دین کی پختگی معلوم ہو جائے حدیث میں آیا ہے کہ ناواقف کی شفاء سوال ہے یعنی جس کو شبہ لاحق ہو اس کو پوچھ لینا چاہیئے ورنہ شیطان بلکہ بعض انسان صورۃً وشیطان حقیقۃً مثل روافض کے اس شبہ کو اور پختہ کر دیتے ہیں حتی کہ خارج از اسلام ہو جاتا ہے اس لیے التماس ہے کہ ضرور بہ ضرور طبیعت شریف کو شبہات باقیہ سے صاف کر لیجئے آپ کے والد ماجد پختہ دین کے تھے بمقتضائے الولد سر لابیہ کے آپ کو بھی صفائی در باب عقیدہ ضرور حاصل کرنی چاہیئے جب کہ ہمارے تمہارے اتحاد حاصل ہے تو مناسب یہ ہے کہ آپ بے تکلف تشریف لاکر بالمواجہ خواہ علانیہ یا در پردہ صفائی باطنی کر لیجئے نقل مشہور ہے "شرح میں کیا شرم ہے"۔

(عام آدمی کو غیر مذہب کی کتابیں نہ پڑھنی چاہیئں)

جب تک آدمی اپنے دین کی کتابوں سے واقف اچھی طرح نہیں ہوتا اور دوسرے دین کی کتابیں نظر سے گذرتی ہیں تو یقیناً شبہات پڑ جاتے ہیں اسی واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے توریت دیکھنے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے شخص کو منع فرمایا اس واسطے عاقل کو مناسب ہے کہ جب تک طرفین کے دلائل نہ سُنے ایک طرف نہ ڈھل جائے حاکم بھی دونوں کی ہی بات سُن کر فیصلہ کرتا ہے خاص کر دین کے باب میں نہایت احتیاط رکھنی چاہیئے اس قاعدہ کو اگر آپ بھی ملحوظ خاطر شریف رکھیں گے تو انشاء اللہ کبھی کسی بے دین کے دھوکے میں نہ آئیں گے۔

اور جو کتاب تمہارے سوالات کے جواب میں (آپ کو) پہنچی تھی یہ مدرسہ عربی دیوبند کی طرف سے تھی اور انہی سوالات کے جوابات جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نے میرٹھ سے بھیجے ہیں بعد نقل کے وہ بھی خدمت میں مرسل ہوں گے جیسا کہ جواب مدرسہ سے ازالہ شبہات ہو کر آپ کو نفع حاصل ہوا انشاء اللہ مولوی صاحب ممدوح کے جوابات سے اس سے زیادہ نفع حاصل ہوگا اور باقی شبہات اگر پیش کرو تو فبہا ورنہ ان کو بھی شبہات زائلہ پر قیاس کر کے گوشت جان لو مگر پیش ہی کرنا اولیٰ اور انسب ہے۔

والسلام علی من اتبع الہدیٰ فقط

اشعار طبع زاد مولوی عبد اللطیف صاحب سنبھلپوری طالب علم مدرسہ عربی دیوبند ضلع سہارنپور

حمد خدا و نعتِ نبی میں میری زبان
لرزاں ہے مثل بید کہ ہیبت کا ہے مکاں

کیا تاب ہے قلم کو لکھے وصفِ چار یارؓ
مداح جن کا آپ ہی رب دو جہاں

کیا پوچھتے ہو خوبی حضرات اہل بیتؓ
مضمون انما اُسے کرتا ہے خود عیاں

اے سالکانِ سنت خیر البشر سنو
شیعوں کا حال نظم میں کرتا ہوں کچھ بیان

شیخین کی جو شان میں کرتے ہیں اعتراض
ہیں محض بے وجود کچھ ان کا نہیں نشان

کرتے ہیں جو خلافت شیخین میں کلام
بے اصل ہے سمجھتے نہیں ہیں وہ بدگمان

شیر خدا کی زور شجاعت سے منہ کو موڑ
دھبا لگائیں ہائے تقیہ کا ناگہاں

کہتے ہیں صاف صاف خلافت علی سے لی
از راہ ظلم حضرت صدیق نے میاں

ایسا ہی بن خطاب نے ان سے کیا سلوک
عثمان ذی حیا کا بھی ایسا ہے یہ بیان

دعوی حب حیدر کرار دیکھنا
ٹپکے ہے اس کلام سے جو کچھ ہے قوستان

ظاہر میں پنجتن کی محبت میں دم بھریں
باطن میں سو طرح کی عداوت رکھیں نہاں

عبد اللہ بن سبا جو یہودی تھا بد گہر
پیرو اسی کے ہیں یہ سبھی خورد اور کلاں

لعنت پہ جنکی ٹھہرے ہے بنیاد آن کی
پھر وہ محب آل نبی ہوں بھلا کہاں

صدیقہؓ جن کی شان میں نازل ہو طیبات
یہ اُن کا منہ جو ان کو کہیں کچھ خدا کی شان

کچھ بھی لحاظ ننگ علی نہیں انہیں
داماد مرتضیٰ کو کہیں میر خائنان

مرثیہ کو کتاب الٰہی سمجھتے ہیں
قرآن کو بتاتے ہیں پنڈت کی پوتھیاں

بولیں کھپاچ خانہ کو سب خانہ امام
مسجد کو گاؤ خانہ سمجھتے ہیں بد زبان

صدہا بنائے شاہ نجف اور کربلا
لکھا بنائیں گورشہ فخر خاندان

ہر سال تعزیہ یہ بنا کر کے روسیاہ
روح یزید و شمر کو کرتے ہیں شادمان

کہتے پھرے ہیں شہر کے کوچوں میں برملا
قید یزید میں ہوا حضرت کا خاندان

اللہ رے یہ حب علی اور یہ گفتگو
پردہ میں دوستی کے کریں دشمنی عیاں

باغ فدک کے باب میں ناگفتنی کہیں
لا نورث وہ سنتے نہیں ہیں بگوش جان

جو جو کہیں ہیں فاطمہ زہراؓ کی شان میں ... پھٹ جائے زمیں قریب ہے گر جائے آسمان

متعہ کا ایک بہانہ عجب ہاتھ آگیا ... مصروف ہے زمانہ میں ہر ایک پیر اور جوان

وہ ان کے مجتہد تھے کہ جن کے قیاس سے ... جاری ہو جہان میں ایک فعل بوطیاں

مومن وہی ہے جو کہے اصحاب کو بُرا ... میں نے سُنا ہے بار ہا یہ قول شیعاں

سمجھائے کوئی لاکھ پہ یہ مانتے نہیں ... سُنتے نہیں کسی کی حدیث ہووے یا قرآن

ہیں چند اعتراض قدیمی گھڑے ہوئے ... کرتے ہیں بار بار وہی پیش مومناں

علماء دیندار بھی دے کر انہیں جواب ... تردید میں ہیں مذہب باطل کے جاوداں

ہے شیخ احمد ایک جوان دیوبند میں ... بھیجے تھے مدرسہ میں سوال اس نے ناگہاں

دیکھا جو ان کو مولوی یعقوب نے تمام ... عبداللہ مولوی کو بلا کر کہا کہ ہاں

دنداں شکن جواب لکھو ان کا کل تلک ... تا آئیں راہ راست پہ بدراہ گمرہاں

پھر وہ سوال مولوی صاحب نے جلد تر ... ایک خط میں بند کر کے میرٹھ کو بھی رواں

لکھ کر جواب مولوی قاسم نے فی البدیہ ... بھیجے وہ دیوبند میں فی الفور اے میاں

عبداللہ مولوی نے بھی ان کا لکھا جواب ... کس شان و اہتمام سے دو دن کے درمیاں

وہ سب جواب مسجد جامع میں الغرض ... کس لہجہ سے پڑھے گئے بیش مشائخاں

شاباش و آفریں کی صدا چار سو ہوئی ... احسنت مرحبا کی ندا سے کھلے دہاں

پھر وہ جواب بھیجے گئے جبکہ لکھنؤ ... ہر مجتہد کی آیا زباں پر کہ الاماں

تاریخ کا جو فکر تھا عبداللطیف کو ... ہاتف نے کان میں کہا یوں آکے ناگہاں

کس فکر میں ہے دیکھ لے حالات لکھنؤ ... چکر میں آرہا ہے ہر اک مجتہد یہاں

(۱۲۹۰ھ)

ایضاً منہ

بفضل خدا طبع فرمودہ اند ... جوابات شیعہ بطرز نکو

سن انطباعش چو میخواستم ... ملک گفت رد روافض بگو

(۱۲۹۱ھ)

طبع دوم ۱۴۰۱ھ

ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم جامع مسجد نور گوجرانوالہ

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ

(انعام)

ردّ روافض

حصّہ دوم

از: حجۃ الاسلام مجدّد دین و علوم بانی دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رح

(۱۲۴۸ھ — ۱۲۹۷ھ)

ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم نزد گھنٹہ گھر گوجرانوالہ

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد حمد و صلوٰۃ کے یہ اجوبہ اربعین کا دوسرا حصہ پیش خدمت ہے حضرات شیعہ کی طرف سے جو چالیس سوال حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کی خدمت میں پہنچے تھے ان میں سے انتیس ۲۹ سوالوں کا جواب حصہ اول میں دے دیا گیا باقی ماندہ بارہ سوالات میں سے سات سوالوں کے چار سوال بنائے گئے یعنی سائل نے ایک سوال کی مختلف شقوں کو علیحدہ علیحدہ سوال بنا کر پیش کیا تو حضرت نانوتوی نے ان شقوں کو ایک ہی سوال کے نیچے جمع کر کے سوال کی ایک ہی تقریر کر دی اور پھر اس کے جواب میں سوال کی ہر شق کا جواب تحریر فرمایا۔

اس حصہ میں بظاہر بارہ کی بجائے نو سوال و جواب ہیں لیکن حصہ ہذا کا سوال ۲ حقیقت میں تین سوالوں کا جواب ہے جیسا کہ حصہ اول کے سوال ۲۹ کے جواب میں حضرت نانوتوی نے خود اشارہ فرمایا ہے اور اسی طرح حصہ ہذا کے سوال ۴ کا جواب حقیقت میں دو سوالوں کا جواب ہے اس میں دو سوال (فدک اور وراثت انبیاء) جمع کر کے ایک سوال کر دیا گیا، اور پھر ایک ہی جواب دیا گیا تو سوال ۴ کا جواب اصل میں دو سوالوں کا جواب ہے یہ حصہ کافی مشکل اور ادق ہے۔

خصوصاً سوال ۲،۳،۴ کے جواب۔ اس حصہ میں متعہ، فدک، وراثت، مسئلہ حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ختم کئی اہم مسائل اور دقیق علمی نکات حضرت نے اپنے مخصوص انداز میں بیان فرمائے ہیں جو صرف پڑھنے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ ان چار جوابوں کے بعد پانچ جواب گمشدہ سوالوں کے ہیں۔ ان کا انداز بیان نسبتاً کافی آسان اور عام فہم ہے۔ اس حصہ میں عنوانات اصل میں مولانا مہر محمد صاحب نے قائم کئے ان کی تصحیح مولانا مفتی محمد عیسیٰ صاحب اور فاضل نوجوان مولوی محمد اشرف نے کی اور مفتی صاحب اور مولوی محمد اشرف کی خواندگی کے بعد احقر عبدالحمید سواتی نے بھی اس کی ریڈنگ میں حصہ لیا۔ حوالوں کی تلاش اور عبارات کی درستگی میں مولوی محمد اشرف نے بہت کاوش اور محنت کی ہے بعض حواشی لگائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے علم اور اخلاص میں برکت عطا فرمائے۔

اب اجوبہ اربعین کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انشاء اللہ یہ کتاب استفادہ کے قابل ہو گئی ہے۔

واللہ علی ما نقول وکیل

احقر
عبدالحمید سواتی

خادم مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

۲۸ ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ / ۲۷ اکتوبر ۱۹۸۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

(عرض ناشر قدیم ۱۲۹۲ھ)

الحمد للہ رب العالمین الرحمن الرحیم ملک یوم الدین

والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وآلہ وذریتہ وصحبہ اجمعین

امابعد!

طالب نجات محمد حیات عرض کرتا ہے کہ یہ کتاب لاجواب دوسرا حصہ اجوبہ اربعین کا ہے پہلے حصہ میں اٹھائیس سوال مع جواب چھپے ہیں اب باقی ماندہ بارہ سوالات اہل تشیع کے جوابات جو خاص ریختہ قلم صواب رقم فاضل بے نظیر عالم عزیز خاتم المحققین سلطان المدققین نخبۃ الاکارم جناب مولانا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی ؒ کے ہیں اس حصہ میں طبع ہوئے اب یہ کل سوالات بھی اور جوابات بھی چالیس چالیس پورے ہو گئے۔

(مولانا نانوتوی ؒ کا تبحر علمی)

مگر افسوس کہ اس نالائق کی جی کی جی ہی میں رہی اور جو جی میں نہ تھی وہ بے ساختہ زبان قلم سے نکل گئی یعنی اس کتاب کا دیباچہ میری طرف سے لکھا گیا تو بے اختیار جی میں آیا بلکہ فرض وواجب تھا کہ میں کچھ ذکر خیر جناب مولانا ممدوح سلطان الاذکیاء امام الاتقیاء امیر الفقراء نحریر العلماء کا بھی لکھوں اور اس فرصت ومدت قلیل میں اور ان کے قلم برداشتہ تحریر مستنیر کی کچھ تعریف واقعی اور توصیف حقیقی بلا مبالغہ بیان کروں مگر اوّل تو مجھ میں نہ قوت بیانی نہ طاقت لسانی نہ چنداں معنی فہمی سخندانی پھر کس حوصلہ پر فصحا سے ہمداستانی۔ دوسرے اگر کچھ سنے سنائے سیکھے اڑائے سڑ پٹر خاک بدتر دو چار

حرف شاید لکھ بھی سکتا تو اس اندیشہ نے ہاتھ روکا کہ مبادا صرف ان منخرفات کے ہی جوابات لکھنے میں کوئی جناب ممدوح کی تعریف کا حصر سمجھ لے یا خدانخواستہ ان جوابات کی عظمت پر سوالات کی متانت اور سائل کی لیاقت پر بھی کسی قدر احتمال کرے اس لیے میری زبان تو دلی تمنا کے ادا سے عاجز و قاصر رہی مگر ہاں قلم بے ہودہ رقم سے بہ نسبت سوالات کے نفرین کی جگہ بے ساختہ آفرین نکل گئی کیونکہ اگر اہل شیعہ یہ زہر نہ اگلتے تو مولانا کی قلم سے یہ مضامین تریاق فاروقی کیسے نکلتے اگر یہ لوگ محرک نہ ہوتے تو مولانا ممدوح اہل تسنن کی بے علمی پر رحم فرما کے اپنے احباب کے اصرار سے کیوں اپنے اوقات قدسیہ کو اس طرف ضائع کرتے اور پھر کس ذریعہ وصیلہ سے یہ جوابات دندان شکن اور جواہرات سخن آویزہ گوش ہوتے اس ظلمات میں تو ہم کو آب حیات ملا ہے شجرۃ الایمان کے سرسبز ونشو ونما ہونے کے لیے یہ عمدہ کھات ملا ہے۔ اسی گیس نے تو مولانا کے شمشیر قلم کے جوہر دکھلائے ہیں۔ اس خاک نے تو آئینہ قلوب کے زنگ مٹائے ہیں۔ اللہ۔ اللہ۔ ع

یہ لعل بے بہا پائے ہیں ہم نے کوڑے کرکٹ میں

اب ان سوالات کی رکاکت اور ان کے جوابات کی وجہ تحریر کی نسبت جو جناب مولانا لکھتے ہیں وہ دو تین سطوریں بھی ہم بلفظہ سوال وجواب سے پہلے لکھ دیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ "ہر چند تحریر سوالات سے سائل کی لیاقت اور حسن فہم ایسا آشکارا ہے جیسے کالے تے میں سے چاند مگر بایں نظر کہ اگر ایسے سوالات کا جواب نہیں دیا جاتا ہے اور یوں سمجھ کر کہ "جواب جاہلاں باشد خموشی" اگر ایسے خرافات کے جواب میں سکوت کیا جاتا ہے تو جاہلوں کو اور بھی جرأت ہوتی جاتی ہے اور باطل کو اور بھی حق سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لیے مختصر مختصر جواب سوالات مرقوم ہیں وباللہ التوفیق۔"

سوال اوّل از جانب شیعہ

سنی کہتے ہیں کہ یہ شیعہ گری کس سے ایجاد ہوئی فقط ایران سے نکاس اس فرقہ کا ہے بیچارے ایران والے تعزیہ نہیں بناتے البتہ اور طرح کی بدعت قبیحہ کرتے ہیں سوا انشاء اللہ تعالیٰ بیوم الحساب معلوم ہوگا۔ آدمی کو چاہیئے کہ جس میں دخل نہ ہو اس میں داخل نہ دے۔ سنیوں کو معلوم نہیں کہ شیعہ کسے کہتے ہیں اور سنی کسے۔ آخر اس کہانی کو کسی کتاب سے کستا تھا

جب کہ سنی کے کلام سے معلوم ہوا کہ شیعہ ایران سے ہوئے تو ضرور سنی مسلمانوں نے حضرت امام حسینؓ کو ذبح اور امام حسنؓ کو زہر دیا پھر یزید ہونے سے کیوں برا مانتے ہیں۔

واضح ہو کہ شیعہ اسے کہتے ہیں کہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کو جانشین حضرت کا جانے اور سنی اسے کہتے ہیں کہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شیخینؓ و جناب امیر و معاویہ و یزید و عبد الملک و ولید و ہشام و سلیمان و ولید بن یزید کو اعتقاد کریں چنانچہ تصریح کی اسکی ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں صفحہ ۱۵۰ اور ابن حجر عسقلانی نے وملا علی قاری شارح فقہ اکبر و قاضی عیاض وغیرہم نے کی ہے۔

جواب (سوال) اوّل

(ہندوستان میں شیعیت ایران کی بدولت پہنچی)

اجی صاحب اتنا کیوں برا مانتے ہو اور مذہب شیعہ کے ایران سے نکلنے سے ایسا کیوں کانوں پر ہاتھ دھرتے ہو سنیوں کا یہ مطلب نہیں جو آپ سمجھ لیے یہ فرقہ یوں تو بہت دنوں سے کار فرمائے بدعت و فساد ہے ہاں ہندوستان میں یہ بدعت البتہ ایران ہی کی بدولت پہنچی ہے نہ ہمایوں اور بادشاہان ایران کے باہم یہ ربط و اتحاد ہوتا نہ وہاں کے امراء علماء یہاں آکر سادہ لوحان ہندوستان کو گمراہ کرتے بالجملہ ہندوستان میں یہ فساد ایرانیوں ہی کے طفیل پھیلا ہے۔ ورنہ یہ فرقہ یوں تو قدیم سے چھپا چھپایا چلا آتا تھا۔

(شیعہ کی بدعہدی و مظالم)

اور انہی صاحبوں نے جگر گوشہ سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا حضرت شہید کربلا رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تفصیل اس بات کی مطلوب ہے تو کان دھریئے اور سنیئے کوفیان باوفا جنہوں نے سالہا سال داد شیعہ گری دی تھی پھر حضرت مسلم رحمہ اللہ تعالےٰ کے ہاتھ پر بیعت کر کے پھر گئے اور میدان کربلا میں آکر خون شہیدان اہل بیت علیہم السلام سے دشت کربلا کو رنگین کیا۔ کوئی صاحب حضرات شیعہ سے پوچھے یہ کون تھے اور کس کے مرید تھے حضرت امیر رضی اللہ عنہ رونق افروز کوفہ رہے یا حضرات اصحابہ ثلاثہؓ امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں یہی مدعیان محبت تھے۔

جنہوں نے دعوئے تشیع کر کے انجام کار بے وفائی کی یا اور کوئی؟ بالجملہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی رکاب میں ہمیشہ یہی مدعیان دروغ رہے جن کی مداخلت کے باعث دوستان با اخلاص کو رسائی نہ ہونے پائی۔ الغرض یہی باوفایان بے وفا حضرات ائمہ رحمہم اللہ کو ہمیشہ دھوکہ دیتے رہے۔ حضرت امیر علیہ السلام کی شکست کا باعث یہی ہوئے اور حضرت مسلم کو انہوں ہی نے شہید کرایا حضرات سید الشہداء [illegible] وشہید کربلا کی جان نازنین پر انہی کی تیغ ستم چلی حضرت زید شہید صاحبزادہ حضرت سجادؒ انہی بزرگواروں کے بھروسے جان بحق ہوئے۔ سنی بیچارے تمہارے گمان کے موافق کس دن ساتھ ہوئے تھے؟ سچ یوں ہے حضرات شیعہ، نائبان یزید و شمر اور کارپردازان عبد اللہ بن زیاد ہیں[1]۔ زمانہ کے گذر جانے سے ناچار ہیں ورنہ جو کچھ کرتے حضرت امام ہی کے ساتھ کرتے۔

---

[1] ملا محمد باقر مجلسی لکھتے ہیں "شیخ مفیدؒ وغیرہ نے بسند ہائے معتبر روایت کی ہے کہ جب حضرت علیؓ نے لوگوں سے بیعت کی اس وقت عبد الرحمٰن بن ملجم مرادی بھی آپ کی بیعت کرنے آیا جناب امیرؓ نے اس کی بیعت قبول نہ فرمائی یہاں تک کہ وہ تین مرتبہ آپ کی خدمت میں آیا اور تیسری دفعہ جناب امیرؓ سے بیعت کی جب وہ پلٹا جناب امیرؓ نے دوبارہ اس کو بلایا اور قسمیں دیں کہ بیعت سے انحراف نہ کرنا اور اس سے پختہ وعدہ لیا" (جلاء العیون مترجم ص ۲۸۱، ۲۸۲ ج ۱) عبد اللہ بن زیاد بھی حضرت علیؓ کے ساتھ رہا ملا صاحب لکھتے ہیں "پس معاویہ نے زیاد کو کوفہ و بصرہ کا والی مقرر کیا چونکہ وہ شیعوں کو پہچانتا تھا اور ایک مدت تک جناب امیرؓ کے ہمراہ رہا تھا۔" (ایضاً ص ۲۲۴ ج ۱)

قاتلان جگر گوشہ رسول حضرت امام حسینؓ کون لوگ تھے شیعہ کا اپنا اقرار ملاحظہ ہو "پھر بیس ہزار اہل عراق نے امام حسینؓ سے بیعت کی اور جنہوں نے امام حسینؓ سے بیعت کی تھی خود انہوں نے امام حسینؓ کے مقابلہ میں شمشیر کھینچی اور ابھی بیعت امام حسینؓ ان کی گردنوں پر تھی کہ امام حسینؓ کو شہید کر دیا اس کے بعد ہمیشہ اہل بیت پر ستم کئے ہم کو ذلیل کیا۔" (ایضاً ص ۲۳۱ ج ۲)

قاتلان امام حسنؓ کی نشاندہی شیعہ کا اپنا اقرار "جب امام حسنؓ کو مدائن میں خنجر مارا زید بن وہب جہنی امام حسنؓ کی خدمت میں آیا اس وقت آپ درد والم کی حالت میں تھے۔ زید نے کہا یابن رسول اللہ ؐ کیا مصلحت ہے بتحقیق کہ لوگ اس کام میں متحیر ہیں حضرتؓ نے فرمایا قسم بخدا اس جماعت سے میرے لیے معاویہ بہتر ہے یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ میرے شیعہ ہیں اور میرے قتل کا ارادہ کیا اور میرا مال لوٹ لیا" (ایضاً ص ۳۱۶ ج ۱) دیکھو حضرت نانوتویؒ نے ہی نہیں کہا بلکہ حضرت امام حسنؓ نے اپنا تجربہ بھی ان لوگوں کے بارے میں ایسا ہی بیان فرمایا ہے۔ ۱۲ (محمد اشرف۔ م)

ناچاری ان کے مقبرہ کی تصویریہ اور ان کے ہمراہیوں کی نعشوں کی خبر لیتے ہیں ڈھول بجاتے ہیں علم اٹھاتے ہیں شدی دکھلاتے ہیں یہ کام اس روز کس نے کئے تھے۔ مشتے نمونہ خروارے۔

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

(اہل سنت حق چار یار کے قائل ہیں)

اور یہ سچ ہے کہ سنی اصحاب اربعہ یعنی چار یار کو بترتیب معلوم جانشین حضرت سیدّ المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ اجمعین سمجھتے ہیں اور خلیفہ راشد (موعود علی منہاج النبوۃ) اعتقاد کرتے ہیں پر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور یزید پلید اور عبدالملک وغیرہ کو سنیوں میں کوئی ایک بھی خلیفہ راشد (موعود) نہیں سمجھتا۔ ہاں جھوٹ کا جواب جھوٹ ہے۔ دروغے راجزا باشد دروغ۔

اس لیے یہ عرض ہے کہ حضرات شیعہ البتہ ان بزرگواروں کو امام اور خلیفہ سمجھتے ہیں ورنہ یوں ان کا اتباع نہ کرتے کہ حضرت امام ہاتھ نہ لگے تو ان کے روضہ کے بانس جدا کر ڈالے اور حضرت قاسم پر بس نہ چلا تو ان کی نعش پر تیر چلا کر دل کے پھپولے پھوڑے۔ مرثیے گائے اور شادیانے بجائے باقی جو آپ نے ابن حجر مکی اور ابن حجر عسقلانی اور ملا علی قاری اور قاضی عیاض کا حوالہ دیتے ہیں یہ آپ کا قصور نہیں یہ آپکے مذہب کی خوبی ہے تقیہ کی آڑ میں جہاں خدائے تعالیٰ اور حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر سینکڑوں طوفان باندھے خدا والوں اور رسول والوں پر بھی ایک تہمت لگاتے چلے تو کیا بیجا کیا۔ اجی صاحب اہل سنت ان لوگوں کو بادشاہ سمجھتے خلیفہ راشد نہیں سمجھتے اگر کسی نے ان کو خلیفہ لکھدیا تو اس سے خلیفہ راشد مراد نہیں [1]۔

---

[1] امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی فرماتے ہیں۔

"درجہ اول۔ خلافت راشدہ خاصہ جس کو خلافت علی منہاج النبوت بھی کہتے ہیں۔ یہ درجہ خلافت سوا ان لوگوں کے جو مہاجرین اولین میں سے ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تمام مشاہد خیر مثل بدر، واحد وحدیبیہ و تبوک وغیرہ کے شریک رہے ہوں اور آیات الٰہی کے وعدوں کے موعود لہم ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا عالی مرتبہ اور مستحق خلافت ہونا بیان فرمایا ہو اور ان کا خلیفہ بنانا امت پر لازم کر دیا ہو اور دین الٰہی کی تمکین ان کے ہاتھ سے ہوئی ہو کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہو سکتا۔ تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے اور علمائے محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ درجہ خلافت کا (باقی صفحہ ۱۸۶ پر)

(مُلک اور مَلِک کا لفظ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ اور انبیا علیہم السلام کے لیے بھی آیا ہے)

حضرت داؤد علیہ السلام کے حق میں وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ (ہم نے ان کی حکومت کو مضبوط کیا) اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی شان میں وَهَبْ لِي مُلْكًا (اے رب مجھے بادشاہی دے) وارد ہوا ہے۔

بقیہ حاشیہ : حضرات ثلاثہ رضی اللہ عنہم کو حاصل تھا اور انہی پر ختم ہوگیا ان تینوں خلافتوں میں نبوت کا رنگ اس قدر غالب تھا کہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پس پردہ بیٹھے ہیں اور یہ تینوں خلیفہ مثل بے جان لکڑی کے آپ کے ہاتھ میں ہیں آپ جس طرح چاہتے ہیں ان لکڑیوں کو حرکت دیتے ہیں اور جو کام چاہتے ہیں ان سے لیتے ہیں یہ تینوں خلیفہ مثل گراموفون کے ہیں۔ کہ ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقدس آواز بھری ہوئی ہے جو آواز ان سے نکل رہی ہے ان کی آواز نہیں بلکہ سرور انبیاء کی آواز ہے ان تینوں خلافتوں میں بھی شیخین کی خلافت کا درجہ بہت عالی ہے۔ درجہ دوم خلافت راشدہ مطلقہ یہ درجہ خلافت کا گو پہلے درجہ سے رتبہ میں کم ہے مگر پھر بھی اس کی شان نہایت ارفع ہے سہ آسمان نسبت بعرش آمد فرود ورنہ بس عالی ست پیش خاک۔ یہ درجہ خلافت کا ان لوگوں کے لیے ہے جن کا مستحق خلافت ہونا جیسا فضائل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہو مگر امت پر ان کا خلیفہ بنانا لازم نہ کیا ہو۔ یہ درجہ عالی خلافت کا حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الشریف کو حاصل تھا اور چھ مہینے حضرت حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ کو حاصل رہا اور ان پر ختم ہوگیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا کہ میرے بعد خلافت تیس ۳۰ برس رہے گی اس سے مراد یہی دونوں قسمیں ہیں خلافت کی۔ قسم سوم۔ خلافت عادلہ یہ درجہ پہلے دونوں درجوں سے بہت گھٹا ہوا ہے اور اس درجہ کے حاصل ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ خلیفہ جامع شرائط ہو اور مقاصد خلافت اس سے فوت نہ ہوتے ہوں اس کی ضرورت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا استحقاق خلافت بیان فرمایا ہو حضرت معاویہؓ کی خلافت اسی قسم میں داخل ہے اس قسم میں بعض خلافتیں ایسی کامل ہوئی ہیں کہ بوجہ خلافت راشدہ کا ہم رنگ ہونے کے بعض علماء نے اُن کو خلافت راشدہ میں شمار کیا ہے۔ جیسے حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی خلافت اس خلافت کا سلسلہ باقی ہے۔ قسم چہارم۔ خلافت ناقصہ یا خلافت عامہ۔ یہ درجہ بالکل ہم رنگ بادشاہت و سلطنت ہے۔ یہ درجہ ان لوگوں کو بھی حاصل ہو سکتا ہے جو تمام شرائط خلافت کے جامع نہ ہوں صرف بڑی بڑی شرطیں مثل اسلام و عقل و بلوغ و ذکورت و حریت وغیرہ ان میں پائی جاتی ہوں بعض خلفائے بنی امیہ و اکثر خلفائے عباسیہ اسی قسم میں داخل ہیں۔ تفصیل کے لیے ازالۃ الخفا مقصد اول ملاحظہ فرمائیں۔ ۱۲ (مقدمہ تفسیر آیات خلافت ص ۲۹، ۳۰) محمد اشرف

بلکہ خود آپ خداوند کریم اپنی شان میں لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ اور لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ[1]

فرماتا ہے پر اس لفظ سے کسی خوش فہم نے یہ نہ سمجھا کہ جناب باری اور یہ دونوں نبی علیہما السلام بھی ایسے ہی تھے جیسے اور ملک والے مثل نمرود و شداد اور فرعون کے گذرے ہیں یا بادشاہان مذکور فقط بوجہ ملک داری خدا اور انبیاءؑ مذکورین کے برابر ہو گئے۔ یہ خوش فہمی البتہ شیعہ حضرات پر ختم ہوئی اور لفظ مُلک کو جو میم کے پیش کے ساتھ ہے، کچھ چنداں مفید مطلب اہل سنت نہیں سمجھتے تو کلام اللہ ہی میں الملک (بادشاہ) لام کے زیر اور میم کے پیش کے ساتھ فرماتے ہیں اگر کلام اللہ یاد نہ ہو اور کیوں ہوگا تو اٹھائیسویں پارہ میں سورہ حشر کا مطالعہ فرمائیں۔ اور یہ فرمادیں کہ لفظ مَلِک جو میم کی زبر اور لام کی زیر سے ہے کیا معنی ہیں؟ بادشاہ کو کہتے ہیں یا کچھ اور معنی ہیں۔ اگر حضرات شیعہ اس بات کو تسلیم کریں کہ لفظ مذکور بمعنی بادشاہ ہے اور بادشاہ سب ایک رنگ کے ہوتے ہیں۔ خواہ یوں کہو کہ بادشاہان مذکور خدا کی سی شان رکھتے ہیں، یا خداوند کریم معاذ اللہ ان کا ہم رنگ تھا تو اہل سنت والجماعت کی طرف سے ہم ذمہ کش ہیں کہ ہم بھی جس کو خلیفہ کہا کرتے ہیں اس سے خلیفہ راشد مراد لیا کرتے ہیں۔

اور اگر حضرات شیعہ اس بات میں تین پانچ کریں تو بڑی ستم کی بات ہے کہ اہل سنت پر مفت الزام لگاتے ہیں اور آپ نہیں شرماتے، اجی حضرت! اہل سنت گو سب کو خلیفہ کہیں پر (موعود) خلیفہ برحق اور خلیفہ راشد چار یار ہی کو سمجھتے ہیں۔ اور یہ ایسی بات ہے جیسے اولاد کو ہر کوئی خلف کہتا ہے پر خلف الرشید اس کو کہتے ہیں جو فرزند کامل ہو ورنہ یا تو ناخلف ہے یا کوئی صفت بھلی بری اس کے ساتھ کچھ نہیں لگاتے، سو خلیفہ راشد تو چار یار ہی تھے اور یزید، ولید، عبدالملک وغیرہ مروانی عباسی اکثر ناخلف تھے۔

(حضرت امیر معاویہؓ و حضرت امیرؓ کا معاملہ حضرت ہارون و موسیٰ علیہما السلام جیسا تھا)

اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ، اس باب میں نہ خلیفہ راشد ہیں نہ ناخلف ہیں[2]۔ ہاں فضیلت

---

[1] آج بادشاہی کس کی ہے صرف ایک خدائے زبردست کی۔

[2] حضرت امیر معاویہؓ کا ولید و یزید سے الگ ذکر خیر حضرت نانوتوی کے ہاں خلیفہ عادل لائق ہونے کی صراحت ہے کہ گو آپ سابق مہاجرین کے سے خلفاء راشد اور موعودہ خلیفہ نہ تھے مگر بعد والوں کی طرح جابر اور نالائق جانشین بھی نہ تھے اس تمام سیاق و سباق کا نتیجہ یہی سمجھنا چاہیے اور حضرت معاویہؓ کے حق میں یا مولف کے حق میں بدگمانی ہرگز نہ رکھنی چاہیے۔ مصحح ۱۲ مہر محمد

صحبت اور بزرگی صحابیت اور اخوۃ ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی ان کو حاصل تھی اور اس لیے سب کے واجب التعظیم ہیں جو برا کہے وہ اپنی عاقبت کھوتا ہے۔ کیونکہ خداوند کریم تمام صحابہ کی نسبت فرماتا ہے یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰهُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ جس کا حاصل یہ ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایمان لانے والوں کو رسوا نہ کرے گا۔ سو جو کوئی اس پر بھی ان کو رسوا کرنا چاہے وہ خدا کا مقابل ہے ہم کو تو اب یہی لازم ہے کہ ان کی عیب چینی نہ کریں اور یوں سمجھیں کہ حضرت امیر علیہ السلام امیر معاویہ وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں اگر باہم کچھ مناقشہ ہوا بھی تو وہ ایسا ہی تھا جیسا حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون اور حضرت یوسف اور ان کے بھائیوں اور حضرت موسیٰ اور خضر میں یہ جھگڑے قضیے ہوئے۔ یہ سب قصے کلام اللہ میں مذکور ہیں انکار کی گنجائش نہیں ورنہ اے حضرات شیعہ خوف کفر ہے پھر بھی کو بزرگ سمجھنا لازم ہے۔

مناقشات صحابہؓ نہ تو کلام اللہ میں مذکور ہیں نہ حدیث میں ذکر ہے تاریخوں میں ان افسانوں کا بیان ہے سو تاریخوں کا ایسا کیا اعتبار اور وہ بھی شیعوں کی تاریخ کا اعتبار تس پر حضرت موسیٰ وغیرہ کو باوجود مناقشات معلوم برا نہیں کہتے اگر ایسا ہی ان حضرات کو کچھ نہ کہو تو کیا پیٹ پھول جائے گا کلام اللہ کے مخالف نہیں حدیث کے منافی نہیں اگر ہے تو موافق ہے۔

بالجملہ اہل سنت خلیفہ بھی کو کہہ دیا کرتے ہیں اس لفظ میں کچھ بزرگی نہیں اس کے معنی فقط جانشین ہیں سو تمہیں کہو اس میں کیا بزرگی ہے اگر کسی نیک آدمی کی جگہ کوئی بدمعاش بیٹھ جائے۔ تو اس کو جانشین تو ضرور کہیں گے پر اس میں کچھ بزرگی نہ نکلے گی۔ ہاں لفظ راشد بزرگی پر دلالت کرتا ہے۔ اس صورت میں خلیفہ کی دو قسمیں ہوں گی ایک خلیفہ راشد یہ تو چار یار اور پانچویں پانچ چھ مہینے کے لیے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ ہو گئے تھے دوسرا خلیفہ غیر راشد اور خلیفہ غیر راشد کو بادشاہ اور ملک بھی سنیوں کی اصطلاح میں کہتے ہیں یزید اور عبدالملک وغیرہ سب اسی قسم کے ہیں ہاں عمر بن عبدالعزیز البتہ مروانیوں میں سے خلیفہ راشد ہوئے ہیں۔ فقط

(شیعہ کے منافی اسلام خصائص)

باقی رہی یہ بحث کہ شیعہ کسے کہتے ہیں اور سنی کسے کہتے ہیں سو اس سے ہمیں کیا بحث؟ پر بات میں بات آ گئی تو ہم بھی تفصیل وار نہیں تو بالاجمال ہی اس امر میں کوئی چٹکلا سناتے چلیں۔

صاحبو! شیعہ اتنی ہی باتوں سے نہیں ہوجاتا شیعہ ہونے کے لیے بڑے بڑے سامانوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو یہ کہ حضرت علیؓ اور باقی ائمہ اطہار کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین سمجھے دوسرے یہ کہ ان کی نسبت نزول وحی کا بھی اعتقاد رکھے تیسری یہ کہ ان حضرات کو در بارۂ نسخ احکام مختار سمجھے[1]۔ سو سمجھنے والے اب سمجھ گئے ہوں گے کہ اس صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم النبیین ہونا بالکل بے معنی ہو جائے گا کیونکہ حضرات ائمہ جب در بارہ تحریم و تحلیل احکام خود مختار ہوئے چنانچہ جملہ یحلون ما یشاؤن ویحرمون ما یشاؤن جو کتاب نوادر میں اسی بارہ میں موجود ہے اس مطلب کے لیے دلیل قاطع ہے تو ان کی نبوت میں حالت منتظرہ ہی کیا باقی رہ گئی گو اطلاق اسم نبی ان پر نہ کیا جاوے اور در صورت ثبوت نبوت حضرات ائمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت کا بطلان ایسا ظاہر و باہر ہے کہ کوئی کور باطن ہی انکار کرے تو کرے بلکہ اگر فہم سلیم ہو تو جملہ یحلون ما یشاؤن ویحرمون ما یشاؤن سے فقط انکار خاتمیت ہی نہیں نکلتا اس انکار کے ساتھ حضرات ائمہ کا جملہ انبیاء سے افضل و اعلیٰ ہونا بھی مفہوم ہوتا ہے

ان تینوں باتوں کے سوا دو امر اور بھی شیعہ بننے کے لیے ضروری ہیں بلکہ اگر ان کو اصل اصول مذہب تشیع کہا جائے تو مناسب ہے۔

اوّل بدا۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ خداوند کریم نعوذ باللہ ناعاقبت اندیش اور عواقب امور سے جاہل محض ہے۔ دوسرے تقیہ جس کا ماحصل یہ ہے کہ حضرات انبیاء و ائمہ تو ہمات اور انکار کے بھروسے ہم رنگ کفار و فساق بنے رہے اور بوجہ خوف اعدا ہمیشہ فرائض و ضروریات دین کو چھپاتے رہے۔ نعوذ باللہ من ھذا الخرافات۔

---

[1] کافی کلینی میں اس کے علاوہ اس سے عجیب تر یہ بھی ہے کہ امام جعفر صادق حضورؐ کے مقابلے میں حضرت علی کی شریعت کے قائل ان کو حضورؐ کا ہم رتبہ اور واحد واجب الاتباع مانتے ہیں۔ ملاحظہ ہو "امام ابو عبد اللہ فرماتے جو شریعت علی لائے ہیں میں وہ لیتا ہوں جن باتوں سے وہ روکیں رکتا ہوں ان کو وہی شان ملی ہے جو محمدؐ کو ملی ہے اور محمد کی فضیلت تمام مخلوق الٰہی (بجز علیؓ) پر ہے۔ آپ پر معترض خدا اور رسول پر معترض ہے کسی چھوٹی بڑی چیز میں آپ پر تنقید کرنے والا مشرک باللہ کی طرح ہے امیر المومنین وہ دروازہ ہیں کہ صرف ان سے اسلام میں داخلہ ہو سکتا ہے یہ وہ واحد راستہ ہے کہ جو اسے چھوڑ کر چلا وہ ہلاک ہو گیا اور یہی شان و مرتبہ یکے بعد دیگرے باقی ائمہ بھی رکھتے ہیں۔

(اصول کافی ص ۱۱۷ طبع لکھنؤ) ۱۲ مہر محمد

(شیعہ اکثر اہل بیت کے منکر ہیں)

ان شروط کے بعد ایک شرط شیعہ ہونے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ چند حضرات اہل بیتؓ کی محبت کا برائے نام دعویٰ کر کے باقی جملہ حضرات اہل بیت کو کلمات گستاخانہ مثل کافر و فاسق و خالد فی النار کے ساتھ یاد کیا جاوے چنانچہ سب جانتے ہیں کہ شیعہ بہ نسبت ازواج مطہرات عموماً اور بہ نسبت حضرت عائشہ صدیقہؓ محبوبہ خاص حضرت خاتم النبیین خصوصاً کیا کیا ہرزہ سرائی کرتے ہیں۔ باوجودیکہ ازواج مطہرات کا اہل بیتؓ میں داخل ہونا شرعاً و عرفاً و عقلاً ظاہر و باہر ہے اس کے سوا حضرت رقیہ و حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہما کو بخلاف جملہ علماء سنت و اہل تاریخ بلکہ خلاف احادیث و اشارات قرآنی جناب ختمی مآب کی صاحبزادیوں میں ہی نہیں کہتے اور نسب سے ہی خارج کیے دیتے ہیں۔

(شیعہ ائمہ کی اولاد کو بدترین جانتے ہیں)

علاوہ ازیں زید بن علی بن حسینؓ اور ان کے بیٹے یحییٰ بن زید کو دشمن سمجھتے ہیں۔ جعفر بن موسیٰ کاظم (اور جعفر بن نقی برادر حسن عسکری) کو ملقب بکذاب کر رکھا ہے۔ حسن بن حسن المثنیٰ وغیرہ کو کافر و مرتد و خالد فی النار جانتے ہیں اس کے سوا اور عقائد و خصائص مذہب شیعہ کو اس پر قیاس کر لینا چاہیے ع قیاس کن ز گلستان شان بہار شان۔ پھر باوجود ان ظلمتوں اور گستاخیوں کے جو شیعہ حضرات اہل بیت کی شان میں کرتے ہیں اگر کوئی شیعہ محبت اہل بیت کا بفرض محال دعوےٰ کرے وہ جھوٹا ہے مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ مذہب حضرت سید المرسلین صلوٰت اللہ و سلامہ علیہ و علی آلہ اجمعین کا تعلیم کردہ ہو ورنہ آپ ہی کی اولاد کو کیوں قتل کرتے۔

(مذہب شیعہ کا بانی یہودی تھا)

ہاں یوں کہیے کہ آپ کے پیشوا عبداللہ بن سبا یہودیؐ نے اس مذہب کی بنیاد ڈالی۔ اوّل

ذَكَرَ بَعْضُ أَهْلِ الْعِلْمِ أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ سَبَا كَانَ يَهُودِيًّا فَأَسْلَمَ وَوَالَى عَلِيًّا عَلَيْهِ السَّلَامُ وَكَانَ يَقُولُ وَهُوَ عَلَى يَهُودِيَّتِهِ فِي يُوشَعَ بْنِ نُونٍ وَصِيِّ مُوسَى بِالْغُلُوِّ فَقَالَ فِي إِسْلَامِهِ بَعْدَ وَفَاتِ

بعض اہل علم نے بیان فرمایا ہے کہ عبداللہ بن سبا یہودی تھا پھر وہ مسلمان ہو گیا اور اس نے علی علیہ السلام سے دوستانہ کیا اور یہ یہودیت کی حالت میں غلو کے ساتھ یوشع بن نون کو موسیٰ علیہ السلام کا وصی کہتا تھا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

باقی حاشیہ صفحہ ۱۹۱ پر

اول تو یہ لوگ یونہی چھپے لگے رہے اور جیسے خوارج اور معتزلہ وغیرہ فرقہائے باطلہ گنے چنے تھے یہ بھی دس دس پانچ پانچ کہیں ہوتے تھے۔ پھر جب اتفاق سے سلاطین ایران نے یہ مذہب قبول کیا تب البتہ اس مذہب کو کسی قدر فروغ ہونا شروع ہوا مگر پھر بھی بحمد اللہ ایران میں بھی اہلسنت بہت ہیں اور کیوں نہ ہوتے وہ ملک کس کا فتح کیا ہوا ہے مع ہذا یہ فروغ اہل سنت کے فروغ کے سامنے ایسا ہے جیسے آفتاب کے سامنے کرم شب تاب (جگنو) کا فروغ۔ اب فرمائیے آپ کو یہ کہنا مناسب ہے، یا ہم کو کہ انشاء اللہ یوم الجزاء میں معلوم ہو جائے گا۔ آدمی کو چاہیئے کہ جس بات میں دخل نہ ہو اس میں دخل نہ دے اپنے قصور کو اہل سنت کے ذمہ لگاتے ہو اور خدا سے نہیں شرماتے اہل کوفہ سب شیعہ تھے ہاں یزید اور عبید اللہ بن زیاد کو اگر یوں کہو کہ وہ شیعہ نہ تھے تو بجا ہے مگر ان کو سنی ہی کون کہتا ہے وہ نہ سنی تھے نہ شیعہ تھے ناصبی تھے۔ بہر حال آدمی کو چاہیئے جس بات میں دخل نہ ہو اس میں دخل نہ دے مگر ہاں ایک حساب سے آپ نے بھی سچ فرمایا بیشک اس مذہب فاسد کی جزا روز قیامت ملے گی۔

سوال دوم از جانب شیعہ (شیعہ کے نزدیک خلافت اجماع سے ثابت نہیں ہو سکتی)

سنی کہتے ہیں کہ بعد آنحضرت کے ابوبکر امام اور بعد انکے عمرؓ امام تھے سو واضح ہو کہ بعد مرتبہ نبوت کے مرتبہ خلافت اور امامت کا ہے جس طرح خلقت اپنی طرف سے رسول اور نبی

بقیہ حاشیہ

رَسُولِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ فِیْ عَلِیٍّ عَلَیْہِ السَّلَامُ مِثْلَ ذٰلِکَ وَکَانَ اَوَّلُ مَنْ اَشْہَرَ الْقَوْلَ بِفَرْضِ اِمَامَۃِ عَلِیٍّ وَاَظْہَرَ الْبَرَاءَۃَ مِنْ اَعْدَائِہٖ وَکَاشَفَ مُخَالِفِیْہِ وَاَکْفَرَہُمْ فَمِنْ ہٰہُنَا قَالَ مَنْ خَالَفَ الشِّیْعَۃَ اَصْلُ التَّشَیُّعِ مَاخُوْذٌ مِنَ الْیَہُوْدِیَّۃِ۔

(رجال کشی ص ۱۰۱ طبع کربلا) ۱۲ محمد اشرف

کی وفات کے بعد اپنے اسلام کے زمانہ میں حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں بھی ایسا ہی کہا۔ ابن سبا پہلا شخص ہے جس نے امامت علی کے فرض ہونے کو مشہور کیا اور ان کے دشمنوں پر تبرا کیا اور ان کے مخالفوں سے کھل کھیلا اور ان کو کافر کہا اسی وجہ سے شیعہ کے مخالف کہتے ہیں شیعت کی بنیاد یہودیت سے ماخوذ ہے۔

نہیں بنا سکتی اسی طرح امام و خلیفہ بھی نہیں بنا سکتی اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ بعد آنحضرت کے ابوبکر و بعد اُن کے عمرؓ خلیفہ و امام تھے تو مذہب شیعوں کا باطل اور اگر امامت اور خلافت ان کی باطل ہو تو مذہب سنیوں کا جھوٹا ہے۔ پس باتفاق سنی و شیعہ منصب امامت و خلافت واسطے شیخین کے کسی آیت و حدیث سے ہرگز ثابت نہیں بلکہ آیت قرآنی لاینال عہدی الظالمین یعنی نہیں پہنچتا عہد میرا ظالمین کو اس سے بھی لائق عہدہ امامت کے شیخین نہیں ہو سکتے۔ فضل اللہ روزبہان ابطال باطل میں تصریح کرتا ہے کہ ابوبکر و عمر نے باجماع اصحاب خلافت آنحضرت کی پائی۔ یہ فقیر کہتا ہے کہ جیسا اجماع سے نبوت نبی کی ثابت نہیں ہوتی اسی طرح امام کی امامت خلقت کے بنانے سے ثابت نہیں ہوتی امام میں سب شرطیں ہیں اعلم الناس ازہد الناس۔ اورع الناس اعدل الناس اشجع الناس افضل الناس افصح الناس ارحم الناس تاکہ خلقت کو اس سے ہدایت ہووے اور امام ایسا ہو کہ دوسرے شخص اس سے مسائل دینیہ میں ہدایت پاویں۔ اگر ایسا امام و نائب نبی کا درباب شرعیہ محتاج دوسرے کا ہو ——— پھر وہ نائب رسول کس بات میں ہے آنحضرت خلقت کو ہدایت فرماتے تھے اور ہر طرح کے شکوک رفع کرتے تھے اسی طرح خلیفہ ہونا چاہیے کہ اسکی طرف تمام خلقت علوم خدا میں رجوع کریں اور جو سوال اس سے کرے بخوبی تمام تسلی و تشفی کرے تا کہ خلافت نیابت آنحضرت کی اس سے ثابت ہو۔ پس شیخین نہ اعلم الناس نہ ازہد الناس الخ تھے۔ قبل از اسلام بت پرستی وغیرہ گناہ کبیرہ و صغیرہ میں مشغول تھے پھر تعجب ہے کہ کس طرح خلافت شیخین کی برحق ہوئی۔ اور انتظام دنیاوی ملک کا فتح کرنا باعث خلافت حقہ کا نہیں ہو سکتا جیسا کہ تیمور بادشاہ نے بکثرت ملک فتح کیا۔ نائب ہونا جناب رسالتمآب کا اس سے لازم نہیں آتا اور جناب امیر میں یہ سب صفات موجود تھیں۔ حاصل تقریر مجملاً یہ ہے کہ خلفاء ثلاثہ کی خلافت قرآن و حدیث سے ہرگز ثابت نہیں پس جو کوئی ان کو خلیفہ رسول اعتقاد کرے وہ خلاف قرآن و حدیث کے ہے پس جب کہ خلافت ان کی باطل ہوئی تو مذہب اہل سنت باطل ہوا۔

جواب سوال دوم

(امامت وخلافت کا نبوّت پر قیاس مع الفارق ہے)

اس سوال میں تو آپ نے اپنے گمان میں آسمان کے تارے توڑ لیے اور ایسی ڈھینگی لی (گھٹیا بات کی) کہ خدا کی پناہ۔ مگر صنعت قیاس مع الفارق تو کوئی آپ سے سیکھ جائے۔

فرماتے ہیں کہ بعد مرتبہ نبوت کے خلافت و امامت کا مرتبہ ہے جس طرح خلقت اپنی طرف سے رسول نبی نہیں بنا سکتی اسی طرح امام وخلیفہ بھی نہیں بنا سکتی۔ خدا خیر کرے شاید اسی قیاس کے موافق حضرات شیعہ یہ بھی کہنے لگیں کہ خلیفہ نبی بھی نبی اور رسول ہی ہونا چاہیئے اور انصاف سے دیکھیئے تو یہ کام ہی آپ کر چکے کیونکہ حضرات ائمہ کو در بارہ نسخ و تبدیل احکام شرعی مجاز و مختار کہنے کے، سوا اس کے اور کیا معنیٰ ہیں کہ حضرات ائمہ کو بھی مرتبہ نبوّت حاصل ہے مرحبا جناب ختمی مآب کی خاتمیت بلا سے باطل ہو جائے مگر اپنے قیاس فاسد میں ذرا خلل نہ آئے ایسے مدعیان اسلام کے ہوتے کفار دشمنان دین کو کون پوچھتا ہے شعر

آنچہ بفیضی نظر دوست کرد

حیف کہ آن دشمن جانی کند

اور کیا عجب ہے، کہ حضرات شیعہ اسی قیاس کے بھروسے دربارہ نائبان ائمہ مثل قضاۃ وغیرہ اور رفتہ رفتہ مجتہد بننے[1] کے لیے یہی مثل نائبان انبیاء علیہم السلام معصوم و افضل الناس و منصوص

---

[1] چنانچہ ائمہ کے بعد مجتہدین کو حلال وحرام سازی اور فرض عین کا حق نبوت دے چکے ہیں مشہور فاضل محقق شیخ عباس قمی منتہی الآمال ج ۲ ص ۳۴ میں رقمطراز ہیں۔

لائح و واضح است کہ مخالفت حکم مجتہدین کہ حافظان شرع حضرت سید المرسلین اند بالشرک در یک درجہ است پس ہر کہ مخالفت حکم خاتم المجتہدین و وارث علوم سید المرسلین و نائب الائمۃ المعصومین کند و در مقام متابعت نباشد بے شائبہ ملعون و مطرود و دور ہیں آستان ملائک آشیان مطرود است و بہ سیاستہائے عظیمہ و تادیبات بلیغ مواخذہ خواہد شد کتبہ طہماسب بن شاہ اسمٰعیل صفوی موسوی

بالکل روشن اور واضح ہے کہ مجتہدین کے حکم کی مخالفت جو حضرت سید المرسلین کی شریعت کے محافظ ہیں، شرک کے درجہ میں ہے پس جو کوئی ائمہ معصومین کے نائب علوم رسول کے وارث اور خاتم المجتہدین کے حکم کی مخالفت کرے اور انکی تابعداری نہ کرے وہ بلا شبہ لعنتی پھٹکارا ہوا اور اس ملائکہ کے آستانہ سے دھتکارا ہوا ہے اسے بڑی سزائیں دی جائیں۔ اور خوب سخت گوشمالی کے ساتھ اس کا مواخذہ کیا جائے یہ فتویٰ طہماسب بن شاہ اسماعیل صفوی موسوی نے لکھا ہے۔ ۱۲

مہر محمد

من اللہ ہونے کی شرط لگانے لگیں۔ ادھر حضرت آدم علیہ السلام کا خلیفہ خداوندی ہونا خود کلام اللہ میں موجود۔ اس پر مسجود ملائک ہونا جو آیات متعددہ سے ثابت ہے۔ اس کا مؤید پھر ضرور اسی قیاس کے موافق حضرات شیعہ بہ نسبت حضرت آدم علیہ السلام ضرور معتقد الوہیت و جمیع صفات خداوندی ہوں گے سبحان اللہ قیاس ہو تو ایسا ہو۔

(تقرر امام نص کے بجائے شوریٰ سے بھی ہوتا ہے)

اس کے سوا ہم کہتے ہیں کہ تقرر امام بواسطہ وحی کوئی اور کہے تو کہے شیعہ کس منہ سے کہتے ہیں دیکھئے نہج البلاغہ جو شیعوں کے نزدیک قرآن سے بھی زیادہ معتبر ہے اس میں حضرت امیر اپنی خلافت کی حقیقت کے ثبوت کے لیے بمقابلہ امیر معاویہ یہ استدلال پیش کرتے ہیں۔

انما الشوریٰ للمہاجرین والانصار فان	یعنی معتبر در بارۂ تقرر خلیفہ مہاجرین وانصار کا مشورہ ہے
اجتمعوا علی رجل وسموہ اماما کان	سو مہاجرین والصار جس شخص کو بالاتفاق خلیفہ بنالیں
ذالك للہِ رضیً۔	وہی عند اللہ پسندیدہ ہوگا۔

اگر حضرت علیؓ کے پاس دربارۂ ثبوت خلافت کوئی نص صریح موجود تھی تو جناب امیر نے اس کو کس روز کے لیے چھپا رکھا تھا۔ کیا قیامت کو کام آئے گی۔ حالانکہ شوریٰ مہاجرین والصارؓ میں تو آخر کس قدر مجال گفتگو بھی تھی نص صریح تو ہر کسی کے نزدیک واجب التسلیم ہے اس کو چھوڑ کر اُس کو اختیار کرنا اس پر حجت قاطع ہے کہ حضرت امیر کے پاس دربارۂ خلافت کوئی نص موجود نہ تھی ورنہ وفات نبوی کے بعد سے لے کر اخیر عمر تک کبھی تو ظاہر ہوتی۔ بالجملہ بفرض محال امام کا منصوص من اللہ ہونا کوئی اور ضروری کہے تو کہے مگر شیعہ کو تو بوجہ ارشاد مرتضوی اس کا قائل ہونا در پردہ جناب امیر کے قول کی تکذیب کرنی ہے۔

(خلیفہ خاص کا تقرر نص سے نہیں ہونا چاہیے عقل نقل کا یہی تقاضا ہے)

علاوہ ازیں اور بھی روایتیں کتب شیعہ میں اس کی مؤید موجود ہیں بلکہ احادیث مرفوعہ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ باوجود استفسار جناب رسالت مآبؐ نے بالتخصیص کسی کا نام لے کر خلیفہ مقرر نہیں فرمایا۔ ہاں یہ پتہ و نشان بطور قواعد کلیہ جو قیامت تک تقرر خلیفہ کار آمد ہوں بیان فرمائے اور یہی امر قرین عقل بھی ہے۔ کیونکہ خاص خلیفہ کا تقرر جناب

شارع سے ہوتا موجب حرج عظیم ہے[۱]۔ جیسا تمام امور شرعیہ میں مثل نکاح و بیع وغیرہ کے شارع نے لوازم و شرائط و اسباب جواز و عدم جواز وغیرہ بطور قواعد کلیہ کے بیان فرمائے اور تعیین شخصی مکلفین کے ذمہ رکھی گئی ورنہ بہت تنگی اور دقت پیش آتی۔ علی ہذا القیاس تقرر خلیفہ کے لیے بھی علامات و لوازم بیان کئے گئے اور تقرر شخصی مکلفین کے اختیار میں رہا۔ اپنی حاجت و ضرورت کے موافق جسکو مناسب سمجھیں سب رل مل کر اس کو خلیفہ بنالیویں۔

(خلفاء کے ساتھ ولیعہد کا برتاو حضورؐ نے فرمایا)

ہاں اس میں شک نہیں کہ جناب رسالتمآبؐ نے خلفاء اربعہ کے ساتھ عموماً اور شیخین بالخصوص صدیق اکبر رضؓ کے ساتھ خصوصاً ایسے معاملات کئے اور ان کے ایسے اوصاف بیان فرمائے کہ جن سے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو ان کا خلیفہ اوّل و جانشین نبوی ہونا ظاہر و باہر ہو گیا تھا یہی وجہ ہے کہ بعد وفات نبوی بلا اختلاف ہر کسی نے حضرت صدیق اکبر کے ہاتھ پر بیعت خلافت کر لی اور خاص حضرات شیعہ کو تو لوجہ نہ ہونے نص صریح کے یہ نفع بھی بہت بڑا ہوا کہ اگر دربارہ خلافت صدیق اکبر رضؓ کوئی نص صریح موجود ہوتی تو سب جانتے ہیں کہ اس کے منکر کا کیا حال ہوتا۔ جواب ہوگا، انشاء اللہ اس سے کچھ زیادہ ہی ہوتا۔ اور تقریر بالا سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ سائل کا یہ کہنا ہو پس باتفاق شیعہ و سنی منصب امامت و خلافت واسطے شیخین کے کسی آیت و حدیث سے ہرگز ثابت نہیں

---

[۱] امام اہلسنت مناظر اسلام مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی فرماتے ہیں۔

"خلافت کے شارع کی جانب سے منصوص ہونے کے تین معنی ہیں (۱) شارع یہ بیان فرمائے کہ فلاں شخص یا اشخاص میں خلافت کی لیاقت موجود ہے یعنی تمام شرائط خلافت کے اس میں پائے جاتے ہیں اگر وہ خلیفہ بنایا جائے گا تو خلافت کے مقاصد اچھی طرح پورے ہوں گے اس معنی کے لحاظ سے تو کافی صحابہ کرامؓ کی خلافت منصوص ہے خصوصاً مہاجرین کے لیے۔

(۲) یہ کہ قابلیت خلافت کے بیان کر دینے کے علاوہ شارع کی طرف سے ان اشخاص کو خلیفہ بنانا مسلمانوں پر واجب و لازم کر دیا گیا ہو اس معنی کے لحاظ سے حضرات شیخین کی خلافت منصوص ہے۔ (۳) یہ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان کر دیا ہو کہ فلاں شخص یا اشخاص کو میں نے اپنا خلیفہ بنا دیا ہے تم لوگ اس کے ہاتھ پر بیعت کر لو اس معنی کے لحاظ سے کسی کی خلافت منصوص نہیں" اس مقام پر حضرت نانوتویؒ اس تیسرے معنی کے لحاظ سے خلافت صدیقی کے منصوص ہونے کا انکار فرما رہے ہیں۔ ۱۲۔ (مقدمہ تفسیر آیات خلافت ص ۲۷ و ص ۲۸) محمد اشرف

بالکل لغو ہے کیونکہ اگر مراد اس سے یہ ہے کہ تعیین شخصی بالتصریح در بارہ شیخین موجود نہیں تو ہم مگر اس میں ہمارا کیا نقصان چنانچہ مذکور ہوا۔ اور خود جناب امیر و دیگر ائمہ کے باب میں اس قسم کی نص موجود نہیں اور اگر یہ مطلب ہے کہ شیخین کا لائق خلافت ہونا بھی کسی نص سے ثابت نہیں تو اور کیا کہوں چھوٹوں کے منہ میں کچھ اور معاملات نبوی و احادیث نبوی کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ حضرات شیخین کا مستحق خلافت ہونا ایسا روشن ہے کہ بجز تیرہ دروں کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا سو دیکھنا چاہیے کہ ان احادیث کا منکر کون ہے شیعہ یا اہل سنت ؟

(لاینال عھدی الظالمین کا مطلب)

باقی یہ جو بکمال ناز آیت لاینال عھدی الظالمین پڑھی جاتی ہے۔ اس کے انجام کی خبر بھی ہے کیا ہوتا ہے ؟ اجی حضرت کلام اللہ کے معنی سنئے جائیں۔ آپ کیا جانیں۔ آپ کیوں اس بیچ میں ٹانگ اڑا کر اپنی ٹانگ تڑائی کوئی آپ سے پوچھے عہد معنی امامت کون سی کتاب میں آپ نے لکھا دیکھا۔ قاموس نے آپ کی ہمت بندھائی یا مطالعہ صراح سے یہ بات ہاتھ آئی اگر آیت انی جاعلك للناس اماما پہ آپ کی نظر ہے تو اس کے معنیٰ ہم سے سنئے خداوند کریم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چند باتوں میں امتحان لیا جب اس امتحان میں حضرت پورے اترے چنانچہ آیت ماقبل اس پر دلالت کرتی ہے۔ ترجمہ دیکھ لیجیے۔ یوں تو آپ کیا سمجھیں گے تو خداوند ذوالجلال نے اس کے جلو میں پیشوائی عالم کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ لفظ للناس اس پر شاہد ہے۔ سو خداوند کریم صادق القول نے اپنا وعدہ پورا فرمایا اس زمانے سے لے کر آج تک حضرت ابراہیم علیہ السلام سب انبیاءؑ اور اولیاءؒ کے پیشوا رہے یہاں تک کہ خود حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ارشاد ہے۔ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِيْمَ حَنِيْفًا جس کے یہ معنیٰ ہیں کہ تم بھی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی پیروی کرو مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہو جائیں بڑے بڑے امیر بادشاہ ہو کے آگے راہ کی درستی اور صفائی کے لیے چلا کرتے ہیں اور بادشاہ اس باب میں ان کی پیروی کیا کرتا ہے۔

غرض حضرت ابراہیم علیہ السلام سب کے پیشوا ہیں۔ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت

تو معلوم ہو چکا۔ باقی حضرت یوسف علیہ السلام خود فرماتے ہیں۔ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْ اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ۔ جس کا ماحصل یہی ہے کہ میں اپنے باپ دادوں حضرت ابراہیم اور حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کی ملت کا پیرو ہوں علی ہذا القیاس اور انبیاءؑ کو اسی پر قیاس فرمایئے۔

(جاعلك للناس اماما سے مراد پیشوائی نبوت ہے)

جب یہ بات مقرر ہو چکی تو یہ عرض ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بمعنی خلیفہ و نائب نہیں تھے۔ امام بمعنی نبی و رسول تھے اگر اس امامت سے پیشوائی نبوّت و رسالت مراد ہے تو اہل سنت کب کہتے ہیں کہ جو لوگ پہلے بت پرست ہوں وہ نبی ہو سکتے ہیں اور اگر امامت بمعنی خلافت مراد ہے تو یہ معنی ہوئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نبی نہ تھے نعوذ باللہ بلکہ نائب نبی تھے سو یہ بات اور یہ مذہب شیعوں ہی کو مبارک ہے اہل سنت تو بجان و دل ان کی نبوّت اور رسالت کے معتقد ہیں کہ وہ سب کے سب منیب ہیں کسی کے نائب نہیں۔ مگر اس تقدیر پر شیعہ ان کو کس کا نائب کہیں گے آذر کا کہیں گے نعوذ باللہ منہا یا کسی اور کا مہربانی فرما کر ہم کو بھی اطلاع فرمائیں۔

(آیت امامت کا بالمثل معارضہ)

بایں ہمہ ہم پوچھتے ہیں جیسے یہاں لاینال عہدی الظالمین ہے اسی صورت میں دوسری جگہ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ (بیشک اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا) بھی فرماتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس میں اس سے بہت کچھ زیادہ تاکید ہے۔ جس کے باعث یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ وعدہ اس وعدہ سے بدرجہا محکم ہے۔ سو اگر ظالمین ظلم گذشتہ اور ظلم حال دونوں کو شامل ہے۔ تب تو لازم آتا ہے کہ کسی بت پرست کو ہدایت نہ ہوا کرے اور یہ ہدایت نبوی و ائمہ اطہار اور انبیاء سابقین ایک افسانہ غلط ہو جائے اور تمام شیعان زمانہ حال و گذشتہ بشہادت آیت مذکور مسلمان نہ ہوں اس لیے کہ گناہوں سے کوئی خالی نہیں۔ تس پر اسلاف اکثر شیعہ بت پرست تھے جو بت پرستی چھوڑ کر اس مذہب میں داخل ہوئے اور اگر ظلم حال مراد ہے تو اصحاب ثلاثہ ایام اسلام میں ایسے جرائم کے مرتکب نہیں ہوئے اور نہ اور کبائر کا صدور ان سے وقوع میں آیا اور اگر فرق بالقوۃ اور بالفعل مراد ہے یعنی جو لوگ اصل طبیعت میں ظالم اور گنہگار ہیں ان کو تو ہدایت نہیں ہوتی جیسے جو اصل سے کالا ہو وہ سفید نہیں ہو سکتا اور جو اصل طبیعت میں گنہگار نہیں اس کو

ہدایت ہوجاتی ہے جو کپڑا وغیرہ کوئلوں کے رنگ سے سیاہ کرلیا ہو اس کو سفید کرسکتے ہیں تو یہ فرق مسلم ہے۔ مگر یہی فرق بہ نسبت آیت لا ینال عہدی الظالمین بھی محفوظ رکھنا پڑے گا اور یہ کہنا ہوگا کہ جو لوگ باعتبار اصل طبیعت ظالم ہیں وہ قابل خلافت و امامت نہیں اور جن لوگوں کی طبیعت اصلیہ لوث ظلم سے پاک ہے وہ قابل ہوں تو اس میں کچھ حرج نہیں اگرچہ زمانہ سابق میں بوجہ امور خارجیہ ظلمت ظلم ان کی طبیعت پر اسی طرح عارض ہوگئی جیسے آئینہ مصفّٰی و مجلی پر اوپر سے سیاہی لگ پڑے سو ظاہر ہے کہ آئینہ کی صفائی اصلی اس سیاہی سے زائل نہیں ہوجاتی بلکہ سیاہی عارضی سے صفائی اصلی اس طرح پر مستور ہوجاتی ہے جیسے نور آفتاب پردۂ ابر میں چھپ جاتا ہے زائل نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر سیاہی مذکور پانی سے دھو ڈالئے تو صفائی اصلی خود بخود ظاہر ہوجاتی ہے۔ یہی صورت بعینہٖ لا ینال عہدی الظالمین میں خیال فرمالیجئے۔ چنانچہ ظاہر ہے۔

(حضرت ابوبکر صدیق رضؓ بت پرستی سے پاک تھے)

علاوہ ازیں آپ جو حضرات شیخین کو نعوذ باللہ ظالمین میں شمار کرتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہے اگر یہ وجہ ہے کہ ان کی عمر کا ایک حصہ زمانہ جاہلیت میں بسر ہوا تو اتنی بات میں تو خود جناب سرور کائنات بلکہ حضرت امیر بھی شریک ہیں اور اگر مطلب سائل یہ ہے کہ شیخین زمانہ جاہلیت میں مرتکب کفر بھی تھے بخلاف جناب رسالتمآب ﷺ و حضرت امیر رضؓ۔ اور اس وجہ سے ان کو ظالمین کہا جاتا ہے تو قطع نظر اس خرابی کے جو اوپر مذکور ہوئی اس دعوی کے لیے آخر کوئی دلیل بھی تو چاہیئے اور ظاہر ہے کہ بدون دلیل نقلی اس باب میں کام چلنا معلوم؟ مگر کتب معتبرہ کا حوالہ ہو یاروں کی گھڑی ہوئی بات نہ ہو۔ کتب معتبرہ میں تو اس کا خلاف ہی انشاءاللہ نکلیگا چنانچہ جملہ لم یسجد للصنم قط وغیرہ شیخین کی شان میں موجود ہے۔[1]

---

[1] مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے صدیق اکبر پر لکھتے ہیں۔ حضرت ابوبکر کی فطرت شروع سے ہی سلیم تھی چنانچہ آپ کو اسلام سے پہلے بھی بت پرستی سے نفرت بھی اور شراب نوشی کو برا جانتے تھے جلال الدین سیوطی نے تاریخ الخلفا میں ابو نعیم کے حوالہ سے حضرت عائشہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ لقد حرم ابوبکر الخمر علی نفسہ فی الجاھلیۃ (ابوبکر رضؓ نے عہد جاہلیت میں بھی شراب اپنے اوپر حرام کر رکھی تھی)۔ ریاض النضرہ ص ۱۲۹ پر شراب و شرکیہ شعر گوئی وغیرہ سے برأت پر ابوبکر رضؓ کا اپنا بیان موجود ہے۔ ۱۲ مہر محمد

باقی فضل اللہ روزبہان پر آپ کا یہ اعتراض کرنا کہ تقرر خلیفہ میں اجماع سے کام نہیں چلتا بلکہ خلیفہ کے لیے اعلم الناس وازھد الناس واورع الناس واعدل الناس واشجع الناس وافضل الناس وارحم الناس ہونا ضروری ہے۔ محض ہذیان سرائی و دعوئے بلا دلیل ہے پہلے گذر چکا کہ امام کا بواسطۂ وحی مقرر ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں بلکہ اس کی جانب مخالف کی تائید کے لیے دلیل بلکہ خود قول مرتضوی موجود ہے کما مر اور اسی قول سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصل اصول تقرر خلیفہ میں اجماع مسلمین ہے۔ ہاں اہل اجماع کو چاہیئے کہ مستجمع شرائط خلافت کو خلیفہ بنادیں اور آپ جو امام کا اورع الناس (سب سے زیادہ پرہیز گار) وارحم الناس وغیرہ ہونا ضروری فرماتے ہیں اول تو ان سب کے ثبوت کے لیے دلیل چاہیئے سو یہ امید رکھنی آپ سے بے جا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر افعل التفضیل آپ کو یاد تھے کیف ما اتفق نقل فرمادیئے۔

(حضرت ابوبکر صدیقؓ ان تمام صفات میں انبیاء کے بعد افضل الناس تھے)

دوسرے اگر ان امور کو دربارۂ نبوت خلافت شرط مانا جائے تو فرمایئے تو سہی سنیوں کا کون سا قول غلط ہو جائے گا۔ سب جانتے ہیں کہ بفضلہٖ تعالیٰ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ موصوف بہمہ صفات کمال تھے ان کے اعلم ہونے پر تو وہ حدیث دلالت کرتی ہے جس میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز یہ ارشاد فرمایا کہ ایک بندہ کو خدا نے دنیا کی نعمتوں اور آخرت کی نعمتوں میں مخیر کیا تھا کہ ان میں سے جسے چاہو لے لو سو اس نے آخرت کو اختیار کیا دنیا کو اختیار نہ کیا اس پر ابوبکر صدیقؓ روتے اور یہ کہا کہ قربان آپ پر ہمارے ماں اور باپ اس کے بعد راوی کہتا ہے کہ ہم کو تعجب ہوا اس شیخ کو دیکھو کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کا ذکر کرتے ہیں اور یہ روتا ہے سو عبد مخیر تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور ابوبکر صدیق ہم سب میں اعلم تھے[1] علاوہ بریں آخر ایام حیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو امام بنانا[2] اور انکو ملقب بصدیق کرنا چنانچہ صحاح میں ہے[3]۔

---

[1] (بخاری ج۱ ص۵۱۵ تمذی ص ۲۰۶/ج۲) بخاری ج۱ ص۹۳ [2] حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم احد پہاڑ پر چڑھے آپکے ساتھ ابوبکر عمر و عثمان تھے احد لرزنے لگا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اثبت احد فانما علیك نبی وصدیق وشہیدان بخاری ج۱ ص۵۱۹ [3] نزال بن سبرہ فرماتے ہیں ہم حضرت علیؓ کے ساتھ باتیں کر رہے تھے باتوں باتوں میں ہم نے ابوبکر بن ابی قحافہ کے بارے میں سوال کیا حضرت علیؓ نے فرمایا وہ ایک ایسے شخص ہیں سماہ اللہ الصدیق علی لسان جبرئیل علیہ السلام وعلی لسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کان خلیفۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (الریاض النضرہ ج۱ ص۹۶)

محمد اشرف

اس پر شاہد ہے بایں نظر کہ یہ بحث کسی قدر آگے آتی ہے یہاں اتنی پر اکتفا کرتا ہوں اور وجہ شہادت کا دریافت کرنا تحقیق آئندہ پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اور ازہد ہونے پر حضرت علیؓ کی روایت جو مشکوٰۃ شریف میں بھی موجود ہے۔ دلالت کرتی ہے یعنی وہ روایت جس میں یہ ذکر ہے کہ آپ سے درباب خلافت عرض کیا گیا تو یہ فرمایا کہ اگر ابوبکر کو امیر کرو گے تو اس کو امین اور زاہد فی الدنیا اور راغب فی الآخرۃ پاؤ گے[1] کیونکہ یہ وصف کسی صحابی کی شان میں آپ نے نہیں فرمایا۔

اور ان کے اورع ہونے پر آیت وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى[2] شاہد ہے کیونکہ اَتقیٰ اور اورع کے معنی ایک ہی ہیں بلکہ کچھ زائد کہئے تو بجا ہے۔ اور ان کے اشجع ہونے پر وہ حدیث گواہ ہے جس میں حضرت علیؓ سے یہ روایت ہے کہ ایک بار رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار نے آگھیرا میں دیکھتا رہا اور مجھ سے کچھ نہ ہو سکا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ اس مجمع میں گھس گئے غرض آپ کی مدد کی اور اس کو مارا اس کو مارا آپ کو بچا لیا۔ کیونکہ یہ روایت غالباً بایں طور ہے کہ آپ کے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ نے آپ سے پوچھا کہ سب میں زیادہ بہادر کون ہے تو اس پر آپ نے یہ فرمایا کہ ابوبکر! اور پھر اس کے ثبوت میں یہ فرمایا

(صدیق کی افضلیت پر خدا کی گواہی)

یہ حدیث صحاح میں موجود ہے[3] فقط شبہ ہے تو اتنی بات میں ہے کہ یہ روایت آپ کے صاحبزادے سے ہے یا کسی اور سے ہے اور ان کے افضل الناس ہونے پر بقول خدا تو یہی آیت سورت واللیل کی اعنی وسیجنبها الاتقی الذی یؤتی ماله یتزکی شاہد ہے کیونکہ دوسری آیت سورت حجرات کی اعنی ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم (اللہ کے ہاں بڑا معزز بڑا پرہیز گار ہے) اس پر دلالت کرتی ہے کہ جو اتقیٰ ہوتا ہے وہی افضل اور اکرم ہوتا ہے۔ دوسری آیت

إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَ

(اگر تم اس پیغمبر کی مدد نہ کرو گے تو اللہ نے تو اس وقت بھی مدد کی جب کہ اس کو کافروں نے نکالا تھا جب کہ وہ دو میں دوسرا تھا جب کہ وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے

---

[1] مشکوٰۃ ص۵۶۷) [2] اور یقیناً دوزخ کی آگ سے وہ سب لوگوں سے بڑا پرہیز گار بچایا جائے گا جو اللہ کی راہ میں مال دیتا ہے تاکہ پاک صاف ہو جائے۔ [3] فتح الباری ج۸ عن محمد بن علی

(توبہ ع-۱۲) ساتھی سے کہتا تھا تو غم نہ کر بیشک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔)

اس پر شاہد ہے۔

(حضرت علیؓ کی گواہی)

چونکہ اس کی شرح وبسط ہدیۃ الشیعہ میں بوجہ اتم مرقوم ہے تو ہم کو حاجت تحریر نہیں جس کو شوق ہو مطالعہ کر دیکھے تس پر بحوالہ نہج البلاغہ جو شیعوں کے نزدیک وحی آسمانی سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس سے ہدیۃ الشیعہ میں حضرت علیؓ سے حضرت ابوبکرؓ کی وہ وہ تعریفیں جو بعد انبیاء سوا صدیق اکبر اور کسی میں متصور نہیں بہ قسم منقول ہیں۔ جس کو شوق ہو کتاب موجود ہے مطالعہ فرمالیں عنوان اس روایت کا یہ ہے۔

لِلّٰہِ بِلَادُ اَبِی بَکْرٍ فَلَقَدْ قَوَّمَ الْاَوَدَ وَدَاوَی الْعَمَدَ وَاَقَامَ السُّنَّۃَ وَخَلَّفَ الْبِدْعَۃَ ذَھَبَ نَقِیَّ الثَّوْبِ قَلِیْلَ الْعَیْبِ اَصَابَ خَیْرَھَا وَسَبَقَ شَرَّھَا اَدّٰی اِلَی اللّٰہِ طَاعَتَہٗ وَاتَّقَاہُ بِحَقِّہٖ رَحَلَ وَتَرَکَھُمْ فِیْ طُرُقٍ مُّتَشَعِّبَۃٍ لَا یَھْتَدِیْ فِیْھَا الضَّالُّ وَلَا یَسْتَیْقِنُ الْمُھْتَدِیْ۔

خدا ہی کے واسطے ہیں شہر ابوبکر کے، (یعنی ابوبکر میں خداداد خوبیاں ہیں) پس قسم ہے کہ انہوں نے سیدھا کر دیا کجی کو اور اصلاح کر دیا ستون کو اور قائم کر دیا سنت کو اور پس پشت ڈالا انہوں نے بدعت کو، دنیا سے پاک دامن بے عیب ہو گئے، خوبی خلافت کی ان کو نصیب ہوئی، اور آگے چل دیئے خلافت کے فسادوں سے، ادا کی انہوں نے خداوند کریم کی طاعت پر ہیزگار رہے حق پرہیزگاری کا۔ چلدیئے اور لوگ مختلف رستوں میں حیران ہیں کہ نہ گمراہوں کو راہ ملی ہے اور نہ ہدایت پانے والوں کو اپنی ہدایت کا یقین ہے،

بلکہ ان لفظوں سے ایک دو زیادہ ہی ہوں گے۔ علاوہ بریں بروایت محمد بن الحنیفہ بخاری میں حضرت علیؓ سے صاف منقول ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سب میں افضل ہیں۔

(حضرت صدیق اکبرؓ میں اوصاف کمال بدرجہ اتم پائے جاتے تھے)

اور ان کے افصح الناس ہونے پر وہ خطبے جو بعد وفات وقبل دفن نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے ہیں شاہد عادل ہیں علی ہذا القیاس لفظ ارحم امتی بامتی ابوبکر جو جمعہ کے خطبوں میں بحوالہ حدیث پڑھا جاتا ہے ان کے ارحم ہونے پر دلالت کرتا ہے باقی رہا اعدل ہونا سو اس کے ثبوت کے لیے بعد اثبات اوصاف مذکورہ کچھ حاجت نہیں کیونکہ عدل کے لیے فقط امانت و دیانت اور زہد و تقویٰ

اور علم کی ضرورت ہے ظالم میں بھی اوصاف نہیں ہوتے جو وہ مرتکب ظلم ہوتا ہے غرض باعث ظلم حُب دنیا اور خیانت اور عدم ترحم ہوتا ہے جس میں وہ اوصاف ہیں اور یہ خرابیاں نہیں وہ لاجرم اعدل الناس ہوگا۔

(ایک شبہ کا ازالہ)

اب اگر کسی صاحب کو اس وجہ سے تامل ہو کہ اکثر روایات مذکورہ اہل سنت کی روایات ہیں۔ تو اوّل تو وجہ ثبوت دعاوی مذکورہ فقط روایات ہی نہیں آیات بھی ہیں۔ اگر آیات کو اہل سنت ہی کی روایت سمجھتے ہو۔ تو نیک نصیب اہل سنت۔ اور بڑے کھوٹے نصیب شیعوں کے۔ جن کے پاس مطلب کے ثبوت میں کلام اللہ تک بھی نہیں بلکہ الٹا ان کے مطلب کے مخالف ہے پھر اس پر حضرت علی رضؓ کے ان اوصاف میں سب سے افضل ہونے پر کیا دلیل ہے۔ اگر روایات شیعہ ہیں تو کیا اعتبار۔ اور روایات اہل سنت یا آیات کلام اللہ ہیں تو لائیے دکھلائیے مثل استدلال مذکور جو آیت لا ینال عہدی الظالمین سے ماخوذ تھا انشاء اللہ اس کے کیل پرزے بھی ادھیڑے جائینگے۔

(مشورہ میں خلقت کی طرف رجوع خلیفہ کے لیے عیب نہیں۔)

اور یہ جو ارشاد ہے کہ اس طرح خلیفہ چاہیے کہ اس کی طرف تمام خلقت علوم خدا میں رجوع کرے اور جو سوال اس سے کرے بخوبی تمام تسلی و تشفی کرے تاکہ خلافت و نیابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے ثابت ہو۔ اگر سچ ہے تو ابو بکر صدیق رضؓ وغیرہم بحمد اللہ ایسے تھے اور اگر کسی بات میں ان کو اوروں کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوئی تو اس سے ان کی فضیلت کو بٹہ نہیں لگتا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (یعنی صحابہ رضؓ سے مشورہ کر لیا کرو) اگر ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہم نے کسی بات میں کسی کی طرف رجوع کیا اور اس سبب سے ان کا رتبہ نعوذ باللہ کم ٹھہرا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تو خود حکم خداوندی ہے ابو بکر و عمر رضؓ نے تو اپنی طرف سے رجوع کیا ہوگا اس صورت میں نعوذ باللہ حضرات شیعہ صحابہ رضؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل سمجھیں نہ کہ ایسا برا۔ تس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بیسیوں جا ایسے وقائع ثابت ہوتے ہیں اور لوگوں نے ان کی غلطیاں پکڑی ہیں۔ کیا ہم کہہ سکتے ہیں (مگر) خارجیوں سے اپنی تسلی کر لیں ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔

غرض ایک دو جا غلطی ہو جانے سے منصب امامت کو زوال نہیں ہو سکتا حضرت موسیٰ ؑ

اور حضرت خضر علیہ السلام کا قصہ کلام اللہ میں مذکور ہے دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کیا کا کیا سمجھ گئے اور پھر منصب نبوت میں کچھ فرق نہ آیا منصب خلافت تو ایک نمبر اور بھی کم ہے اتنا غلّ کا ہے کے لیے ہے۔

(خلافت راشدہ کے لیے فتوحات و تمکین موعود اور ضروری تھیں)

اور یہ جو آپ فرماتے ہیں کہ انتظام دنیاوی اور ملکوں کا فتح کر لینا باعث خلافت حقّہ کا نہیں ہو سکتا اگرچہ بظاہر حق معلوم ہوتا ہے پر شیطان نے اپنی بات پھر بھی ہاتھ سے جانے نہیں دی آپ کے اس آڑ میں اپنا کلمہ کہلا لیا۔ اجی حضرت آپ کس خیال میں ہیں یہی اعتراض بعینہٖ نصرانی اور یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت پر کرتے ہیں آپ کو ان کا طریقہ ایسا کیوں مرغوب ہے آیت

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا	(اور اللہ نے وعدہ کیا ہے تم میں سے ایمان لانے
الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا	والوں اور اچھے عمل کرنے والوں کے ساتھ کہ یقیناً
اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ وَلَیُمَکِّنَنَّ	ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسے ان سے پہلے لوگوں
لَھُمْ دِیْنَھُمُ الَّذِی ارْتَضٰی لَھُمْ	کو بنایا تھا اور ان کے لیے اپنا پسندیدہ دین قائم کر دے گا
وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِھِمْ	اور ان کے خوف کو امن سے بدل ڈالے گا۔)
اَمْنًا الآ (پ۱۸ ع ۱۳)	

کو بغور دیکھئے کیا ارشاد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی یہی نشانی ہے کہ وہ زمین کے خلیفہ ہو جائیں اور بزور شمشیر سلطنت دین متین کو جما دیں چونکہ اس آیت کے مضامین بھی درج ہدیۃ الشیعہ ہو چکے ہیں اس لیے ان کے ذکر اور اس آیت کی تفسیر سے معذور ہوں۔ اہل شوق خود مطالعہ کریں گے۔

ہاں اگر خلفاء راشدین کے زمانے میں ترقی اسلام نہ ہوتی بلکہ مثل تیمور فقط ملک گیری ہوتی تو ان کو تیمور چھوڑ کر انگریزوں سے تشبیہ دے دیجیے ہوتی اور در صورت کہ عرب سے ایران تک انہیں کی بدولت کلمہ اسلام جاری ہوا تو پھر یہ کہہ کر مصداق وَمَنْ کَفَرَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ (جو اس نعمت کے ہو چکنے کے بعد اس کا انکار کرے تو یہی فاسق ہیں) جو بعد آیت مذکورہ واقع ہے۔ بنتے ہو کیونکہ اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ رسوخ خلافت اسلام اور تمکین

دین کے بعد جو شخص ان بزرگواروں کا شکر ادا نہ کرے وہ فاسق ہے اور بھی کوئی نہیں تو شیعوں کو تو شکر گذاری اصحاب ثلاثہ لازم ہے اگر یہ صاحب نہ ہوتے تو نعرہ یا علی یا علی کربلا سے لے کر ادھر کی حد ایران تک جاری نہ ہوتا۔

مجمل تقریر یہ ہے کہ جب کلام اللہ و حدیث سے بزرگی ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ان کی خلافت ثابت ہو گئی اور شیعوں کا دعوے ثابت نہ ہوا تو مذہب اہل سنت حق ٹھہرا اور مذہب شیعہ باطل۔

سوال سوم از جانب شیعہ

(بحث متعہ)

متعہ میں اختلاف شیعہ و اہل سنت مشہور و معروف ہے مگر شیعہ کہتے ہیں۔ کلام اللہ میں تو آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ط (پھر جس کو کام میں لائے تم ان عورتوں میں سے تو ان کو دو ان کے حق جو مقرر ہوئے۔)

اس کے جواز پر دلالت کرتی ہے خاص کر قراءت عبد اللہ بن مسعود جو اہل سنت کے عمدہ پیشوا ہیں کیونکہ ان کی قرأت میں بعد منھن لفظ الی اجل بھی زائد ہے اور ظاہر ہے کہ تحدید اجل متعہ ہی میں ہوا کرتی ہے نکاح میں تحدید مدّت کی کوئی صورت نہیں۔ اور احادیث میں حدیث اباحت متعہ کا بعض غزوات میں شہرہ عالمگیر ہے بایں ہمہ لفظ اجورھن ان کے مطلب کے بھی مؤید ہے اس لیے کہ اجر عقد اجارہ میں ہوا کرتا ہے اور صحت اجارہ کے لیے تعیین مقدار کی یا تحدید زمانہ و روزگار ضرور ہے مثلاً درزی ایک دو انگرکھے سینے کا نوکر ہوتا ہے یا ایک دو روز کا یہ نہیں ہو سکتا کہ زمانہ کی کوئی حد نہ ہو نہ کام کی کوئی مقدار ہو اس صورت میں اگر مرد و زن میں کوئی زمانہ مقرر ہو گیا تب تو ثبوت متعہ بطور شیعہ سنیوں ہی کے اقرار سے لازم آجائے گا اور اگر عدد کرات مجامعت معقود علیہ ہے تب بھی وہی بات ہے کیونکہ کرات مجامعت ایک زمانہ معین میں پوری ہو سکتی ہے۔ اس لیے پھر وہی انجام نکل آتا ہے۔

(اہل سنت کا استدلال)

مگر شاید اہل سنت و جماعت کو۔ آیت

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْعَادُوْنَ

(اور وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں بجز اپنی بیویوں کے یا باندیوں کے کہ اس میں ان پر ملامت نہیں۔ پس جو شخص ان دو کے علاوہ جنسی تعلق چاہے پس وہ زیادتی کرنے والے ہیں۔)

پر نظر ہو اور یہ خیال ہو کہ آیت مسطورہ سے زوجہ اور باندی کے سوا اور عورتوں سے اجتناب نکلتا ہے اور زن متعہ بالیقین دونوں قسم سے خارج ہے۔ باندیوں کی قسم سے علٰحدہ ہونا تو محتاج بیان ہی نہیں ہاں احتمال زوجیت ہو تو ہو لیکن اوّل علماء شیعہ نے ان زن متعہ کو زن نکاح سے جدا رکھا ہے بلکہ جیسے اہل سنت موافق اشارہ آیت مسطورہ زن حلال کی کل دو قسمیں بتلاتے ہیں ایک اپنی زوجہ دوسری اپنی باندی ایسے ہی علماء شیعہ زن حلال کی چار قسمیں بتلاتے ہیں دو تو یہی قسمیں جو مذکور ہوئیں۔ اور دو اور۔ ایک زن متعہ دوسری زن عاریہ یعنی وہ باندی جس کا مالک کسی کو صحبت کرنے کے لیے مستعار دے دیوے سو اس سے صاف ظاہر ہے کہ زن متعہ زوجہ نہیں کہلاتی۔ دوسرے لوازم و آثار نکاح زنِ متعہ میں یک لخت مفقود ہیں نہ چار کی حد نہ عدل کی ضرورت نہ طلاق کی کوئی صورت نہ عدت کی حاجت اور ظاہر ہے الشئی اذا ثبت ثبت بلوازمہٖ اگر زن متعہ منجملہ ازواج ہوتی تو یہ سارے لوازم و آثار پائے جاتے بالجملہ علماء اہل سنت کو بمقابلہ شیعہ آیت والذین ہم لفروجہم حافظون الخ پر نظر ہو تو ہو اور اس لیے متعہ کو حرام کہتے ہوں

(شیعہ کی طرف سے جواب)

تو جواب اس شبہ کا یہ ہے۔ کہ یہ آیت دو جا کلام اللہ میں آئی ہے ایک سورت مومنون میں دوسری سورت معارج میں اور باتفاق مفسرین یہ دونوں سورتیں مکی ہیں یعنی قبل ہجرت نازل ہوئی ہیں اور حدیث اباحت متعہ مدنی ہے کیونکہ غزوات سب مدنی ہیں اس لیے واقعہ اباحت آیت حرمت کے بعد کا قصہ ہے اس صورت میں حدیث ہی ناسخ آیت معلوم ہوگی آیت کو ناسخ حدیث نہ کہہ سکیں گے باقی یہ حسن ادب کہ آیت حدیث سے اعلیٰ اور افضل ہوتی ہے پھر حدیث سے کیونکر منسوخ ہو اسی شخص کا کام ہے جو وجہ ثبوت قرآنیت قرآن مجید سے خبردار نہ ہو پر جس شخص کو اتنی بات کی اطلاع ہے کہ قرآن کا قرآن ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کے ارشاد سے معلوم ہوا اور ان احکام کا احکام خداوندی ہونا امتیوں نے آپ کے فرمانے سے جانا۔ تو اس شخص کو اس بات میں ہرگز تامل نہیں ہو سکتا کہ نسخ قرآن شریف حدیث نبوی سے ممکن ہے چنانچہ علماء اہل سنت خصوصاً حنفی اسی جانب گئے ہیں اور اس لیے حدیث کلامی لاینسخ کلام اللہ کی تاویلیں کرتے ہیں۔ ہاں افضلیت قرآن مسلم مگر یہ افضلیت باعتبار الفاظ ہے باعتبار احکام نہیں جو احکام کہ احادیث سے ثابت ہوں بشرط ثبوت احکام قرآنی سے کم نہیں کیونکہ احکام مندرجہ احادیث بھی احکام خداوندی ہیں گو باعتبار ظاہر احکام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم معلوم ہوتے ہوں اس لیے کہ آپ رسول اور پیغام بر ہیں بذات خود حاکم مستقل نہیں۔ باقی رہی روایت نسخ اباحت متعہ یعنی وہ روایت جس میں بعد اباحت حکم حرمت بھی موجود ہے شیعوں کے نزدیک ضروری التسلیم نہیں اس لیے کہ اس کے راوی فقط اہل سنت ہیں اور انہوں نے اپنے مطلب کے موافق بنالی ہوگی۔

(جواب از اہل سنت والجماعت)

الجواب، بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ الحمد للہ نحمدہ ونستعینہ ونومن بہ و نتوکل علیہ ونشہد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ ونشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ اللّٰھم صل علی سیدنا محمد وعلی آل سیدنا محمد کما صلیت علی سیدنا ابراھیم وعلی ال سیدنا ابراھیم انک حمید مجید اللّٰھم صل علی سیدنا محمد ن النبی الامی وازواجہ امہات المومنین وذریتہ واھل بیتہ کما صلیت علی سیدنا ابراھیم انک حمید مجید۔ اللّٰھم انزلہ المقعد المبارک عندک یوم القیامۃ اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

بعد حمد وصلوٰۃ بندہ گنہگار محمد قاسم عرض پرداز ہے کہ تقریر سوال شیعہ تو اس کمترین نے اس زرق برق سے کر دی ہے کہ خود شیعوں کو بھی اس انداز سے بیان کرنا نصیب نہ ہوا ہوگا اور اس وجہ سے میرے ممنون ہوں تو بجا ہے مگر مقتضائے احسان مندی یہ ہے کہ تقریر جواب کو بھی بغور و انصاف دیکھیں مطلب کے یار تو سبھی ہوتے ہیں پر انصاف پرستی جوہر انسانی ہے تقریر سوال تو دلچسپ ہی تھی پر تقریر جواب اس سے بھی بڑھ کر۔ لیجیے حضرات شیعہ کا مطلب نہ آیت استمتاع سے نکلے

نہ حدیث سے ثابت ہو اور نہ آیت سورت مومنون و سورت معارج حدیث مذکور سے منسوخ ہوئی اور نہ ہو سکے۔

(حرمت متعہ کی عقلی وجوہ)

علاوہ بریں عقل صائب اس بات پر شاہد ہے کہ تجویز متعہ ہمیشہ کے لیئے اور ہر کسی کے لیے خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نہیں ہو سکتی اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ادیان سابقہ میں سے کسی دین میں متعہ جائز نہیں ہوا اور اس دین میں سوا حضرات شیعہ اور کوئی اس طرف نہ گیا بلکہ ابتداء عالم سے لے کر اس زمانہ تک اطراف عالم میں کسی دین میں آسمانی ہو یا نہ ہو سوائے مذہب شیعہ یا مشرب جاہلان زمانہ جاہلیت ملک عرب اس امر کا پتہ نہیں سینکڑوں تاریخیں موجود ہیں سیاحوں کے افسانے مشہور ہیں پر کہیں متعہ کا نام و نشان نہیں ملتا خیر یہ بات تو اتفاقی تھی کلام اللہ اور حدیث سے استدلال کا حال بیان کیجیئے اور حقیقت نسخ کا پتہ دیجیئے تو کام چلے۔

(نکاح کا اولین مقصد اولاد کی پیداوار ہے)

اس لیے بطور تمہید اوّل کچھ گذارش ہے بگوش ہوش سنیئے کلام اللہ میں فرماتے ہیں نِسَاؤُکُم حرث لکم یعنی تمہاری عورتیں تمہاری کھیت ہیں اس سے صاف روشن ہے کہ نکاح سے مقصود اولاد ہے کیونکہ کھیت سے مقصود پیداوار ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کھیت کی پیداوار یہی اولاد ہے گیہوں چنا وغیرہ نہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شیعوں کے نزدیک جو سارے جہان کے خلاف بیوی سے اغلام درست ہے وہ کلام اللہ کے بھی مخالف ہے کیونکہ اغلام سے تولد اولاد متصور نہیں مگر ہاں شاید شیعوں میں یہ کرامت ہو اور موافق شعر ذوق ؎

نہیں ہیں خون سے مژگان تر یہ خار دلنشیں نکلے
جنوں یہ نیشتر کیسے کہیں ڈوبے کہیں نکلے

ادھر سے نطفہ ادھر چلا جاتا ہو باقی رہا جملہ فاتوا حرثکم انی شئتم۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آؤ اپنی کھیتیوں میں جہاں سے چاہو شیعوں کو کچھ مفید نہیں کیونکہ اوّل تو انّٰی بمعنی کیف بھی آتا ہے پھر ان کو کیا اختیار کہ بے وجہ انّٰی کو بمعنی ظرف مکانی رکھیں مستدل اور مدعی کے لیے وہ بات مفید نہیں ہو سکتی جس میں احتمال مخالف بھی موجود ہو بایں ہمہ جملہ نساءکم احتمال مخالف یعنی معنی کیف کے مؤید

اور معنی ظرف مسانی کے مخالف ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے اور اگر انی بمعنی ظرف مکانی ہی ہو پھر بھی یوں کو کچھ مفید نہیں کیوں کہ جیسے کوئی یوں کہے کہ اپنی زمین میں بیج ڈالنے کے لیے مشرق کی طرف جاؤ یا غرب کی طرف سے بہرحال تم کو اختیار ہے اور اس سے ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ مقصود اصلی بونا ہے دونوں طرف سے جانے میں برابر حاصل ہے پیداوار دونوں طرح ایک ہی سی ہوگی ایسے ہی اس جملہ سے ہر عاقل یہی سمجھے گا کہ اپنی بیویوں سے الٹے سیدھے جس طرح چاہو صحبت کرو تولد اولاد میں دونوں صورتیں برابر ہیں یہ نہیں کہ سیدھے صحبت کیجیے تو بچہ اچھا ہو اور الٹی کیجیے تو احول پیدا ہو جیسے یہودی کہا کرتے تھے چنانچہ اسی وہم وفاسد کی مدافعت کے لیے یہ ارشاد ہوا کہ فاء توحرثکم انی شئتم۔ مگر علماء شیعہ کی خوش فہمی دیکھیے کہ بات کیا تھی اور کیا مطلب کی سمجھ گئے۔ مگر وہ بھی کیا کریں اگر متعہ اور اغلام نہ ہوتا تو خواص تو متنفر تھے ہی عوام کالانعام بھی اس مذہب کو پسند نہ کرتے۔

(ولد صالح باقیات صالحات میں سے ہے)

علاوہ بریں ولد صالح کا باقیات صالحات میں سے ہونا بھی اولاد کے مقصود ہونے پر شاہد ہے کیونکہ انما الاعمال بالنیات۔ اگر شہوت رانی ہی مقصود ہوتی اور اولاد مقصود نہ ہوتی تو ان کے حساب سے اولاد کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اگر صالح ہوئی تو کیا اور فاسق ہوئی تو کیا علی ہذا القیاس سقی ماء غیر یعنی عورت حاملہ من الغیر سے جماع حرام نہ ہوتا چنانچہ ظاہر ہے بہرحال مقصود اصلی نکاح سے اولاد ہے شہوت رانی مقصود اصلی نہیں ہاں جیسے اکل غذا سے بدل ما یتحلل مقصود ہے اور بھوک مثل چپراسی سرکاری اس بیگار کے لیے متقاضی ہے ایسے ہی عورتوں سے اولاد مقصود ہے اور شہوت جماع تقاضا جماع کے لیے ساتھ لگا دی گئی ہے۔

(وقت واحد میں ایک عورت کے لیے زیادہ خاوند نہ کرنے کی وجہ)

مگر جب اولاد مقصود ٹھہری چنانچہ آیت مسطور اس پر شاہد ہے اور نیز عقل سلیم اس پر گواہ تو پھر ایک عورت کو زمانہ واحد میں دو یا زیادہ مردوں سے نکاح کی اجازت قرین عقل نہ تھی۔ اس لیے کسی دین میں یہ امر جائز نہ ہوا۔ کیفیت شہادت آیت مرقوم ہو چکی ہاں عقل صائب کی گواہی باقی ہے اس لیے یہ گذارش ہے کہ درخت بارآور بذات خود مطلوب نہیں ہوتا پھل مطلوب ہوتا ہے سامان اور اسباب مطلوب نہیں ہوتا۔ نتیجہ مطلوب ہوتا ہے۔ اب دیکھیے کہ شہوت رانی اور جماع اولاد کے لیے سامان اور اسباب میں

سے ہے یا قصہ برعکس ہے؟ سو ایسا کون ناداں ہوگا جس کو دفاع و جماع کے سبب ہونے اور اولاد کے مسبب ہونے میں تامل ہو۔ علاوہ بریں آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔

اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جن و انس کو خاص اپنے کام کے لیے بنایا ہے اور آیت خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ

اس بات پر شاہد ہے کہ زمین و آسمان بنی آدم کے لیے بنائے گئے ہیں برعکس نہیں۔

(کائنات انسان کیلئے بنی اور انسان عبادت الٰہی کے لیے بنایا گیا)

زمین اور زمین کی پیداوار کا بنی آدم کے لیے ہونا تو لفظ لَكُمْ سے ظاہر ہے اور آسمانوں کا بنی آدم کے لیے بنایا جانا بقرینہ عطف ظاہر ہے یعنی قید لکم یہاں بھی بقرینہ عطف ملحوظ ہوگی علاوہ بریں آیت اَلَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وغیرہ آیات میں یہ بات زیادہ مصرح ہے اور کیوں نہ ہو زمین و آب ہوا و آتش و آفتاب و کواکب و افلاک نہ ہوں تو ہماری ہزاروں حاجتیں بند ہو جائیں بلکہ یوں کہو ہم مر جائیں اور ہم نہ ہوں تو ان اشیاء کا کچھ حرج نہیں۔ پھر یوں نہ کہئے تو اور کیا کہئے کہ وہ ہمارے لیے بنائی گئی ہیں ہم ان کے لیے نہیں بنائے گئے مگر اس صورت میں یہ بات ظاہر ہے کہ زمین ہو یا آسمان ہو جو کچھ بنی آدم کے لیے بنایا گیا اس کو حصول عبادت میں دخل ہے یعنی اگر وہ نہ ہو تو پھر عبادت میں کمی یا نقصان پیش آئے یا وہ نہ ہو تو عبادت نہ ہو سکے کیونکہ اس وقت بنی آدم اور باقی مخلوقات مشار الیہا کی ایسی مثال ہوگی جیسے یوں کہئے گھوڑا سواری کے لیے اور گھاس دانہ گھوڑے کے لیے سو جیسا یہاں ہر کوئی سمجھتا ہے کہ اگر گھاس دانہ نہ ہو تو پھر سواری کی بھی کوئی صورت نہیں بلکہ گھوڑا تڑپ تڑپ کر مر جائے ایسا ہی بنی آدم اور ان چیزوں کو سمجھئے جو اس کے لیے بنائی گئی ہیں کہ اگر وہ نہ ہوں تو پھر عبادت ہی نہیں سو کھانے پینے کی ضرورت تو ظاہر ہے کون نہیں جانتا کہ اگر خورد و نوش کی نوبت نہ آئے تو آدمی مر جائے پھر عبادت کون کرے۔ ادھر کھانے پینے کے لیے زمین آسمان کی ضرورت ظاہر۔ زمین کو تو ہم خوب جانتے ہیں رہا آسمان اس کی ضرورت کھانے پینے کے لیے آیت وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (اور آسمانوں سے پانی اتارا جس کے ذریعے پھل نکالکر تمہارا رزق بنایا) سے ظاہر ہے پر شہوت جماع کو اس کام

میں کچھ دخل نہیں سو یہ کیونکر ہو سکے کہ امور خارجہ من ذات العابد میں تو حصول عبادت پر نظر ہے اور شہوت کو جو ایک امر داخلی ہے باوجود ارشاد وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ الخ عبادت میں کچھ دخل نہ ہو۔

الغرض شہوت کا بنی آدم میں پیدا کرنا بذات خود بے مصرف معلوم ہوتا ہے ہاں اگر تولد اولاد پر نظر کیجیے تو پھر اس کے برابر خورد و نوش بھی عبادت میں دخل نہیں رکھتے کیونکہ کھانے پینے سے اگر طاقت عبادت پیدا ہوتی ہے تو جماع سے خود عبادت کرنے والے پیدا ہوتے ہیں بالجملہ عقل و نقل اس بات پر شاہد ہیں کہ شہوت رانی بذات خود مقصود نہیں تولد اولاد مقصود ہے[1]

(کثرت اولاد سے کثرتِ امت پر حضور علیہ السلام فخر کریں گے)

چنانچہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جو در بارۂ ترغیب نکاح مشہور ہے اس میں یہ جملہ کہ انی مکاثر بکم الامم اس مضمون کو اور بھی واضح کئے دیتا ہے کیونکہ غرض نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ترغیب نکاح سے اس وقت یہ نکلی کہ امت کے لوگ کثرت سے نکاح کریں گے تو اولاد کثیر پیدا ہوگی اور اس وجہ سے یہ امت بڑھ جائیگی اور ایک سامان افتخار آپ کو ہاتھ آئے گا۔ جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی کہ نکاح سے مقصود اولاد ہے شہوت رانی مقصود نہیں تو اب وجہ ممانعت تعدد نکاح زن بھی ایک زمانہ میں بھی بیان کرنی چاہیئے۔

(عورت کے لیے بیک وقت تعددِ نکاح کی ممانعت کی عقلی دلیل)

سنئے زمین کی پیداوار تو سب ایک ہی ہوتی ہے اور اس کے سب دانے باہم متشابہ ہوتے ہیں خورش میں سب یکساں۔ کسی کو کسی پر کچھ فوقیت نہیں اس لیے شرکت میں کوئی خرابی پیش نہیں آتی علی السویہ تقسیم ہو سکتی ہے۔ پر اولاد میں اگر اشتراک تجویز کیا جائے تو ایک نزاع عظیم برپا ہو امید کثرت عباد و عبادت تو درکنار پہلے ہی عابدوں کی خیر نہ ہو کیونکہ اول تو یہی کچھ ضرور نہیں کہ ایک سے زیادہ بچہ پیدا ہو اور دو تین پیدا بھی ہوئے تو کچھ ضرور نہیں کہ سب لڑکے ہی ہوں یا سب لڑکیاں ہی ہوں اور پھر ایک ہی قسم کے ہوں تو وہ سب عابد و زاہد ایک ہی نمبر کے ہوں اور عاقل و فاضل ایک ہی درجہ کے ہوں[2] بلکہ عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے کہ جیسے پانچوں انگلیاں یکساں

---

[1] ادہر اولاد کا مطلوب ہونا اور بعد حصول اولاد انکے ساتھ شفقت پیش آنا اسی پر دال ہے کہ اولاد مقصود طبع سلیم انسانی ہے۔ ۱۲

[2] اور حسین جمیل ایک ہی طرح کے ہوں اور قوی توانا ایک ہی طاقت کے ہوں۔ ۱۲ (حاشیہ طبع قدیم)

نہیں ہوتیں۔ ایسے ہی تمام اولاد یکساں نہیں ہوتی ادھر محبت پدری سب کے ساتھ خداداد۔
سو بالفرض ایک عورت کے اگر کئی خاوند ہوں اور وہ بھی فرض کرو ایک پورب کا رہنے والا ہو ایک پچھم کا تو پھر تقسیم اولاد کی کوئی صورت نہیں۔ بوجہ تفاوت معتاد جو باہم اولاد میں ہوا کرتا ہے اوّل تو ناقص حصہ والے کا اپنے نقصان پر راضی ہونا دشوار ہے۔ دوسرے بوجہ محبت تمام اولادوں کا صبر کرنا معلوم۔ اور اس وجہ سے یہ بھی ممکن نہیں کہ روپیہ وغیرہ سے جبر نقصان کر کے ایک کو راضی کر دیتے بجئے خاص کر جب کہ بچہ ایک ہو اور عورت کے خاوند کئی۔ یا عدد ازواج زن، زوج، (جفت) ہو اور عدد اولاد طاق۔ ہاں اگر اولاد کاٹنے پھانٹنے کے قابل ہوتی تو مثل غلہ مشترک یا گوشت مشترک جامہ مشترک کاٹ پھانٹ کر برابر کر لیتے اور نزاع رفع کر دیتے یا مثل غلام عورت کا ہر وقت ایک حال رہتا اور یہ تفاوت احوال اور اختلاف کیفیات مزاجی نہ ہوا کرتا تو ہفتہ وار یا ماہوار یا سال وار ایک خاوند کے پاس رہا کرتی۔ مگر اوّل تو ہر دم اور ہر حال میں رحم زن نطفہ کو قبول نہیں کرتا دوسرے یہ اختلاف احوالِ زن بیشتر موجب اختلاف ذکورت و انوثت و عقل و بے عقلی وغیرہ احوال و اخلاق ہو جاتا ہے۔

(والدین خصوصاً ماں کا طبعی اثر بچے کے مزاج و اخلاق پر پڑتا ہے)

جو لوگ دقائق طبیہ اور حقائق موجبات اختلاف امزجہ اولاد سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ وقت جماع و وقائع جو کیفیت والدین خصوصاً والدہ پر غالب ہوتی ہے وہی کیفیت اولاد کے حق میں خلق اور طبیعت بن جاتی ہے اوّل تو اہل عقل کو مشاہدہ بقاء انواع سے یہ بات ظاہر ہے کیونکہ آدمی کے گھر آدمی کا پیدا ہونا اور سگ و خوک سے سگ و خوک کا پیدا ہونا اور اسپ و خر سے خچر کا پیدا ہونا جس میں دونوں کا اثر مشہود ہوتا ہے اس بات کے سمجھ لینے کو کافی ہے۔ کہ کیفیت مزاج والدین کو اخلاق و عقل اولاد میں دخل تام ہے۔

دوسرے اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ بھی جو جملہ مسلمہ ہر عام و خاص ہے اس بات پر شاہد ہے کیونکہ کسی کو کسی کا اب حقیقی اور والد تحقیقی باعتبار وقت علوق نطفہ ہی کہہ سکتے ہیں اور اوقات کے حساب سے یہ اطلاق مجازی ہوتا ہے۔ سو وقت علوق جو کیفیت مزاج والدین پر غالب ہو اسی کا اثر اولاد میں آنا چاہیے ورنہ الولد سر لابیہ کیونکہ صحیح ہو گا۔

(حضرت مریم کے پاس بشر بن کر جبرئیل کے آنے کی وجہ)

ادھر محققان اہل اسلام نے حضرت مریم کے سامنے حضرت جبریل علیہ السلام کے آدمی کی شکل میں آنے کی وجہ یہی بیان کی ہے کہ اگر حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی شکل ملکی میں ان کے روبرو نمودار ہوتے تو حضرت مریم علیہا السلام بتقاضاء بشریت ڈر جاتیں اور وہ کیفیت خوف مزاج عیسوی میں اثر کر جاتی آپ نامرد اور بزدل پیدا ہوتے اور کار رسالت ادا نہ کر سکتے کیونکہ اس کام کے لیے ہمت عالی اور شجاعت تامہ کی ضرورت ہے نامردوں سے ایسے بڑے کام جس میں ایک جہان سے مقابلہ اور عداوت کھڑی ہو نہیں سکتے۔ باقی رہا صورت ملکی سے خوف کھانا وہ حضرت مریم سے کیا بڑے بڑے مردوں سے بھی مستبعد نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تک حضرت جبرئیل کی صورت ملکی سے مرعوب ہو گئے تھے اور کسی کا تو کیا ذکر ہے۔ علاوہ بریں یہ قصہ اکثروں نے سنا ہوگا کہ وقت جماع کسی عورت کو سانپ نظر پڑ گیا تھا بچہ جو پیدا ہو تو سانپ ہی کی شکل تھی بالجملہ بوجہ تفاوت احوال معلومہ یہ بھی ممکن نہیں کہ غلام کی طرح نوبت بنوبت ہر خاوند کے پاس رہا کرے کیونکہ عورت کے لیے اگر یہ امر تجویز کیا جائے تو مقتضائے انصاف یہ ہے کہ خدمت فراش یعنی وقاع وجماع کی مقدار قدر نوبت مقرر ہو اور بہت دراز کرو تو ایک شب رکھ لو اس لیے کہ عورت کے متعلق یہی خدمت ہے اور اس خدمت کے ادا کرنے میں اتنی ہی دیر کافی ہے اور اس باب میں غلام پر قیاس ممکن نہیں اس لیے کہ خدمت غلام کوئی امر معین نہیں جو اس کی مقدار تعیین نوبت میں ملحوظ ہے۔ اس لیے وہاں وہ زمانہ جس میں خدمت معتد بہ تمام شرکاء کے نزدیک ادا کر سکے معین ہوگا[1] علی ہذا القیاس مردوں کی نوبت پر بھی قیاس نہیں کر سکتے جو کم از کم ایک شب ہی مقرر ہو اس لیے کہ غرض اصلی یعنی جماع جو تعیین نوبت سے مقصود ہے مرد کے ایسے اختیار میں نہیں ہے کہ جب چاہے سبکدوش ہو جائے کم سے کم ایک شب میں۔ البتہ اس کے وقوع کا احتمال ہے یہی وجہ ہے کہ عدل (بین المنکوحات) کے لیے

---

[1] علاوہ ازیں مرد کو ہر وقت قدرت علی الجماع ہونی معلوم اور حاجت الجماع کا ہر لحظہ احتمال اور یہ حاجت بدون عورت رفع ہونی محال یعنی مثلاً اگر غلام نہ ہو تو بجائے غلام کاروبار اپنے ہاتھ سے بھی انجام دے سکتا ہے اور جماع میں یہ بھی متصور نہیں تو ان وجوہ سے بھی شرکت زوجہ میں خلاف مصلحت ہونی چاہیے۔ ۱۲۔ (حاشیہ طبع قدیم)

جماع ضرور ہوا، ہاں خدمت فراش البتہ عورت کے ہر وقت اختیار میں ہے۔

(نسب وحمل میں اختلاط بھی تعدد زوج سے مانع ہے)! بایں ہمہ عورت قبل ظہور حمل اگر دو مرد کے پاس رہے تو یہ تعیین نہیں ہو سکتی کہ یہ حمل کس کا ہے اور بعد ظہور حمل اگر دوسرے کے پاس جائے تو اس کے نطفہ کے اختلاط کی وجہ سے پھر وہی صورت اشتراک پیدا ہوتی ہے دو بچے پیدا ہوتے ہیں تو تعیین مشکل ہو جاتی ہے اور اتنا زمانہ دراز نوبت کے لیے مقرر کیا جائے کہ ایک کا نطفہ دوسرے کے نطفہ کے ساتھ مختلط نہ ہو سکے تو یہ دقت تو کہیں نہیں گئی کہ کسی وقت رحم زن نطفہ قبول کرتا ہے اور کسی وقت نہیں کرتا اور کرتا ہے تو کسی وقت کیفیت صالحہ عارض حال زن ہوتی ہے۔ کسی وقت کیفیت فاسدہ لاحق حال ہو جاتی ہے اور درصورت وحدت مرد و تعدد زنان بھی اگرچہ یہی احتمال ہے مگر چونکہ وہ صاحب حرث ہے تو اگر وہ وقت کیفیت صالحہ عورت کے پاس نہ جائے تو کچھ اپنا ہی نقصان کرے گا کسی دوسرے کا حق تلف نہ کرے گا جو گنجائش اعتراض ہو۔

جب یہ سب باتیں ذہن نشین ہو گئیں اور وجہ ممانعت تعدد مرد و وحدت زن معلوم ہو گئی تو یہ بھی عرض کرنا مناسب سمجھا ہے کہ ایام عدت وفات وطلاق میں جو نکاح ممنوعہ رہا تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ کہ اگر ساعت دو ساعت بیشتر مرگ وطلاق سے باہم جماع کا اتفاق ہوا ہو اور بمجرد وفات زوج وطلاق پھر دوسرے سے نکاح کر کے جماع کی نوبت آئی تو وہی خرابی لازم آئے گی جو وقت واحد میں کئی خاوندوں کے ہونے میں متصور تھی کیونکہ وہاں بھی وقت واحد میں تو دونوں کا جماع متصور ہی نہ تھا ساعت دو ساعت کے فاصلہ کی ضرورت بالضرور تھی جب باوجود اس کے خرابیہائے مذکورہ لازم آتی تھیں تو یہاں کیوں نہ لازم آئیں گی۔

(والمحصنات من النساء میں احصان کا فائدہ)! اس تقریر سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ بیان محرمات میں لفظ محصنات کو کیوں اختیار کیا لفظ منکوحات یا لفظ متزوجات وغیرہ الفاظ دالہ علی النکاح میں سے کوئی اور لفظ کیوں نہ اختیار فرمایا۔ یعنی اگر والمحصنات نہ فرماتے بلکہ والمنکوحات یا والمتزوجات فرماتے تو معتدہ خاص کر معتدہ وفات یا معتدہ طلاق مغلظہ کو یہ لفظ شامل نہ ہوتا اور پھر بدلالت واحل لکم ما وراء ذالکم معتدہ سے نکاح کرنا حلال ہو جاتا مگر جن خرابیوں کے باعث حیات زوج اول یا نکاح زوج اول کے وقت نکاح ممنوع تھا وہ سب خرابیاں اس نکاح میں لازم آئیں الغرض لفظ والمحصنات کے اختیار فرمانے کی یہ وجہ ہے کہ حرمت نکاح معتدہ کی طرف بھی اشارہ منظور ہے۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ لفظ احصان یعنی حفظ آتا ہے سو بیان بوجوہ مذکورہ بالا یہ عرض ہے کہ خاوند اپنی عورت کو غیر مرد سے محفوظ رکھے اور جو وہ نہ ہو تو جیسے فرض کیجئے مر گیا تو اس کی کس کو دکنبہ اور خویش و اقربار حافظ ننگ و ناموس ہیں۔ مگر چونکہ بنائے حفظ ننگ و ناموس پاس نسب ہوتا ہے تو اگر بعد موت زوج اول یا طلاق زوج اوّل عورت ایک ساعت کے بعد ہی بچہ جن اٹھے تو اب حفظ ننگ و ناموس کی کچھ ضرورت نہ رہی کیونکہ اب اختلاط نسب متصور نہیں۔ اس لیے اس صورت میں بمجرد وضع حمل اس کو اختیار دینا مناسب سمجھا اور یہ ارشاد ہوا۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ (حمل والی عورتوں کی عدت بچہ جننے تک ہے۔)

ہاں اگر حمل کے ہونے نہ ہونے میں اشتباہ ہو اور کسی کی زوجہ کی نسبت ہر دم یہ اشتباہ رہتا ہے کیونکہ اول علوق میں تو جانوروں میں تمیز حمل ہو نہ آدمیوں میں تو اس صورت میں انتظار ظہور حمل مناسب تھا۔

(عدت بیوہ اور عدت مطلقہ میں فرق کی وجہ:) اس لیے عدت بیوہ دس دن چار مہینے مقرر ہوئی وجہ اس کی یہ ہے کہ اس مدت میں حمل ہوگا تو خود ظاہر ہو جائے گا کیونکہ موافق احادیث صحیحہ چالیس دن تک نطفہ پر صورت نطفہ باقی رہتی ہے اگرچہ اوّل و آخر وقت میں فرق زمین و آسمان ہو۔ الغرض جیسے خون سیاہ و سرخ و زرد میں باوجود تفاوت الوان وہ بات مشترک ہے جس کے باعث اس کو خون کہے جاتے ہیں ایسے ہی نطفہ پر روز اوّل اور رنگ ہو اور چالیسویں دن اور رنگ ہو۔ بایں ہمہ کوئی ایسی بات باہم مشترک ہوتی ہے جس کے باعث اس وقت تک نطفہ ہی کہہ سکتے ہیں علقہ یا مضغہ نہیں کہہ سکتے۔ ہاں دو سرکے چلے میں وہ حالت اس پر عارض رہتی ہے جس کے سبب علقہ یعنی خون کا لوتھڑا اس کا نام ہو جاتا ہے پھر تیسرے چلے میں مضغہ ہو جاتا ہے اور چالیس دن تک مضغہ رہتا ہے بعد تیسرے چلے کے پورے ہو جانے کے نفخ روح کی نوبت آتی ہے۔ مگر اول اول جان پڑتی ہے تو نہایت درجہ کی ناتوانی ہوتی ہے حرکات کی طاقت کجا۔ کسی قدر عرصہ کے بعد حرکات ظاہر ہونے لگتی ہیں سو تین چلوں کے تو پورے چار مہینے ہوئے ربع چلہ بغرض ظہور حرکات اور بڑھا لیا تاکہ حمل کے ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ رہے یعنی جب مقدار شکم زیادہ ہو گئی اور حرکات نمایاں ہوئیں تو پھر یہ احتمال ہو ہی نہیں سکتا کہ استسقاء یا رجاء وغیرہ امراض ہوں ہاں اگر اتنے عرصہ میں ہی حمل ظاہر نہ ہو تو پھر یقین کامل ہو گیا کہ حمل زوج مردہ نہیں جو اس کے ننگ و ناموس کو ملحوظ رکھیں اور نسب کی حفاظت کی جائے اس لیے یہ ارشاد ہوا۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (بقرہ) (پھر جب وہ اپنی عدت (کے ختم) تک پہنچ جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے متعلق جائز صورت اختیار کریں۔)

اس تقریر سے فائدہ لفظ تربص بھی ظاہر ہوگیا اور مفعول تربص بھی معلوم ہوگیا یعنی غرض اس لفظ سے یہ تھی کہ جن عورتوں کے خاوند مر جائیں وہ عورتیں دس دن چار مہینے انتظار کیا کریں سو اس تقریر سے واضح ہوگیا کہ انتظار ظہور حمل مقصود ہے تاکہ حمل ظاہر ہو جائے تو وضع حمل تک اور کسی سے نکاح نہ کیا جائے اور اگر ظاہر نہ ہو تو عورت کو اختیار دیا جائے۔ الغرض لفظ یَتَرَبَّصْنَ کے ساتھ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ کو ملایئے تو یہ مطلب نکل آتا ہے کہ اگر پورے چار ماہ دس روز انتظار ہی میں گذر جائیں تو پھر عورتوں کو اختیار ہے مگر انتظار اسی حالت کا نام ہے جس میں اس چیز کے ہونے نہ ہونے کا یقین نہ ہو سکا انتظار رہے۔ سو پورے چار ماہ دس دن تک انتظار بھی متصور ہے کہ آخر ساعت تک یقین حمل نہ ہوا ہو اور درصورتیکہ حمل کا یقین پہلے ہی ہو چکا تو اب اس حالت کو تربص بمعنی انتظار نہیں کہہ سکتے جو موافق فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ ایسی حالت میں بعد چار ماہ دس روز کے اجازت نکاح مل جائے بلکہ اس وقت وہ عورت منجملہ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ سمجھی جائے گی۔ اس طور پر آیت۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (بقرہ ۳۰۶)	(اور جو لوگ مر جاویں تم میں سے اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو چاہیئے کہ وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن)

اور آیت وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ میں کچھ تعارض نہ رہا۔

(وفات کی عدت میں انتظار سے مقصود فقط ظہور حمل ہے)

اور آیت فاذا بلغن اجلہن میں جو لفظ بالمعروف موجود ہے اس کا فائدہ بھی معلوم ہوگیا یعنی مدت معلومہ کے بعد باوجود ظہور حمل اگر عورت نے کسی سے نکاح کر لیا تو بوجہ مذکور یہ نکاح بھی معروف (جائز) نہ سمجھا جائے گا۔ مگر چونکہ وجہ تربص بعد موت زوج فقط انتظار حمل ہی تھا اور وجہ تربص بعد طلاق انتظار رضاء زوج بھی ہے۔ تو عدت وفات میں تو حمل کے چھپانے نہ چھپانے میں جداگانہ کچھ ارشاد نہ فرمایا کیونکہ یہاں تو خود ظہور حمل ہی کا انتظار مقصود ہے ادھر دس دن چار ماہ ایک مقدار معین ہے جس میں کمی بیشی مقصود نہیں پھر کیا حاجت جو بروے احتیاط اور تاکید کی جائے اور عدت طلاق کے ذکر کے بعد یہ بھی ارشاد کر دیا۔

وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ	(اور ان کو حلال نہیں کہ چھپا رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور پچھلے

کیونکہ انتظار حمل کے سوا یہاں انتظار رضاء زوج بھی ہے ادھر طہر و حیض اول تو منجملہ امور مخفیہ ہیں)
دوسرے ان کے لیے مقدار معین نہیں، موافق بعض مذاہب اونتالیس ۳۹ دن میں تین حیض متصور ہیں اور اس
قدر مدت میں حمل اوروں پر خوب ظاہر نہیں ہو سکتا غرض انتظار ظہور حمل مقصود نہ تھا جو بیان مدت دربارۂ
ممانعت خفا کافی ہو جاتی ادھر بوجہ خفاء امر طہر و حیض و عدم تعیین مدت چھپا لینے کا احتمال تھا اس لیے
یہاں بتصریح ارشاد کی ضرورت ہوئی۔

(طلاق کی عدت میں مقصود خاوند کی رضا بھی ہے)

باقی رہی یہ بات کہ عدت طلاق میں انتظار رضا بھی مقصود ہوتا ہے اور عدت وفات میں فقط انتظار حمل ہے۔ یہ خود ظاہر ہے رجعت کا طلاق میں مقرر ہونا اور بے نکاح زوج کو زوجہ پر تصرف کر لینا خود اس بات کی دلیل ہے کہ نکاح بالکل منقطع نہیں
ہوا اور کیوں ہو حقیقت نکاح تراضی طرفین تھی اور بناء تراضی اتحاد نوعی اور احتیاج طرفین ہے جو ایک کو
دوسرے لگی ہوئی تھی پھر احتیاج بھی ایسی ویسی نہیں بلکہ اس احتیاج کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ مرد مظہر
کامل محبت بنایا گیا اور عورت مظہر جمال محبوبیت بنائی گئی تاکہ احتیاج اپنے کمال کو پہنچ جائے۔ کیونکہ اس
سے بڑھ کر احتیاج کی کوئی صورت ہی نہیں کہ ایک معشوق ہو اور اہل فہم جانتے ہوں گے کہ جذب محبوب
جذب محب سے کہیں زیادہ ہے۔ اس صورت میں یہ کب ہو سکتا ہے کہ محبت محبوب محبت محب سے
کم ہو۔ ورنہ ضعف جذب جو آثار طلب محبت میں سے ہے ادھر ہوتا اور ادھر نہ ہوتا۔ اس صورت میں محب و
محبوب، محبوب یکدگر ہوں گے اور محتاج یکدگر، مگر سوا اس کے اور احتیاجیں یا اس کے برابر ہوں گی یا اس
سے کم تر وجہ اس کی یہ ہے کہ بناء احتیاج محبت پر ہی یا تو ہو یعنی عدت طلاق رجعی میں انتظار حمل رضا
اگر بے واسطہ محبت ہے تو وہ احتیاج عشق کی ہم وزن ہے بلکہ خود عشق ہے اور اگر بواسطہ ہے جیسے
روپیہ وغیرہ وسائل و ذرائع رزق کی محبت جو بذات خود فرض کرو محبوب ہے یا متعلقات اشیائے بکار نہ
محبوبہ ہی کی محبت۔ تو وہ اس سے کم تر، بہر حال احتیاج عشق و محبت جمال سے بڑھ کر کوئی احتیاج
نہیں اور بناء طلاق ناخوشی اور شکر رنجی معاملات خانگی پر ہے اور ظاہر ہے کہ اتحاد نوعی اور محبت عشقی
کوئی امر ناپائیدار نہیں جو یوں کہئے کہ آج ہے کل نہیں۔ ہاں شکر رنجی معاملات بیشتر ایک امر ناپائیدار ہوتا
ہے اس لیے انتظار رضاء نکاح ثانی کے لیے ضرور ٹھہرا۔ بالجملہ تقرر رجعت جو عدم انقطاع نکاح پر دلالت

کرتا ہے ضرورت انتظار رضا کے لیے دلیل کامل ہے۔ ہاں جب دوبار یا تین بار پاک صاف ہو کر لباس و زیور سے آراستہ ہو کر عورت پیش نظر رہے اور پھر بھی زوج کو ادھر التفات نہ ہوا تو یوں کہو یہ ناخوش دلی بھی اور یہ نفرت تہ دل کی تھی جو باوجود اس بھلانے کے کچھ خیال نہ آیا۔ الغرض عدت طلاق میں ایسی مدت مقرر کی گئی جس میں حفظ ونسب بھی ہاتھ سے نہ جائے اور نوبت تا مقدور مفارقت کو بھی نہ آئے جو مخالف اصل طبیعت اور منجملہ البغض المباحات ہے وجہ ثانی کا اس حکم میں ملحوظ ہونا تو آشکارا ہو چکا۔

(عدت میں حفاظت نسب کی کیفیت) پر حفظ نسب کی کیفیت بیان کرنی ضرور ہے حالت حمل میں سب جانتے ہیں کہ حیض بند ہو جاتا ہے۔ اس لیے ان ایام کے خون کو اگر اتفاق سے آجائے تو حیض میں شمار نہیں کرتے، مرض استحاضہ میں محسوب ہوتا ہے سو جب مکرر سہ کرر حیض آیا تو احتمال حمل اصلاً نہ رہا، بایں ہمہ تقریباً یہ مدت بھی دس دن چار مہینے کے قریب آپڑتی ہے۔ کیونکہ اکثر عورتوں کی عادت یہی ہے کہ مہینے میں ایک بار آئے اور زیادہ سے زیادہ دس دن آئے سو اگر شروع طہر میں کسی نے اپنی زوجہ کو طلاق دی تو ایک ایک ماہ کے تین طہر اور تین حیض کا ایک ماہ جس کا ماحصل وہی چار ماہ نکلے مگر چونکہ خاوند یہاں زندہ ہے اور اس کو سب سے زیادہ اپنے نسب کے بننے بگڑنے کا خیال ہے تو اس قسم کی احتیاط عورت کو کرنی ضرور نہ ہوئی جس قسم کی احتیاط عدت وفات میں ضروری تھی جو اور دس روز کا بھی حساب لگایا جاتا۔

(طلاق مغلظہ میں عدم انتظار رضاء زوج کے شبہ کا ازالہ) اب شاید یہ شبہ باقی ہو کہ طلاق مغلظہ میں تو احتمال رجعت باقی نہیں پھر یہ عدت کاہے کے لیے ہے اس کا جواب یہ ہے کہ چار ماہ دس روز بغرض کمال احتیاط مقرر ہوئے تھے اور وجہ اس احتیاط کی یہی تھی کہ صاحب نسب مر گیا دوسروں کو ایسا کیا خیال ہوگا اور نہ حیض اس امر میں کافی تھا۔ کیونکہ حیض کا آنا خود حاملہ نہ ہونے کی دلیل ہے۔ سو جب صاحب نسب زندہ ہو تو پھر اس احتیاط کی کیا ضرورت۔ وہ خود تحقیق کرتا ہے گا بہت ہو گا تو یہ ہوگا کہ دو باتوں میں ایک ہے۔ خود محتاج الیہ سے بے واسطہ محبت ہو یا بواسطہ۔ اور انتظار تھا دونوں ہی کا۔ طلاق مغلظہ میں فقط انتظار حمل ہی رہ گیا۔

(طلاق مغلظہ میں عدت کا فائدہ خاوند کو ناشکری کی سزا میں ذہنی کوفت میں مبتلا کرنا بھی ہے) بلکہ غور سے دیکھئے تو یہاں انتظار رضاء کے بدلے ایک اور غرض ساتھ لگ گئی وہ کیا زوج کا جلانا۔ یعنی جب طلاق ثالث کے بعد عورت نے مکرر (دل) لبھایا تو اگر اس کو کچھ بھی محبت ہوگی

تو اب بجز سوز و گداز اور کیا ہاتھ آئے گا۔ اپنے جی میں جل بھن کر رہ جائے گا۔ اور اس کا یہ اضطراب و قلق اور یہ سوز گداز آگے کو تو اس کے یوں کام آئے گا۔ اور عورت کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرے گا۔ اور اوروں کو یوں مفید ہو گا کہ انہیں بھی اپنے دن نظر آئیں گے اور عبرت پکڑ کر ایسے خیالات سے باز رہیں گے بہرحال طلاق خلاف مرضی خداوندی تھی اس لیے یہ جرمانہ مقرر ہوا۔ سو یہ بات حیض و طہر ہی کے ساتھ خوب مربوط ہے دس دن چار ماہ کو اس سے علاقہ نہیں۔ کیونکہ اس عدد کو لبھانے میں کچھ دخل نہیں علاوہ بریں کسی طلاق کا ثانی یا ثالث ہونا ایک امر اضافی ہے بلحاظ ما قبل یہ وصف اس پر عارض ہوتا ہے ورنہ فی حدّ ذاتہٖ اول اور دوم اور سوم سب برابر ہیں اور عدت مذکورہ حسب بیان بالا طلاق کے مقتضیات ذات میں سے ہے۔ یعنی یہ انتظار رضا بوجہ اتحاد نوعی محبت باہمی وقت ناخوشی قابل لحاظ تھا اور حرمت مغلظہ بوجہ امر اضافی مذکور عارض ہوئی اس لیے عدت جوں کی توں رہی۔ کیونکہ مقتضیات ذات عوارض خارجیہ کے باعث زائل نہیں ہو سکتے۔ ہاں جیسے نور شمس وقت کسوف زائل نہیں ہوتا چاند کی اوٹ میں مستور ہو جاتا ہے لوازم و مقتضیات ذات بھی عوارض خارجیہ کی آڑ میں مستور ہو جاتے ہیں اور اپنا اثر نہیں کرتے سو یہاں بھی بعینہٖ قصہ ہے کہ عدت وہی کی وہی رہی پر فائدہ عدت متفرع نہ ہوا یعنی انتظار رضا بے کار گیا اور زوج اول کے ہاتھ پلے کچھ نہ پڑا۔ بالجملہ حالت عدت میں خاص کر عدت وفات اور عدت طلاق مغلظہ میں نکاح باقی نہیں رہتا اگر رہتا ہے ________________ تو اس کا اثر یعنی احصان باقی رہتا ہے۔ سو اگر لفظ والمحصنات نہ فرماتے بلکہ والمتزوجات یا والمنکوحات فرماتے تو باشارہ وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ معتدہ طلاق مغلظہ اور معتدہ وفات دونوں حلال سمجھی جاتیں پر علت حرمت جوں کی توں باقی رہتی۔ چنانچہ بخوبی واضح ہو گیا۔ اس لیے جناب باری تعالیٰ نے لفظ والمحصنات اختیار فرمایا اور سوا اس کے اور خدا جانے کیا کیا حکمتیں ہوں گی۔

(علت احصان سے متعہ حرام ہے) لیکن جب وجہ اختیار لفظ والمحصنات معلوم ہو گئی اور معنیٰ احصان بخوبی ظاہر ہو گئے تو اب التماس دیگر یہ ہے کہ یہی وجہ اور یہی معنیٰ وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِکُمْ مُّحْصِنِیْنَ غَیْرَ مُسٰفِحِیْنَ (اور حلال ہیں تم کو سب عورتیں ان کے سوا

لہ غرض یہاں بھی انتظار رضا بھی ہے گو وہ رضا کے پہلے جفا کے جرمانہ میں بیکار جائے۔ ۱۲ (حاشیہ طبع قدیم)

بشرطیکہ طلب کریں ان کو اپنے مال کے بدلے قید میں لانے کو نہ مستی نکالنے کو) میں ملحوظ رکھنے چاہئیں بلکہ یہاں یہ لحاظ بدرجہ اولیٰ ضروری ہے اس لیے کہ غیر مسافحین بھی یہاں تو ساتھ لگا ہوا ہے جس کے یہ معنی ہیں۔ کہ شہوت رانی مقصود نہ ہو غرض یہاں احصان مذکور زیادہ تر ملحوظ رکھنا ضروری ہے اور باوجود اس دلالت سیاق اور تاکید غیر مسافحین اگر احصان بمعنی مذکور ملحوظ نہ ہو تو یوں کہو کہ منکوحات امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم منجملہ المحصنات نہ ہوں اور سوا ان رشتہ داروں کے جن کے ساتھ نکاح کرنا حسب ارشاد سابق حرام ہو چکا ہے اور سب کو منکوحات امت محمدیہ سے حالت نکاح اول میں بھی نکاح درست ہو نعوذ باللہ منہا۔ ہاں اگر احصان کے یہ معنی نہ ہوتے اور وجہ امر احصان یہ نہ ہوتی جو بندہ کمترین عرض کر آیا ہے تو البتہ کسی صاحب کو مجال دم زدن بھی تھی مگر قطع نظر اس بات کے کہ اشارہ حفظ نسب جملہ احکام متعلقہ نکاح سے مترشح ہے۔ چنانچہ معروضات سابقہ اس باب میں کافی ہیں۔ اور وہ اشارات ارادہ معنی معروض پر مثل آفتاب روشن دلالت کرتے ہیں اور کوئی معنی یا وجہ اگر حکم احصان کے لیے تجویز کی جائے تو بجز اس کے اور کیا ہو کہ وجہ احصان انتساب فی مابین یعنی عورت کا مرد کے نام لگ جانا موجب حکم احصان ہو اور تفسیر احصان غیرت جاہلیت اہل ہند ہو۔ یعنی تمام عمر کی عدت عورت کے ذمے پڑے۔ سو ایسے مضامین کے تسلیم کرنے کے لیے عقل جاہلانہ اور مذہب ہندوانہ کی ضرورت ہے اہل اسلام کو ایسے خرافات سے کیا مطلب۔

کون نہیں جانتا کہ باندی غلام بلکہ اور اموال مملوکہ بھی بعد مرگ مالک اس کی ملک سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اجارات بعد موت مستاجر فسخ ہو جاتے ہیں سو ملک منافع بضعہ یا اجارہ نکاح ایسا کیا پائیدار اور مستحکم ہے جو بعد مرگ بھی باقی رہے ادھر طلاق خود قطع نکاح کے لیے موضوع ہے۔ نہایت کار ایک وار میں عقدہ نکاح منقطع نہ ہو۔ تین بار میں منقطع ہو جائے۔ آخر کلہاڑا، تیشہ وغیرہ آلات نجار بھی جو قطع اشجار وغیرہ کے لیے موضوع ہوئے ہیں ایک بار اور ایک وار میں تو نہیں قطع کر دیتے۔ بالجملہ طلاق تو قطع نسبت عقد کے لیے موضوع ہے اور موت اگرچہ بالذات قاطع نسبت نہیں پر قاطع رشتہ حیات منتسبین ہے مگر منتسبین یا احد المنتسبین نہ ہوں تو نسبت منقطع کیا معدوم ہی ہو جائے گی اس صورت میں بقاء علاقہ نکاح کی تو کوئی صورت ہی نہیں۔

(وضع حمل سے پہلے حرمت نکاح کی حسی مثال) ہاں ایسے کہیے کہ جیسے ظروف مبیعہ میں بائع کا روغن یا شہد و شیر وغیرہ مثلاً رکھا ہوا ہو۔ اور اس وجہ سے مشتری اپنا روغن وغیرہ تاوقتیکہ وہ ظروف خالی نہ ہو لیں۔

ان میں ڈال نہیں سکتا کیونکہ ڈال دے تو اتلاف حق غیر اور افساد حق غیر لازم آتا ہے یعنی بعد اختلاط، تمیز حقوق مشکل ہے ایسے ہی تا بقائے حمل زوج اول، زوج ثانی زراعت ولد یعنی جماع جس میں القاء تخم ولد یعنی نطفہ ہوتا ہے، نہیں کر سکتا۔ ہاں مگر اتنا فرق ہے کہ روغن و شیر وغیرہ کا برتنوں میں رکھنا کوئی خواہش طبعی اور لذت قلبی نہیں جو بعد بیع قبل استفراغ ظروف اندیشہ اختلاط ہو۔ ادھر روغن و شیر وغیرہ ایسی اشیاء نہیں کہ سوا ظرف اوّل بے نقصان اور کسی ظرف میں منتقل ہی نہ ہو سکیں، بایں ہمہ قطع نظر تعلق حق غیر سے روغن و شیر وغیرہ ایسی اشیاء نہیں کہ زمین پر گرا دیجئے تو یہ گرا دینا اس کے حق میں کوئی ظلم و ستم سمجھا جائے اس لیے قبل استفراغ یعنی خالی کرنے سے پہلے ان کی بیع میں کوئی نقصان یا اندیشہ نہ تھا البتہ قبل وضع حمل اگر نکاح تجویز کیا جائے تو یہ ساری خرابیاں موجود ہیں نہ یہ ہو سکے کہ شکم زوجہ سے نکال کر کسی اور شکم میں رکھ دیں نہ یہی ہو سکے کہ اگر زوج اوّل اپنے حمل کے نکلوانے میں دیر کرے تو زمین پر ہی گرا دیجئے کیونکہ قطع نظر حق زوج اوّل سے حمل کا گرا دینا بھی تو منجملہ خون ہے جو اوّل درجہ کا ظلم ہے بایں ہمہ یہ زراعت یعنی القاء تخم نطفہ جو بوسیلہ جماع ہوتا ہے، ایسی خواہش غالب اور لذت عجیبہ ہے کہ بعد قدرت، صبر قریب محال ہے۔ اس لیے ایسے وقت میں اجتناب زنا کے وہ فضائل مقرر ہوئے کہ کیا کہیئے، بایں نظر نکاح ہی ایسے اوقات میں ممنوع ٹھہرایا گیا نہ یہ کہ بقاء نکاح، مانع نکاح ثانی ہے اور ظاہر ہے کہ بعد انقطاع نکاح اوّل سواء اندیشہ اتلاف حق غیر یا افساد حق غیر دوسروں سے نکاح کا ممنوع ہونا ایسا ہی ہے جیسا بعد انقطاع علاقہ ملک کسی غلام باندی کا کسی سے عقد اجارہ خدمت کا ممنوع ہونا سو جیسا اس کو کوئی عاقل تجویز نہیں کر سکتا ایسے ہی قطع نظر اتلاف و افساد حق غیر سے بعد انقطاع نکاح اول ممانعت نکاح ثانی کوئی تجویز نہیں کر سکتا۔ ورنہ قطع نظر مخالف ہدایت کے پھر عدت ہی کی کیا تخصیص تھی مثل بیوگان ہند ساری عمر ہی نکاح ممنوع ہونا تھا۔

بہر حال سوا اندیشہ اختلاط نسب وجہ ممانعت نکاح وقت بقاء نکاح اول یا وقت عدت اور کوئی امر نہیں اس لیے ایسے نکاح کی تحریم کے وقت ایسا لفظ جامع اختیار فرمایا جو اس وجہ مشترک پر دلالت کرے اور پھر اس کے بعد وَأُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَن تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُم مُّحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ۔ ارشاد کیا تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جو عورتیں باقی رہیں وہ کیف ما اتفق حلال نہیں بلکہ بشرط ارادہ احصان ہی حلال ہیں ورنہ موافق قاعدہ مذکورہ لازم آتا ہے کہ منکوحات

اہل اسلام اوروں پر حرام نہ ہوں۔ کیونکہ جب احصان ملحوظ نہ رہا تو وہ منجملہ محصنات نہ ہوئیں سو جو لوگ ایسے ہوں کہ ان سے کوئی رشتہ موجب حرمت منجملہ رشتہ ہائے مذکور الصدر نہ ہو ان سے نکاح حرام نہ ہو۔

(حرمت متعہ کی وجہ شہوت رانی ہے) مگر جب معنی احصان اور تفسیر احصان یہ ٹھہری جو اوپر معروض ہوئی تو نکاح متعہ حلال نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں شہوت رانی مقصود ہوتی ہے۔ احصان مقصود نہیں ہوتا۔ اگر احصان مقصود ہوتا تو عدت ضرور مقرر ہوتی کیونکہ تا بقاء مدت متعہ خاوند جماع کا مجاز ہے اور کیوں نہ ہو عورت کو اور نوکر ہی کاہے کے لیے رکھا ہے اور جب آخر ساعت مدت متعہ میں جماع کی نوبت آئی تو پھر احتمال حمل باقی ہے اس صورت میں عدت کا مقرر ہونا ضرور تھا حالانکہ باقرار شیعہ متعہ میں عدت نہیں ہوتی اور کلام اللہ میں اس کی عدت کہیں مذکور نہیں۔ یعنی جیسے عدت طلاق اور عدت وفات جدا جدا کلام اللہ میں مذکور ہیں عدت متعہ جداگانہ کلام اللہ میں کہیں مذکور نہیں۔ الغرض نہ شیعہ اس بات کے قائل ہیں کہ عدت متعہ مثل عدت طلاق یا عدت وفات ہے اور نہ کلام اللہ سے اس کا کہیں پتہ نکل سکتا ہے۔

(از روئے عقل متعہ عدت کا متقاضی نہیں) اور یہ عدم عدت متعہ بروئے عقل بھی دیکھئے تو بجائے خود ہے کیونکہ یہاں نکاح متعہ وقت اختتام مدت تمام ہو چکا اور ظاہر ہے کہ کسی شے کے تمام ہو جانے کے بعد اس کے آثار باقی نہیں رہ سکتے ہاں انقطاع شے کے بعد وہ آثار جو بوسیلہ اتصال ظاہر ہوتے تھے کسی قدر باقی رہتے ہیں مثلاً ایک تو درخت کا تمام ہو جانا ہے اس صورت میں تو آثار نمو بھی مثل تازگی وغیرہ ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اگر شاخ درخت سے ملی ہوئی کوئی چوب خشک رکھی ہوئی ہو تو آثار نمو یعنی تازگی اس میں نہیں جاتی اور اگر درخت کو یا اس کی شاخ کو قطع کر دیجئے تو وہ تازگی جو اوپر کے کسی ٹکڑے کو بوجہ اتصال نیچے کی طرف پہنچی تھی کس قدر دیر تک باقی رہتی ہے اور پھر ایک زمانہ معین کے بعد مبدل بخشکی ہو جاتی ہے۔ سو ایسے ہی نکاح حلال اور متعہ میں فرق ہے۔ متعہ میں تو ملک منافع اختتام کو پہنچ جاتی ہے اور طلاق و وفات میں ملک نکاح منقطع ہو جاتی ہے اگر ان دونوں کی نوبت نہ آئی تو نکاح کے بقاء میں کوئی شک نہیں اور متعہ میں ظاہر ہے کہ طلاق دو یا نہ دو مرد یا نہ مرو بعد اختتام مدت مثل دیگر اجارات تمام لازم آجاتا ہے سو یہ عدم جواز نکاح ثانی جو آثار و لوازم نکاح اول میں سے تھا نکاح متعہ میں باقی رہے تو کیونکر رہے ہاں اگر نکاح حلال کے انقطاع کے بعد جو کسی قدر باقی رہے تو بجائے خود ہے۔

(استبراء کا عذر لنگ مفید نہیں) اس صورت میں اگر کوئی شیعہ بوجہ دور اندیشی آج استبراء کی بکھیڑ بھی لگائے تو اس کا کیا جواب دیں گے کہ یہاں استحقاق استبراء زوج اوّل کو باقی نہیں کیونکہ اسکا حق تمام ہو چکا منقطع نہیں ہوا اگر منقطع ہو جاتا تو مضائقہ بھی نہ تھا غرض نہ نکاح اول باقی ہے نہ اثر نکاح اول پھر استحقاق زوج اول ہی کیا ہے جو ثانی سے معاملہ نہ ہو سکے۔ ہاں اگر ممانعت نکاح محصنات کی علت سواء پاس زوج اور کوئی امر ہوتا تو مضائقہ بھی نہ تھا مگر ناظران تقاریر گذشتہ پر یہ بات بخوبی واضح ہے کہ یہ ممانعت بے شک بوجہ حق زوج ہے اور کیوں نہ ہو۔ ازواج متعدد ہوں تو شہوت رانی میں چنداں حرج نہیں تولد اولاد میں کچھ نقصان نہیں اگر شہوت رانی کو تعدد ازواج مانع ہوتا تو رنڈیوں کی دوکان کاہے کو چلتی۔ تولد اولاد میں نقصان کا خیال تو غلط۔ ہاں امید کہیے تو بجا ہے ایک زوج ہو تو یہ بھی احتمال ہے کہ عنین ہو یا اس کا نطفہ صالح نہ ہو متعدد ہوں تو یہ احتمال بھی اٹھ جاتا ہے غرض تکثیر بنی نوع اور تکثیر نسل حضرت آدم میں یہ امر خارج نہیں۔ ہاں بنی آدم بوجہ اتلاف و افساد حقوق یقینی تھا اس لیے ممنوع ٹھہرایا گیا۔

(زن متعہ کو باندی پر قیاس کرنا باطل ہے) باقی رہا باندیوں پر قیاس کرنا اس سے بھی بڑھ کر جہالت ہے۔ کیونکہ وہاں نکاح زوج اوّل یعنی کافر تمام نہیں ہوتا۔ علی ھذا القیاس ملک مالک اوّل تمام نہیں ہوتے یہ دونوں منقطع ہو جاتے ہیں اگر تمام ہوتے تو بے احراز یا بے بیع بھی وقت معلوم پر زوج اول اور مالک اوّل سے زمان معلومہ جدائی ہو جاتیں اور جب انقطاع ٹھہرا تو اب عدت بوجہ مذکور بجائے خود ہے مگر چونکہ بشہادت آیت۔

فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ (پ۵ ع۲) (تو اگر کریں بے حیائی کا کام تو ان پر آدھی سزا ہے بیبیوں کی سزا سے)

جو چند آیتوں کے بعد آگے موجود ہے یہ بات معلوم ہوئی کہ احترام اماء مثل احترام حرائر نہیں بلکہ باندیوں کا احترام حرائر سے آدھا ہے تو عدت اور طلاق بھی ان کی آدھی مقرر ہوئی کیونکہ یہ دونوں باتیں بھی بوجہ احترام ہی مقرر ہوئی ہیں یعنی بایں نظر کہ اولاد حرائر زیادہ مرغوب و معزز سمجھی جاتی ہے۔ تو ان کی اولاد کا نسب بھی زیادہ قابل حفاظت سمجھا گیا اس لیے ان کے لیے پوری عدت مقرر ہوئی یعنی وہ مقدار مقرر ہوئی جو بشہادت عقل زیادہ سے زیادہ ہے مگر جب باندیوں کی اولاد زیادہ معزز اور محترم نہ ہوئی تو بقدر کمی احترام احتیاط اور حفظ میں کمی آئے گی سو وہ کمی چونکہ بقدر نصف تھی تو طلاق عدت میں بھی

مثل حدود تناصف لازم آیا۔ اس لیے کہ علت تنصیف دونوں جا موجود ہے یعنی تناصف احترام ہی باعث تناصف عذاب ہوا تھا۔

قاعدہ ہے جن کا اعزاز زیادہ کیا جاتا ہے انہی سے مواخذہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ع

نزدیکاں را بیش بود حیرانی

انسان کو ترک صوم وصلوٰۃ اور ارتکاب ظلم و فساد اور زنا اور شرب خمر وغیرہ پر عذاب ہوگا جانوروں کو نہ ہوگا۔ وجہ کیا ہے؟

یہی احترام واکرام بنی آدم اور عدم احترام واکرام حیوانات ہے اسی طرح تناصف احترام موجب تناصف طلاق اور تناصف عدت ہونا چاہیے۔

(باندی میں طلاق کی تجزی نہ ہونیکی وجہ) ہاں اتنا فرق ہے کہ ماہیت عذاب مشار الیہ یعنی حدود اگرچہ قابل تنصیف حقیقی نہیں پر عدد عذاب یعنی حدود قابل تنصیف حقیقی ہے۔ اس لیے تو سو درّوں کی جا پچاس اور اسّی کی چالیس مقرر ہوئے مگر طلاق کو دیکھا تو نہ ماہیت طلاق قابل تنصیف ہے اور نہ عدد طلاق لائق تنصیف۔ عدد کا قابل تنصیف نہ ہونا تو اس کے طاق ہونے سے ظاہر ہے اور اگر کسی کو بوجہ تجویز کسور شبہ واقع ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کسور معدود میں ہوتی ہیں عدد میں نہیں ہوتی ورنہ وحدات) یا احاد عدد، وحدت، واحد نہ رہیں مرکب اور متعدد ہو جائیں اس سے زیادہ علماء کو ضرورت نہیں اور کم فہم زیادہ بھی بدقت ہی سمجھیں گے رہی ماہیت طلاق اس میں تنصیف درکنار مطلق انقسام ہی کی گنجائش نہیں۔ ہاں وہ اگر منجملہ کمیات ہوتی ہو تو یہ بات ہوتی البتہ بوسیلہ عدد انقسام عددی متصور ہے۔ اس لیے اس کی طلاق مغلظہ دوسری طلاق ہوگی کیونکہ اگر بالفرض کوئی شخص بزعم خود آدھی طلاق دے تو اس کے اقرار کے موافق وجود مادہ طلاق تو ہوا مگر طلاق واحد حسب بیان بالا نہ باعتبار ماہیت قابل تقسیم ہے نہ باعتبار عدد جو یوں کہا جائے کہ آدھی آدھی نہیں اس لیے جب ہوگی تو پوری ہی ہوگی۔

(حیض وطہر بذات خود قابل انقسام نہیں) علی ہذا القیاس عدت طلاق کو خیال فرمایئے کیونکہ حیض و طہر بذات خود تو قابل انقسام ہی نہیں اگر ہیں تو باعتبار زمانہ قابل انقسام ہیں وجہ اس کی اسی سے ظاہر ہے کہ ان کے لیے کوئی مقدار معین نہیں یعنی کوئی ایک زمانہ مقرر نہیں کہ اس سے کمی بیشی متصور

نہ ہو قلیل وکثیر سب پر ان دونوں کا اطلاق درست ہے سو یہ بات کہ قلیل وکثیر دونوں پر برابر اطلاق ہو سکے اشکال وصور یعنی حدود کے خواص میں سے ہے خواہ وہ شکل وصورت مدرکات بصری میں سے ہو یا کسی اور حاسہ کے مدرکات میں سے ہو۔ غرض اس جگہ صورت مصطلح اہل منطق سمجھنی چاہیئے صورت حاصلہ فی العقل سے جو وہ مراد لیتے ہیں وہی میں مراد لیتا ہوں۔ اور وجہ اس اختصاص کی کہ اس قسم کا اطلاق انہیں کے ساتھ مخصوص ہے یہ ہے کہ حدود وصور اگرچہ حدود وصور کمیات ومقادیر کیوں نہ ہوں اقسام کیف میں سے ہیں اقسام کم میں سے نہیں جو مقدار کی کمی بیشی باعث اختلاف ذاتی مقصود ہو جائے اگر مثال سے تسکین خاطر مقصود ہے تو سنیئے کسی کی تصویر اس سے چھوٹی ہو یا اس سے بڑی، صورت وہی کی وہی رہتی ہے ورنہ تبدل صورت ہوا کرتا تو پھر اس کا تصویر ہونا اور اس پر اس کا دلالت کرنا غلط ہو جاتا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کمی بیشی معروض تصویر میں ہوتی ہے خود تصویر میں نہیں ہوتی اس صورت میں حیض وطہر کا انقسام بھی بذات خود ممکن نہ ہوا جو مثلاً "قروء" کی جگہ باندیوں کے لیے ڈیڑھ قرء بلا کم وکاست مقرر ہو اس صورت میں جب ڈیڑھ قرء کسی کے ذمہ رکھا جائے گا تو پورے دو ہی قرء لازم آئیں گے۔

(معنی قرء میں حنفی شافعی اختلاف اور علم ریاضی سے اس کی وضاحت) اگر قرء بمعنی حیض ہے جیسے حنفی کہتے ہیں تو دو حیض۔ اور بمعنی طہر ہے جیسے شافعیوں کا مذہب ہے تو دو طہر۔ ہاں معروض طہر وحیض یعنی زمانہ مثل معروض تصویر البتہ محل انقسام ہوتا ہے سو وہ اور چیز ہے اس سے یہاں بحث نہیں۔ بحث کے قابل یہ بات ہے کہ تصویر یعنی وہ صورت جو کاغذ وغیرہ پر مرقوم ہوتی ہے۔ قطع نظر کاغذ سے بھی قابل انقسام ہے یا نہیں۔ سو اہل فہم سلیم پر روشن ہوگا کہ اگر وہ اس طرح قابل انقسام ہوتی تو لاریب اس کے لوازم ذات بھی قابل انقسام ہوتے اگر صورت حسین ہو تو حسن بھی بعد انقسام منقسم ہو اور قبیح ہو تو قبح بھی بعد انقسام منقسم ہو۔ علی ہذا القیاس در صورت حسن جس قدر محبت پوری صورت سے تھی وقت تنصیف وہ بھی نصفا نصفی ہو جائے حالانکہ تنصیف میں تو بہت کچھ نقصان آجاتا ہے۔ یہاں تو فقط ایک آنکھ ناک کی کمی بیشی میں حسن مبدل بقبح ہو جاتا ہے۔ اور محبت مبدل بنفرت سو وجہ اس تبدل وانقلاب کی یہی ہے کہ صورت سابقہ منقسم نہیں ہوتی بلکہ بدل جاتی ہے اور کیونکہ نہ ہو بعد انقسام منقسم کا اقسام پر صادق آنا ضرور ہے۔ غلہ آب زمین وغیرہ اشیاء کو اگر تقسیم کرتے ہیں تو تمام اقسام اور اجزاء کو بعد تقسیم بھی غلہ، آب، زمین ہی کہتے ہیں اور صورت کا یہ حال ہے کہ بعد

عروض اس حالت کے جس کو بظاہر انقسام کہیے اطلاق مقسم درست نہیں ہوتا بلکہ اس کا اور کچھ نام ہو جاتا ہے مثلاً مربع کو اگر قطر وغیرہ سے تنصیف کیجیے تو پھر ان ٹکڑوں کو جو بعد انقسام مشار الیہ حاصل ہوئے ہیں مربع نہیں کہہ سکتے بلکہ مثلث یا منحرف کہیں گے۔ وجہ اس انقلاب کی وہی ہے کہ یہ تقسیم صورت مربع پر عارض نہیں ہوئی بلکہ معروض مربع یعنی سطح پر عارض ہوئی ہے۔ اس لیے اطلاق سطح ہنوز بدستور ہے۔ مگر چونکہ سطح مذکور کو بوجہ عروض صورت مربع، مربع کہہ دیتے ہیں اس لیے عوام کو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مربع یعنی صورت مشار الیہ منقسم ہوگئی اسی طرح آب و زمین وغیرہ اشیاء جنس کو سمجھیے کہ جو چیز قلیل و کثیر پر برابر بولی جاتی ہے وہ صورت آب و زمین ہے مگر وہ قابل انقسام نہیں اور جو چیز قابل انقسام ہے وہ معروض صورت آب ہے وہ ہیولیٰ ہو یا اجزاء لایتجزیٰ یا بعد مجرد، سو کوئی صاحب اس بات سے کہ آب بعد انقسام پھر آب ہی رہتا ہے حالانکہ قلیل کثیر پر بولا جاتا ہے دھوکا نہ کھائیں اور اس بات کو غلط نہ سمجھیں کہ جو چیز قلیل و کثیر پر یکساں بولی جائے وہ مثل صورت حدود قابل انقسام نہیں ہوتی وجہ اس شبہ کی یہ ہے کہ کبھی حدود خود محدود ہو جاتی ہیں۔ جیسے سطح حد جسم ہے اور بہ نسبت خطوط خود محدود ہے۔ سو ایسی ہی چیز میں ایک حد ہوتی ہے ایک محدود ایک صورت ہوتی ہے، ایک معروض۔ صورت انقسام تو عوارض محدود و معروض میں سے ہوتا ہے۔ اور اطلاق علی القلیل والکثیر لوازم و موجبات صورت و حدود میں سے ہوتا ہے اور جہاں دونوں باتیں مجتمع ہو جاتی ہیں یعنی ایک شئے کسی کی حد اور صورت ہو اور کسی کی محدود اور ذو صورت۔ تو انقسام اور عدم انقسام کا بھی یہی حال ہوگا کہ ایک اعتبار سے انقسام ہوگا اور ایک اعتبار سے نہ ہوگا۔ مثلاً سطح اگر منقسم ہے تو عرض و طول میں منقسم ہے مگر اس اعتبار سے وہ حد اور صورت جسم نہیں۔ حد اور صورت جسم ہے تو باعتبار عمق ہے اور ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے سطح قابل انقسام نہیں۔

القصہ حیض و طہر طہارت و نجاست منجملہ صور و حدود ہیں اور احکام دینے میں بحیثیت صورت ہی ملحوظ ہیں۔ کیونکہ ان سے یا تحدید زمانہ مقصود ہے جیسے عدت میں ہوتا ہے یا تقیید مکلفین مثلاً جب یوں کہتے ہیں کہ نماز بے وضو درست نہیں تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ مومن مطلق کی نماز صحیح نہیں بلکہ مومن طاہر کی نماز صحیح ہے سو جیسے غسل، وضو قابل انقسام نہیں ورنہ آدھے وضو سے آدھی نماز صحیح ہو جایا کرتی اور آدھے غسل سے اس کے متعلق آدھے کام نکل آیا کرتے۔ ایسے ہی حیض و طہر

کو سمجھئے۔ سو جب ان میں انقسام ہی نہیں تو اگر کہیں نصف حیض یا نصف طہر لازم آئے گا تو سارا ہی حیض و طہر لازم آئے گا کیونکہ آدھا کہو یا تہائی وجود مادہ پر دلالت کرتا ہے مگر مادہ چونکہ قابل انقسام نہیں ادھر قلیل و کثیر پر اطلاق برابر درست ہے تو آدھا ہے جب سارا ہو گا اور تہائی ہے جب سارا ہو گا۔

(استبراء بیک حیض اور عدت کامل میں فرق) اور استبراء بیک حیض جو بعد ملک باندیوں کے باب میں ضرور ہوا اور تین حیض بے نزدو۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ عدت طلاق میں فقط حفظ نسب ہی مقصود نہ تھا بلکہ انتظار رضاء زوج بھی ملحوظ تھا تو یہاں انتظار تو ہے نہیں اگر ہے تو فقط حفظ نسب ہے اس کے لیے ایک حیض کافی ہے کیونکہ حیض آنا حمل کے نہ ہونے کے لیے دلیل کامل ہے بایں ہمہ اندیشہ اتلاف افساد حق غیر نہیں کیونکہ اگر حمل ہوا بھی تو وہ بھی اپنی والدہ کے ساتھ داخل ملک مالک ہو چکا۔ اس لیے زیادہ احتیاط کی ضرورت نہ ہوئی مگر بہر حال یہاں بھی انقطاع نکاح ہے اتمام نکاح نہیں جو زن متعہ کو ملک یمین پر قیاس کر کے استبراء کا قائل ہو جیئے۔ اس تقریر سے یہ شبہ بھی مرتفع ہو گیا کہ عدت متعہ کلام اللہ میں مذکور نہیں تو کیا ہوا استبراء زن غنیمت اور باندیوں کی عدت بھی مذکور نہیں۔ کیونکہ یہ سب کلام اللہ ہی سے ثابت ہوا۔ بایں ہمہ ان وجوہ میں سے ایک وجہ بھی مذکور ایسی نہیں جو زن متعہ کو اس وجہ سے ان احکام میں سے کسی میں شریک کر دیجئے اور نہ انشاء اللہ قیامت تک علماء شیعہ کو کوئی وجہ مقتضی استبراء عقل و نقل سے ہاتھ آئے بلکہ برعکس آرزو شیعہ وجوہ عدم استبراء عقل و نقل سے نمایاں ہیں۔ سو اگر علماء شیعہ کو عقل و نقل سے سروکار ہے اور اس دین کو موافق اشارہ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ عین حکمت سمجھتے ہیں تو عدم وجوب استبراء کے قائل ہوں گے اور پھر بوجہ عدم دخول فی المحصنات متعہ کی حرمت پر ایمان لاویں گے۔ ورنہ وہ جانیں۔

بالجملہ جملہ محصنین الخ اس پر شاہد ہے کہ وہ عورتیں جن کو مَا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ کہئے اگر حلال ہیں تو بشرط احصان حلال ہیں اور ظاہر ہے کہ رعایت احصان ان عورتوں کے محصنات بنا دینے کو مقتضی ہے اور بالالتزام زن متعہ کی حرمت پر دلالت کرتا ہے۔ غرض یہ مضمون الیا عام نہیں کہ زن نکاح اور زن متعہ دونوں کو شامل ہو اور تفریع فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ از قسم بیان احکام خاص بعد ذکر العام ہو۔

(استمتاع کا مفہوم و مطلب) ہزار افسوس علمائے شیعہ نے استمتعتم کی میم، تا، عین کو تو دیکھا پر سنہ دیکھا کہ اگر یہ کلمہ متعہ پر دلالت کرے گا تو یہ قصہ ایسا ہو جائے گا۔ جیسے کہا کرتے ہیں ہر بیاہ میں زیج کا لیکھا، اول کلام معارض کلام آخر، اور آخر معارض اوّل ہو جائیں گے۔ مگر ہاں شاید علماء شیعہ نعوذ باللہ نعوذ باللہ خدا کو بھی اپنی طرح دروغ گو سمجھتے ہیں۔ اور اپنی شرم اتارنے کو حافظ نباشد کا الزام خدا کے ذمہ لگاتے ہیں۔ سبحان اللہ اس خوش فہمی کے قربان جائیے کہ میم، تا، عین کے بھروسے سنیوں سے الجھنے کو تیار ہیں۔ اگر ان خرابیوں پر نظر نہ تھی جو مذکور ہوئیں تو معنی لغوی استمتاع کو دیکھا ہوتا کہ کیا ہے۔ بوستان گلستان کے پڑھنے والے بھی اتنا تو جانتے ہیں کہ یہ مادہ بمعنی انتفاع آتا ہے۔ بوستان کا یہ مصرعہ "تمتع زہر گوشہ یافتم" علماء شیعہ کو بھی یاد ہوگا۔ اور استاد کے بتلائے ہوئے معنی بھی محفوظ ہوں گے۔ اگر لغات عرب اور محاورات کلام اللہ سے جاہل تھے۔ تو گلستان بوستان تو عربی کی کتاب بھی نہ تھی۔ جیسے زبان اردو میں عربی فارسی وغیرہ الفاظ داخل ہو گئے ہیں ایسے ہی حضرت سعدیؒ کے زمانہ کی فارسی میں سینکڑوں الفاظ عربی داخل ہو گئے تھے منجملہ ان کے لفظ تمتع بھی تھا۔ اگر اسی قرینہ سے یہ سمجھ لیتے کہ لفظ استمتعتم بمعنی انتفعتم ہے تو کوئی بڑی بات نہ تھی مگر ہاں یوں کہیئے بھوکوں کو دو اور دو چار روٹیاں ہی سمجھ میں آتی ہیں جہاں میم، تا، عین ہو وہاں موافق آرزو پنہانی شیعوں کے مرد عورت کو متعہ سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ بات تھی تو اس مطلب کے لیے آیت فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَی الْحَجِّ زیادہ مناسب تھی اول تو الی الحج بیان مدت اور تحدید زمانہ کے لیے عمدہ ماخذ تھا کیونکہ آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ط میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو تحدید مدت پر دلالت کرے اور متعہ کے لیے وجہ ثبوت بن جاتی۔ اور اگر قرأت عبد اللہ بن مسعودؓ میں اِلٰی اَجَلٍ بھی ہے تو وہ مثل الی الحج متواتر نہیں بلکہ قرأۃ شاذہ میں سے ہے اور جب سنیوں کے نزدیک وہ قرأت شاذ ہوئی تو پھر اس کے بھروسے ان کا الزام دینا شیعوں کی غلط فہمی ہے۔

(شیعہ کے نزدیک متعہ نکاح سے افضل ہے) دوسرے نکاح اور متعہ میں اگر بظاہر ایک نوع کا تجانس ہے تو در حقیقت بون بعید اور فرق زمین و آسمان ہے۔

نکاح ایک ہو یا ہزار نہ حضرت امام الشہداء (در کربلا) امام حسین رضی اللہ عنہ کا رتبہ ملے نہ حضرت سبط اکبر رضی اللہ عنہ، کا درجہ میسر آئے نہ حضرت امیر رضی اللہ عنہ کا مقام حاصل ہو نہ حضرت سرور عالم صلعم

اللہ وعلی آلہ وسلّم کا منصب نصیب ہو۔ اور متعہ کا یہ رتبہ کہ ایک (مرتبہ) کرے حضرت سید الشہدا، امام حسین رضی اللہ عنہ کی مسند اڑائے اور دو کرے تو حضرت سبط اکبر کی گدی اڑائے اور تیسرا کرے تو پھر حضرت امیر رضی اللہ عنہ کی قدر و منزلت میں شریک ہو اور چوتھی میں تو خود حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سہیم ہو جائے۔[1] اور پھر قیاس کو دوڑائے تو حسب خیالات و افہام شیعہ پانچویں متعہ میں خدا بننے کی امید کا موقع ہے۔ ادھر غسل میں یہ پاکیزگی کہ ہر قطرہ خمیر یک ملک (فرشتہ) ہے جس کو سوا تسبیح و تقدیس ربانی اور کچھ کام نہ ہو۔[2] اس صورت میں متعہ کا نکاح کے ساتھ پیوند ایسا ہے جیسا خراب مرد بازاری سے تاج شاہانہ کو مسی دیجیے۔

---

[1] کتب شیعہ سے متعہ کے ان فضائل کا ثبوت موجود ہے۔ دیکھو شیعہ مفسر اپنی تفسیر منہج الصادقین میں نقل کرتا ہے "من تمتع مرۃ کان درجتہ کدرجۃ الحسین علیہ السلام ومن تمتع مرتین فدرجتہ کدرجۃ الحسن علیہ السلام ومن تمتع ثلاث مرات کان درجتہ کدرجۃ علی بن ابی طالب علیہ السلام ومن تمتع اربع مرات فدرجتہ کدرجتی یعنی ہر کہ یک بار متعہ کند درجہ او چوں درجہ حسین علیہ السلام باشد و ہر کہ دو بار متعہ کند درجہ او چوں درجہ حسن باشد و ہر کہ سہ بار متعہ کند درجہ او چوں درجہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام باشد و ہر کہ چہار بار متعہ کند درجہ او مانند درجہ من باشد۔ تفسیر منہج الصادقین ص ۴۹۳/۲ مطبوعہ تہران۔ ۱۲۔ محمد اشرف۔

[2] ہر کہ یکبار در مدت عمر خود متعہ کند از اہل بہشت باشد و ہر گاہ متمتع و متمتعہ باہم بنشینند فرشتہ بر ایشاں نازل گردد و حراست ایشاں کند تا آنکہ از آں مجلس برخیزند و اگر باہم سخن کنند سخن ایشاں ذکر و تسبیح باشد و چوں یکدیگر بوسہ دہند حق تعالیٰ بہر بوسہ حجی و عمرہ برائے ایشاں بنویسد و چوں خلوت کنند بہر لذتے و شہوتے حسنہ برائے ایشاں بنویسد مانند کوہہائے برافراشتہ، بعد ازاں فرمود کہ جبرئیل مرا گفت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ می فرماید کہ چوں متمتع و متمتعہ برخیزند و بغسل کردن مشغول شوند و بغسل در حالیکہ عالم باشد باآنکہ من پروردگار ایشانم گواہ شوید بر آنکہ من آمرزیدم ایشاں را و آب بر ہیچ موئے از بدن ایشاں نگذرد مگر کہ حق تعالیٰ بہر موئے دہ حسنہ برائے ایشاں بنویسد و دہ سیئہ محو کند و دہ درجہ رفع نماید۔ پس امیر المومنین علیہ السلام برخاست و گفت "انا مصدقک" من تصدیق کنندہ ام ترا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چیست جزائے کسے کہ در ایں باب سعی کند؟ فرمود "لہ اجرھما" مر او را باشد اجر متمتع و متمتعہ۔ گفت یا رسول اللہ اجر ایشاں چہ چیز است؟ فرمود چوں بغسل مشغول شوند بہر قطرۂ آب کہ از بدن ایشاں ساقط شود حق تعالیٰ فرشتہ بیافریند کہ تسبیح و تقدیس او بجا آرد کند و ثواب آں از برائے غاسل ذخیرہ باشد تا روز قیامت۔

(منہج الصادقین ص ۴۹۴/۲) ۱۲۔ محمد اشرف)

(ائمہ سے متعہ کے فضائل در اصل متعہ حج کے لیے ہیں)

ہاں اگر حج کعبہ سے متعہ کو جوڑیئے تو بروئے باطن تو یہ مناسبت کہ حج اگر موجب مغفرت معاصی ہے تو متعہ سرمایہ ترقی مدارج ہے وہ اگر عنوان محبت ہے تو یہاں مصداق محبوبیت ہے۔

تفصیل اس اجمال کی احکام حج اور فضائل متعہ سے عیاں ہے۔ احرام۔ سر و پا برہنہ نعرہ لبیک بر زبان حجر اسود کا بوسہ اور ملتزم کی ہم آغوشی اور کعبہ کا طواف اور کوچہ صفا میں مارے مارے پھرنا۔ رمی جمار، ناصح نادان کو سنگ باراں کرنا اور پھر آخر کار قربانی۔ یعنی جان و مال کو قربان کر دینا یہ سب عاشقوں کے کام ہیں اور مقامات حسنین رضی اللہ عنہما اور مناصب حضرت امیر رضی اللہ عنہ، اور مدارج حضرت بشیر و نذیر علیہ وعلی آلہ الصلوٰۃ والسلام میں سرمایہ محبوبیت ہے۔

ادھر نکاح میں بجز حصول اولاد یا قضائے شہوت اور کچھ منفعت دینی ہے نہ دنیوی اس لیے وہاں اگر مہر میں زخارف دنیوی مقرر کیے جائیں تو بجائے خود ہے۔ پر متعہ جیسی افضل العبادات کے اجر میں مال دنیا کا دینا لاریب موجب توہین ہے۔ ہاں جیسے نکاح میں باموالکم فرمایا ہے۔ متعہ میں اگر بالعمرۃ فرمائیں تو البتہ کچھ ٹھکانے کی بات ہے پھر اگر الی الحج کو غایت تمتع نہ کہیئے بلکہ بیان تحدید عوض متعہ ہو۔ یعنی عمرہ سے لے کر حج تک جو کچھ ثواب اور برکات میسر آئیں وہ سب اجر و مہر متعہ قرار دیا جائے اور تحدید مدت مثل لفظ استمتعتم لفظ تمتع کے مدلولات میں سے رکھئے تو گو تحدید مدت متعہ کہیں سے بتصریح ثابت نہ ہوگی اگر ہوگی تو بدلالت وضع مادہ متعہ ثابت ہوگی۔ مگر اس صورت میں فضیلت متعہ کی طرف زیادہ تر اشعار ہو جائے گا ادھر جزا فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ کی وجہ موجہ ہاتھ آ جائے گی یعنی در صورتیکہ اس متعہ کو جو آیت فَمَنْ تَمَتَّعَ میں اس کی طرف اشارہ ہے متعہ حج کہیئے جیسا تمام امت کہتی ہے۔ تو یہ حکم ہدی بوجہ شکر توفیق جمع عمرہ و حج سمجھا جاتا تھا اور جب اس متعہ کو متعہ زن قرار دیا جائے اور اس کے لیے اس قدر ثواب و مدارج تجویز کیے جائیں تو پھر بدرجہ اولی شکر مذکور لازم آئے گا کیونکہ اس صورت میں اپنی جان بھی قربان ہو جائے تو بجا ہے وصال جاناں اور رضائے جان آفریں دونوں موجود ہیں۔ بہرحال اگر یہی اٹکل بے جوڑ قصہ ہے تو مطلب براری شیعہ آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ سے اس قدر متصور نہیں جس قدر آیت فَمَنْ تَمَتَّعَ سے اس مطلب کے حصول کی امید ہے۔

(آیت تمتع حج کی طرح آیت فما استمتعتم سے بھی متعہ مراد لینا بالکل باطل ہے) ہاں اگر اس پر نظر ہے کہ کلام ربانی میں تحریف معنوی نہ ہونے پائے اور تعارض اوّل آخر کی نوبت نہ آئے بلاغت کلام ہاتھ سے نہ جائے اور حکمت عقلی قانون نقلی سے ٹکر نہ کھائے تو پھر نہ آئے فَمَنْ تَمَتَّعَ سے یہ مطلب نکل سکتا ہے اور نہ آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ سے یہ کام چلتا ہے آیت فَمَنْ تَمَتَّعَ میں بشہادت سیاق و سباق انتفاع دو عبادتوں سے ایک احرام میں مراد ہے۔ اور آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ میں انتفاع جماع و خلوت مقصود ہے یعنی اگر بعد نکاح خلوت صحیحہ کی نوبت آجائے تو پھر جتنا مہر مقرر ہو لیا ہے سارا کا سارا دینا آئے گا چنانچہ اُجُوْرَهُنَّ کے بعد لفظ فَرِيْضَةً اسی لیے بڑھایا ہے اور وجہ اس ارشاد کی یہ ہے کہ اگر بالفرض بعد نکاح قبل خلوت زن منکوحہ کو اس کا شوہر طلاق دیدے۔ تو موافق ارشاد آیت

وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ الخ (البقرہ پ۲ ۱۳)

(اور اگر طلاق دو ان کو ہاتھ لگانے سے پہلے اور ٹھہرا چکے تم ان کے لیے مہر تو لازم ہوا آدھا اس کا کہ تم مقرر کر چکے تھے)

آدھا مہر دینا آتا ہے سارا مہر واجب نہیں ہوتا۔ سارا مہر جبھی واجب ہوتا جب کہ خلوت صحیحہ بھی میسر آجائے۔

(قرأت شاذہ ابن مسعودؓ کا محمل) اس صورت میں قرأت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اسی مضمون کی مبین اور مفسر ہوگی اور یہ قاعدہ بھی درست رہے گا کہ قرأت شاذہ حکم تفاسیر رکھتی ہیں اور وجہ تفسیر کی خود ظاہر ہے کیونکہ اِلٰی اَجَلٍ غایت اِسْتَمْتَعْتُمْ ہوگی۔ سو اَجَلٍ منکر (نکرہ) کو غایت و نہایت استمتاع یعنی انتفاع خلوت رکھا جائے گا تو یہی معنی ہوں گے کہ کسی قدر مدت تک بھی نوبت استمتاع آگئی تو سارا ہی مہر لازم آئے گا۔ بالجملہ لفظ اَجَل بھی مثل زمانہ قلیل و کثیر پر بولا جاتا ہے۔ ایک ساعت قلیلہ سے کر زمانہ دراز تک کو اجل کہہ سکتے ہیں۔ سو قدر خلوت صحیحہ بھی ایک مصداق اِلٰی اَجَلٍ ہے۔ الغرض شیعہ اِلٰی اَجَلٍ کو انتہاء عقد سمجھ کر بہکے اگر انتہاء انتفاع سمجھ جاتے تو ساری باتیں ٹھکانے لگتیں۔ اور اس تجویز کی بھی نوبت نہ آتی کہ اِسْتَمْتَعْتُمْ میں تضمین معنی عقد کر کے اپنا کام بنایا معنی حقیقی استمتاع سے کام نہ چل سکا۔ الغرض اگر آیت استمتاع کو ماخذ حلت متعہ تجویز کیجیے تو اوّل تو معنی مجازی لیے

کی ضرورت یعنی تضمین معنیٔ عقد کیجیے تو کام چلے سو اس کے کلام اللہ کی بے ربطی۔ نظم قرآنی کی بے انتظامی آیت مُحْصِنِیْنَ اور آیت المُحْصَنٰتُ کے مخالف آیت نِسَاءُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ کے معارض علت تعدد ازواج زن واحد کو مستلزم۔ اتنی خرابیاں سر دھریے تو متعہ کے جواز کا آیت اِسْتَمْتَعْتُمْ سے نام لیجیے۔ سو یہ بات سوا شیعوں کے اور کس سے ہو سکے۔

(لفظ اُجُوْرَهُنَّ سے تعیین مدت کے بارے میں واقع ہونے والے شبہ کا جواب)

باقی وہ شبہ جو لفظ اُجُوْرَهُنَّ سے دوبارہ تعیین مدت واقع ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری آیت میں متصل ہی یوں ارشاد ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (پ۵ ع۱)

(اور جو کوئی نہ رکھے تم میں مقدور اس کا کہ نکاح میں لائے بیبیاں مسلمان تو نکاح کرے ان سے جو تمہارے ہاتھ کا مال ہیں جو تمہارے آپس کی لونڈیاں ہیں مسلمان اور اللہ کو خوب معلوم ہے تمہاری مسلمانی تم آپس میں ایک ہو سو ان سے نکاح کرو ان کے مالکوں کی اجازت سے اور دو ان کے مہر)

اس آیت میں بتصریح ذکر نکاح ہے اور پھر باایں ہمہ لفظ اُجُوْرَهُنَّ موجود ہے اور ظاہر ہے کہ نکاح و متعہ کی حقیقت میں تو یہی فرق ہے کہ متعہ میں مدت محدود ہوتی ہے نکاح میں مدت نکاح محدود نہیں ہوتی سو جس طرح یہاں لفظ اُجُوْرَهُنَّ مقتضی تحدید مدت نہیں ایسے ہی آیت استمتاع میں بھی سہی۔ علاوہ بریں عقد نکاح کو عقد بیع تو کہہ ہی نہیں سکتے اگر کہیں گے تو عقد اجارہ ہی کہیں گے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ متعہ کو تو سوا شیعہ اور کوئی جائز نہیں کہتا پر نکاح کے جواز میں کسی کو کلام ہی نہیں سو جب اس کو عقد اجارہ کہا اور مدت معین نہ ہوئی تو لفظ اُجُوْرَهُنَّ نہ شیعوں کو مفید ہوا نہ سنیوں کو مضر۔ بلکہ یہ شبہ الٹا شیعوں کو مضر پڑا۔ اس لیے کہ تصحیح متعہ کے پیچھے (لیے) نکاح متفق علیہ کا قصہ تمام غلط ہو گیا یعنی جب لفظ اجورھن اس بات کو مقتضی ہے کہ عقد مذکور عقد اجارہ ہو اور عقد اجارہ کو تعیین مدت اس صورت میں لازم ہوتی کہ تعیین کار کسی اور طرح نہ کیا گیا ہو۔ تو پھر اس صورت میں نکاح امام کا بطلان آپ ظاہر ہو گیا۔ لفظ اُجُوْرَهُنَّ موجود ہے۔ اس لیے ضرور ہے کہ عقد نکاح عقد اجارہ ہو اور بجز نکاح بعد۔ کار کی کوئی صورت نہیں تو اب بجز بطلان اور کیا ہو گا۔

(نکاح اور ملکِ یمین میں ملکِ اصلی ہے متعہ اور عاریت میں صرف اخذ منافع)

اور ہم سے پوچھیے تو تحقیقی بات یہ ہے کہ جیسے روشنی کی دو صورتیں ہیں۔ ایک ذاتی دوسری عرضی۔ یعنی ایک تو یہ کہ روشنی کہیں اور سے ماخوذ اور مستعار نہ ہو جیسے بظاہر نور آفتاب کا حال ہے۔ دوسرے یہ کہ کہیں اور سے ماخوذ ہو جیسے دھوپ کے وقت زمین کی روشنی۔ ایسے ہی ملک منافع کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ نوبت استعارہ نہ آئے جیسے اپنے ملک میں ہوتا ہے دوسرے یہ کہ کہیں اور سے حاصل کیجیے پھر اس کی بھی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ ملک منافع بعوض مال ہو جیسے اجارہ میں۔ دوسرے یہ کہ بے عوض ہو جیسے عاریت میں ہوتا ہے۔ بہرحال ملک منافع جو بطور اخذ و استعارہ ہو اس کے لیے ماخذ اور معیر کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے روشنی ماخوذ کے لیے ماخذ کی ضرورت ہوتی ہے سو جیسے منافع ماخوذ آخذ کی ملک ہو جاتے ہیں۔ ماخذ منافع معطی کی ملک ہوتا ہے۔ اس تحقیق کے بعد گذارش یہ ہے کہ متعہ میں تو مرد آخذ منافع بعوض ہوتا ہے اور نکاح میں مرد مالک ماخذ ہوتا ہے۔ سو جیسے اپنی باندی غلام سے انتفاع بوسیلہ ملک ماخذ ہے بوجہ اخذ منافع نہیں اور دوسرے کی غلام سے انتفاع یا کسی اور محسن یا اجیر سے انتفاع بوجہ اخذ منافع ہے بوسیلہ ملک ماخذ نہیں اور اس لیے احسان و اجارہ میں بعد مرور وقت انتفاع یعنی احسان و اجارہ ملک خود بخود منقطع ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی باندی غلام کے منافع کی ملک بعد مرور وقت انتفاع بھی باقی رہتی ہے۔ البتہ بوجہ اعتاق یعنی ازالہ ملک ماخذ منافع ملک زائل ہو جاتے ہیں ایسے ہی اپنی زوجہ منکوحہ سے انتفاع بوسیلہ ملک ماخذ ہے اخذ منافع نہیں۔

(متعہ میں طلاق اور اعتاق نہیں ہوتا)

اور یہی وجہ ہے کہ بعد مرور وقت انتفاع بھی، ملک اور اختیار انتفاع باقی رہتا ہے۔ مرور وقت انتفاع سے ملک زائل نہیں ہوتی طلاق یعنی ازالہ ملک ماخذِ منافع سے ملک منافع زائل ہو جاتی ہے اور زن متعہ سے انتفاع بطور اخذ منافع ہے اس لیے زوالِ وقت، موجب زوال ملک و زوال اختیار انتفاع ہو جاتا ہے۔ طلاق کی حاجت نہیں۔ اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ متعہ میں طلاق کیوں نہیں ہوتی اور نکاح میں کیوں ہوتی ہے۔ القصہ جیسے ملک یمین کے لیے اعتاق ہے ملک اجارہ کے لیے نہیں ایسے ہی ملک ماخذ منافع زن کے لیے طلاق ہے ملک منافع یعنی اجارہ متعہ کے لیے نہیں بہرحال جیسے ملک یمین میں انتفاع کے لیے کوئی مدت معین اور محدود نہیں ہوتی ایسے ہی ملک ماخذ منافع میں بھی انتفاع کے لیے کوئی وقت

معین نہیں ہوتا۔

(متعہ و نکاح میں بیع کا شبہ بھی باطل ہے) ہاں یہ شبہ باقی رہا کہ اگر یہی ملک ماخذ اور تناسب طلاق وعتاق ہے تو یوں کہو کہ نکاح میں عورت اپنے آپ کو یا کسی عضو خاص کو شوہر کے ہاتھ بیع کر دیتی ہے سو اول تو احرار و حرائر کی بیع یا ان کے اعضاء کی بیع درست نہیں نہ خود ان کو نہ کسی اور کو کیونکہ حر و حرہ کسی کے مملوک نہیں ہوتے نہ اپنے نہ کسی بیگانہ کے اور بفرض محال ہوتے بھی تو اپنے تو ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ مالک اور مملوک اور بائع اور مبیع میں تقابل و تضایف ہے۔ اور متضایفین میں تغایر ضرور ہے اتحاد متصور نہیں چنانچہ مفہوم مالک و مملوک و بائع و مبیع بشہادت وجدان بھی ہر خاص و عام کے نزدیک تغایر پر دلالت کرتا ہے۔

(منکوحہ میں بیع و شراء ہبہ اور عاریت کے اختیارات کیوں نہیں ہیں[1]) دوسرے اگر اس صورت میں مہر کو ثمن و قیمت کہنا تھا اجر کیوں فرمایا علاوہ بریں بیع و شراء اور ہبہ اور عاریت کا اختیار کیوں نہیں اس کا جواب ایک مقدمہ لطیفہ پر موقوف ہے اول اس کا عرض کرنا ضرور ہے۔

(مقدمہ لطیفہ تمام اشیاء میں قبضہ ہی سے ملک تام حاصل ہوتا ہے) علت[2] ملک قبضہ ہے سوا اس کے اور کوئی امر موجب ملک نہیں اموال منقولہ و غیر منقولہ اول اگر مملوک ہوتے ہیں تو اسی قبضہ کے بدولت ہوتے ہیں جانوران وحشی اور نباتات خود روئیدہ اور آب چاہ و دریا کے مملوک ہونے کا طریقہ بجز قبض اور کچھ نہیں۔

(اسباب معروفہ بیع و شراء وغیرہ انتقال ملک کا سبب ہیں نہ کہ حدوث ملک کا) باقی رہی بیع و شراء و ہبہ اجارہ وصیت میراث اسباب معروفہ، اسباب انتقال ملک ہیں، اسباب حدوث ملک نہیں یعنی ملک موجود ایک جا سے دوسری جا چلی جاتی ہے یہ نہیں کہ پہلی ملک کا نام و نشان کچھ نہ تھا اسباب مذکورہ کے سبب از سر نو حادث ہو جاتی ہے بایں ہمہ ان اسباب میں بھی قبض کی ضرورت

---

[1] اس سوال کا جواب ص۲۴۵ پر موجود ہے۔ ۱۲۔ [2] ان عبارات کا حاصل یہ ہے کہ منکوحہ میں اسباب معروفہ بیع و شراء وغیرہ نہیں پائے جاتے پھر یہ اسباب انتقال ملک کا سبب ہیں۔ حدوث ملک کا سبب نہیں جیسا کہ بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے۔ ۱۲ محمد عیسیٰ گورمانی۔

حصول ملک کے لیے اہل فہم پر مخفی نہیں قبل قبض جو بیع مبیع مشتری کو ممنوع ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ملک قبض ہی سے حاصل ہوتی ہے قبل قبض حاصل نہیں ہوتی پھر بیع کس چیز کی کی جائے بیع مالا یملک نہ نقلاً درست ہے چنانچہ احادیث صحیحہ اس پر شاہد ہیں۔ اور نہ عقلاً زیبا اس لیے کہ بیع میں مبادلہ ملک بالملک ہوتا ہے۔ جب ملک ہی نہیں تو مبادلہ کیونکر ہو سکے اور اگر قبل قبض مبیع ملک پیدا ہو جاتی ہے تو پھر ممانعت کی کیا وجہ تھی ارکان بیع سارے موجود بائع موجود مشتری موجود۔ مبیع موجود۔ ثمن موجود۔

(حرمت ربا کی وجہ یہ ہے کہ ربا میں ایک طرف سے عوض ملک نہیں پایا جاتا)

اگر صورت ربا ہوتی تو یوں بھی کہہ سکتے تھے کہ اگر فرض کرو سیر بھر گیہوں کو سوا سیر گیہوں سے مثلاً فروخت کریں گے تو پاؤ سیر کے مقابلہ میں کچھ نہ ہوگا۔ اس صورت میں اس کو مبیع کہو گے تو ثمن ندارد ہے اور ثمن کہو گے تو مبیع نیست و نابود ہے اور پورے سوا سیر کو سیر کے مقابل نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ جس صورت میں جنس واحد ہے تو موجبات رغبت دونوں طرف برابر ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ ایک طرف سیر بھر ہو اور ایک طرف زیادہ اس لیے عدالت خداوندی اس بات کو مقتضی ہوئی کہ اتحاد جنس کی صورت میں مقدار میں کمی بیشی نہ کی جائے۔ ہاں در صورت اختلاف جنس بجز تساوی وزن و پیمانہ رغبت کی اور کوئی صورت نہ تھی۔ اس لیے وہاں اجازت دی گئی۔ اور اگر کسی صاحب کو رضا طرفین کے سبب کچھ تامل ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ تراضی بہ نیت ثواب و مواسات ہو گی تو وہ معاملہ بیع نہیں قدر زائد کو ہبہ سمجھو اور اگر بنظر عوض مال ہے تو کوئی صاحب فرمائیں قدر زائد کے عوض میں کیا ہے۔

(بیوع فاسدہ میں بھی ربا ہے)

علی ہذا القیاس بیوع فاسدہ کو سمجھو کیونکہ وہاں بھی علاوہ متقابلین ایک طرف کچھ اور بھی مشروط ہوتا ہے مثلاً گھوڑا، بھینس، گائے، مکان کی کسی قدر روپوں کے عوض بیع کر کے بائع یہ شرط لگائے کہ ایک ماہ تک مثلاً میں قبضہ نہ دوں گا اپنے ہی قبضہ میں رکھوں گا۔ سو یہ ایک مہینہ کے منافع بے عوض بائع کو حاصل ہوں گے کیونکہ جب بیع واقع ہو چکی تو اب مبیع کو بائع سے کیا علاقہ وہ مشتری کے باپ دادے کی ہو چکی اس کے منافع میں بائع کا استحقاق منجملہ محالات ہے اس لیے بناچاری ان منافع کو بلا عوض کہنا پڑے گا اور اگر فرض کرو بیع ابھی ہوئی ہی نہیں تو مشتری کو دعوے استحقاق جیسا اب ناروا ہے ایسا ہی بعد ماہ بھی ناروا ہوگا بالجملہ بیوع فاسدہ اور معاملات سود کے ممانعت کی ایک ہی وجہ ہے۔ قدر زائد اور شرط زائد میں ارکان بیع و اجارہ سارے موجود نہیں ہوتے۔

اگر مبیع یا منافع عقد اجارہ کہو گے تو ثمن و اجرت کا پتہ نہیں ثمن و اجرت کہو گے تو مبیع و منافع کا نشان نہیں غرض بیع فاسد میں وہ بیع سود ہو یا کچھ اور ظاہر میں ایک ہوتی ہے۔ اور کہنے کو ایک معاملہ ہوتا ہے پر حقیقت میں ایک تو بیع صحیح ہوتی ہے اور ایک بیع باطل اس کے ساتھ اور لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یعنی وہ معاملہ لگا ہوتا ہے جس کے تمام ارکان موجود نہیں ہوتے اگر ہوتے ہیں تو بعضے موجود ہوتے ہیں بعضے نہیں ہوتے سو بیع قبل القبض کو اگر موجب ملک کہا جائے تو پھر کون سا رکن بیع مفقود ہو گیا ہے جو اس کو ممنوع کیئے بلکہ معاملہ بیع موجب استحقاق قبض ہو جاتا ہے اور قبض موجب ملک علی ہذا القیاس ہبہ کو سمجھو فرق ہو گا۔ تو اتنا ہو گا کہ کسی کے نزدیک مثل بیع قبضہ مشاع بھی موجب ملک سمجھا جائے اور کسی کے نزدیک قبضہ مشاع کافی نہ ہو بلکہ باین نظر کہ اشتراک کے لیے تساوی مراتب ضرور ہے ورنہ مالک اور مستعیر اور خدائے مالک الملک اور بندگان مالک و قابض اموال شریک دیگر سمجھے جاتے تقسیم کی ضرورت پڑی تاکہ موہوب کے لیے کوئی مزاحم باقی نہ رہے ورنہ اشتراک باوجود عدم تساوی مراتب قبضہ جملہ قابضان لازم آئے گا۔

(اجارہ عاریت، میراث اور وصیت میں بھی قبضہ پایا جاتا ہے)

جب بیع اور ہبہ کا حال معلوم ہو گیا تو اجارہ اور عاریت کے حال کی تحقیق کی کچھ ضرورت نہیں کیونکہ یہاں بعینہ وہی معاملہ ہے جو وہاں ہے یعنی اجارہ میں بیع منافع ہوتی ہے اور عاریت میں ہبہ منافع فقط۔ نوع مبیع اور نوع موہوب جدا جدا ہے۔ ہاں میراث اور وصیّت باقی ہیں۔ سو ان میں بظاہر اگرچہ حصول ملک کے لیے قبض کی ضرورت نہیں پر غور سے دیکھئے تو وہاں بمجرد موت مورث موصی قبضہ ذات وارث و موصی لہٗ حاصل ہو جاتا ہے کیونکہ قابض اول کا قبضہ تو گیا خود ہی اٹھ گیا اور کوئی مزاحم حال نہیں، حاکم سب کا وکیل، اور اس کا قبضہ موجود، اور ظاہر ہے کہ قبضہ وکیل وہ قبضہ موکل ہی ہوتا ہے۔ بالجملہ حاکم بوجہ حکم خداوندی وارث اور موصی لہٗ کے دلانے کو موجود۔ اور کوئی دعویٰ استحقاق نہیں رکھتا۔ ہاں بیع و ہبہ میں قبضہ بائع و واہب ہنوز موجود ہے جب تک اس کا قبضہ باقی ہے۔ مشتری اور موہوب لہٗ کا قبضہ ممکن نہیں۔

(مال غنیمت میں بھی قبضہ علت ملک ہے)

القصہ تمام احکام و آثار ملک۔ قبضہ کے علت ملک ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ احراز کا ملک غنیمت کے لیے مشروط ہونا اور قبضہ کفار کا رافع ملک اہل اسلام ہو جانا ہے۔ اسی جانب مشیر ہے۔ ہاں اتنا فرق ہے کہ کسی کے نزدیک بعد غلبہ کفار اگر بھ

اہل اسلام مسلط ہوجائیں تو ملک سابق اہل اسلام عود نہیں کرتی بعض اموال مقبوضہ ملک مالکان سابق نہیں ہوجاتے بلکہ حسب قانون غنیمت تقسیم کیے جائیں گے اور بعضے علماء کے نزدیک وہ ملک سابق پھر عود کر آتی ہے۔ جیسے برودت آب بعد زوال حرارت پھر عود کر آتی ہے بالجملہ جس طرف سے دیکھئے قبض ہی کا موجب ملک ہونا نکلتا ہے تمام احکام دین اور اقوال علماء دین اس پر شاہد ہیں۔

(بدن کے واسطے سے اموال پر روح کا قبضہ ہوتا ہے اور مرنے سے بوجہ اٹھ جانے قبضہ کے ملک چلی جاتی ہے) اس صورت میں بدن انسانی کا مملوک روح انسانی ہونا ضروری التسلیم ٹھہرا کیونکہ روح انسانی کا اپنے بدن پر قبضہ بدیہی (ہے) اگر ہاتھ کو اشارہ کرتی ہے تو وہ ہلتا ہے اور پاؤں کو اشارہ ہوتا ہے تو وہ چلتا ہے۔ آنکھ۔ کان سب اسی کے زیر فرمان ہیں اسی کے احکام کی بجا آوری میں شب و روز مشغول ہیں۔ بلکہ قبضہ روح جو اور اشیاء پر ہوتا ہے اس کے لیے قبض علی البدن شرط ہے یعنی جب تک روح کا قبضہ بدن پر نہ ہو چکے تب تلک کسی چیز پر قبضہ روح نہیں ہو سکتا اس سے زیادہ اور کیا تصرف ہو گا جس کا تحقیق قبضہ کے لیے انتظار ہے ادھر بدن انسانی کا قابل الملک ہونا اور روح کا لائق ملکیت ہونا ایسا نہیں جو گنجائش انکار ہو اگر روح لیاقت مالکیت نہ رکھتی تو کسی چیز کی نسبت مالکیت متحقق نہ ہو سکتی۔ اموال منقولہ و غیر منقولہ سب آزاد ہی رہتے اس لیے کہ سوا روح اور ہے تو بدن ہے اور بدن کا حال ظاہر ہے کہ وہ تنہا مالک تو کیا مملوک ہونے کے قابل نہیں۔ القصہ بعد انتقال وانفکاک روح۔ بدن جوں کا توں رہتا ہے۔ اگر مالک خود بدن ہوا کرتا تو نہ صرف مورث کی ملک زائل ہوتی اور نہ وارث کی ملک اس کے قائم مقام ہو سکتی مالکیت روح ہی کے متعلق تھی مگر چونکہ سرمایہ ملک وہ قبضہ ہے اور اموال پر قبضہ بوسیلہ بدن تھا اور وقت انتقال۔ بدن سے قبضہ اٹھ گیا تو اموال سے بھی قبضہ اٹھ گیا۔ بالجملہ روح کا مالک اور لائق مالکیت ہونا ایسا نہیں کہ انکار ہو سکے۔

(بدن کے مملوک ہونے کی پہلی دلیل) رہا بدن اس کا مملوک ہونا اول تو اسی سے ظاہر ہے کہ ملک یمین اس دین کے مسلّمات میں سے ہے۔

(دوسری دلیل) دوسرے مملوک ہونے کے لیے مالیت شرط ہے اور مالیت کے لیے میلان خاطر ضرور ہے غرض مال اس میلان ہی سے مشتق ہے اور موجب میلان طبائع سلیمہ بھی منافع ہوتے ہیں

(خمر، خنزیر اور میتہ وغیرہ ناپاک اشیا غیر نافع ہونیکی وجہ سے مسلمان کی ملکیت نہیں بن سکتے)

یہی وجہ ہے کہ میتہ اور دم اور ناپاکی کو مال نہیں کہتے اور ان کی بیع کو باطل کہتے ہیں کیونکہ بیع میں بھی مبادلہ مال بالمال ہوتا ہے جب ان اشیاء میں منافع ہی نہیں تو مال بھی نہیں کہہ سکتے۔

علیٰ ہٰذا القیاس خمر و خنزیر میں اگرچہ منافع موجود ہیں مگر مسلمان کے حق میں خمر و خنزیر نافع نہیں بلکہ ایسے مضر ہیں جیسے سمیات اگرچہ کسی نہ کسی بات میں نافع ہیں لیکن مزاج انسانی کے لیے مضر ہیں بالجملہ مدار ملکیت مالیت پر ہے اور مدار مالیت منافع پر ہے اور ظاہر ہے کہ منافع بدن انسانی منافع ابدان دیگر سے بدرجہا زیادہ ہیں۔ اس کے صنائع و بدائع ایسے نہیں جو کوئی نہ جانتا ہو۔ اس صورت میں بدن انسانی کو اسی روح کا مملوک کہنا جو اس پر قابض ہے اور متصرف ہے اور حاکم اور بادشاہ ہے ہر عاقل کے ذمہ ضرور ہے۔ ہاں اتنی بات ہے کہ جیسے مملوکات خداوندی قابل بیع و ہبہ و میراث نہیں ایسے ہی بدن انسانی بھی قابل بیع وغیرہ نہیں۔ علاوہ بریں جیسے چھت کی کڑی کا بیچنا قبل انفصال ناجائز حالانکہ اس کا مملوک ہونا بدیہی اسی طرح باوجود مالکیت و مملوکیت بیع بدن قبل انفصال روح تو اس لیے ناجائز ہے کہ قبضہ مشتری متصور نہیں اور بعد انفصال اس لیے جائز نہیں کہ اوّل تو اختیار بیع مالک کو ہوتا ہے مالک وہ روح تھی سو وہ اور عالم کو چل دی۔ دوسرے معنی مالیت بعد انفصال روح باقی نہ رہے کیونکہ اس وقت بدن انسانی ایک میتہ اور جیفہ ہے اور میتہ اور جیفہ کو مال نہیں کہہ سکتے کیونکہ اب کوئی منفعت اس میں باقی نہ رہی۔

(بدن اور روح کے تعلق کی مثال) بالجملہ جب تک بدن میں پرتو روح اور اثر روحانیت ایسی طرح موجود تھا جیسے زمین میں دھوپ کے وقت پرتو آفتاب اور اثر آفتاب ہوتا ہے تب تک اس میں منافع حیات موجود تھے۔ بعد موت نہ اثر روحانیت یعنی حیات رہا نہ وہ منافع باقی رہے مگر ہاں اگر بوجہ کفر موافق اشارہ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ کوئی شخص ملحق بالحیوانات ہو جائے اور اس لیے داخل حبالۂ ملک اہل ایمان ہو تو گو تنہا بدن ان کے حق میں بھی نافع نہیں۔ مگر جیسے اور حیوانات سے بوسیلہ پرتو روحانی انتفاع ممکن ہے۔ یہاں بھی ممکن ہے۔ اور یہ بات اگرچہ اپنے بدن کی بیع و شراء میں کبھی خیال میں آسکتی ہے۔ لیکن جب اس بات کا لحاظ کیجیے کہ در صورت بیع خود روح بائع ہوگی اور ظاہر ہے کہ مبیع غیر بائع ہوتی ہے کیونکہ بیع ایک مفہوم اضافی

ہے ۔ جس کی ایک جانب بائع ہے اور ایک طرف مبیع اور یہ دونوں متحد نہیں ہو سکتے ورنہ حاشیتین اضافت کا تغایر [illegible] ہی اور ضروری ہے محض غلط ہو جائے اس لیے خود روح تو مبیع بن نہیں سکتی پھر اگر روح کی امداد مشروط ہے تو وہی فساد اور بطلان مشار الیہ لازم آئے گا اور امداد مشروط نہ ہو اور بجبر کام لیا جائے تو ظلم صریح کا فتویٰ دینا پڑے گا۔

(روح کفار پر بوجہ جائز ہونے جبر کے غلام اور باندی میں ملک آجاتا ہے)

اور جہاد میں بیع نہیں ہوتی جو فساد و بطلان کا اندیشہ ہو ظلم کا کھٹکا فضیلت جہاد نے رفع کر دیا غرض جیسے شگاف دنبل اور قطع عضو بوسیدہ اور ریم خوردہ نہ دنبل و عضو کے حق میں ظلم ہے نہ صاحب دنبل و عضو کے حق میں، بلکہ صاحب دنبل و عضو کے حق میں احسان ہے ظلم نہیں ایسے ہی قتل و قمع کفار نہ ان کے حق میں ظلم نہ اور عالم ——— کے حق میں ظلم ہے بلکہ اور عالم کے حق میں احسان ہے اس لیے وہاں اگر روح کفار پر جبر کیا جائے تو بدرجہ اولیٰ جائز اور بجائے خود ہوگا۔ آئندہ بعد اسلام غلام یا اس کا آزاد نہ ہو جانا اگر کسی کو موجب تامل ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو حق ملک یقینی اور اسلام میں یہ احتمال کہ بغرض عتق ہو۔ اور امر یقینی امر محتمل سے حقوق غیر میں مرتفع نہیں کر سکتی دوسرے اسلام ضد کفر ہے ضد رقیب نہیں جو بے رفع کئے مرتفع ہو جائے جیسے کفر خود ضد عتق نہ تھا جو بے مملوک بنائے یعنی بے قبضہ کئے کافر مملوک ہو جائے ایسے ہی اسلام ضد مملوکیت نہیں جو بے رفع کیے مرتفع ہو جائے یعنی بے آزاد کئے آزاد ہو جائے۔ ہاں جیسے کفر موجب قبول ملک ہے اور یہی وجہ ہوئی کہ قتل و سلب و قبض جان و مال کی ترغیب دی گئی۔ ایسے ہی اسلام میں ضعف قبول مذکور آجاتا ہے اس لیے اعتاق کی ترغیب دی گئی۔ اور اس تقریر سے حقیقت معاملہ کتابت جو مکاتب کے ساتھ ہوتا ہے معلوم ہو گئی ہو گی۔

(کتابت میں مملوک اپنے آپ کو خرید لیتا ہے)

غرض یہ ہے کہ معاملہ کتابت میں مالک کی جانب سے بیع اور مکاتب کی جانب سے شراء بدن خود ہوتا ہے مگر چونکہ موانع مذکورہ میں سے یہاں سب مفقود ہیں تو بجز جواز معاملہ اور کوئی حکم نہ آیا۔

بالجملہ روح انسانی اس بدن کی ضرور مالک ہوتی ہے جس کے ساتھ اس کو تعلق حاصل ہے اور جب مالکیت اور مملوکیت متحقق ہو گئی تو اس وجہ سے تو اس بیع میں تامل زیبا نہیں جو تحقیق حقیقت

نکاح مفہوم ہوتی ہے۔ ہاں کوئی اور وجہ ہو تو مضائقہ نہیں سو اور کوئی وجہ اگر متصور تھی تو وہی عدم امکان قبضہ تھا وہ بھی غور سے دیکھا جائے تو یہاں مفقود ہے کیونکہ کل بدن کی بیع میں تو بوجہ عدم امکان قبضہ جس کی تشریح بقدر کفایت ہو چکی ممانعت کی گئی تھی بوجہ عدم مالکیت و مملوکیت نہیں کی گئی تھی۔ رہی حریت وہ اصل میں صفت روحانی تھی صفت جسمانی نہ تھی بلکہ جسم تو مملوک روح تھا اور روح احرار کسی کی ملک نہ تھی۔ اس لیے بیع ارواح تو بوجہ حریت ممنوع تھی اور بیع اجسام خود روح کو تو بوجہ عدم امکان قبضہ اور سوا اس کے اوروں کو بوجہ ملک غیر ممنوع ہوئی۔ ہاں جب بوجہ کفر۔ کفار کے اموال کی اجازت ہوئی اور ان پر جبر و تعدی جائز ہوا تو بدن مملوک روح پر تو قبضہ اور خود روح پر دوبارہ اعمال جسمانی جبر میں کچھ حرج نظر نہ آیا بلکہ ملازمان خاص یعنی اہل ایمان کی کار برآری کے لیے مثل قبضہ و اکراہ حیوانات قبض و اکراہ کفار کی اجازت دی گئی۔ الغرض بیع اجسام احرار بوجہ عدم مملوکیت ممنوع نہ تھی بوجہ عدم امکان قبضہ یہ بیع ممنوع تھی مگر نکاح میں یہ قبضہ بے ظلم و جبر برضاء و رغبت بائع یعنی زن منکوحہ متصور ہے چنانچہ ظاہر ہے۔

(احرار کے اجسام کی بیع بوجہ تذلیل جائز نہیں) ہاں اگر احرار کو خصوصاً مردوں کو اوروں کی خدمت گاری ایسی طرح مرغوب ہوتی جیسے عورت کو خدمت فراش یعنی جماع مرغوب ہے تو پھر علی العموم بیع ابدان احرار جائز ہو جاتی۔ مگر یوں دیکھا کہ ارواح احرار کو اوروں کی خدمت مرغوب تو کیا ہو گی ایسی مکروہ ہے کہ اس کے برابر دنیا میں کوئی مکروہ ہی نہیں۔ اگرچہ بوجہ طمع یا اندیشہ نوبت اضطرار نہ پہنچے یا امید رضائے خدا تعالیٰ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معارض نہ ہوں تو پھر اہل ہمت کو نفس خدمت گذاری سے مرگ بہتر ہے کیونکہ اس میں ہتک عزت ہے اور عزت کے پیچھے ہی اکثر جانیں جاتی ہیں۔ بادشاہوں کی لڑائی بھوک و پیاس کے تقاضے سے نہیں عزت ہی کے لیے ہے وقت غیرت مردوں کا زہر کھا لینا اور گولی کھا کر مر جانا اس عزت ہی کی بدولت ہے بلکہ عورتیں جن کا خوف و جبن ان کی حب زندگانی پر گواہ ہے غیرت کے وقت ڈوب کر مر جاتی ہیں تو اس عزت کی محبت میں مر جاتی ہیں اس صورت میں اگر بالفرض بیع ابدان ارواح کو جائز ہوتی تو اس بیع کے سبب وہ ذلت اٹھانی پڑتی کہ خدا کی پناہ القصہ عزت کے برابر بندوں کے نزدیک کوئی چیز نہیں بلکہ بندے کیا خدا کے یہاں بھی اگر پوچھ بھی ہے تو اسی کی ہے۔ وہاں بھی اگر مطلوب ہے تو یہی عزت مطلوب ہے۔ چنانچہ آیت

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔ (اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو) اور آیت وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ۔ (اور ان کو حکم یہی ہوا کہ بندگی کریں اللہ کی خالص کر کے اس کے واسطے بندگی۔)

اسی حصر طلب پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ تعبد اسی تذلل کو کہتے ہیں اور تذلل میں بھی (خدا کے آگے) صرف عزت ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ ادھر اور نعمتوں کی داد و دہش کے لیے مخلوقات کو رکھا اور عزت کا مصرف کسی اور کو نہ بنایا بلکہ اوروں کے لیے صرف عزت سے مطلقاً منع فرمایا۔

(خدا نے تمام قوتوں کو مخلوق کے لیے صرف کرنے کا حکم دیا ہے لیکن عزت کو اپنے لیے مخصوص کر دیا)

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نعماءِ داخلی ہوں جیسے ہاتھ پاؤں آنکھ ناک یا نعماءِ خارجی جیسے روپیہ روٹی کپڑا خدا کے کسی مصرف کا نہیں اس کی اگر ضرورت ہے تو مخلوقات ہی کو ہے ہاں بایں نظر کہ حوائج ضروریہ سد باب عبادت اور نیز موانع ہر کار ہیں کھانے پینے کو سامان عبادت کہیے اور ہاتھ پاؤں کی عبادت کو رفع موانع قرار دیجیے تو پھر اس داد و دہش اور اس امداد کو خدا ہی [illegible] ہیں لے بہر حال صرف نعماء خارجی و داخلی سوا نعمت عزت، مخلوقات کے لیے تجویز کیا اور اس پر کیا کیا ثواب عنایت فرمایا۔ مگر ہاں عزت بنی آدم خاص اپنے لیے رکھی یہاں تک کہ سوال سے منع فرمایا اور وجہ اس اختصاص کی یہ ہوئی کہ عزت کے لیے استغناء کی ضرورت ہے اور ذلت کے لیے احتیاج کی حاجت اور استغناء اس سے زیادہ متصور نہیں کہ سب خوبیاں موجود ہوں اور ذلت اس سے زیادہ ممکن نہیں کہ ہر خوبی میں دوسرے کا محتاج۔ سو در صورتیکہ خدائے تعالیٰ اور بندہ ناکارہ میں یہ فرق ہو تو پھر جس کے محتاج ہوں وہی عزت کا مستحق ہے سوا اس کے اور کسی کے سامنے ذلیل نہ ہونا چاہیے یا یوں کہیے خدا تعالیٰ کے خزانہ میں سب کچھ ہے ایک عجز و نیاز ہی نہیں اسی کی طلب گاری ہے اس لیے جتنا عجز و نیاز بن پڑے اسی کے سامنے بجا لانا چاہیے اور کسی کے لیے سر جھکانا اور گڑگڑانا نہ چاہیے بالجملہ عزت سے بہتر کوئی چیز نہیں خدا کے یہاں بھی اسی کی پوچھ پاچھ ہے اس لیے بیع بدن تو ممنوع رہی کیونکہ ذلت خدمت گاری کے برابر کوئی چیز بری اور نامطبوع نہیں اور اس کا لزوم بیع میں ضروری۔ اور اس کے ساتھ کوئی لذت یا منفعت ایسی نہیں کہ اس کی لذت کی مکافات ہو جاوے اور نکاح میں جو چیز لازم آتی ہے وہ بائع یعنی زن منکوحہ کے حق میں ایسی مطبوع کہ اس کے پیتے (لیئے) عزت جیسی عزیز چیز

بھی لبا اوقات خاک میں رل جاتی ہے علاوہ بریں جیسے مافی الارض بشہادت۔

آیت۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ (بقرہ ع ۳)

(وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے واسطے جو کچھ زمین میں ہے سب پھر قصد کیا آسمان کی طرف سو ٹھیک کر دیا ان کو سات آسمان)

زمین و آسمان خصوصاً ارض و مافیہا بنی آدم کے لیے مخلوق ہوا۔ ایسے ہی بشہادت

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً (روم ع ۳)

(اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ کہ بنا دیے تمہارے واسطے تمہاری قسم سے جوڑے کہ چین سے رہو ان کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ پیار اور مہربانی)

عورتیں مردوں کے لیے مخلوق ہیں اس لیے کہ بقرینہ آیت۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ إِلَيْهَا (اعراف ع ۲۴)

(وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ایک جان سے اور اسی نے بنایا اس کا جوڑا تاکہ اس کے پاس آرام پکڑے)

ازواج سے آیت مذکورہ میں عورتیں ہی مراد ہیں۔

(عورتیں مردوں کے لیے پیدا کی گئیں ہیں) ادھر عقل صائب کا بھی یہی فتویٰ ہے کہ عورتیں مردوں کے لیے مخلوق ہیں مرد عورتوں کے لیے مخلوق نہیں ہوئے وجہ اس کی یہ ہے کہ عورت کا جی چاہے یا نہ چاہے مرد اس سے کامیاب ہو سکتا ہے اور مرد کو اگر رغبت نہ ہو تو پھر عورت کی آرزو پوری نہیں ہو سکتی اس صورت میں عورت کو ایسا سمجھو جیسا فرض کرو کسی گھوڑے کو مثلاً یہ آرزو ہو کہ مجھ پر فلاں شخص سوار ہو جیسی آرزوئے براق بہ نسبت سواری حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مشہور ہے یا فرض کرو طعام و شراب وغیرہ نعما، ارضی کو یہ تمنا ہو کہ ہم کو فلاں شخص استعمال کرے اس صورت میں جیسے آرزوئے اسپ وغیرہ نعماء کا حصول ہی استعمال کرنے والوں کی مرضی پر موقوف ہے اور بنی آدم کا استعمال کرنا ان اشیاء کی مرضی پر موقوف نہیں۔ ایسے ہی کامیابی زن و مرد ہے۔ عورت کو رغبت ہو کہ نہ ہو مرد اپنی آرزو پوری کر سکتا ہے اور مرد کا اگر جی راغب نہ ہو تو عورت سے کچھ نہیں ہو سکتا پھر نسبر جیسے نعماء دنیوی کو اپنے منافع سے کچھ مفاد نہیں اگر ہے تو استعمال کرنے والوں کو مفاد ہے

یہ ایسے ہی عورت کے منافع معلومہ سے خود عورت کو کچھ مفاد نہیں البتہ مرد کو اس کے منافع سے مفاد ہے یعنی اولاد جو اس زراعت اور اس زمین کی پیداوار ہے۔ عورت کے ذریعے سے خداوند عالم مرد کو عنایت کرتا ہے عورت کو اس سے کچھ علاقہ نہیں چنانچہ کلمہ قرآنی یعنی اَلْمَوْلُوْدِ لَہٗ اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اَنْتَ وَمَالُكَ لِاَبِيْكَ اسی جانب مشیر ہے کہ اگر اولاد کی نسبت کچھ شائبہ مالکیت ہے تو والد کو ہے والدہ کو نہیں اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ سلسلہ نسب والد کی طرف کو چلتا ہے اور اسی سے متعلق ہوتا ہے والدہ کی طرف کو نہیں چلتا اور نہ اس سے متعلق ہوتا ہے چنانچہ تمام عالم۔ تمام اقوام۔ تمام مذاہب اس پر متفق ہیں۔

(نکاح میں منافع کا ماخذ ملک میں آجاتا ہے)

اس صورت میں جیسے اور ثمار، ملک میں آجاتی ہیں ایسے ہی ماخذ منافع جماع بھی قابل ملک ہے اگرچہ عورت حرہ ہی کیوں نہ ہو۔ ہاں منافع مردان احرار خود ان کے لیے مفید ہیں یعنی ان کے وسیلہ سے اپنی حاجتیں بھی رفع کر سکتے ہیں۔ بلکہ اول اپنی ہی رفع کرتے ہیں۔ آنکھ، ناک، کان سب ہیں اول اپنے ہی کام آتے ہیں ان اعضاء کا اپنے حق میں ضروری ہونا ایسا نہیں جو کسی پر مخفی ہو اس لیے یوں نہیں کہہ سکتے کہ یہ اعضاء اور ان کے منافع اور یہ جسم اور اس کے فوائد خود صاحب عضو کے لیے موضوع نہیں کسی اور کے لیے مخلوق ہوئے ہیں اور اسی کے ملک میں آسکتے ہیں اس صورت میں اوروں کی کاربرآری میں لحاظ اجر و اجرت ضرور ہوگا۔ ہاں کاربرآری مرد میں جو بوسیلہ عورت ہوتی ہے ایسی ضرورت نہ ہوگی۔

(ان قابل احترام منافع میں اجرت خود بخود ثابت اور لازم ہو جاتی ہے)

اور شاید یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ اور اجارات میں تعیین اجرت صحت اجارہ کے لیے ضروری ہے پر عقد نکاح میں تعیین مہر تو کیا خود ذکر مہر ضروری نہیں بلکہ نفی مہر بھی کی جائے اور یہ شرط لگائی جائے کہ مہر نہ ہوگا تب بھی نکاح درست ہو جاتا ہے۔ ہاں جب یہ لحاظ کیا جاتا ہے کہ زنان حرہ کے منافع جسمانی میں سے مردوں کیلئے مخلوق ہوئے ہیں تو یہی منافع جماع یا ماخذ منافع جماع مخلوق ہیں تو معاوضہ کی ضرورت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اور منافع میں زنان حرائر مردان احرار کے ہم پلہ ہیں۔ جیسے مردانِ احرار اپنے جسم کے مالک ایسے ہی زنان حرائر اپنے جسم کی مالک۔ اور ظاہر ہے کہ منافع معلومہ اور ماخذ منافع معلومہ جسم سے متعلق ہیں بالجملہ ماخذ منافع معلومہ اور جسم زنان حرائر ذو جہتین معلوم ہوتا ہے سو کچھ تو اس وجہ سے تملک کے لیے عوض کی

ضرورت ہوئی اور کچھ بایں نظر کہ ماخذ منافع معلومہ اگرچہ مردوں کے لیے مخلوق ہے۔ پر مثل تمام مخلوقات اصل میں مملوک خداوند متعال ہے سو اور منافع قلیل العزت کو تو یوں ہی سے دلا دیا پہ ان منافع محترمہ کے لیے کچھ محصول مقرر کر دیا تاکہ ان کا احترام اور عزت معلوم رہے اور موجب مزید امتنان ہو یعنی جب ان کی عزت اور احترام خوب دلنشیں ہو جائے گی تو خالق منافع کا کیا کیا شکر ادا نہ کریں گے چنانچہ حدیث علیٰ کُلِّ سُلامی صدقة جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے جسم کے ہر ہر جوڑ اور ہر ہر عضو پہ صدقہ دینا چاہیئے اس قسم کی بات کی طرف مشیر ہے اور وجوب طاعت و عبادت کے لیے موافق اشارہ آیت

تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا۔ (پ مائدہ ع ۱۰)

(کیا تم ایسی چیز کی بندگی کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر جو مالک نہیں تمہارے برے کی اور نہ بھلے کی۔)

منافع نعماء دنیوی سبب کامل ہے۔

بالجملہ ہر نعمت خاص کر نعماء محترمہ استحقاق عوض رکھتی ہیں سو ماخذ منافع معلومہ چونکہ بغایت درجہ محترم ہے۔ اس لیے عوض کا مقرر کرنا ضروری ٹھہرا اس لیے اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ بھی بعد اُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِكُمْ بڑھا دیا ہاں جیسے شکرانہ مال کو جسے زکوٰۃ کہتے ہیں مساکین وغیرہ مصارف معلومہ کے لیے مقرر کیا تھا۔ شکرانہ نکاح یعنی مہر خود محل ماخذ نکاح یعنی عورت کے لیے مقرر کر رکھا۔

(عورت کا تمام جسم حق شوہر میں پابند ہونے کی وجہ سے نان و نفقہ واجب ہے)

مگر چونکہ ماخذ منافع معلومہ اور ماخذوں سے علیحدہ نہیں اور اس وجہ سے اور ماخذ بیکار رہتے ہیں۔ کیونکہ بیکار بوجہ تعلق ملک شوہر جس کی ایضاح کی اب حاجت نہیں اور ماخذ بلکہ تمام جسم زن محبوس حبس شوہر رہتا ہے تو اور ماخذوں کا ہرجانہ دینا پڑے گا یہی وجہ ہوئی کہ نان و نفقہ لباس وغیرہ ضروریات معلومہ شوہر کے ذمہ رہیں کیونکہ تکلیف صرف قوی نافعہ بغرض ضرورت ہوتی ہے

سو بالفرض اگر عورت بطور خود رہتی تو بغرض تحصیل ضروریات اپنے قوئی نافعہ اور اعضاء کاسبہ کو صرف میں لاتی۔ اس سے زیادہ اقتضاء اصل فطرت نہیں جو اور کچھ بڑھایئے اور ضروریات معلومہ پر قناعت نہ کیجئے بہر حال قابلیت ملک ماخذ منافع معلومہ میں کچھ تامل کی گنجائش نہیں۔

(مہر کو منافع کے عوض ہونے کی وجہ سے اُجُورَھُنَّ فرمایا اَثْمَانَھُنَّ نہ فرمایا)

ہاں یہ بات باقی ہے کہ عوض معلوم کو اجر و مہر کیوں کہتے ہیں قیمت و ثمن کیوں نہیں کہتے سو اجر و مہر کہنے
اور ثمن و قیمت نہ کہنے کی یہ وجہ ہے کہ منافع از قسم مصادر ہیں اور مصدر کا اطلاق مرتبہ بالقوۃ اور مرتبہ
بالفعل پر برابر شائع۔ اور یہ نہ ہو تو مشتقات میں بھی یہ فرق باقی نہ رہے۔ کیونکہ حار و بارد مثلاً بالقوۃ اور بالفعل
دو طرح کے ہوتے ہیں تو حرارت اور برودت ہی کے بالقوہ اور بالفعل ہونے کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ سو
جس کو ماخذ منافع کہیئے وہ مرتبہ بالقوہ ہے اور منافع حاصلہ وہ منافع بالفعل۔ اور اسے مرتبہ ما بہ
المنفعت کہتے ہیں یعنی جیسے علم میں ایک مرتبہ ما بہ العلم اور ما بہ الانکشاف اور مبدأ
العلم اور مبدأ الانکشاف اور ماخذ العلم یعنی مرتبہ بالقوہ ہے خواہ وہ قوت علمیہ ہو یا
ذہن یا کچھ اور۔ اور ایک مرتبہ انکشاف متجدد اور علم متجدد یعنی مرتبہ بالفعل ہے ایسے ہی منافع
معلومہ کے لیے دو مرتبہ ہیں ایک مرتبہ بالقوہ اور ماخذ المنافع اور مبدأ المنافع ہے اور ایک مرتبہ
بالفعل یعنی منافع متجددہ۔ لیکن اہل لسان عوض منافع کو اجر اور اجرت کہتے ہیں اور عوض اعیان کو ثمن
اور قیمت۔ معقود علیہ اگر اعیان ہو تو بیع کہتے ہیں اور منافع ہوں تو اجارہ اس لیے قرآن شریف
میں لفظ اُجُورَھُنَّ فرمایا اَثْمَانَھُنَّ نہ فرمایا۔

(نکاح میں منافع بالقوۃ بیع اعیان کی طرح پورے موجود ہوتے ہیں)

ہاں یہ بات مسلم کہ اعیان اور مرتبہ بالقوہ قار الذات ہونے میں شریک ہیں یعنی جیسے اعیان آن واحد میں بتمامہ موجود ہوتے ہیں
ایسے ہی مرتبہ بالقوہ مذکور بتمامہا آن واحد میں موجود ہو جاتے ہیں یہ نہیں کہ آناً فآناً مثل حرکت ادھر موجود
ہو جائیں ادھر معدوم ہوتے جائیں۔ اور مرتبہ بالفعل میں زمانہ کے ساتھ ساتھ تجدد ہوتا جاتا ہے اس لیے
مرتبہ بالفعل تو شیئاً فشیئاً ملک میں آتا جاتا ہے اسی طرح ملک سے نکلتا جاتا ہے۔ کیونکہ جب موجود
ہی نہیں تو مملوک کیوں کر ہوں اور مرتبہ بالفعل بالقوہ ایک دفعہ سارا کا سارا ملک میں آجاتا ہے۔
اور پھر بوجہ انقضاء زمانہ ملک سے نہیں نکلتا ہاں جیسے اعیان میں باندی غلام اصل میں قابل ملک
نہ تھے بلکہ آزاد اور حر تھے فقط بوجہ عروض عوارض معلومہ ملک ان پر عارض ہو جاتی ہے۔ اور اس
لیے فعل مالک جس کو عتق کہیئے ملک عارض کو زائل کر دیتا ہے۔ اور اس وجہ سے حریت مستترہ
پھر ظاہر ہو جاتی ہے ایسے ہی ماخذ منافع معلومہ اصل میں بوجہ حریت زن منکوحہ قابل ملک نہ تھی پھر بوجہ

مذکورہ ملک عارض آزادگی اور بے قیدگی معلوم کو دبالیتی ہے اور فعل طلاق اس کو زائل کر کے آزادگی اصلی کو ظاہر کر دیتی ہے ورنہ جیسے باندی غلام کی ملک اپنے آپ مثل تعلق اجارہ قابل زوال نہ تھی ایسے ہی ملک نکاح مثل تعلق متعہ اپنے آپ زوال پذیر نہیں۔

(منکوحہ میں حق حبس ہوتا ہے اور باندی میں حق ملک اس لیے منکوحہ میں بیع و ہبہ کا اختیار نہیں)

ہاں یہ بات باقی رہی کہ اگر یہ ہے تو پھر بیع و ہبہ کا اختیار کیوں نہیں۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حسب تقریر بالا تمام منافع بالقوہ زن بلکہ خود جسم زن شوہر کی حبس میں آجاتا ہے اور ایک منفعت کے ماخذ کے پتے سارے ماخذ بلکہ محل تمام ماخذ محبوس ہو جاتا ہے۔

سو جہاں عورت خود راغب ہو وہاں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی رضامندی سے حبس کی نوبت آئی ہے۔ ظلم و ستم نہیں کہہ سکتے جو منع کیا جائے مگر خاوند اگر بطور خود کسی کے حوالہ کر دے تو ماخذ مملوک میں تو اسکو اختیار تھا ماخذ محبوس میں اس کو کیا اختیار جو اپنے حبس سے نکال کر اوروں کے حوالے کر دے۔

(منکوحہ میں حق ملک کا مفقود ہونا اور احصان کا ضروری ہونا بیع و شراء سے مانع ہیں اور حق حبس کا تقاضا کرتے ہیں)

ہاں اگر ماخذ منافع معلومہ پر قبضہ تنہائی ہو سکتا تو پھر وجہ ممانعت بیع و ہبہ تصرف فی ملک الغیر تو نہ تھی البتہ احصان مذکور الصدر جس کی ضرورت بدلائل عقلیہ و نقلیہ اوپر ثابت ہو چکی ہے مانع بیع و ہبہ ہوگا اور یہ ایسی وجہ ہے کہ اگر بالفرض عورت حبس غیر شوہر پر راضی ہو جائے تو پھر بھی اجازت بیع و ہبہ نہیں ہو سکتی۔ الغرض تملک ماخذ معلوم کو بذات خود تو ہبہ اور بیع سے انکار نہیں پر فرضیت احصان اور شمول حق زن مانع بیع و ہبہ و عاریت ہے اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ جو شیعوں نے اعادہ فروج جواری تجویز کیا ہے تلبیس شیطانی ہے سراسر فحش ہے قابل جواز نہیں مگر جب مرتبہ احصان اس درجہ کو پہنچا کہ لوازم تملک کو بھی بیکار کر دیا یعنی اختیار بیع و شراء و ہبہ و عاریت جو اصل مقتضاء مالکیت ہے احصان کے باعث بیکار ہو گیا تو پاس شہوت پرستی جو سراسر اس قاعدہ کے مخالف ہے جو آیت نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ سے منتزع ہوتا ہے کیونکر ناسخ ضرورت احصان ہو سکتا ہے۔

بالجملہ یہ آیت حسب بیان بالا اولاد کے مطلوب ہونے اور قضاء شہوت کے اس کی نسبت وسیلہ ہونے پر دال ہے اور ظاہر ہے کہ پاس مبادی ناسخ مطالب نہیں ہو سکتا۔ ہاں رعایت مطالب

دافع لحاظ وسائل ہوسکتا ہے[1]۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ایام شیر خوارگی اولاد میں بعض اشارے کنائے بر نسبت ممانعت جماع پائے جاتے ہیں علیٰ ہذا القیاس اِکسال کا غیر محمود ہونا بھی ایسا نہیں جو کوئی نہ جانتا ہو ادھر عورتوں میں ودود ولود (محبت کرنے والیوں بچے جننے والیوں) کا ممدوح ہونا اور عقائم (بانجھ عورتوں) کا کسی قدر غیر محمود ہونا اسی پر مبنی ہے۔ ادھر زنان دیندار کا در بارہ نکاح محمود ہونا بھی اسی جانب مشیر ہے کیونکہ حسب بیان بالا امر جبر اولاد میں احوال و اخلاق والدین کو دخل تام ہے اس صورت میں دیندار عورت ہو تو دینداری اولاد کی اُمید ہے بالجملہ شہوت پرستی کو دیکھئے تو عقیمہ اور ولود اور دیندار اور بے دین اور عورت شیر وہ اور غیر شیر وہ سب برابر ہیں ہاں اولاد کے حساب سے جو کچھ فرق ہے وہ معلوم ہی ہو چکا۔

الحاصل جس حکم متعلق زنان کو دیکھئے مراعات اولاد اس سے ٹپکتی ہے اور خود مراعاتِ اولاد ہی سبب فرضیت احصان ہوا ہے چنانچہ مفصل اوپر مرقوم ہو چکا اور کیوں نہ ہو غرض اصلی خلق نسا رے جب زراعت معلوم نکلی چنانچہ آیت نِسَآءُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ اس پر شاہد ہے اور دلائل عقلیہ جو اوپر مذکور ہو چکے اس کے مؤید تو پھر اس کا منسوخ کہنا اغراض اصلیہ اور مقتضیات ذاتیہ اور لوازم ذاتیہ کے امکان انفکاک پر فتویٰ دینا ہے۔ کیونکہ احکام شرعیہ حقائق خارجیہ پر مبنی ہیں خدائے تعالیٰ کی عبادت موافق اشارہ۔

اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا (کیا تم ایسی چیز کی بندگی کرتے ہو اللہ کو چھوڑ کر جو مالک نہیں تمہارے برے کی اور نہ بھلے کی) مالکیت نفع و ضرر پر مبنی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت وصف رسالت پر مبنی ہے۔ خلیفہ کی اطاعت اس کی خلافت اور اولو الامری پر موقوف۔ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے غنا کی ضرورت ہے حج کی فرضیت کے لیے کعبہ کے بیت اللہ ہونے کی حاجت، یعنی ثروت مالی پر زکوٰۃ کی بنا ہے اور کعبہ کے تجلی گاہ خداوندی ہونے پر طواف کی بنا ہے۔ زنا بوجہ فحش ممنوع ہے اور شراب بوجہ سکر ممنوع اور قتل و غضب بوجہ ظلم ممنوع ہے

---

[1] مثلاً اولاد کا حاصل کرنا مقصد ہے اور یہ مقصد بغیر مباشرت کے حاصل نہیں ہو سکتا لیکن جب کہ بچہ پیدا ہو گیا ہو اس کے ایام شیر خوارگی میں مباشرت کے نقصان دہ ہونے کے باعث وسیلہ اولاد یعنی مباشرت کو روکا گیا ہے۔ ۱۲۔ محمد علی گوریانی۔

اور حرکات لایعنی بوجہ لغو و بے سود ہونے کے ممنوع ہیں۔ بر والدین کے وجوب کی بنا حق محبت و تربیت پر ہے اور عقوق والدین کے ممنوع ہونے کی بنا اتلاف حق مذکور ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اور اوامر و نواہی کو سمجھیے۔ اس صورت میں بنا ءِ حکم جس بات پر ہوگی اگر وہ بات دائم و قائم ہے تو وہ حکم بھی دائم و قائم رہے گا۔ اور اگر وہ بات قابلِ زوال ہے تو وہ حکم بھی زوال پذیر ہوگا مگر ہر چہ بادا باد۔ ہر حکم کے لیے ایک مبنیٰ اور اصل ضرور ہے جس کو علت حکم کہیے محکوم علیہ اصلی وہی ہوتا ہے اور اسی کے پہچان لینے کو اصطلاح شرع میں حکمت اور حکم کہتے ہیں اور بغور دیکھیے تو آیات يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ اور آتَيْنَاهُ حُكْمًا وَعِلْمًا وغیرہ میں حکمت و حکم سے اسی علم کی طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے۔

(حسن بالذات اور قبیح بالذات کے اوامر و نواہی ناقابل تنسیخ ہیں)

اس تقریر کو دیکھ کر اہل فہم کو یقین ہو گیا ہوگا کہ امر و نہی حسن بالذات و قبیح بالذات قابل نسخ و تغیر نہیں۔ یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ ایمان اور اطاعت خدا و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور احسان اور عدل اور بر والدین اور صلہ رحمی اور مروت اور سخاوت اور عفت ہمیشہ ہر زمانہ میں ہر دین میں محمود رہے ہیں اور شرک اور بدعت اور ظلم اور عقوق والدین اور قطع رحم اور بخل اور زنا اور چوری۔ قزاقی وغیرہ ہر زمانہ میں ہر دین میں مذموم رہے۔ کیونکہ علت امر و نہی اور سبب وجوب و حرمت وغیرہ امر و نہی اور وجوب حرمت وغیرہ سے بوجہ حسن و قبح ذاتی کبھی جدا نہیں ہو سکتے ہاں حسن بالغیر اور قبح بالغیر قابل نسخ و تغیر ہیں۔

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ بوس و کنار وغیرہ امور معلومہ جو اکثر مواقع میں داعی الی المجامعت ہوتے ہیں علی العموم ممنوع نہیں اپنی اولاد کا بوسہ اور احباب کا معانقہ اور مردوں کا مردوں کو دیکھنا اور عورتوں کا عورتوں کی طرف نگاہ کرنا اور تنہا بیٹھنا ہرگز ممنوع نہیں بلکہ لبا اوقات یہ امور کسی اور وجہ سے اور محمود ہو جاتے ہیں۔ اگر یہ امور بھی مثل زنا و اغلام بذات خود مذموم ہوتے تو ہر جا ہر طرح سے ممنوع اور مذموم ہوتے ہاں خود زنا اور اغلام چونکہ بذاتِ خود ممنوع ہیں تو محارم کے ساتھ اس کی ممانعت اور اشد ہے پر بوس و کنار وغیرہ امور ایسے مواقع میں اکثر محمود سمجھے جاتے ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رُخ حسنین رضی اللہ عنہما پر بوسہ دینا اور حضار مجلس الذکر میں سے اگر ایک شخص نے یہ کہا کہ میرے دس بیٹے ہیں کبھی کسی کا بوسہ نہیں لیتا تو آپ کا اس کے

جواب میں یہ ارشاد کہ میں کیا کروں جو خدائے تعالیٰ نے تیرے دل میں سے رحمت نکال لی ہو، صاف اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ایسے مواقع میں یہ امور محمود ہیں۔ حالانکہ زنا و اغلام ایسے مواقع میں اور مواقع سے زیادہ تر ممنوع ہیں۔ بہر حال امر حسن بالذات اور نہی قبیح بالذات قابل نسخ و تغیر نہیں اگر ہیں تو امر و نہی حسن بالغیر و قبیح بالغیر قابل نسخ و تغیر ہیں۔

(نسخ و تغیر میں پہچان آسان نہیں) لیکن یہ پہچاننا کہ نسخ و تغیر کس کو کہتے ہیں ہر کسی کا کام نہیں اس لیے یہ گذارش ہے کہ نسخ و تغیر اور چیز ہے اور استتار حکم اور چیز ہے نسخ میں حکم اوّل کا مٹا دینا ہوتا ہے اور استتار میں چھپا لینا۔ نسخ میں حکم باقی نہیں رہتا زائل ہو جاتا ہے اور استتار میں حکم مستور بجنسہٖ باقی رہتا ہے کسی اور حکم کے تلے دب کر چھپ جاتا ہے۔

اوّل کو ایسا سمجھو جیسا چراغ گل ہو جاتا ہے اور دوسرے کو ایسا سمجھو جیسا کہ چراغ گل تو نہ ہو پر کسی برتن میں دھر کر اوپر سے سر پوش رکھ دیجیے۔ سفر و مرض میں اگر افطار کی اجازت ہے تو اس کو نسخ فرضیت صوم رمضان نہیں کہہ سکتے یہاں وہ حکم فرضیت بجنسہٖ باقی ہے پر حکم رخصت کے تلے دبا ہوا ہے غرض مرض و مشقت درگاہ رحمانی سے تخفیف ہو گئی جس وقت یہ مشقت مرض و سفر گئی اسی وقت سے پھر تقاضا ہے۔

(علت حکم کبھی ظاہر ہوتی ہے کبھی مخفی) جب یہ بات ذہن نشین ہو گئی تو اور سنیئے کبھی علت حکم ایسی ظاہر و باہر ہوتی ہے کہ اس کے علت ہونے میں کسی کو شک و شبہ نہیں ہوتا۔ پھر بایں ہمہ وہ علت ایسی پائیدار اور ضروری الوجود یا دائم الوجود نہیں ہوتی جو کبھی اس کا عدم متصور ہی نہ ہو ایسی صورت میں زوال و بقاء حکم محتاج بیان نہیں ہوتا مثلاً زکوٰۃ کے وجوب کے لیے ثروت مالی کا علت ہونا ایسا نہیں کہ کوئی نہ جانتا ہو اس لیے بعد افلاس اگر کوئی غنی ہو جائے یا بعد غنا کوئی مفلس ہو جائے تو دوبارہ تغیر حکم سابق حکم جدید اور وحی تازہ کی ضرورت نہ ہو گی یعنی وقت افلاس زکوٰۃ فرض نہ تھی اور بعد غنا زکوٰۃ فرض ہوئی یا وقت غنا زکوٰۃ فرض تھی اور بعد افلاس پھر فرض نہ رہی تو اس تغیر کے لیے حکم جدید کی ضرورت نہیں اور اس وجہ سے اس تغیر کو عرف شرع میں نسخ نہیں کہتے اگرچہ نسخ میں بھی یہی تغیر حکم بوجہ حدوث علت حکم یا زوال علت حکم ہوتا ہے

ہاں علت حکم اگر ایسا امر ہے جس کا علت ہونا ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا یا خود اس علت کا ہونا

نہ ہونا ہی ہر کسی کو معلوم نہیں ہوتا تو پھر تغیر مذکور کو نسخ کہتے ہیں۔

(احکام کو منسوخ کرنا قادر مطلق کی شان ہے) بالجملہ نظر ظاہر بین نسخ کرشمہ بے نیازی و اختیار کلی احکم الحاکمین سمجھتی ہے۔ اور علت و اصل حکم سے کچھ بحث نہیں کرتی۔ اور عقل حقیقت شناس اگرچہ بے نیازی و اختیار کلی کو ایسا حق سمجھتی ہے کہ علل احکام اس کے آگے اس سے زیادہ مرتبہ نہیں رکھتیں جتنا سائل دریوزہ گر اس کے سامنے رکھتا ہے جس سے سائل ہے۔ بلکہ اس سے بھی کم۔ لیکن اسم حکیم و عدل اور صفت حکمت و عدالت خداوندی پر ایمان ضروری جانتی ہے اور اس لیے ہر حکم کے واسطے جدید ہو یا قدیم ہو کسی نہ کسی وجہ کا ہونا اس کے نزدیک ایسی طرح ضروری ہے جیسے شہنشاہ ہفت اقلیم۔ جس کو نظم و نسق ہفت اقلیم اور عزل و نصب میں اختیار کلی ہو ہر طرح سے سیاہ و سفید کر دینے کا مختار ہو بھلا کرے یا برا کرے اس کے آگے مجال دم زدن کسی کو نہ ہو بوجہ عقل و دانش و عدل خداداد جو کرتا ہے مناسب ہی کرتا ہے لائق عطا کو عطا کرتا ہے اور سزاوار کو سزا دیتا ہے قابل عزل کو معزول اور لائق منصب کو مامور کرتا ہے مستحقان کرم سے درگذر اور مستوجبان غضب پر قہر کرتا ہے اگرچہ ان سب باتوں میں بوجہ شوکت دبدبہ و بے نیازی شہنشاہی اختیار برعکس حاصل ہے۔

الغرض حکمت و عدل خداوند علیم و حکیم و عدل کریم باوجود بے نیازی مذکور جس کے ثبوت کے لیے قطع نظر شہادت عقل آیت يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَاءُ (اللہ جو چاہتا ہے کر گذرتا ہے) کی گواہی بھی بالضرور اس بات کو مقتضی ہے کہ ہر کسی کے ساتھ وہ معاملہ کیجئے جس کی قابلیت رکھتا ہے اور ہر زمانہ میں وہ حکم دیجئے جو مناسب وقت ہو۔

(نسخ احکام طبیب کے نسخہ بدلنے کی مانند ہیں) الغرض جیسے یہاں گرم مزاج و سرد مزاج والوں کو امراض متحدہ و مختلفہ میں ایک دوا نہیں دیتے وہاں بھی اختلاف اوضاع بنی آدم پر نظر ہے جیسے یہاں موسم گرما و سرما کا فرق وقت علاج ملحوظ رکھتے ہیں وہاں در بارہ احکام فرق زمانہ ملحوظ نظر ہے ہاں جیسے جاہلوں کو اطباء کا یہ فرق سمجھ میں نہیں آتا ایسے ہی اکثر افراد بنی آدم کو جن کی شان میں اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا وارد ہوا ہے فرق احکام خداوندی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس تقریر سے یہ بات روشن ہو گئی ہو گی کہ نسخ احکام خداوندی بوجہ تدارک غلطی سابقہ نہیں ہوتا جو یوں کہیئے خداوند علیم کی نسبت غلطی کا احتمال نہیں پھر نسخ حکم سابق ہوا تو کیوں ہوا۔ بلکہ یہ نسخ و تغیر بوجہ تغیر علل اسباب ہوئی

جو بوجہ اختلاف افراد و انقلاب زمان اکثر ہوتا رہتا ہے۔

بہر حال احکام مختلفہ کے لیے اختلاف علل ضروری ہے اور تغیر احکام کے لیے تغیر علل ضروری ہے مگر اسی طرح استتارِ حکم کے لیے استتار علل ضروری ہے۔ ہاں وہ استتار اگر ممکن ہے تو کسی علت ہی کے عروض کے باعث ممکن ہے مثلاً استطاعت صوم جو اصل و علت فرضیت صوم ہے صعوبت مرض و مشقت سفر کے تلے دب جاتی ہے چنانچہ بمجرد زوال مرض و اختتام سفر وہ استطاعت پھر عود کر آتی ہے اگر مستور نہ ہوتی بلکہ زائل ہو جاتی تو دوبارہ استطاعت کے لیے مثل صعوبت و مشقت مذکورہ کسی امر خارجی کی ضرورت ہوتی بمجرد زوال و اختتام اس کا ظہور نہ ہوتا اور ظاہر ہے کہ یہ صعوبت و مشقت ہی علتِ رخصت افطار ہے جس کے تلے وہ استطاعت مستور تھی اس صورت میں وقت رخصت افطار بوجہ مرض و سفر استتار علت فرضیت اور استتار فرضیت ہوگا اور وقت فرضیت صوم بعد زوال مرض و سفر زوال علت رخصت و زوال حکم رخصت ہوگا۔

(اجازت متعہ از قسم رخصت تھی از قسم نسخ نہیں تھی)

مگر (جب بات) یوں ٹھہری تو بعد حصر اِلَّا عَلیٰ اَزْوَاجِھِمْ اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ اجازت متعہ از قسم رخصت ہے از قسم نسخ نہیں کہہ سکتے کیونکہ علت حصر مذکور اولاد کا مقصود ہونا ہے جس کو بحکم معروضات گذشتہ احصان لازم ہے۔ اولاد کا مقصود ہونا ایسا نہیں جو قابل انفکاک ہو۔

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ نِسَآءُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ قضیہ طبعیہ ہے ہاں ذوق سلیم نہ ہو تو اس کا کچھ علاج نہیں بایں ہمہ کون نہیں جانتا کہ اس جا احتمال تخصیص نہیں ایسی کون عورت ہے جس کے شکم میں رحم مخلوق نہ ہوا ہو اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقصود اصلی پیدائش زنان سے توالد و تناسل ہے۔

(عوارض خارجیہ کے نیچے احکام اصلیہ مستور ہو جاتے ہیں زائل اور منسوخ نہیں ہوتے)

البتہ عروض عوارض گاہ بیگاہ مانع تولد اولاد ہو جاتا ہے مگر عوارض خارجیہ ساترِ آثار و احکامِ اصلیہ ہوتے ہیں دافع اور مزیل نہیں ہو سکتے جو یوں کہا جائے کہ مرض عقم وغیرہ موانع اولاد، توالد کے مقصود نہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔

اور اگر یوں کہیے کہ اولاد کا مقصود ہونا اس کے منافی نہیں کہ شہوت پرستی مقصود نہ ہو تو اس شبہ

کا جواب نقلی تو یہ ہے کہ اس قضیہ میں حرث مقدم ہے اور لکم موخر ہے جس سے بیاد علم معانی موافق محاورہ اہل لسان حصر فی الحرثیت نکلتا ہے اور ظاہر ہے کہ حصر فی الحرثیت بعینہ حصر فی مقصودیۃ التوالد ہے۔

اور جواب عقلی یہ ہے کہ شہوت پرستی اور مجامعت مبادی و اسباب اور ذرائع و وسائل توالد میں سے ہیں اور توالد و تناسل ذرائع شہوت پرستی و مجامعت میں سے نہیں اور ظاہر ہے کہ اسباب بذات خود مقصود نہیں ہو سکتے خاص کر شہوت پرستی، چنانچہ توضیح مرقوم ہو چکا ہے۔ اور ظاہر ہے جب عورت سے اولاد مقصود بالذات ہوگی تو احصان مذکور خود بخود لازم آئیگا۔ چنانچہ ناظران اوراق گذشتہ اس امر سے بخوبی آگاہ ہو چکے ہیں۔

بالجملہ قطع نظر اس امر کے کہ حدیث غیر متواتر کو ناسخ قرآن شریف نہیں سمجھ سکتے۔ اس جا پر گنجائش نسخ ہی نہیں۔ ہاں اگر صفت ولودیت عورتوں سے ممکن الانفکاک ہوتی تو البتہ اس اجازت متعہ کو ناسخ حصر اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِھِمْ کہہ سکتے (تھے)۔ اس صورت میں بجز اس کے کہ رخصت کہئے اور اور کیا کہیئے۔ یعنی جیسے وقت حالت مخمصہ اجازت اکل میتۃ ناسخ حرمت میتۃ نہیں بلکہ بوجہ ضرورت عارضہ جو علت اباحت بلحاظ پاکیزگی طبع انسانی جو موجب حرمت میتۃ وغیرہ ہے مستور ہو گیا اور اس وجہ سے حکم حرمت متعہ جو حصر مذکور سے صاف روشن ہے۔ زیر پردہ رخصت متعہ مستور اور روپوش ہو گیا تھا چنانچہ لفظ رُخِّصَ لَنَا بھی جو روایات متعہ میں موجود ہے اس استتار و عدم نسخ پر شاہد ہے۔

(متعہ کے عارضی طور پر مباح ہونے کی علت) رہی یہ بات کہ ضرورت کیا تھی وہ ہم سے سنیئے، اکل میتہ میں فقط ضرورت عباد تھی اور یہاں ضرورت عباد اور ضرورت معبود دونوں تھیں۔ علاوہ بریں اکل میتہ میں فقط ضرورت دنیوی تھی یہاں ضرورت عباد بھی تھی تو فقط ضرورت دنیوی ہی نہ تھی۔ ضرورت دینی اور ضرورت دنیوی دونوں تھیں۔

ضرورت عباد تو اس باب میں اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ بشہادت احادیث صحیحہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے خصی ہو جانے کا ارادہ کیا اور یہ ان کا ارادہ اگرچہ اہل ہند کو تعجب انگیز ہو کیونکہ یہاں ایسی قوت کہاں جو اس درجہ کو بے قراری اور اضطراری کی نوبت آئے مگر اس باب میں اوّل تو عرب والے مشہور ہیں۔ دوسرے وہ ملک گرم طبائع، عشق آمیز مزاج محبت خیز قیس اور لیلیٰ اور وامق اور عذرا کا افسانہ مشہور و معروف ہے۔ بنی عذرہ کا یہ قصہ اوروں نے بھی سنا ہوگا کہ ان میں اکثر آدمی مرض عشق میں

مبتلا ہو کر مر جاتے تھے کسی نے ان میں سے کسی سے وجہ پوچھی تو یہ کہا تَحَسُّنُ نِسَاءُنَا وَعَفَّتُ فِتْیَانُنَا یعنی مرض عشق میں مبتلا ہو کر جو ہماری قوم کے لوگ اکثر مر جاتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری قوم میں عورتیں حسین ہوتی ہیں اور مرد عفیف یعنی پاکباز ہوتے ہیں۔

بالجملہ صحابہؓ کا ارادہ اختصار کوئی امر مصنوعی نہ تھا صحیح تھا اور ظاہر ہے کہ خواہش جماع خواہش دنیوی ہے۔ ہاں ضرورت عبادۃ بھی ہو اور پھر ضرورت دینی ہو اس کے بیان کی ضرورت ہے اس لیے معروض ہے کہ خواہش جماع مراجعت وطن کے لیے متقاضی تھی تا کہ اپنی ازواج سے جا کر ہم آغوش ہوں اور فرضیت جہاد اور فضائل معیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم فی الجہاد اور نیز فضائل صحبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مانع تھے اور ظاہر ہے کہ یہ سب امور خصوصاً فرضیت جہ ،ر ایسے نہیں کہ موجب ضرورت واحتیاج نہ ہوں۔

رہی ضرورت معبودی۔ ہر چند یہ لفظ بظاہر مُوہم گستاخی ہے مگر بایں نظر کہ مبادی مقصود اس کے حق میں ضروری ہوتے ہیں اور اس لیے بالتبع مقصود ہو جاتے ہیں یہاں بھی یوں کہہ سکتے ہیں کہ عبادت جملہ بنی آدم بشہادت مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ خدا کے یہاں سے مطلوب ہے۔ اور جہاد اس کے لیے ضروری ہے مگر ظاہر ہے کہ جہاد اگر ہو سکتا ہے تو بعد اجتماع مجاہدین ہو سکتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی امر موجب تفرق ایسے دنوں میں پیش آیا کہ اسلام کی تونیو (بنیاد) رکھی جاتی ہو اور اہل اسلام جن سے امید جہاد ہو گنے چنے ہوئے ہوں، اگر وہ چلے جائیں تو پھر جہاد کی کوئی صورت نہیں۔ ایسے دنوں میں موجباب تفرق کا انسداد ضروری ہو جائے گا ہاں اگر اسلام شائع ہو جائے اہل اسلام بکثرت ہوں۔ ایک گروہ چلا جائے تو دوسرا آ سکتا ہے۔ ایسے دنوں میں انسداد موجبات تفرق اتنا ضروری نہیں یعنی پہلی صورت میں تو اجازت بعض محرمات اگر ضرورت ہو تو قرین قیاس ہے پر دوسری صورت میں ضروری نہیں ہوتی جو اجازت ہو۔

(اباحت متعہ کی وقتی ضرورت اور وجوہ) القصہ وقت ضرورت اباحت محرمات ممکن ہے مگر ضرورت متعہ سوا ابتداء زمانہ اسلام کبھی نہیں ہوئی اور انشاء اللہ نہ ہو گی۔ جو حضرات شیعہ کو اس پاکبازی کے لیے دستاویز ہو جائے۔ ہاں یہ مسلم۔ وقت اباحت متعہ ضرورت متعہ شدید تھی۔ مجاہدین گھر چلے جائیں تو جہاد کون کرے اور کیوں کہ ہو اور نہ جائیں تو کیا کریں خصی ہو جانے کی اجازت نہ ملی زنا پر یہ تشدد کہ

سنگسار ہوں یا سو تازیانہ کھائیں اور نکاح کریں تو کہاں سے کریں مہر کی مقدور نہیں اگر ہوتی تو ایک ایک چادر پر متعہ کرلنے کی نوبت کاہے کو آتی پھر نان نفقہ کی ایسی صورت نہیں کہ زوجہ اول وثانی کو برابر بٹھائیں اور ہر اس مقام کی عورتوں سے یہ توقع نہیں کہ اپنے مولد و اقربا کو چھوڑ کر دور دراز چلی جائیں۔ اس تقریر سے صاف ظاہر ہے کہ ضرورت مخمصہ سے یہ ضرورت شدید تھی کیونکہ اول تو وہ ضرورت اور سو طرح سے مرتفع ہو سکتی ہے۔ محنت، مزدوری، قرض، سوال، کسی طرح قدر قوت میسر نہ آسکے تو گھاس پھونس کھا کر تو اپنا پیٹ بھر سکتے ہیں یہاں رفع ضرورت کی بجز اجازت متعہ یا مراجعت وطن اور کوئی صورت نہ تھی سو جیسے بوجہ جہاد قتل و قتال امور ممنوعہ کی اجازت ملی تھی اس وقت بوجہ معلوم متعہ کی بھی اجازت ضروری ہوگئی۔

الغرض ضرورت مذکورہ غزوات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بے شک قابل لحاظ تھی۔ اس زمانہ قلت اہلِ اسلام و کثرت اعداء میں اگر اس امر قبیح کو بوجہ ضرورت بالعرض بھی حسن نہ سمجھتے تو ترقی دین میں سو طرح کے کھٹکے تھے۔

جس وقت قتل و قتال کو بوجہ حسن بالغیر جائز کر دیا تو فساد متعہ پر ایسے وقت ضرورت میں کیا لحاظ کیا جائے ایسے وقت ضرورت میں اباحت متعہ اس سے زیادہ قابلِ لحاظ ہے کہ حالت مخمصہ میں اباحت اکل میتہ۔

(بالفرض متعہ جائز ہوتا تو اہل سنت کے لیے جائز ہوتا) اس تقریر سے اہل فہم کو خوب واضح ہوگیا ہوگا۔ کہ اگر بالفرض والتقدیر متعہ جائز بھی ہوتا تو اہل سنت کے لیے جائز ہوتا جہاد میں جانفشانیاں اور جانبازیاں تو اہل سنت کریں یہ پاکبازیاں بھی ہوتیں تو انہیں کے لیے ہوتیں۔ مگر تماشا ہے کہ جانیں کون گنوائیں اور مزے کون اڑائیں۔ حق یہ ہے کہ دقیقہ سنجی اور انصاف پرستی اور صدق فی الروایۃ اہل سنت ہی کے لیے ہے بہر حال اباحت متعہ بوجہ ضرورت تھی اور وہ ضرورت بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں تھی اور پھر وہ بھی وقت سفر تھی وقت حضر نہ تھی اور وقت سفر بھی انہی لوگوں کے لیے تھی جن کی بیبیاں ان کے ساتھ نہ تھیں چنانچہ روایات صحاح اہلِ سنت اس بات پر شاہد ہیں صحیح مسلم میں ہے۔

عَنْ قَيْسٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللهِ يَقُوْلُ (صحیح مسلم میں حضرت قیس رحم فرماتے ہیں میں نے عبداللہ

كُنَّا نَغْزُوْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم لَيْسَ لَنَا نِسَاءٌ فَقُلْنَا اَلَا نَسْتَخْصِيْ فَنَهَانَا عَنْ ذٰلِكَ ثُمَّ رَخَّصَ لَنَا اَنْ نَنْكِحَ الْمَرْاَةَ بِالثَّوْبِ اِلٰى اَجَلٍ

(انتہیٰ مقام الحاجۃ منہ ج۱ ص۴۵۰ مسلم)

(ابن مسعودؓ سے سنا فرماتے تھے ہم حضور علیہ السلام کے ساتھ غزوہ میں تھے ہمارے ساتھ بیویاں نہ تھیں تو ہم نے پوچھا کیا ہم خصی نہ ہو جائیں تو آپ نے اس سے روکا پھر ہم کو اجازت مل گئی کہ ہم کسی عورت کے ساتھ مدت مقررہ تک نکاح کر لیں۔)

اور نیز صحیح مسلم میں ہے۔

قَالَ ابْنُ شِهَابٍ اَخْبَرَنِيْ خَالِدُ بْنُ الْمُهَاجِرِ بْنِ سَيْفِ اللّٰهِ اَنَّهُ بَيْنَا هُوَ جَالِسٌ عِنْدَ رَجُلٍ جَاءَهُ رَجُلٌ فَاسْتَفْتَاهُ فِي الْمُتْعَةِ فَاَمَرَهُ بِهَا فَقَالَ لَهُ ابْنُ اَبِيْ عَمْرَةَ الْاَنْصَارِيُّ مَهْلًا قَالَ مَا هِيَ وَاللّٰهِ لَقَدْ فُعِلَتْ فِيْ عَهْدِ اِمَامِ الْمُتَّقِيْنَ قَالَ ابْنُ اَبِيْ عَمْرَةَ اِنَّهَا كَانَتْ رُخْصَةً فِيْ اَوَّلِ الْاِسْلَامِ لِمَنِ اضْطُرَّ اِلَيْهَا كَالْمَيْتَةِ وَالدَّمِ وَلَحْمِ الْخِنْزِيْرِ ثُمَّ اَحْكَمَ اللّٰهُ الدِّيْنَ وَنَهٰى عَنْهَا۔

(انتہیٰ مقام الحاجۃ (مسلم ج۱ ص۴۵۲)

(ابن شہاب کہتے ہیں مجھے خالد بن مہاجر بن سیف اللہ نے بتایا کہ وہ ایک آدمی کے پاس بیٹھے تھے تو ایک شخص نے متعہ کے بارے میں آکر مسئلہ پوچھا تو اس آدمی نے اسے اجازت دی ابن ابی عمرۃ الانصاری کہنے لگے چھوڑو وہ کہنے لگے ایسا کیوں امام المتقین کے زمانہ میں ہم نے کیا تھا تو ابن ابی عمرۃ نے کہا یہ اسلام کے دور آغاز میں رخصت تھی اس شخص کے لیے جو مجبور ہو جیسے کوئی آدمی مردار خون اور خنزیر کھانے پر مجبور ہو پھر اللہ نے دین کو پختہ کر دیا اور ہمیں متعہ سے (خدا نے) روک دیا)

(اجازت متعہ ایسی ہی تھی جیسے حالت اضطراری میں مردار کھانے کی اجازت ہے۔)

ان دونوں روایتوں سے صاف روشن ہے کہ ابتداء اسلام میں وقت سفر جہاد بوجہ ضرورت شدیدہ متعہ جائز تھا علی العموم جائز نہ تھا اور پھر وہ جواز بھی ایسا ہی تھا جیسے میتہ اور خنزیر کا حالت مخمصہ میں کھانا جائز ہے یعنی رخصت تھا عزیمت نہ تھا جو امید ثواب رکھیئے اور ایک متعہ پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مرتبہ کا امیدوار رہے اور دوسرے متعہ پر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کے رتبہ کی توقع باندھیئے اور تیسرے متعہ پر حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کے مقام کا انتظار کیجیے اور چو—

ہیں منصب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی آرزو پکاریں۔

بالجملہ زمانۂ نبوت میں بھی متعہ عزیمت نہ تھا بلکہ رخصت تھا اور وہ بھی سفر میں نہ حضر میں اور سفر میں بھی تھا تو فقط سفر جہاد ہی میں اور وہ بھی ان لوگوں کے۔ لیے جن کی عورتیں نہ تھیں اور ان میں سے بھی انہی کے لیے جن کو ایسی ضرورت ہو جیسے حالت مخمصہ میں پیٹ بھر لینے کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ یہ تمام مضامین دونوں روایتوں کے الفاظ سے مثل آفتاب روشن ہیں۔

(اکل میتہ حالت اضطراری میں اب بھی جائز ہے اور متعہ کو بوجہ ارتفاع علت ہمیشہ کے لیے منسوخ کر دیا گیا ہے) مگر چونکہ حالت مخمصہ کا احتمال آئندہ بھی تھا پر بعد فتح مکہ احتمال ضرورت متعہ کسی طرح نہ تھا کیونکہ بعد فتح مکہ معظمہ تمام ملک عرب مسلمان ہو گیا تمام اقوام فوج فوج داخل زمرہ اسلام ہونے لگیں خدا کی مدد نے چاروں طرف سے ظہور کیا۔ چنانچہ سورت۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا (پ۳۰)

جب پہنچ چکے مدد اللہ کی اور فیصلہ اور تو دیکھے لوگوں کو داخل ہوتے ہیں دین میں فوج فوج

اس مضمون پر شاہد ہے اور مشاہدہ فتوح شام و مصر و عراق و فارس وغیرہ اس کے مصداق ہیں۔ اس لیے اکل میتہ میں تو بشرط حالت مخمصہ رخصت بحال خود باقی رہی اور متعہ کو قیامت تک منسوخ کر دیا۔ چنانچہ وہ روایتیں کے جو اس حرمت ابدی پر دلالت کرتی ہیں پیش کش ناظران اوراق ہیں منجملہ اور روایتوں کے ایک روایت تو مرقوم بھی ہو چکی یعنی دوسری روایت جس میں یہ لفظ ہیں۔ ثُمَّ أَحْكَمَ اللَّهُ الدِّينَ وَنَهَى عَنْهَا اس روایت سے صاف روشن ہے کہ متعہ زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی اول ہی جائز تھا پھر دین کو محکم اور مضبوط کر دیا یعنی متعہ سے انجام کار ہمیشہ کے لیے منع فرما دیا سوا اس کے اور روایت لیجیے صحیح مسلم میں موجود ہے۔

حَدَّثَنِي الرَّبِيعُ بْنُ سَبْرَةَ الْجُهَنِيُّ عَنْ أَبِيهِ قَالَ خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْفَتْحِ إِلَى مَكَّةَ اس کے بعد پھر یہ روایت ہے۔ حَدَّثَنِي الرَّبِيعُ بْنُ سَبْرَةَ الْجُهَنِيُّ أَنَّ أَبَاهُ حَدَّثَهُ

(ربیع بن سبرۃ جھنی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم حضور علیہ السلام کے ساتھ فتح مکہ کے دن نکلے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے لوگو میں نے تم کو عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی اور اللہ نے اسے قیامت

أَنَّهُ كَانَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ فَقَالَ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ قَدْ كُنْتُ أَذِنْتُ لَكُمْ فِي الْاِسْتِمْتَاعِ مِنَ النِّسَاءِ وَأَنَّ اللّٰهَ قَدْ حَرَّمَ ذٰلِكَ إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَمَنْ كَانَ عِنْدَهُ مِنْهُنَّ شَيْءٌ فَلْيُخَلِّ سَبِيْلَهُ وَلَا تَأْخُذُوْا مِمَّا آتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا (مسلم ص ۴۵۱ ج ۱)

تک حرام کر دیا پس جس کے پاس ایسی چیز (عورت) ہو تو اس کا راستہ چھوڑ دے اور جو کچھ تم نے مہر دیا ہو وہ بھی ان سے واپس نہ لینا۔)

ان دونوں روایتوں کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بھی غزوہ مکہ ہی میں واقع ہوا ہے یعنی اوّل تو غزوہ فتح میں بعد نہی خیبر اجازت ہوئی اور پھر بعد تین روز کے ہمیشہ کے لیے یہ ارشاد فرمایا چنانچہ ماہران کتب احادیث پر مخفی نہ رہے گا۔

الغرض بعد تحقیق یوں معلوم ہوتا ہے کہ دو بار متعہ کی اجازت ہوئی اور دو بار نہی ہوئی مگر دوسری دفعہ کی نہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تھی مگر چونکہ وہ بات رقم کر چکا ہوں جس سے بعد فتح مکہ حرمت ابدی کا مناسب ہونا معلوم ہو جائے تو یہ تناسب آپ ہی معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہ ارشاد اس وقت کیوں ہوا، پس و پیش فتح مکہ یہ ارشاد کیوں نہ فرمایا ہاں اب تیسری روایت کا نمبر ہے۔ سو وہ تیسری روایت خود حضرت علی رضی اللہ عنہ، سے صحیح مسلم وغیرہ کتب احادیث میں مروی ہے۔

عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ يَعْنِي ابْنَ الْحَنَفِيَّةِ أَنَّهُ سَمِعَ عَلِيَّ بْنَ أَبِيْ طَالِبٍ يَقُوْلُ لِابْنِ عَبَّاسٍ نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ مُتْعَةِ النِّسَاءِ يَوْمَ خَيْبَرَ وَعَنْ أَكْلِ لُحُوْمِ الْحُمُرِ الْإِنْسِيَّةِ۔

(مسلم ص ۴۵۲ ج ۱ بخاری ص ۷۶۷ ج ۲)

(محمد بن حنفیہ اپنے والد حضرت علیؓ سے سن کر راوی ہیں کہ حضرت علیؓ نے ابن عباسؓ سے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے متعہ کرنے سے اور پالتو گدھوں کا گوشت کھانے سے خیبر کے دن منع فرمایا۔)

یہ روایات مذکورہ اہل سنت کے لیے تو درباره رخصت ہونے متعہ کے سرمایہ تسکین و لقین ہوں گی اور اس لیے وہ الزام شیعہ جس کے دفع کے لیے یہ اوراق مرقوم ہوئے ہیں خود بخود ان کے نزدیک ساقط ہو جائے گا اور پھر اس باب میں انشاء اللہ شیعوں کو مجال دم زدن نہ رہے گی۔ اور

شیعوں کے لیے یہ روایات منجملہ ہدایات وارشاد وتلقین ہوں گی۔

(روایات مذکورہ شیعہ کے لیے بھی ہدایت وارشاد کا باعث ہیں۔) وجہ اس کی یہ ہے کہ جب کسی مذہب ومشرب کا کوئی کلیہ یا قاعدہ یا ان کے دین کی کسی بات کی کوئی اصل دلنشین اور ذہن نشین ہو جاتی ہے اور پھر اس کے مناسب ہی اور احکام اس مذہب میں نظر پڑتے ہیں۔ تو اہل مذہب کو تو اس کی حقیقت کا یقین ہو جاتا ہے۔ اور مخالفان مذہب مذکور کو بشرط طلب حق رشد وہدایت کا سامان ہو جاتا ہے۔ اگر کلام اللہ میں اور اس کے احکام اور اخبار میں یہ تناسب نہ ہوتا تو سب میں پہلا اعتراض یہی ہوتا کہ نعوذ باللہ دروغگو را حافظہ نہ باشد اور جب یہ اعتراض نہیں تو جیسا اہل اسلام کو سامان مزید تسکین وتلقین ہو گا اہل باطل کے حق میں بشرط تدبر یہ تلقین وتنبیہ بہ نہانی باعث تنبیہ وہوش ہو گی خاص کر روایات اخیرہ کیونکہ حضرت علیؓ کا نام ہی شیعوں کے مرمٹنے کو کافی ہے۔

سنیوں کو یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ غزوہ فتح بعد فتح خیبر ہے۔ اور غزوہ فتح مکہ میں بشہادت بعض روایات مذکورہ پھر اجازت ہو گئی تھی۔ اس صورت میں نہی غزوہ فتح سے اگر قطع نظر کی جائے تو اجازت غزوہ فتح ناسخ نہی خیبر ہو گی۔ اور حضرت علیؓ کا یہ ارشاد بوجہ بے خبری ہو مگر شیعوں کو اس عذر کی گنجائش نہیں ان کے نزدیک اماموں سے غلطی کا احتمال نہیں اور پھر وہ بھی دین کی باتوں میں خاص کر اس وقت جب کہ نسخ کا بھی احتمال نہ رہا ہو یعنی بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی کا آنا موقوف ہو گیا نسخ کی کوئی صورت نہ رہی دین پائیدار ہو گیا۔

اس صورت میں وہ متعہ کا رخصت ہونا اور عزیمت نہ ہونا جو بدلائل واضحہ انشاء اللہ ہر خاص و عام پر واضح ہو جائے گا۔ اس تناسب کے ساتھ مل کر جو حضرت علیؓ کی روایت سے ثابت ہوتا ہے شیعوں کے حق میں بالضرور موجب تنبیہ ہو گا اور انشاء اللہ اب اس خواب غفلت سے جس میں مدت سے بے ہوش ہیں ہوشیار ہو کر حرمت متعہ کو علی رؤس الاشہاد تسلیم کریں گے اور یہ بھی نہ ہو گا تو اس سے تو خالی ہی نہیں کہ یہ روایتیں دافع الزام اباحت ہو جائیں یعنی حضرات شیعہ جو بدستور روایات اباحت۔ اہل سنت پر الزام لگاتے تھے وہ الزام روایات سے مندفع ہو جائے۔

(حاصل کلام) اس صورت میں حاصل تقریر یہ ہو گا کہ ایک زمانہ میں متعہ کا ایسی طرح حلال ہو جانا جیسے میتہ کبھی حلال ہو جاتا ہے مسلّم! لیکن اول تو وہ اجازت وقت ضرورت بوجہ ضرورت تھی۔

کوئی امر تعبدی نہ تھا جو ہمیشہ کے لیے رہتا اور ایسا ثواب بے پایاں اس پر متفرع ہوتا کہ ایمان سے لے کر اعمال تک کسی عبادت اور طاعت اور زہد و تقویٰ کا وہ ثواب نہیں کیونکہ نہ ایمان کا یہ رتبہ کہ بہ ترتیب معلوم چوتھی دفعہ ہیں ثانی خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ہو جائے اور ہر قطرۂ غسل سے فرشتہ پیدا ہو نہ کسی عبادت میں یہ اثر نہ زاہد سے یہ امید نہ تقویٰ سے یہ توقع یہ پاکیزگی تو اسی (متعہ کی) پاکبازی میں ہے۔

اور اگر فرض کیجیے حضرات شیعہ میر فتح اللہ شیرازی کی تفسیر کو معتبر نہ جانیں اور اس وجہ سے ان کی روایات کو نہ مانیں تب بھی شیعوں کے نزدیک متعہ کے منجملہ حسنات ہونے میں تو کچھ تامل ہی نہیں۔

بہر حال بوجہ ضرورت، وقت ضرورت متعہ کے لیے اجازت دے دینا خود اس بات کو مقتضی ہے کہ بعد ضرورت یہ حکم نہ رہے گا اور ایسا حکم منجملہ حسنات نہیں ہو سکتا دوسرے کہ حرمت ابدی اور حدیثوں سے ثابت۔ جس کا حاصل یہ ہو گا کہ وہ اباحت ثابت من الاحادیث جو شیعہ کے نزدیک اس حرمت کو ناسخ تھی جو آیت اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ الخ سے ثابت ہوتی تھی احادیث ہی سے پھر منسوخ ہو گئی

(حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور عبد اللہ بن عباسؓ کے فتاویٰ کی حیثیت)

باقی رہا حضرت عبد اللہ بن عباس اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کا بعد وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم متعہ کی اباحت پر فتویٰ دینا اہل سنت کے حق میں کچھ مضر نہیں کیونکہ اوّل تو اہل سنت کے مجتہد سے خطا بھی ہو جاتی ہے دوسرے ان کا یہ فتویٰ قبل اطلاع نہی تھا بعد اطلاع انہوں نے بھی رجوع فرمایا۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا حدیث نہی سے مطلع نہ ہونا تو حضرت علیؓ کی روایت سے ثابت ہے اسی طرح حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کو خیال فرمایئے۔[1]

---

[1] حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے متعلق حضرت علیؓ کی روایت ص ۲۵۶ پر گزر چکی ہے علاوہ ازیں ترمذی شریف میں حضرت ابن عباسؓ کا قول مذکور ہے حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ "متعہ شروع اسلام میں تھا آدمی کسی شہر میں جاتا جہاں اسکی جان پہچان نہ ہوتی تو جتنی دیر اس نے قیام کرنا ہوتا اتنی دیر کے لیے کسی عورت سے نکاح کر لیتا وہ عورت اس کے سامان کی حفاظت کرتی اور اس کے لیے کھانا بھی تیار کرتی یہاں تک کہ جب آیت اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ نازل ہوئی قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَكُلُّ فَرْجٍ سِوَاهُمَا حَرَامٌ" (ترمذی ص ۱۸۱ ج ۱ باب نکاح المتعہ)

باقی حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے مسلم ص ۴۵۱ ج ۱ میں مروی ہے قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللّٰهِ يَقُوْلُ كُنَّا نَغْزُوْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ لَيْسَ لَنَا نِسَاءٌ فَقُلْنَا اَلَا نَسْتَخْصِيْ فَنَهَانَا عَنْ ذٰلِكَ ثُمَّ رَخَّصَ

(باقی ص ۲۵۹ پر)

اور اگر بالفرض حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو رجوع کا اتفاق نہیں ہوا تو اس کی یہ وجہ ہے کہ احادیث نسخ ان کو پہنچی نہ تھیں اور اجماع ان کے بعد منعقد ہوا بہر حال انجام کار سب نے رجوع کیا اور حرمت متعہ پر اجماع منعقد ہوگیا۔

(حرمت متعہ پر امت کا اجماع ہے) چنانچہ کتب اہل سنت میں موجود ہے (علامہ) نوویؒ شارح مسلم باب نکاح المتعہ میں بحوالہ قاضی عیاض رقم فرماتے ہیں۔

قَالَ الْقَاضِیُ وَاتَّفَقَ الْعُلَمَاءُ عَلٰی اَنَّ هٰذِهِ الْمُتْعَةَ کَانَتْ نِکَاحاً اِلٰی اَجَلٍ لَا مِیْرَاثَ فِیْهَا وَفِرَاقُهَا یَحْصُلُ بِانْقِضَآءِ الْاَجَلِ مِنْ غَیْرِ طَلَاقٍ وَوَقَعَ الْاِجْمَاعُ بَعْدُ عَلٰی تَحْرِیْمِهَا مِنْ جَمِیْعِ الْعُلَمَآءِ

(قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں کہ علماء کا اتفاق ہے کہ یہ متعہ وقتی نکاح (بمعہ گواہ) تھا اس میں میراث نہ تھی اور بلا طلاق مدت مقررہ کے ختم ہونے پر جدائی ہو جاتی تھی اس کے بعد اس کی حرمت پر تمام علماء کا اتفاق ہوا بجز روافض کے حضرت ابن عباسؓ کچھ عرصہ

بقیہ حاشیہ ص ۶۸ لنا ان ننکح المرأة بالثوب الی اجل ثم قرء عبد اللہ یا ایھا الذین اٰمنوا لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین۔ حضرت ابن مسعودؓ ولا تعتدوا سے ان لوگوں کا رد فرما رہے ہیں جو بعد حرمت متعہ کے بھی حلت متعہ کے قائل ہیں ابن مسعودؓ کا مطلب یہ ہے کہ جیسے طیبات کو حرام کرنا درست نہیں ایسے ہی حدود سے تجاوز بھی درست نہیں اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بوقت ضرورت غزوات میں اور سخت مجبوری کے وقت جب کہ عورتیں پاس نہ تھیں اجازت فرمائی اور بعد میں انہ حرام الی یوم القیامۃ فرما کر قیامت تک کے لیے حرام ہونے کا اعلان کر دیا اب جو شخص متعہ کی اجازت دے اس نے حدود اللہ سے تجاوز کیا وان اللہ لا یحب المعتدین۔ کما اشار الیہ ابن القیمؒ۔ حافظ ابن حجرؒ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے بارے میں روایت نقل کرتے ہیں وفی روایۃ ابی معاویۃ عن اسماعیل بن ابی خالد ففعلنا ثم ترک ذلک وفی روایۃ لابن عینیۃ عن اسماعیل ثم جاء تحریمھا بعد وفی روایۃ معمر عن اسماعیل ثم نسخ۔ (فتح الباری ص ۱۲۰ ج ۹) - ۱۲-

محمد اشرف

الا الروافض وکان ابن عباسؓ یقول بإباحتها وروی عنه انه رجع عنه انتہی (نووی علی مسلم ص۴۵ ج۱) (اباحت کے قائل تھے پھر آپ سے مروی ہے کہ آپ نے جواز سے رجوع کر لیا۔)

اور شرح باب مذکور میں بحوالہ قاضیؒ یہ بھی مرقوم ہے۔

قَالَ الْمَازِرِیُّ ثَبَتَ اَنَّ نِکَاحَ الْمُتْعَةِ کَانَ جَائِزًا فِیْ اَوَّلِ الْاِسْلَامِ ثُمَّ ثَبَتَ بِالْاَحَادِیْثِ الصَّحِیْحَةِ الْمَذْکُوْرَةِ ھُنَا اَنَّهٗ نُسِخَ وَانْعَقَدَ الْاِجْمَاعُ عَلٰی تَحْرِیْمِهٖ وَلَمْ یُخَالِفْ فِیْهِ اِلَّا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُبْتَدِعَةِ ۔ انتہی مقام الحاجة (نووی علی مسلم ص۴۵ ج۱)

(مازریؒ نے کہا ہے کہ نکاح متعہ اسلام کے ابتدائی دور میں جائز تھا پھر صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ وہ منسوخ ہوگیا اور اس کی حرمت پر اجماع واقع ہوگیا۔ اور اس میں کسی نے اختلاف نہیں کیا بجز اہل بدعت کے ایک گروہ کے)

خلاصہ مرام یہ ہے کہ نہ کلام اللہ میں متعہ کا نشان ہے نہ اس کی خوبی یا اباحت کا کہیں بیان ہے کوئی آیت اس کے استحبات یا اباحت پر دلالت نہیں کرتی بلکہ کلام اللہ سے اگر نکلتی ہے حرمت نکلتی ہے۔ ہاں احادیث سے ایک زمانے میں تھوڑے دنوں کے لیے مباح ہونا ثابت ہوتا ہے۔ مگر جیسا تھوڑے دنوں کے لیے اباحت کا ثبوت احادیث سے نکلتا ہے ایسا ہی بعد اباحت چند روزہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا حرام ہوجانا نکلتا ہے۔

چونکہ جمیع مالہٗ وماعلیہ بحث متعہ سے بحمد اللہ فراغت حاصل ہوئی تو اب لازم یوں ہے کہ خدا کا شکر ادا کیجیے اور بنام خدا ختم کیجیے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین والصلوٰة والسلام علی رسولہ سید المرسلین خاتم النبیین وآلہ وصحبہ وازواجہ وذریتہ اجمعین۔

سوال چہارم

(بحث فدک و وراثت انبیاء علیہم السلام) | بیٹیوں کا وارث ہونا قرآن میں سورت نساء رکوع دوم

اعنی یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ لِلذَّکَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَیَیْنِ میں منصوص ہے

فرماتے ہیں فَاِنْ کَانَتْ وَاحِدَۃً فَلَھَا النِّصْفُ جس کے یہ معنی ہیں کہ اگر اولاد میں ایک

ہی بیٹی ہو تو اس کا آدھا حصہ ہے اس صورت میں حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کے آدھے ترکہ کی مالک تھیں پھر کیا سبب ہوا کہ خلیفہ اول نے ان کو بالکل جواب دیا

یہ بھی ظلم نہیں تو اور ظلم کس کا نام ہے؟

اور اگر یہ کہئے کہ حدیث میں آیا ہے نَحْنُ مَعَاشِرَ الْاَنْبِیَآءِ لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَا

صَدَقَۃٌ یعنی انبیاء کے مال میں میراث نہیں ہوتی تو یہ معنی ہوئے کہ حکم قرآنی حدیث سے منسوخ

ہو گیا تو اول تو حدیث واحد ہے یعنی ایسی احادیث سے جن کو محدثین احاد کہا کرتے ہیں قرآن کا منسوخ

ٹھہرانا سنیوں کے نزدیک بھی جائز نہیں دوسرے یہ حدیث اور آیات قرآنی کے معارض ہے جن میں

سے ایک تو وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ ہے۔ دوسری وَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ

وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ۔ اول کا مطلب تو یہی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام حضرت داؤد علیہ السلام

کے وارث ہوئے اور دوسری دعا حضرت زکریا علیہ السلام ہے اور مطلب اس کا یہ ہے۔

کہ اے اللہ دے مجھ کو ایسا جانشین جو میرا بھی وارث ہو اور آل یعقوب کا بھی وارث ہو۔

اور ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے خلاف قاعدہ مقررہ خداوندی دعا متصور نہیں اور اگر بالفرض انبیاء

کرام سے کوئی دعا خلاف قاعدہ مقررہ صادر بھی ہو تو مثل دعا حضرت نوح علیہ السلام یعنی۔

رَبِّ اِنَّ ابْنِیْ مِنْ اَھْلِیْ وَاِنَّ وَعْدَکَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْکَمُ الْحٰکِمِیْنَ۔ (اے رب میرا بیٹا ہے میرے گھر والوں میں اور بیشک تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بڑا حاکم ہے۔)

قابل عتاب ہے چنانچہ جملہ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ اِنِّیْٓ اَعِظُکَ اَنْ تَکُوْنَ مِنَ

الْجٰھِلِیْنَ۔ (سو مت پوچھ مجھ سے جو تجھ کو معلوم نہیں میں نصیحت کرتا ہوں تجھ کو کہ نہ ہو جائے

تو جاہلوں میں) سے ظاہر ہے۔ مثل دعا مذکور حضرت زکریا علیہ السلام قابل اجابت نہیں تھی سورۃ جاثیہ

دعائے مذکور جس پر جملہ یٰزَکَرِیَّا اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلَامٍ اسْمُہٗ یَحْیٰی شاہد ہے۔ بایں لطف وعنایت جو لفظ نُبَشِّرُ سے ظاہر ہے درصورت صحت وصدق خبر لانورث ہرگز متصور نہیں کیونکہ اگر انبیاء کا کوئی وارث نہ ہوا کرتا تو حضرت زکریا علیہ السلام کو اس قاعدہ کی اطلاع بھی ضرور ہوگی پھر ایسی دعا کیوں کرتے بہرحال حضرت زکریا اور حضرت داؤد علیہما السلام دونوں بالیقین نبی ہیں اور ان کے مال میں وراثت کا جاری ہونا کلام اللہ سے ثابت ہے اس صورت میں حدیث مذکور مخالف کلام اللہ ہوئی۔ سو کلام اللہ کو غلط نہیں کہہ سکتے ہو نہ ہو حدیث مذکور ہی غلط ہوگی۔

جواب (میراث کی بنا تین شرطوں پر ہے) بعد حمد وصلوات راقم حروف عرض پرداز ہے کہ میراث کی بنا تین باتوں پر ہے۔

(شرط اول۔ مورث کی روح کا اس کے جسم سے علاقہ حیات باقی نہ رہے) ایک تو یہ کہ جس کے مال میں کسی کو استحقاق میراث ہو اس کی روح کو اس کے جسم سے علاقہ حیات باقی نہ رہے اگر علاقہ مذکور باقی ہے تو اس کا مال اسی کی ملک رہتا ہے اور اس کی ازواج اس کے نکاح میں، اقرباء کو اس کے مال میں تصرف کا اختیار نہ ہوگا کسی اور کو اس کی ازواج سے نکاح کی اجازت نہ ہوگی یہی وجہ ہے کہ جب تک دم میں دم ہے آدمی اپنے مال کا مالک ہے اس کی زوجہ کا نکاح منقطع نہیں ہوتا۔ ہاں اگر علاقہ مذکور منقطع ہو جائے تو اموال سے بھی علاقہ ملک منقطع ہو جاتا ہے اور ازواج سے بھی علاقہ نکاح ٹوٹ جاتا ہے اس لیے کہ روح کو بذات خود تو اموال وازواج کی ضرورت ہی نہیں۔ بلکہ جیسے سوار کو گھاس دانہ کی ضرورت بوجہ اسپ سواری ہوتی ہے روح کو کھانے پینے اور اموال وازواج کی حاجت بوجہ بدن ہے، جب بدن سے علاقہ ہی نہ رہا تو مال وازواج روح کے کس مصرف کے ہیں۔

(شرط دوم۔ مورث کا یُوْصِیْکُمُ اللہُ کے خطاب میں شمول۔) دوسری بات جس پر بنا میراث ہے یہ ہے کہ خطاب یُوْصِیْکُمُ اللہُ میں مورث داخل ہو۔ یہ نہ ہو کہ جیسے حج، زکوٰۃ کا خطاب مثلاً اغنیاء کے لیے ہے فقراء خارج ہیں خطاب مذکور سے مورث خارج ہو۔

(شرط سوم۔ مورث کا ترکہ اس کی ملکیت ہو) تیسری بات یہ ہے کہ متروکہ مورث اسی کا مملوک ہو کسی کی امانت یا مال وقف نہ ہو۔

(صورت مسئولہ میں تینوں شرائط مفقود ہیں) جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو آگے سنیے کہ اس جھگڑے

میں تینوں باتوں کا پتہ نہیں اور ظاہر ہے کہ ثبوت دعویٰ میراث کے لیے اول حضرات شیعہ کو ان تین باتوں کا اثبات ضروری ہے اس کے بعد اگر سنیوں سے جواب مانگیں تو بجائے خود ہے۔ اور قبل اثبات مذکور سنیوں کی طرف سے لَا نُسَلِّمُ کافی ہے ان تینوں سے اگر مقدمہ واحد ہی ثابت نہ ہو گا تو پھر سنیوں کے سامنے منہ کرنے کی گنجائش نہ ہوگی۔ اور یہاں ذہن سلیم ہو تو ان تینوں باتوں کی اضداد کلام اللہ ہی سے ثابت ہیں اور احادیث کثیرہ اس کی مؤید۔ خیر یہ بات تو بہت طویل ہے قابلِ گذارش یہ ہے۔

(حدیث لانورث اخبار کے قبیل سے ہے اور اخبار ناسخ و منسوخ نہیں ہوتیں) کہ حدیث میں نفی امر اول کیطرف اشارہ ہے اور صورت اس کی یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے مال میں میراث کا جاری نہ ہونا اگر حدیث مذکور سے ثابت ہے تو بایں معنی ثابت ہے کہ عدم موروثیت کی خبر دیتی ہے یہ نہیں کہ ان کے لیے جدا امر وارشاد ہے کہ حدیث کو ناسخ، قرآن کو منسوخ کہیں۔ بالجملہ امر و نہی ناسخ امر و نہی ہوا کرتے ہیں اخبار ناسخ اوامر ونواہی نہیں ہوتیں۔

ہاں اگر کوئی ایسی خبر ہو جس سے وقوع امر و نہی معلوم ہو جیسا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ یا حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ تو وہ خبر تو پھر بھی ناسخ امر و نہی ہوتی البتہ وہ امر و نہی جو بذریعہ خبر مذکور معلوم ہوتے ہیں بشرط مخالف امر و نہی دیگر ناسخ ہوا کرتے ہیں سو یہاں نہ کسی امر کی خبر ہے نہ کسی نہی کا بیان۔

(بناء میراث کی شرط اول کا فقدان حدیث لانورث کی رو سے حیات انبیاء علیہم السلام ہی مانع میراث ہے) بلکہ مطلب اصلی یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام وقت موت بھی بدستور بقید حیات رہتے ہیں چنانچہ بہدایت عقل صائب جملہ لانورث سے یہ بات عیاں ہے اور ہم بھی انشاء اللہ بیان کریں گے۔ اس لیے ان کے مال میں میراث نہیں چلتی۔ سو سنی نہ سہی علماء شیعہ ہی فرمائیں کہ اس میں کیا خرابی ہے اور اس صورت میں کس طرح نسخ قرآن لازم آتا ہے زندہ کے مال میں نہ تو شیعوں کے نزدیک میراث ہوتی ہے نہ سنیوں کے نزدیک جب تک جان کو تن سے علاقہ باقی ہے تو کیسا ہی کوئی ضعیف و نحیف بدتر از مردگان کیوں نہ ہو اپنے مال کا مالک اپنی زوجہ کا خاوند رہتا ہے نہ اس کے مال میں وارثوں کو گنجائش تصرف ہے نہ اس کی ازواج کے ساتھ کسی کو نکاح کی اجازت جب ہمارا تمہارا باوجودیکہ ہماری حیات بدتر از موت ہے کہ حالت نزع میں اپنے مال کے مالک اور اپنی زوجہ کے خاوند رہتے ہیں انبیاء علیہم السلام اگر بقید حیات اپنے مال کے مالک اور اپنی ازواج کے خاوند رہیں تو کیا بیجا ہے۔

(دو اہم سوال) ہاں یہ بات قابل تحقیق ہے کہ جملہ لانورث بقاء حیات پر کیوں کر دلالت کرتا ہے۔ اور دوبارہ بقاء حیات انبیاء وقت موت بھی احادیث احاد سے کام چل سکتا ہے یا نہیں؟

(جواب سوال اول۔ مورثیت کی نفی کا سبب حیات ہے) سو جواب امر اول تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لانورث فرمایا ہے لا یرثنا احدٌ نہیں فرمایا غرض نفی وارثیت ورثہ نہیں کی اپنی مورثیت کی نفی فرماتے ہیں۔ اگر نفی وارثیت فرماتے تو یہ بھی احتمال تھا کہ معاذ اللہ قتل یا کفر وغیرہ اسباب حرمان کے باعث وراثت سے محروم رہ جائیں پر مانع مورثیت مورث بجز حیات اور کوئی امر ہی نہیں۔ اس لیے کہ موجب تعلق وراثت فقط انقطاع تعلق فیمابین روح وجسم ہے کسی اور شرط یا سبب کی ضرورت ہی نہیں جو اس کے نہ ہونے کا احتمال ہو۔

اس صورت میں بجز اس کے اور کسی بات کی گنجائش ہی نہیں کہ حیات مانع میراث قائم ہو اور یہ فرق نفی وارثیت اور مورثیت میراث میں ایسا ہے جیسا ابصار میں نہ دیکھنے اور نہ دکھلائی دینے کا فرق موجود ہے یعنی اندھا اگر کسی شکل وصورت کو نہیں دیکھتا تو وہاں اندھے کا قصور ہے اس شکل کا قصور نہیں اور اگر ہوا یا روح وغیرہ اشیاء غیر مبصرہ کو کوئی آنکھوں والا نہیں دیکھتا تو وہاں آنکھوں والے کا اس بات میں کچھ قصور نہیں بلکہ ہوا اور روح کا قصور ہے یعنی ہوا اور روح دیکھنے کے قابل نہیں سو پہلی صورت میں اندھے کے بصیر ہونے کی نفی کرنی چاہیئے اور دوسری صورت میں ہوا اور روح کے مرئی ہونے کی نفی مناسب ہے۔

بہر حال بدلالت نفی مورثیت حقیقت شناسائی معانی سنج تو اس طرف گئے کہ انبیاء میں مورثیت ہی نہیں یعنی انقطاع تعلق روح وجسم کی نوبت ہی نہیں آتی اور ظاہر پرستان کم فہم نفی مورثیت کو نفی وارثیت پر محمول کر کے لڑنے کو تیار ہیں کہ بیٹی کا وارث ہونا قرآن میں منصوص ہے حدیث واحد سے منسوخ یا مخصوص نہیں ہوسکتا۔ سے ببیں تفاوت رہ از کجا است تا بکجا۔

کوئی پوچھے اس حدیث کو نفی وارثیت سے کیا علاقہ جو اعتراض نسخ لیے دوڑے۔

(جواب سوال دوم۔ موت وحیات کے باب میں خبر واحد بھی معتبر ہے) اور امر ثانی کا جواب یہ ہے کہ موت وحیات کے باب میں تو ہر عادل کی گواہی مقبول ہے کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات دوبارہ حیات مقبول نہ ہوگی حضرات شیعہ ہی فرمائیں یہ بات سچ ہے یا جھوٹ۔

ایک اور سوال موت وحیات کا اجتماع ممکن ہے؟ ہاں یوں کہیئے کلام اللہ میں یوں بھی ارشاد ہے۔ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (ہر جی کو چکھنی ہے موت) جس سے بے تخصیص انبیاء علیہم السلام سب کے لیے موت کا آنا ثابت ہے بلکہ خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں۔ اِنَّكَ مَيِّتٌ (تجھے بھی مرنا ہے) پھر اس بنا پر فرماتے ہیں۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ (پ۴) (اور محمد تو ایک رسول ہے ہو چکے اس سے پہلے بہت رسول پھر کیا اگر وہ مرگیا یا مارا گیا تو تم پھر جاؤ گے الٹے پاؤں۔)

اور ظاہر ہے کہ موت وحیات باہم متضاد ہیں اور اضداد باہم مجتمع نہیں ہوسکتے۔ ظاہر ہے کہ نور وظلمت اور حرارت اور برودت ایک محل واحد میں جو جمع نہیں ہوتے تو بوجہ تضاد ہی باہم مجتمع نہیں ہوتے۔

(دلیل نقلی) سو اس کا جواب اوّل تو نقلی لیجئے اگر کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کلام اللہ میں ہے تو وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (اور تو نہ سمجھ ان لوگوں کو جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مردے بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس کھاتے پیتے) بھی کلام اللہ ہی کی آیت ہے انجیل یا توراۃ کا درس نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ بشہادت کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ شہداء کی موت کا اقرار لازم ہے ورنہ بایں ہمہ کلیت جملہ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ اگر شہداء منجملہ اموات ہوں گے تو اس قضیہ کا کلیہ ہونا دربارہ موت انبیاء کرام علیہم السلام کیونکر مفید ہوسکتا ہے۔ سو جیسا شہداء میں موت وحیات کا اجتماع ممکن ہے ایسا ہی انبیاء علیہم السلام میں بھی سہی۔

(ایک خدشہ) اس تقریر کو سن کر شاید علماء شیعہ آیت لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا کی تفسیر میں درپے تغیر ہو کر یہ فرمائیں کہ قُتِلُوْا صیغہ ماضی ہے اس لیے الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ سے وہ لوگ مراد ہیں جو قبل نزول آیت لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا۔ خدا کی راہ میں مارے گئے علی العموم تمام شہداء مراد نہیں۔ اس صورت میں ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ ایک بار مرگئے ہوں اور پھر بعد مرگ ان کو زندہ کر اٹھایا ہو اور اس لیے یہ ارشاد ہوا کہ لَا تَحْسَبَنَّ

اَلَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتاً بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ، مگر اس کا جواب اول تو اپنے مفسروں سے پوچھیں۔

(جواب خدشہ) حضرت من! باتفاق مفسرین فریقین آیت مذکورہ تمام شہداء کو عام ہے سابقین ہوں یا لاحقین اور کیوں نہ ہو۔ اگر یوں نہ کہیئے تو آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں بھی یہی کہنا پڑے گا۔ اور اس صورت میں ظاہر ہے کہ شیعان مابعد کو بزعم خود بھی اپنے آپ کو اس قسم کی بشارات سے محروم و بے نصیب کہنا پڑے گا۔ بالجملہ اس قسم کی آیات میں زمانہ کا ماضی ہونا باعتبار وقت جزاء و تفریعات ہوتا ہے باعتبار وقت تکلم نہیں ہوتا۔ سو جیسے آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں جزا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ سے مثلاً تقدم ملحوظ ہو گا اس آیت میں ... م حسبان اور رزق اور فرحت وغیرہ امور مندرجہ آیت۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتاً بَلْ اَحْیَاءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ فَرِحِیْنَ بِمَا اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَیَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِیْنَ لَمْ یَلْحَقُوْا بِھِمْ مِنْ خَلْفِھِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (پ ۴ ع ۹)

(اور تو نہ سمجھ ان لوگوں کو جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مردے بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس کھاتے پیتے خوشی کرتے ہیں اس پر جو دیا ان کو اللہ نے اپنے فضل سے اور خوش وقت ہوتے ہیں ان کی طرف سے جو ابھی تک نہیں پہنچے ان کے پاس ان کے پیچھے سے اس واسطے کہ نہ ڈر ہے ان پر اور نہ ان کو غم)

سے تقدم اعتبار کیا جائے گا ورنہ ہم تو نہیں کہہ سکتے یہی تفسیر دانی ہو گی تو حضرت امام الشہداء امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے رفقاء کی حیات سے شیعوں کو انکار ہی کرنا پڑے گا بہر حال جملہ اَلَّذِیْنَ قُتِلُوْا کی تعمیم ضرور ہے۔

(شہداء اور انبیاء علیہم السلام میں موت کے بعد دوبارہ حیات کی دو قسمیں، متصل اور منقطع)

پھر اس صورت میں دو حال سے خالی نہیں کہ مقتولان فی سبیل اللہ کی حیات اوّل ہی بدستور ہو اور اس لیے بَلْ اَحْیَاءٌ فرمایا ہو یا حیات اوّل منقطع ہو گئی ہو پر حیات ثانی کے اعتبار سے ان کو احیاء فرمایا ہو۔ صورت اوّل میں تو ظاہر ہے کہ بعد قتل موت و حیات کا اجتماع لازم آئیگا۔

(منقطع کی پھر دو قسمیں متصل اور منفصل)

پر صورت ثانی کی پھر دو صورتیں۔ ایک تو یہ کہ حیات اول کے ختم ہوتے ہی دوسری حیات شروع ہو گئی ہو یعنی حیات اوّل کا انتہا اور حیات ثانی

کا ابتدا اسی طرح متصل اور چسپاں ہو جیسے رات اور دن۔ ظہر اور عصر مثلاً۔ دوسرے یہ کہ حیات اول کے اختتام کے بعد ایک زمانہ تک موت ہی رہتی ہو اور پھر حیات ثانی آتی ہو ان دونوں میں سے پہلی صورت میں اگر موت انتہاء حیات اور حد حیات اور طرف حیات ہے تو جیسے خط و سطح مفروض علی السطح المتصل اور سطح مفروض علی الجسم المتصل یا آن مفروض فی الزمان للتصل اتصال سطح اور اتصال جسم اور اتصال زمان میں قادح نہیں ایسے موت مفروض بین الحیوتین کو خیال فرمایئے کیونکہ اس صورت میں تعدد حیوٰۃ باعتبار فرض موت ہے اور موت ایک انتہاء غیر منقسم کا نام۔ سو جیسے تعدد سطح جو وقت فرض خط مستدیر مثلاً لازم ہے اتصال سطح داخل و خارج مستدیر میں قادح نہیں۔ ایسے ہی موت بھی اتصال حیات سابق و لاحق میں قادح نہ ہو گی اور اگر موت کیفیت مستمرہ کا نام ہے تو پھر وہی صورت ہے یہاں بھی موت و حیات باہم مجتمع ہوں گی۔ ہاں صورت ثانی میں البتہ اجتماع موت و حیات نہ ہو گا بلکہ حیات اول تک تو موت بھی ہے نہیں اور حیات ثانی کے وقت موت زائل ہو گئی اور یہی احتمال شیعوں کو مفید بھی معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ دونوں حیاتوں کے مابین جو زمانہ موت ہو گا۔ تو اس موت کے معروض وہی اَلَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ہیں۔ جن کی شان میں لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ط بَلْ اَحْیَآءٌ فرماتے ہیں۔ القصہ خود آیت لَا تَحْسَبَنَّ ہی احتمال مذکورہ کی مکذب ہے۔

(دلیل عقلی) اور دلیل عقلی موت و حیات کے اجتماع کے ممکن ہونے پر مطلوب ہے تو سنیئے کہ اجتماع اضداد کے محال ہونے کے لیے ضرور ہے کہ جہت و زمان بھی واحد ہو ورنہ مختلف زمانوں میں جیسے پانی کا گرم سرد ہوتا اور زمین کا مضئ و مظلم ہونا ممکن کیا مشہور ہے ایسے باعتبار جہات مختلفہ بھی حرارت و برودت اور نور و ظلمت کا اجتماع موجود ہے۔ علی ہذا القیاس ادویہ باردہ بالطبع اور آب جو بالطبع بارد ہے بوسیلۂ آتش گرم ہو جاتے ہیں اور علی ہذا القیاس ادویہ حارہ بالطبع مثل مرچ و گوگل شدت سرما میں بارد ہو جاتی ہیں اور طبیعت وہی کی وہی رہتی ہے تاثیرات جوں کی توں رہتی ہیں اگر اجتماع مفہومات مذکورہ ہر طرح محال ہی ہوتا تو یہ اجتماع کیوں کر ہو سکتا اس لیے بناچاری اتحاد جہت کا شرائط تضاد میں سے کہنا ضرور ہے سو جیسے یہاں حرارت ذاتی اور برودت طبعی زائل نہیں ہوتی بلکہ برودت عارضہ اور حرارت غریبہ کے تلے دب جاتی ہے اور زیر پردہ اضداد مستور ہو جاتی

ہے۔ ایسے ہی اگر حیات ذاتی زیر پردہ موت مستور ہو جائے تو کیا عجب ہے۔ کیونکہ موت بشہادت آیت خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ امر وجودی ہے عدمی محض نہیں جو یوں کہا جائے کہ ساتر ہونے کے لیے وجودی ہونا ضروری ہے اور موت امر عدمی ہے اس کے ساتر ہونے اور حیات کے مستور ہونے کے کیا معنی؟

اور اگر یوں کہیے کہ موت تو امر عدمی ہی ہے پر یہاں وہ چیز مراد ہے جس سے یعنی عدم الحیات لازم آیا ہے سو اس کا جواب یہ ہے کہ حیات منجملہ اوصاف و عوارض ہے، اقسام موصوفات اور جواہر میں سے نہیں اور ظاہر ہے کہ اوصاف وجودی دو حال سے خالی نہیں ہوتے یا اوصاف ذاتیہ ہوں گے یعنی ذات موصوف کے حق میں خانہ زاد ہوں کسی اور کا فیض نہ ہوں جیسے فرض کرو حرارت آتش، اس قسم کے اوصاف تو اہل علم و عقل جانتے ہیں کہ موصوف سے جدا ہی نہیں ہوتے اور اگر اوصاف وجودی اوصاف ذاتیہ نہ ہوں گے تو اوصاف عرضیہ بمعنی بالعرض ہوں گے یعنی کسی اور کا فیض ہوں گے جیسے فرض کرو حرارت آب گرم کہ آب گرم میں فیض آتش ہے آب کے حق میں وصف خانہ زاد نہیں اس قسم کے اوصاف البتہ زوال پذیر ہوتے ہیں اور موصوفات سے ان کا عدم متصور ہوتا ہے لیکن اس قسم کے اوصاف اگر ایک جا سے معدوم ہو جاتے ہیں تو جہاں کا فیض ہے وہاں سے معدوم نہیں ہوتے۔ الغرض ہر وصف عرضی بمعنی بالعرض کے لیے ایک موصوف بالذات ضرور ہے سو جس کسی کی ایسی حیات ہو گی اس کی حیات معدوم نہیں ہو سکتی اگر ہو گی تو مستور ہی ہو گی۔ اور وہ چیز جو آیت مذکورہ میں لفظ موت سے مراد ہو گی اس کے حق میں ساتر ہی ہو گی مزیل نہ ہو گی۔

(عالم اسباب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات ذاتی ہے اور اوروں کی حیات آپ کے فیض سے عرضی ہے)

سو ہم کہتے ہیں کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات عالم اسباب میں خانہ زاد ہو اور اوروں کی حیات عالم امکان میں اسی طرح اس کا فیض ہو جیسے چاند میں آفتاب کا فیض تو اس صورت میں آپ کی حیات وقت موت زائل نہ ہو گی تو مستور ہو گی یعنی جیسے وقت کسوف یعنی گہن کے وقت نور آفتاب چاند کی اوٹ میں مستور ہو جاتا ہے۔ اور چاند کا نور وقت خسوف یعنی چاند گہن میں بایں وجہ کہ زمین اس کے اور آفتاب کے بیچ میں حائل ہو گئی ہے۔ بالکل زائل ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت موت آپ کی حیات تو زیر پردہ موت مشار الیہ فی الآیۃ مستور ہو جائے اوروں کی حیات بالکل زائل ہو جائے۔

بالجملہ موت اور حیات بوجہ اختلاف جہات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اگر مجتمع ہوجائیں تو کونسا محال لازم آئے گا۔ حیات۔ ذاتی اور اصلی ہوگی اور موت عرضی۔

اس صورت میں حدیث لَا نُوْرِثُ مَا تَرَکْنَا جو حیات انبیاء پہ دلالت کرتی ہے جیسے آیت یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْ اَوْلَادِکُمْ کی مخالف نہ تھی ایسے آیت اِنَّکَ مَیِّتٌ اور کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَۃُ الْمَوْتِ کی بھی مخالف نہ ہوگی۔

رہا تعارض حدیث مذکور اور آیت وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ اور آیت۔

(آیت وَوَرِثَ سُلَیْمٰنُ سے وراثت علمی اور خلافت مراد ہے)

فَھَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْکَ وَلِیًّا یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ (پ ۱۶ سورہ مریم ع ۱)

(سو بخش مجھ کو اپنے پاس سے ایک کام اٹھانیوالا جو میری جگہ بیٹھے اور یعقوب کی اولاد کی)

یہ تعارض ظاہر شیعوں کو بوجہ قلت مزاولت کلام اللہ تعارض حقیقی معلوم ہوتا ہے اگر کلام اللہ کی تلاوت کبھی نصیب ہوتی اور ان کے ایسے کہاں نصیب تو یہ دھوکہ نہ پڑتا خلاصہ یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں بھی مثل آیت۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِھِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْکِتٰبَ (پ ۹ اعراف ع ۲۱) اور آیت ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا (پ ۲۲ سورہ فاطر ع ۴)

(پھر ان کے پیچھے آئے ناخلف جو وارث بنے کتاب کے)
(پھر ہم نے وارث کئے کتاب کے وہ لوگ جن کو چن لیا ہم نے اپنے بندوں میں سے)

وراثت علمی مراد ہے یا وراثت خلافت و ولیعہدی۔ وراثت مالی مراد نہیں چنانچہ آیت وَرِثَ سُلَیْمٰنُ دَاوٗدَ سے پہلے متصل ہی یہ ارشاد

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ عِلْمًا وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ فَضَّلَنَا عَلٰی کَثِیْرٍ مِّنْ عِبَادِہِ الْمُؤْمِنِیْنَ (پ ۱۹ سورہ نمل ع ۲)

(اور ہم نے دیا داؤد اور سلیمان کو ایک علم اور بولے شکر اللہ کا جس نے ہم کو بزرگی دی اپنے بہت سے بندوں ایمان والوں پر)

اور بعد جملہ وَوَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاوٗدَ متصل ہی یہ ارشاد

وَقَالَ يٰاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ (اور بولا اے لوگو ہم کو سکھائی ہے بولی اڑتے جانوروں کی۔)

اس ارادہ کے لیے قرینہ بھی ہے ورنہ وراثت مالی مراد ہو تو پھر وہی قصہ ہو جائے جیسے گنوار کہا کرتے ہیں "بیاہ میں ذیج کا لیکھا"[1]، سواگر کسی گنوار کی کلام ہوتی تو احتمال بھی تھا خدا کے کلام میں ایسی بے ربطی انہیں کے نزدیک متصور ہے جن کے نزدیک خدائے تعالیٰ کو کلام گفتگو کا سلیقہ نہ ہو اور کلام اللہ معجز نہ ہو۔

بایں ہمہ حدیث کلینی جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اس بات پر شاہد ہے کہ آیت وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ داؤدَ میں وراثت علمی مراد ہے وراثت مالی مراد نہیں وہ حدیث یہ ہے وَرِثَ سُلَيْمَانُ دَاوُدَ وَوَرِثْنَا سُلَيْمَانَ[2] حاصل کلام یہ ہے۔ کہ حضرت سلیمان حضرت داؤد کے وارث ہوئے تھے اور ہم حضرت سلیمان کے وارث ہوئے اور ظاہر ہے۔ کہ وراثت مالی کے لیے ان رشتوں اور قرابتوں میں سے کسی رشتہ دار اور قرابت کا ہونا ضرور ہے جن پر وراثت موقوف ہے۔ سو حضرات شیعہ ہی فرمائیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تو حضرت داؤد علیہ السلام کے فرزند تھے ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کون تھے جو ان کے مال کے وارث ہوئے اور پھر وارث بھی ہوئے تو کیا فدک وغیرہ متروکہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سلیمان علیہ السلام ہی کے ترکہ میں سے آپ کو ملا تھا۔

(آیت يَرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ سے بھی وراثت علمی مراد ہے)

اب آیت فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ کا حال بھی سنئے۔ اس آیت میں میراث مالی مراد ہو تو یہ معنی ہوں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا مال حضرت زکریا علیہ السلام کے

---

[1] مشہور کہاوت ہے یعنی ایک کام میں دوسرا بے محل کام کرنا۔ ۱۲۔ محمد اشرف

[2] حدیث کلینی کی یہ روایت بالمعنی ہے اصل عبارت یہ ہے۔ اِنَّ دَاوٗدَ وَرِثَ عِلْمَ الْاَنْبِيَاءِ وَاِنَّ سُلَيْمَانَ وَرِثَ دَاوٗدَ وَاِنَّ مُحَمَّدًا صلی اللہ علیہ وسلم وَرِثَ سُلَيْمَانَ وَاِنَّا وَرِثْنَا مُحَمَّدًا صلی اللہ علیہ وسلم۔ بے شک حضرت داؤد علیہ السلام انبیاء کے علم کے وارث بنے اور سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے وارث بنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ سلیمان علیہ السلام کے وارث بنے اور ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث بنے۔ اصول کافی ص۲۲۵ طبع تہران۔ ۱۲۔ محمد اشرف

زمانے تک غیر مقسوم رکھا ہوا تھا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے فرزند کا انتظار تھا سو اس عرصہ دراز تک جو کچھ اوپر دو ہزار برس ہوتے ہیں حضرت یعقوب علیہ السلام کا مال ویسے رکھا رہا ہو کسی عاقل کے فہم میں تو آنہیں سکتا۔ ہاں کہیں سے جنون مالیخولیا بھی مل جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ بایں ہمہ اس صورت میں فقط جملہ یَرِثُنِیْ کافی تھا۔ جملہ ثانیہ یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ کی کیا ضرورت تھی کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی وراثت بے وساطت حضرت زکریا علیہ السلام متصور نہیں اور اگر کسی اور کے واسطے سے متصور بھی ہے تو ان کا نام لینا تھا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا ذکر پھر بھی بے محل ہے یہ تو اس صورت میں ہے کہ لفظ آل آیۃ مشارٌ الیہا میں حسب محاورہ عرب زائد ہو اور اگر لفظ آل زائد نہیں تو یوں کہو کہ تمام بنی اسرائیل سے جو اس وقت تک لاکھوں ہوں گے حضرت زکریا علیہ السلام کے فرزند کو وہ قرابت تھی جس کے وسیلہ سے ان سب کے وارث ہو سکتے تھے اور پھر ان سب کا انتقال بھی حضرت زکریا علیہ السلام کے فرزند کے روبرو ہونا چاہیے جو یَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ صحیح ہو۔

علاوہ بریں وہ خوف جو جملہ خِفْتُ الْمَوَالِیَ سے ثابت ہوا اگر بایں نظر تھا کہ آپ کے کنبے کے لوگ آپ کو مسرف نظر آتے تھے ان سے بے جا خرچ کرنے کا کھٹکا تھا تو اس دعائے نیک وارث کی حاجت نہ تھی اپنے آپ خدا کی راہ میں خرچ کر جاتے اور اگر چھوڑ ہی جاتے تو کیا تھا بعد موت تکلیف شرع باقی ہی نہیں رہتی جو کچھ خوف حساب آخرت ہو۔ دوسرے، دوسروں کا کیا انہیں پہ پڑتا جو کرتا وہی بھرتا لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی کلام اللہ میں موجود ہے دعائے مذکور میں یہ اہتمام کر۔

رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِیًّا وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ (پ ۱۶ مریم ع ۱)	(اے میرے رب بوڑھی ہوگئی ہیں میری ہڈیاں اور شعلہ نکلا سر سے بڑھاپے کا اور تجھ سے مانگ کر اے رب میں کبھی محروم نہیں رہا اور میں ڈرتا ہوں اپنے بھائی بندوں سے اپنے پیچھے۔)

کاہے کے لیے کیا گیا۔ ہاں اگر وراثت علمی مراد ہو تو دونوں آیتوں کا سیاق سباق بھی درست ہو جائے اور کوئی خرابی بھی پیش نہ آئے۔

حاصل اس صورت میں یہ ہوگا کہ جو منصب انصاف و ارشاد پہلے حضرت داؤد علیہ السلام کو حاصل تھا ان کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کو ملا اور جو منصب ہدایت زکریا علیہ السلام رکھتے تھے بعد اس منصب کے لیے کسی ولی عہد پسندیدہ کے خواستگار ہیں۔ چنانچہ لفظ ولی کو یرثنی کے ساتھ ذکر کرنا عاقلوں کے نزدیک اس جانب مشیر ہے کہ ولی عہد چاہتے ہیں۔ مثل اہل دنیا فقط فرزندی کے آرزومند نہیں۔ کیسا ہی ہو بلکہ بیٹا ہو یا کوئی اور جو ہو ولی عہد ہو پر ایسا نہ ہو کہ امت کے لوگوں کو خراب کر دے۔ ایسے ولی عہد تو ان کے اقربا میں بھی بہت تھے چنانچہ جملہ اِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ سے ظاہر ہے بلکہ ولی عہد بھی ہو تو پسندیدہ خدا ہو اس لیے جملہ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا بڑھایا۔ اور جب یہ بات ٹھہری تو اب حضرات شیعہ ہی انصاف فرمائیں کہ ولی عہد اور خلیفہ کی وراثت کون سی قسم ہوتی ہے۔ وراثت مالی ہوتی ہے۔ یا مثل خلفائے انبیاء، علماء، وفقراء فقط وراثت ارشاد و تلقین، انصاف وحفظ جان و مال رعایا۔ مگر ہاں شیعوں کے نزدیک شاید ولی عہد انبیاء کرام علیہم السلام ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے نواب و امراء لکھنو و ایران۔ یعنی جس کسی کا مال ہاتھ آیا بے دریغ لیا خواہشات نفسانی میں صرف کیا۔

بہر حال لفظ ولی اور لفظ موالی خود شاہد ہیں کہ وراثت مالی نہیں وراثت علمی اور وراثت ارشاد مراد ہے۔ اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ بعد ذکر بشارت تولد یوں فرمایا۔ یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَاٰتَیْنٰهُ الْحُکْمَ صَبِیًّا (اے یحییٰ اٹھا لے کتاب زور سے اور دیا ہم نے ان کو حکم کرنا لڑکاپن میں) تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام اپنے قرب زمانہ وفات کی طرف دعا رَبِّ اِنِّیْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا میں اشارہ کر چکے تھے۔ اور غرض یہ تھی کہ ولیعہد مذکورہ کی جلدی ہی ضرورت ہے تاکہ اس منصب کو سنبھالے سو خداوند کریم نے ان کی خاطر لڑکپن ہی میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کو کمال علمی اور عملی عنایت فرما کر اُغتیان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی تاکہ معلوم ہو جائے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی مراد یَرِثُنِیْ سے کیا تھی۔ الغرض خداوند کریم تو حضرت زکریا علیہ السلام کا یہ مطلب سمجھے جو اس خاکسار نے عرض کیا۔

حضرات شیعہ اگر کچھ اور سمجھیں تو سمجھا کریں مگر ہاں حضرات شیعہ کا بھی قصور نہیں خدا کو جب

بدلہ واقع ہو تو اگر کسی بندہ کی مراد بھی نہ سمجھے تو کیا بے جا ہے۔ علاوہ بریں وراثت ایک معنی اضافی ہے جس کے لیے دو حاشیوں یعنی مضاف اور مضاف الیہ کی ضرورت ہے سو ایک طرف تو یہی وارث ہے دوسری طرف کبھی مورث کو رکھتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں شخص کا وارث ہے اور کبھی مال مورث کو مثلاً رکھتے ہیں۔ اور یہ مطلب ہوتا ہے کہ یہ مال مثلاً اس کو اس سے میراث میں ملا۔

(قرآن مجید میں وراثت کا استعمال قائمقام میں بکثرت آیا ہے)

بہر حال معنی میراث اس صورت میں یہ ہوتا ہے۔ کہ فلاں شخص فلاں مال میں فلاں شخص کا قائمقام ہوا اور اس پر متسلط ہوا۔

چنانچہ خداوند کریم جابجا مادہ میراث کو اپنے کلام پاک میں انہیں معنوں میں استعمال کرتا ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا (پ ۱۶) — (ہم وارث ہوں گے زمین کے اور جو کوئی ہے زمین پر)

وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ (پ ۲۰) — (اور ہم ہیں آخر کو سب کچھ لینے والے)

ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا (پ ۲۲) — (پھر ہم نے وارث کیے کتاب کے وہ لوگ جن کو چن لیا ہم نے اپنے بندوں میں سے)

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ (پ ۹ اعراف ع ۲۱) — (پھر ان کے پیچھے آئے ناخلف جو وارث بنے کتاب کے۔)

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا (پ ۲۵ زخرف ع) — (اور یہ وہی بہشت ہے جو میراث پائی تم نے)

وغیرہا آیات کو دیکھ لیجئے۔ حسب مراد شیعہ میراث مالی تو بطور معلوم تو ہو ہی نہیں سکتی چنانچہ ظاہر ہے خاص کر دو اوّل کے جملوں میں خداوند پاک کو نہ کسی سے قرابت نسبی حاصل ہے نہ میراث مالی بطور معلوم بن پڑے ہاں معنی قائمقام اور متسلط ہونے کے لیجئے تو البتہ تمام آیات میں برابر چل پڑے۔

(کتب شیعہ میں مادہ وراثت کا میراث علمی میں استعمال)

بلکہ شیعوں کو یاد نہیں ان کی احادیث میں بھی یہی مادہ وراثت میراث علمی میں مستعمل ہے کلینی کی ایک حدیث میں جس کو پورا پورا انشاء اللہ آگے نقل کروں گا یہ لفظ بھی ہیں۔

إِنَّ الْأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِرْهَمًا وَلَا دِينَارًا وَإِنَّمَا أَوْرَثُوا أَحَادِيثَ مِنْ أَحَادِيثِهِمْ الخ (اصول کافی صہ ۳۲/۱۴ طبع تہران) — (بے شک انبیاء کرام کسی کو درہم کا وارث نہیں بناتے اور نہ دینار کا وہ تو صرف احادیث (علم) کا وارث بنا کر جاتے ہیں)

کو دیکھئے میراث مالی پر دلالت کرتا ہے یا میراث علمی پر بھی اس لطف سے دلالت کرتا ہے کہ انبیاء
کی نسبت میراث مالی کی سراسر نفی کر دی جس کے بعد انصاف سے دیکھئے تو شیعوں کو مجال ومنزدن
باقی ہے۔ اور نہ سنیوں کو اور کسی جواب کی ضرورت۔

مگر اس پر بھی شیعہ نہ مانیں تو پھر ان کو موافق مثل مشہور "گوہ کی دارومدت" خوارج ہی کے حوالہ۔

(وراثت علمی اور وراثت مالی میں کوئی تلازم نہیں کہ ایک دوسرے پر ضرور دلالت کریں)

بالجملہ میراث ایک معنی اضافی ہے اور حاصل اس کا قائمقام اور متسلط ہو جاتا ہے۔ سو اول تو قائم مقام
ہونا الخ ایسا مضمون ہے کہ اموال ہی کے ساتھ مخصوص نہیں جو لفظ وَرِثَ اور یَرِثُ کو دیکھ کر
دھوکہ کھایئے۔ دوسرے اضافت اور نسبت اور ہے اور اطراف اضافت و نسبت اور۔ جو ایک
کے لیے لفظ موضوع ہو وہ دوسرے پر دلالت نہ کرے گا اور بطور التزام اگر دلالت کرے گا۔ بقدر
لزوم و التزام دلالت کرے گا جیسا مضمون غسل مفہوم آب پر بالالتزام دلالت کرتا ہے مگر
ظاہر ہے کہ دلالت التزامی وہیں متصور ہے۔ جہاں لزوم ہو جیسے غسل کے لیے آب لازم ہے اور جہاں
نہ ہو جیسے قائمقام ہونے کے لیے مال لازم نہیں وہاں دلالت مطابقی تو کیا دلالت التزامی بھی متصور نہیں
بالجملہ اضافت مطلقہ، مطلق مضاف یا مضاف الیہ قابل انتساب و اضافت کی خواستگار ہے۔
خصوصیت مال کہاں سے نکال لی۔ ہاں یوں کہیئے کہ بوجہ کثرت وقوع میراث مالی لفظ میراث کا
استعمال میراث مالی میں بکثرت ہوتا ہے اس لیے عوام اسی کو میراث سمجھنے لگے۔ مگر علماء شیعہ کو
دیکھئے کہ یہ بھی عوام ہی کے مقلد ہو گئے۔ اس تقریر کو سن کر اہل فہم کو یہ یقین ہو گیا ہو گا کہ میراث وراثت
مالی اور وراثت علمی وغیرہ سے عام ہے اس لیے مدعیان میراث مالی کا کام نہیں چل سکتا نہ آیت
وَوَرِثَ سُلَيْمَانُ ان کو مفید ہے نہ آیت فَهَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا يَرِثُنِي وَيَرِثُ
مِنْ آلِ يَعْقُوبَ ان کی مؤید اور نہ حدیث بخاری جس میں حضرت علیؓ کا خلافت ثانیہ میں طالب
میراث ہونا موجود ہے۔ ان (شیعہ) کے کار آمد ہے۔ اس لیے کہ اس وقت اگرچہ حدیث لَا نُوْرَثُ
کے بھول جانے کا احتمال بہت مستبعد ہے۔ حضرت فاطمہؓ اور خلیفہ اولؓ کا جھگڑا طے شدہ از بام
ہو چکا تھا مگر بقرینہ سیاق و سباق بعد ثبوت عموم مذکور میراث تولیت تھی جس کا ثبوت بہ نسبت حضرت
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آگے انشاء اللہ معلوم ہو جائے گا۔

جب اس بحث سے بحمد اللہ فراغت پائی تو خلاصہ تقریر گذشتہ کی طرف اشارہ کرکے آگے چلتا ہوں۔

حاصل بحث۔ آیت یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ میں وراثت کا مدار موت ہے اور حدیث لَا نُوْرَثُ میں حیات کا اثبات ہے اور اسکی عقلی مثال)

مخدوم من! یہ بات تو روشن ہوگئی کہ حدیث لَا نُوْرَثُ نہ آیت یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ کی ناسخ نہ آیت وَرِثَ سُلَیْمَانُ اور آیت یَرِثُنِیْ کے معارض۔ ناسخ نہ ہونے کی تو وجہ یہ ہے کہ آیت یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْ اَوْلَادِکُمْ بقرینہ آیت سابقہ

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِہِمْ نَارًا وَّسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا (پ۴ سورہ نساء ع۱)

(جو لوگ کہ کھاتے ہیں مال یتیموں کا ناحق وہ لوگ اپنے پیٹوں میں آگ ہی بھر رہے اور عنقریب داخل ہوں گے آگ میں)

اور نیز باجماع جملہ فرقہا اہل اسلام اس تقسیم پر دلالت کرتی ہے جو بعد انقطاع علاقہ فیما بین روح وجسم ہونی چاہیئے اور حدیث لَا نُوْرَثُ عدم انقطاع علاقہ پر دلالت کرتی ہے۔ اس صورت میں یہ قصہ ایسا ہوگیا۔ جیسا کوئی طبیب حاذق کسی مریض سکتہ کو یوں کہے کہ یہ شخص مرا نہیں اس کو مردہ سمجھ کر اس کے مال کو میراث میں تقسیم مت کرو۔ سو جیسا قول طبیب مذکور ناسخ آیت یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ اور رافع حکم مذکور نہیں ایسے ہی قول نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ناسخ حکم مذکور نہیں۔ بلکہ مثل قول طبیب مذکور عدم تحقق شرط میراث مالی یعنی عدم انقطاع علاقہ حیات کی خبر دیتا ہے۔ اور آیت وَرِثَ سُلَیْمَانُ دَاوٗدَ اور آیت یَرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ سے معارض نہ ہونے کی یہ وجہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں تو بوجوہ مذکورہ میراث علم وارشاد وخلافت مراد ہے۔ اور حدیث لَا نُوْرَثُ میں بقرینہ جملہ مَا تَرَکْنَا صَدَقَۃٌ میراث مالی مراد ہے اگر دونوں جا ایک ہی قسم کی میراث مراد ہوتی تو بے شک تعارض ہوتا۔

جب خلاصہ تقریر جواب معلوم ہوگیا۔ تو آگے سنیئے اہل سنت وجماعت کو بمقابلہ طعن فدک جو حضرات شیعہ کرتے ہیں تصحیح حدیث لَا نُوْرَثُ کے لیے ایک احتمال ممکن بہ نسبت بقائے حیات کافی ہے بلکہ حدیث لَا نُوْرَثُ ہوتی یا نہ ہوتی۔ حضرت ابوبکر صدیق رض کی طرف سے فدک نہ دینے کے لیے احتمال بقائے حیات بطور معروض مدافعت طعن شیعہ کے لیے بہت تھا اثبات حیات کی ضرورت نہ تھی۔

کیونکہ وجہ ثبوت مدعی کے ذمہ ہوتی ہے مدعا علیہ کو بعد امکان احتمال مخالف دعوئے مدعی فقط لَا نُسَلِّمُ کافی ہوتا سو دعوئ میراث میں شیعہ مدعی ہیں اور سُنی مدعیٰ علیہ۔ دلیل لائیں تو شیعہ لائیں۔ سنیوں سے بقائے حیات کی دلیل طلب نہ فرمائیں مگر بایں ہمہ خاطر حضرات شیعہ عزیز ہے ان کی تسکین کے لیے کسی قدر اثبات حیات سرور کائنات علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وازواجہ افضل الصلوات والتسلیمات بھی یہی اس لیے معروض ہے۔

(مسئلہ حیات سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم) کہ صورت اجتماع موت وحیات کی سمجھا دینے کے بعد ہم اس بات کے بھی مدعی ہیں کہ علاقہ فیما بین روح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وجسم مبارک عروض موت سے منقطع نہیں ہوا۔ دلیل بکار ہے تو ایک اِنّی لیجئے دوسری لمّی۔

(دلیل اِنّی) اوّل کی تقریر تو یہ ہے کہ سورۂ نساء میں لَا تَنْکِحُوا مَا نَکَحَ آبَاءُکُمْ فرما کر حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّهَاتُکُمْ وَبَنَاتُکُمْ الخ فرمایا۔ اور تمام محرمات کو بیان فرما کر ارشاد وَاُحِلَّ لَکُمْ مَا وَرَاءَ ذٰلِکُمْ سے گرفتارانِ ہوا وہوس کی تسکین فرمائی۔ حاصل کلام یہ ہے کہ سوائے محرمات مندرجہ آیات سابقہ اور سب تمہارے لیے حلال ہیں اس کے بعد سورت احزاب میں یہ ارشاد ہوا۔

مَا کَانَ لَکُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ	(اور تم کو نہیں پہنچتا کہ تکلیف دو اللہ کے رسول کو
وَلَا اَنْ تَنْکِحُوْا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ	اور نہ یہ کہ نکاح کرو اس کی عورتوں سے اس کے
اَبَدًا۔[1] (پ ۲۲ سورۃ احزاب ع ۷)	پیچھے کبھی)

اور ظاہر ہے کہ یہ حکم حرمت بھی مثل حکم حلت مشارٌ الیہ تمام امت کی نسبت ہے۔ کسی ایک دو کی تخصیص نہیں۔ اور ظاہر ہے اور فریقین کے نزدیک مسلم، کہ نسخ وتخصیص کا اسی وقت قائل ہونا چاہیئے کہ تطبیق کی کوئی صورت نہ ہو یہاں اگر یوں کہا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ اسی آیت میں اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمًا کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ کہ ازواج مطہرات سے نکاح کرنے کو بہت بڑا گناہ فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر میں زندہ ہیں اور اسی وجہ سے آپکی وراثت نہیں اور نہ ہی آپ کی ازواج سے نکاح درست ہے۔ (تفسیر مظہری ص ۳۸۹ ج ۷) ۱۲۔ محمد اشرف۔

کی حیات جسمانی اور علاقہ مذکور عروض موت سے زائل نہیں ہوا اور اس وجہ سے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا نکاح منقطع نہیں ہوا تو ہرگز کوئی صورت تعارض کی نہ رہے گی جو نسخ یا تخصیص کے قائل ہونے کی ضرورت پڑے بلکہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اس صورت میں منجملہ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ ہو جائیں گی۔

(سوا حیات کے موجبات تحریم میں سے کوئی وجہ ایسی نہیں کہ تمام امت کے حق میں عام ہو)	ہاں اگر کوئی وجہ تحریم موجبات تحریم میں سے ایسی عام ہو سکتی کہ تمام امت کے حق میں موجب

حرمت ہو جاتی تو البتہ ممکن تھا کہ باوجود انقطاع علاقہ فیما بین روح پر فتوح و جسم منور حضرت ساقی کوثر صلی اللہ علیہ وسلم اور باوجود زوال حیات جسمانی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم، ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن تمام امت کے حق میں حرام ہو جائیں مگر موجبات حرمت مندرجہ آیات مشار الیہ میں کوئی ایسی وجہ نہیں جو اس کے بھروسہ کسی عورت کو تمام جہان کے حق میں حرام کہہ سکیں کیونکہ نہ کوئی عورت سارے جہان کے باپوں کی منکوحہ ہو سکے نہ سارے جہان کی والدہ نہ سارے جہان کی دختر علیٰ ہذا القیاس۔ البتہ کسی کی منکوحہ تا بقائے نکاح سارے جہان کے حق میں حرام ہوتی ہے۔ یا متوفّٰی عنہا زوجہا تا بقائے عدت۔ اور ظاہر ہے کہ محصنات کی یہی دو قسمیں ہیں بحکم۔

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ أَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّعَشْرًا۔ (پ۲ بقرہ ع۳۰)

(اور جو لوگ مر جاویں تم میں سے اور چھوڑ جاویں اپنی عورتیں تو چاہیئے کہ وہ عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن)

سارے جہان کے اموات کی ازواج کی عدت کل دس دن چار مہینے ہیں اور حاملہ ہو تو بحکم وَأُولَاتُ الْأَحْمَالِ أَجَلُهُنَّ أَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ۔ عدت مذکورہ تا وضع حمل ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حمل کی مدت نو مہینے ہیں زیادہ ہو تو دو برس اور اس سے زیادہ ہو سکے تو چار پانچ برس کہہ لو قیامت کا حساب کتاب تو ہوتا ہی نہیں۔

بایں ہمہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں دم وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم باتفاق مؤرخین فریقین کوئی ام المؤمنین حاملہ تھی بھی نہیں۔ اس صورت میں پھر وہی گذارش ہے کہ نسخ و تخصیص تو جبھی جائز ہے کہ تطبیق ممکن نہ ہو اور یہاں بوجہ امکان اجتماع موت و حیات انطباق ممکن۔ یعنی جب یوں

کہیئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب بھی بدستور عالم دنیا (روضہ مبارک) میں زندہ ہیں آپ کا علاقہ حیات روحانی جو جسم اطہر سے منقطع ہوا ہی نہیں جو عدت مذکورہ کی نوبت آئے۔ اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ کے بعد مِنكُمْ بھی بڑھایا۔ علیٰ ہذا القیاس اِنَّكَ مَيِّتٌ جدا فرمایا اور اِنَّهُم مَّيِّتُونَ جدا فرمایا اور دونوں کو مثل جملہ لاحقہ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِندَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ (پھر تم قیامت کے دن اپنے رب کے آگے جھگڑو گے) ایک خطاب میں اکٹھا نہ کر دیا تاکہ وقائع شناساں معانی سنج کو اس جانب تنبیہ رہے کہ موت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور قسم کی ہے اور موت امت اور قسم کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موت میں استتار حیات زیر پردہ موت یا زیر پردہ موجب موت ہوتا ہے اور امت کی موت کے وقت زوال حیات کل یا بعض ہو جاتا ہے۔ مثال درکار ہے تو وہی کسوف وخسوف (کی) ہے یا چراغ کا کسی ہنڈیا میں بوسیلہ سرپوش بند ہو کر مکان میں اندھیرا ہو جانا یا گل ہو کر چاندنی کا زائل ہو جانا ہے سو جیسے کسوف میں استتار نور اور خسوف میں زوال نور ہوتا ہے اور نور چراغ پہلی صورت میں مستور اور دوسری صورت میں زائل ہو جاتا ہے اور اندھیرا ہو جانے کے لیے خسوف وکسوف اور چراغ کا بند ہو جانا اور گل ہو جانا دونوں برابر ہیں ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب استتار حیات ہوا اور امت کی جانب زوال حیات اس لیے اخبار وقوع موت کے وقت اِنَّكَ مَيِّتٌ جدا کہا اور اِنَّهُم مَّيِّتُونَ جدا کہا۔

اور بیان احکام متفرعہ علی الموت کے ہر ایک وقت کا حکم جدا بتلا دیا یعنی نکاح متوفی عنہا زوجہا میں تو یوں تفریق فرمائی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات سے کوئی نکاح نہ کرنے پائے۔ چنانچہ ارشاد لَا اَنْ تَنكِحُوا اَزْوَاجَهُ مِنْ بَعْدِهِ اَبَدًا سے ظاہر ہے اور ازواج امت کے حق میں یہ ارشاد کر دیا۔ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ الخ۔

(آیت توفی میں مِنكُمْ کا خطاب امت کو ہے اور عدت موجب حرمت ہے اور ازواج مطہرات میں امہات ہونا موجب حرمت ہے) چونکہ ان لا تنکحوا کی مخاطب امت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں۔ یہاں بھی منکم کے مخاطب وہی ہوں گے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خارج ہوں گے ورنہ اضافہ مِنكُمْ لغو وبیکار تھا اتنا کام تو فقط وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ سے بھی چل سکتا تھا اور یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ آیت وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ میں مِنْ اَزْوَاجِكُمْ

نہ بڑھایا کیونکہ اس حکم میں مطلقات اور متوفی عنہن ازواجہن دونوں داخل ہیں اور ظاہر ہے کہ طلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی متصور ہے۔ بایں ہمہ مطلقات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مدخولہ بہا جو امت پر حرام رہیں تو بوجہ لقاء عدت حرام نہیں بلکہ وجہ اس کی جملہ وَاَزْوَاجُہٗٓ اُمَّہٰتُہُمْ سے ماخوذ ہے۔ یعنی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا امہات المومنین ہونا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابو المومنین ہونے کو مقتضی ہے اور اس وجہ سے منجملہ مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ ہیں اور بحکم لَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ سب پر حرام ہیں۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابوت بہ نسبت مومنین خود اس بات کو مستلزم ہے کہ آپ بدستور زندہ ہیں۔ چنانچہ انشاء اللہ یہ بات عنقریب روشن ہونے والی ہے۔ مگر اس صورت میں یہ قصہ ایسا ہوگا کہ کوئی متوفی عنہا زوجہا بعد انقضاء عدت بوجہ نسبت یا رضاع وغیرہ اسباب کے کسی پر حرام ہے سو جیسے وہ حرمت بوجہ عدت نہیں اور اس وجہ سے منجملہ وَالْمُحْصَنٰتُ نہیں کہہ سکتے۔ ایسے ہی یہاں یہ بھی سمجھئے۔ غرض عدت مطلقہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اگر حاملہ ہوتی وہی وضع حمل تھی آپ کی ازواج کی کوئی جدا عدت نہ تھی۔ اس لیے وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ کے بعد مِنْ اَزْوَاجِكُنَّ نہ فرمایا۔ اور عدت وفات چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں متصور ہی نہ تھی تو وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ کے بعد مِنْکُمْ بھی بڑھایا۔

(عدت کی اصل وجہ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ کی آیت سے ماخوذ ہے)

رہی متصور نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وفات و موت اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور امت دونوں کو عارض ہوتی ہے مگر عدت کی علت فقط موت اور وفات ہی نہیں بلکہ علت عدت وہ امر ہے جو نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ سے ماخوذ ہے جس کے باعث منکوحات غیر کا نکاح ناجائز۔

(ایک وقت میں ایک عورت کیلئے متعدد خاوندوں کے نہ ہونے کی وجہ)

رہا مردوں کی طرح عورتوں کو ایک وقت میں متعدد نکاحوں کی اجازت نہ ملی تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ بارشاد نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ اس جانب اشارہ فرمایا کہ نکاح سے مقصود اولاد ہے فقط شہوت رانی اور لذت جماع مقصود نہیں بلکہ شہوت اس پیداوار کے حق میں ایسی ہے جیسے کھیتی کا سامان غلہ کے لیے یا کھانے کی خواہش بدل ما یتحلل کے لیے موافق شعر مشہور ؎

خوردن برائے زیستن و ذکر کردن است تو معتقد کہ زیستن از بہر خوردن است

بیج جیسے اصل بدل ما یتحلل ہے اور بھوک اور کھانے کا مزہ اسکے حصول کا سامان، یا کھیتی میں اصل مقصود پیداوار ہوتی ہے اور کھیتی کا سامان اس کے حصول کی تدبیر۔ ایسے ہی اصل مقصود عورتوں سے اولاد ہے اور شہوت اور لذت جماع اس کے حصول کی تدبیر اور اگر لذت جماع اور شہوت رانی ہی مقصود ہوتی تو زنا بھی بشرط رضی طرفین ہرگز ممنوع نہ ہوتا۔ بالجملہ نکاح سے مقصود اصلی اولاد ہے کیونکہ عورتیں اگر کھیت ہیں تو اسی پیداوار کی کھیت۔ اس صورت میں اگر عورتوں کو زمانہ واحد میں متعدد نکاحوں کی اجازت ہو تو اس کے سارے خاوند اولاد میں اسی طرح شریک ہوں گے جیسے ایک زمین کی پیداوار میں تمام زراعت کے تمام شریک مگر غلہ کی تقسیم میں تو کوئی دقت نہ تھی اس کی اجازت رہی۔ اولاد کی تقسیم کی کوئی صورت نہیں اگر ایک ہی بچہ ہوا تب تو ظاہر کہ کاٹ سکیں نہ بھانٹ سکیں نہ وقت واحد میں ایک بچہ دونوں کے پاس رہ سکے۔ اور اگر نوبت بہ نوبت ہر ایک کے پاس رہا کرے تو یہ بھی بن نہیں پڑتا اس لیے کہ غلام و زوج وغیرہ اشیاء جن میں نوبت جاری ہوتی ہے بذات خود مقصود نہیں ہوتے غلام سے خدمت اور خاوند سے قضاء حاجت یا اولاد مقصود ہوتی ہے اس لیے ان سے دلی محبت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ غلام کی بیع و شراء اور خاوند سے خلع جائز رہا۔ اگر بذات خود مقصود ہوتے تو جدائی کسی کو گوارا نہ ہوتی اور خدا کی طرف سے جدائی کی اجازت نہ ملتی۔ اور اولاد خود بذات خود مقصود ہوتی ہے ان کی محبت بے واسطہ ہے اس لیے عقوق والدین اور اپنے نسب کا انکار ممنوع بلکہ کبیرہ گناہ ٹھہرا اور برّ والدین منجملہ حسنات اور باقیات صالحات۔ اور جب اولاد مقصود بالذات ٹھہری چنانچہ جملہ نِسَآؤُکُمۡ حَرۡثٌ لَّکُمۡ ہی خود اس جانب مشیر ہے تو اب تقسیم بطور نوبت میں حصول مقصود بوجہ اتم معلوم۔ ایک اگر کامیاب ہوگا تو دوسرا ابتلاء درد فراق رہے گا اور اگر اولاد کثیر ہوئی اور ازواج پر صحیح تقسیم بھی ہو سکی تب بھی یہ نہیں کہ مثل غلہ آدھا مثلاً یہ لے جائے آدھا وہ۔ کیونکہ غلہ سے قضاء حاجت مقصود ہے بذات خود مقصود نہیں اور اس امر میں یہ ڈھیر ہو یا وہ سب برابر ہیں اور اولاد سب کی سب بذات خود مقصود سب سے برابر محبت ہے در صورت تقسیم اگر ایک کو وصال سے مسرور ہوگا تو دوسرے کو فراق ستائے گا۔ اس لیے در صورت جواز تعدد نکاح تقسیم اولاد کی کوئی صورت نہ تھی۔

(متعدد خاوندوں کی صورت میں خرابیاں)

اور یہ بات کہ جب تک حمل رہ کر بچہ پیدا ہو۔ ایک ہی کے تصرف میں رہے دو وجہ سے ممکن نہ تھا۔

ایک تو یہ کہ استحقاق دونوں کا برابر، باوجود ملک بضعہ ایک کو اجازت ہو دوسرے کو نہ ہو خلاف انصاف ہے۔ ہاں انتفاع بقدر معتد بہ یعنی جماع وقت واحد میں دونوں سے متصور نہیں۔ سو اگر تہائی اور تناوب ہوا یعنی نوبت بہ نوبت منتفع ہونے کی اجازت ہوتی تو بضرورت عدم امکان اجتماع فی الجماع مثل نوبت زنان شب دو شب کی نوبت مقرر ہوتی۔

اتنا زمان طویل جو ایک کے حق میں عیش طویل دوسرے کے حق میں حسرت دراز ہو ہرگز قابل تقرر نوبت نہ تھا۔

دوسرے حمل کے رہنے کے لیے کوئی زمانہ ایسا مقرر نہیں کہ خواہی نخواہی اس موسم میں یا اس قدر مدت میں علوق نطفہ ہو ہی جایا کرے پھر وضع حمل کے لیے کوئی مدت ایسی معین نہیں جو اس سے کم و بیش متصور نہ ہو اس لیے نوبت کی تساوی اور عدل فی النوبت کی کوئی صورت نہ نکلی جو مثل غلام و زوج کہ نوبت بہ نوبت سب آقاؤں اور تمام بی بیوں کے پاس رہ سکتا ہے۔ ایک عورت سب خاوندوں کے پاس برابر رہ سکتی اور کوئی فساد اس وجہ سے پیش نہ آتا اگر تھی تو یہی ایک صورت تھی کہ نوبت بہ نوبت طہر واحد میں متعدد خاوند زن واحد سے منتفع ہوا کرتے۔ مگر ظاہر ہے کہ اس صورت میں در صورت تولد اولاد یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کس کے نطفہ سے پیدا ہوا ہے اور اگر کسی قرینہ سے معلوم بھی ہو جائے تو اتنی بات معلوم ہو گی کہ اول کس کا نطفہ رحم زن میں ٹھہرا۔ یہ بات کیونکر معلوم ہو کہ دوسروں کا نطفہ بعد میں بھی شامل نہیں ہوا۔ بایں ہمہ دوسروں کا منہ اتنی بات سے بند نہیں کر سکتے۔ ہر خاوند کو اس وقت میں دعویٰ کی گنجائش ہو گی اور ایک نزاع عظیم برپا ہو گا۔ بالجملہ وجہ عدم جواز تعدد نکاح عورت کے وقت واحد میں یہ ہے۔

عدت وفات چار ماہ اور دس دن مقرر کرنے کی حکمت

مگر یہ بات بعد وفات زوج جب تک باقی ہے کہ بالیقین حاملہ ہو تو وضع حمل ہو جائے اور شبہ حمل ہو تو وہ شبہ مٹ جائے مگر شبہ حمل کے مٹ جانے کی عمدہ صورت اگر ہے تو یہ ہے کہ کچھ اوپر تین چلوں تک انتظار کیا جائے وجہ اس کی یہ ہے کہ بشہادت احادیث صحیحہ ایک چلہ تک نطفہ اپنی ہیئت اصلی پر رہتا ہے یعنی نطفہ رہتا ہے گو کسی قدر کیفیت اصلی بدل جاتی ہو اور ایک چلہ تک علقہ (خون بستہ) رہتا ہے اور ایک چلہ تک مضغہ (گوشت کا لوتھڑا) رہتا ہے بعد تینوں چلے پورے ہو جانے کے نفخ

روح کی نوبت آتی ہے۔ سو بمجرد نفخ روح اتنی طاقت کہاں کہ حرکات ظاہر ہوں البتہ دس روز میں اتنی طاقت متصور ہے اور پھر جوں جوں دن زیادہ ہوتے جائیں گے طاقت بڑھتی جائے گی۔ چنانچہ نفخ روح سے جوانی تک روز بروز زور افزوں رہتا ہے۔ بالجملہ شروع حرکات بعد نفخ روح کسی قدر دیر کے بعد متصور ہے سو خداوند علیم کو معلوم ہوگا کہ دس دن میں یہ بات ہوتی ہے اب دیکھیے کہ چار مہینوں کے تو وہی تین چلے ہوئے دس دن اور اوپر بڑھا کر عدت مقرر کی تاکہ بوسیلہ مشاہدہ حرکات جو رحم میں بچہ کرتا ہے کسی کو یہ احتمال باقی نہ رہے کہ حمل نہیں مرض رجا[1] ہے اور ظاہر ہے کہ سوا اس کے اور کسی طرح پر یقین نہیں ہو سکتا کہ حمل نہیں۔ خون آنے کی علامت عدم حمل رکھیے تو خون ایام حمل میں بھی آجاتا ہے حیض کہو یا استحاضہ یا نفاس سو بعد مرور ایام عدت یعنی چار ماہ دس دن کے بعد اگر حمل نہ نکلا تو اختیار ہے ورنہ موافق اشارہ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ دربارہ نکاح وضع کا اور انتظار کرنا پڑے گا۔

(عدت وفات ظہور حمل کے لیے ہے اور بصورت ثبوت حمل وضع حمل تک ہے لہذا سورۃ بقرہ اور سورۃ طلاق کے حکم میں تعارض نہیں) اس صورت میں آیت وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ اور آیت وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ میں کچھ تعارض نہ رہے گا کیونکہ يَتَرَبَّصْنَ کا مفعول اس صورت میں ظہور الحمل مثلاً ہوگا اور ادھر کوئی ایسا مضمون نہیں جس سے اجازت نکاح بمجرد مرور ایام عدت معلوم ہو باقی جملہ لاحقہ۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ

(پھر جب پورا کر چکیں اپنی عدت کو تو تم پر کچھ گناہ نہیں اس بات میں کہ کریں وہ اپنے حق میں قاعدہ کے موافق)

(پ۲ بقرہ ع ۳۰)

سے کوئی دھوکہ نہ کھائے۔ اس لیے کہ لفظ بِالْمَعْرُوْفِ میں معروف موجود ہے پھر باوجود آیت وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ حاملہ متوفی عنہا زوجہا کے حق میں بمجرد مرور دس دن چار ماہ کے نکاح کو کون معروف کہہ دے گا۔ علاوہ بریں مطلقات کی عدت میں اوّل تو یہ ارشاد فرمایا۔

---

[1] رجا حمل کاذب کو کہتے ہیں۔ ۱۲ سواتی۔

وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ ط بعد ازاں ارشاد کیا۔ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ط (پ بقرہ ع) (اور طلاق والی عورتیں انتظار میں رکھیں اپنے آپ کو تین حیض تک اور ان کو حلال نہیں کہ چھپا رکھیں جو پیدا کیا اللہ نے ان کے پیٹ میں اگر وہ ایمان رکھتی ہیں اللہ پر اور پچھلے دن پر۔)

جب یہاں یہ ارشاد ہے حالانکہ وجہ انتظار ثَلٰثَةَ قُرُوْءٍ یہاں امید رضاء زوج ہے۔ اندیشہ اختلاط نطفہ نہیں تو جہاں وجہ انتظار عدت، خود اندیشہ اختلاط نطفہ ہے وہاں حاملہ سے مجامعت کیونکر منجملہ معروفات ہو سکتی ہے۔

(مطلقہ میں تین حیض تک انتظار کی وجہ خاوند کی رضا اور اس کا رجوع ہے) تفصیل اس اجمال کی سننی ہے تو سنیئے ارباب وجدان صحیح اور اصحاب طبائع سلیمہ کو معلوم ہوگا کہ اصل نکاح تراضی طرفین اور اصل طلاق تخالف طرفین ہوتا ہے۔ مگر تراضی تو مقتضیات طبعی میں سے ہے کیونکہ زن و مرد علاوہ اتحاد نوعی کے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ احتیاج مباشرت و جماع تو ظاہر کیا اظہر ہے۔ اس کے سوا عورت نان و نفقہ میں مرد کی محتاج۔ کمانا اصل میں مردوں ہی کا کام ہے اور مرد کھانے پکانے انتظام امور خانہ داری وغیرہ میں عورت کا محتاج ہے اس صورت میں شکر رنجی باہمی اکثر امر عارضی ہوا کرتی ہے جس کے زوال کی توقع اور امید بے جا نہیں بجا ہے اور ظاہر ہے کہ اس وقت اس تراضی کو جو اصل موجب نکاح تھی زائل نہیں کہہ سکتے بلکہ اگر ہوتا ہے تو گمان غالب اس کے استتار کا ہوتا ہے۔ ہاں یہ بھی ایک احتمال ہوتا ہے کہ تنفر کی کوئی وجہ قوی ہو جس کے زوال کی کوئی صورت نہ ہو اس لیے کسی قدر انتظار ضرور ہوا۔ سو انتظار کے لیے عمدہ زمانہ وہ ہے جس میں مکرر موجبات رغبت کا ظہور ہو یعنی تین حیض یا تین طہر مقرر ہوئے۔ تاکہ تین طہر کی نوبت آئے اور عورت پاک صاف ہو کر نہا دھو کر پوشاک و زیور سے آراستہ ہو کر مکرر سہ کرر خاوند کو لبھائے اس حال میں اگر اس کی ناخوشی اوپر اوپر کی تھی تب تو ظاہر ہے کہ خاوند اس دلربائی پر پھر دل دے بیٹھے گا اور اگر اب بھی وہی کشیدگی رہی تو معلوم ہوا کہ نکاح ٹوٹ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بعد مرور عدت رجعت کا اختیار نہیں اگر ہو تو نکاح جدید ہو اور طلاق مغلظہ میں باوجود قطع امید رجعت، جو عدت وہی تین قروء رہی تو اس کی وجہ یہ ہے کہ احکام اصلیہ موانع خارجیہ سے زائل نہیں ہو جاتے۔

اگر یہ نہ ہوتا تو دائم الحبس بھی مثل مردہ سمجھا جاتا۔ اس کا نکاح ٹوٹ جاتا اس کا مال میراث میں بٹ جاتا اور جب احکام اصلیہ عوارض خارجیہ سے زائل نہیں ہوتے تو یہاں بھی کسی طلاق کا مرتبہ اولیٰ یا ثانیہ، ثالثہ میں واقع ہو جانا ایک حالت عرضی ہے۔ تیسرا ہونا طلاق کی ذاتیات یا اوصاف ذاتیہ میں سے نہیں۔ بہرحال مطلقات میں علتِ تقررِ عدت، انتظار رضائے زوج ہے جب وہاں یہ حکم ہے کہ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ تو متوفیٰ عنہا زوجہا کے لیے تو وجہ تقرر عدت معلوم خود یہی اندیشہ اختلاط نطفہ غیر ہے یہاں کیونکر وہ حکم نہ ہوگا۔ مگر طلاق میں چونکہ وجہ عدت کچھ اور تھی تو وہاں لَا يَحِلُّ لَهُنَّ کی تصریح ضرور تھی اور یہاں علت تقرر عدت خود وہی اندیشہ تھا جس کی مدافعت کے لیے لَا يَحِلُّ لَهُنَّ فرمایا اس لیے مصرح کہنے کی حاجت نہ ہوئی۔ الحاصل آیت مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَآ اَنْ تَنْكِحُوْٓا اَزْوَاجَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖٓ اَبَدًا الآیت وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَاۗءَ ذٰلِكُمْ کو ملائیے تو بعد لحاظ کر اس امر کے کہ سوا محصنات و منکوحات ہوں یا متوفیٰ عنہا زوجہا اور عورتیں سارے جہاں پر حرام نہیں ہو سکتیں۔

(حاصل کلام) اہل علم کو اس میں شبہ نہیں رہ سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدستور اول زندہ ہیں اور آپ کا علاقہ حیات جو فیما بین روح پر فتوح اور جسم اطہر تھا ہنوز اسی طرح قائم ہے جس طرح تھا۔ اور اگر کسی نے بوجہ ام المؤمنین ہونے کے بلحاظ آیت وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاۗؤُكُمْ ان کو حرام کہا بھی تو ان کا ام المؤمنین ہونا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ابو المؤمنین ہونے کو مستلزم اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ابو المؤمنین ہونا ان کے زندہ ہونے کو مقتضی ہے چنانچہ دلیل لمی سے (جو بنسبت حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم موعود ہے یہ امر آشکارا ہو جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ دلیل یہ ہے۔

(دلیل لمی سے حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ثبوت) خداوند کریم نے سورہ احزاب میں فرمایا ہے۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ (نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے اور اس کی عورتیں ان کی مائیں ہیں)

(پ ۲۱ احزاب ع ۱)

دلیل لمی: علت واقعیہ کو لفظوں میں علت بنانا۔ دلیل اِنّی واقعہ میں معلول کو لفظوں میں علت بنانا۔ محمد اشرف

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مومنین کیلئے ان کی جانوں سے اقرب اور محبوب ہونا)

اولی کی تفسیر اقرب ہے اور حاصل مطلب یہ ہے کہ نبی مومنوں کی جانوں سے بھی زیادہ مومنوں سے نزدیک ہے مگر سب جانتے ہیں کہ نبوت و ولایت واولویت بمعنی اقربیت ہو یا بمعنی احبیت واولویت بالتصرف اصل میں اوصافِ روحانی ہیں۔ اوصاف جسمانی نہیں۔ نبوت و ولایت واولویت بالتصرف اور اولویت بمعنی اقربیت کا حال تو خود ظاہر ہے ہاں احبیت میں شاید کسی کو شبہ ہو۔ سو اس کے مٹانے کی یہ تدبیر ہے کہ محبوبیت جمالی تو البتہ احوال واوصاف جسمانی میں سے ہے مگر محبوبیت فی اللہ بالیقین ہر خاص وعام کے نزدیک اوصاف واحوال روحانی میں سے ہے اور ظاہر ہے کہ محبوبیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حب فی اللہ کے سبب ہے کسی جمال وکمال جسمانی کے باعث نہیں۔

(روح پر فتوح صلی اللہ علیہ وسلم ارواح مومنین کی نسبت ذات اور منشأ انتزاع ہے اور ارواح مومنین اوصاف ذاتیہ اور انتزاعیات ہیں)

ہاں یہ بات باقی رہی کہ یہاں اولویت کے کیا معنی ہیں سو ہمارے نزدیک اولیٰ بمعنی اقرب ہے اور یہ اقربیت اس بات کو مقتضی ہے کہ روح پر فتوح صلی اللہ علیہ وسلم منشأ انتزاع ہو اور ارواح مومنین انتزاعیات۔ روح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم علت بمعنی مصدر وجود ارواح مومنین معلول بمعنی صادر، بہر حال علت کہو یا منشأ انتزاع معلول کہو یا امر انتزاعی، مطلب ایک ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ اقربیت اور ابعدیت کے یہ معنی ہیں کہ اگر اس طرف کو حرکت کی جائے تو جو اقرب ہو وہ پہلے آئے جو ابعد ہو وہ بعد میں آئے سو ایسی اقربیت کہ اپنے سے بھی زیادہ قریب ہو وہیں متصور ہے جہاں اقرب بہ نسبت اقرب منہ کے علت اور منشأ انتزاع ہو کیونکہ امور متبائنہ میں تو یہ قرب متصور ہی نہیں۔ رہے اوصاف عرضیہ بمعنی بالعرض مقابل بالذات وہ بھی فی الحقیقت موصوف سے یہ قرب نہیں رکھتے ورنہ اس قرب پر جدائی دشوار تھی۔ حالانکہ اوصاف مذکورہ کا منفک ہو سکنا خود ان کے بالعرض ہونے سے ظاہر ہے ہاں اوصاف ذاتیہ بمعنی مقتضائے ذات، معلول ذات ہوتے ہیں اور ذات ان کی نسبت علت اور منشأ انتزاع، اور لوازم ذات مذکورہ انتزاعیات۔

خیر ان کے انتزاعیات اور ذات کے منشأ انتزاع ہونے کو تو کوئی مانے یا نہ مانے پر اوصاف ذاتیہ کا معلول اور ذات کا علت بمعنی مصدر وجود ہونا ایسا نہیں جو کوئی عاقل اس کا انکار کرے۔ سو ہمیں اتنی بات کافی ہے۔ اس لیے کہ معلول کا وجود ایسی علت کے وجود پر خارج میں تو سب کے نزدیک

موقوف ہوتا ہے پر وجود ذہنی کا حال بھی یہی ہے اس لیے کہ عقل مُخبر ہے مُنشی نہیں موجودات خارجیہ کی خبر دینے کے لیے عقل کو بنایا ہے نئی باتوں کی ایجاد اس کا کام نہیں۔

(ذہن میں حاصل شدہ مضمون کی خبر میں بھی محکی عنہ یعنی علت پائی جاتی ہے)

سو جاننے والے جانتے ہیں کہ اسی مرتبہ حاصل اخبار کا نام وجود ذہنی ہے اور کیفیت لحاظ حصول اشیاء بانفسہا یا باشباحھا پر موقوف ہے۔ سو اگر تنہا معلول یا اس کی شبیح ذہن میں ہو۔ اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ معلول اپنے وجود خارجی میں علّت کا محتاج نہیں۔ در صورتیکہ وقت علم سے بذات خود ذہن میں آئی۔ اور جب تو یہ بات ظاہر کیا اظہر ہے۔

(نور شمس سے علم۔ مبدا علم اور عالم کی مثال)

اگرچہ کم فہموں اور ان لوگوں کو جنہوں نے مثل متشابہات دینی مسئلہ حصول الاشیاء بانفسہا کو تسلیم کر رکھا ہے اس بات میں تین پانچ کرنے کی گنجائش ہو۔ مگر اہل اذہان صافیہ پر یہ بات روشن ہے کہ جیسے اشیاء منورہ بنور الشمس بذات خود نور میں حاصل ہوتی ہیں۔ ایسے ہی اشیاء معلومہ بذات خود نور علم میں آجاتی ہیں اور وہ نور علم ذوات علماء کے ساتھ اسی ہی طرح قائم ہے جیسے نور شمس خود شمس کے ساتھ۔ جیسے مبداء تنور اشیاء منورہ بالنور، وہ نور شمس ہے ایسے ہی مبداء علم یعنی مبداء انکشاف وہ نور علم قائم بالعالم ہے اگرچہ بحکم لامشاحۃ فی الاصطلاح صور حاصلہ یا کیفیت انکشافیہ یا اضافت فیما بین کو مبداء انکشاف کہنے کی گنجائش ہے۔

القصہ در صورت حصول اشیاء بالذات، تو تنہا معلول کا ذہن میں آنا محال ہے اگر آئے گا تو علت کے ساتھ آئے گا اور در صورت حصول اشیاء باشباحہا کے یہ معنی ہوں گے کہ وقت حصول اشیاء بانفسہا مطابق ظاہر اشیاء، باطن مبداء انکشاف میں ایک صورت کا پیدا ہونا اسی طرح ضرور ہے جیسے وقت حصول اشیاء منورہ فی النور، باطن نور میں مطابق ظاہر صورت اشیاء ایک صورت کا حاصل ہونا یا مطابق صورت اشیاء، حاصلہ فی الماء یعنی آب۔ باطن آب میں اس صورت کا پیدا ہو جانا بالجملہ صورت اصلیہ اور صورت شبیح میں وہ نسبت ہے جو قالب اور مقلوب کی صورت باطنہ اور ظاہرہ میں نسبت ہوتی ہے۔

(مذکورہ بالا دونوں صورتوں میں ذہن میں حاصل شدہ صورت ہی سے علم حاصل ہوتا ہے)

الحاصل ذہن میں بالذات اور بالشبح دونوں طرح صورت ہی ہوتی ہے ذی صورت نہیں ہوتا۔

علم بالکنہ اگر ہوتا ہے تو صورت کا ہوتا ہے ذی صورت کا علم بالوجہ ہوتا ہے۔ سو یہ وجہ کون ہے صورت ہے مگر سوا اس طریق کے حصول شبح کی اور کوئی صورت نہیں معنیٰ انعکاس بھی حقیقت میں یہی ہیں یعنی شبح عکس اصل ہوتا ہے چنانچہ ملاحظہ مثال قالب و مقلوب سے ظاہر ہے۔

(بصورت تقابل عکس (پرتو) کی صورت کے وقت اصلی شئی یعنی علت کی صورت ذہن میں موجود ہوتی ہے)

اور اگر بالفرض انعکاس صورت اور حصول شبح کے لیے تقابل صورت اور محاذات ذی شبح کافی ہے تب بھی ہمارا مطلب کہیں نہیں گیا وقت تقابل معلول علت سے جدا نہ ہو گا سوا ان میں اگر یہ قرب ہو گا کہ معلول کی نسبت علت خود معلول سے بھی زیادہ قریب ہے تو یہ ممکن نہیں کہ شبح معلول اور عکس معلول تو ذہن میں حاصل ہو اور شبح علت اور عکس علت ذہن میں حاصل نہ ہو۔ ورنہ یہ قرب مبدل بہ بعد ہو جائے گا کیونکہ ایک کے شبح کا ذہن میں آنا اور دوسرے کے شبح کا ذہن میں نہ آنا سوا اس کے متصور نہیں کہ ایک کو تقابل میسر آئے دوسرے کو میسر نہ آئے اور یہ بات اس قسم کی اقربیت میں ممکن نہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے۔ بالجملہ اوصاف ذاتیہ اپنے موصوف سے اور انکی شبح اور ان کا عکس موصوف کے عکس اور شبح سے جدائی نہیں ہو سکتے۔

(حصول معلول فی الذہن حصول علت پر موقوف ہے اور ان کے مابین کوئی واسطہ نہیں)

جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اس بات کا تسلیم کرنا آپ سر پڑا۔ کہ حصول فی الذہن حصول علت پر موقوف ہے۔ حصول اشیاء بانفسہا میں تو اس بات کے کہنے کی حاجت ہی نہیں اور باشباحھا کی صورت میں اس لیے کہ ذی شبح، شبح کے تابع ہے۔ اگر وہاں تقدم یا توقف ہے تو یہاں بھی اس کا ہونا ضرور ہے ورنہ تقدم اور توقفِ اصل غلط ہو جائے گا۔ چنانچہ واضح ہو چکا اس صورت میں اس کا اقرار ضروری ٹھہرا کہ تعقل معلول تعقل علت پر موقوف ہے۔ اس سے اضافی اور انتزاعی ہونا معلول اور لازم ذات کا بھی واضح ہو گیا۔ اس صورت میں اگر خود معلول اور لازم ذات ہی اپنے ادراک کی طرف متوجہ ہو تو قبل تصور علت و ملزوم اپنا تصور ممکن نہیں۔ سو اس حرکت علمی میں معلول کو اول علت پیش آئے گی اس کے بعد اپنی ذات۔ اور ظاہر ہے کہ سوائے حرکت علمی اور کسی حرکت کی فیمابین معلول و علت گنجائش نہیں اگر ممکن ہے تو یہی حرکت علمی اور انتقال فکری ممکن ہے اور اس صورت میں وہ اقربیت مذکورہ مشارٌالیہا موجود ہے۔

(روح محمدی کا ارواح مومنین کیلئے علت ہونا اس کا متقاضی ہے کہ آپ کی روحانیت اور حیات اصلی اور امت کی عارضی ہے	اس لیے خواہ مخواہ اس صورت میں اس بات کا اقرار لازم ہو گا۔

کہ روح پر فتوح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم علت ہو اور ارواح امت محمدیہ مثلاً معلول بمعنی مذکور۔ اور ظاہر ہے کہ جو بات معلول میں بحیثیت معلولیت ہوتی ہے وہ علت ہی سے مستعار ہوتی ہے۔ چنانچہ معلول ہونا اور توقف وجود خود اس پر شاہد ہے۔ کیونکہ توقف وجود تمام اوصاف وجودیہ کے توقف کا خواستگار ہے۔ اس صورت میں حیات اور روحانیت ارواحِ امت عرضی اور مستعار ہوگی مگر جیسے کمالات معلول مستعار اور عرضی ہوتے ہیں کمالاتِ علت، اصلی اور خانہ زاد ہوتے ہیں۔ اور اگر یہ نہیں تو وہ علت بھی نہیں۔

جہاں یہ اوصاف مشترکہ بین العلۃ والمعلول وجود ہوں یا غیر وجود۔ ذاتی اور خانہ زاد ہوں گی۔ وہی علت ہوگی۔ اور اقربیت مذکورہ ایسی ہی علت کے لیے ہو سکتی ہے چنانچہ ظاہر ہے۔ مگر کسی وصف کے ذاتی ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ وصف بالعرض نہ ہو چنانچہ سیاق سے ظاہر ہے یہ نہیں کہ مخلوق بھی نہ ہو۔

(تقریر مذکورہ بالا کا آیت اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ سے انطباق)	مگر جب اقربیت بمعنی مذکور۔

مساوی علیّت نکلی تو اور سنئے ملاحظہ جملہ معروضہ قرآنی۔ اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ اقربیت مذکورہ آپ کو حاصل تھی اس لیے علیّت بھی ہونی چاہیئے۔ مگر یہ بھی تو وصف حیات کا آپ میں ذاتی ہونا بھی ضرور ہے۔ لیکن اوصاف ذاتیہ کا انفکاک خود ظاہر ہے کہ محال ہے ورنہ اوصاف ذاتیہ اور اوصاف عرضیہ میں کیا فرق رہ جائے اس صورت میں حیات روحانی حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم جاودانی ہوگی۔ جب یہ بات مقرر ہو چکی تو اور سنیئے کہ درصورتیکہ ارواح امت، روح پر فتوح نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ٹھہریں اور اس سے پیدا ہوئیں چنانچہ علیت و معلولیت سے ظاہر ہے۔ تو ابوت روحانی اور بنوت روحانی کا تسلیم کرنا ضرور ٹھہرا یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ بعد اس جملہ کے وَاَزۡوَاجُہٗۤ اُمَّہٰتُہُمۡ فرمایا کیونکہ آپ کی اُبُوَّت کو ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا امہات المومنین ہونا لازم ہے بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت میں جو فی مابین جملتین جملہ وَھُوَ اَبٌ لَّھُمۡ اور زائد ہے اور بھی اس بات کا مؤید ہے کہ اولویت مذکورہ کا مقتضیٰ ابوت روحانی اور ابوت روحانی مذکورہ ازواج مطہراتؓ کے امہات المومنین ہونیکا خواستگار ہے۔

(آیت مذکورہ میں تصرف اور احبیّت کے معنی علیت اور اقربیت میں لازماً پائے جاتے ہیں)

مگر ہاں شاید کسی کو یہ شبہ دامنگیر ہو کہ بعض مفسّروں نے اولیٰ کو اس آیت میں بمعنی اقرب لیا ہے تو بعض نے بمعنی احب لیا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس بعض نے بمعنی اولیٰ بالتصرف قرار دیا ہے۔ اس صورت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی علیت اور امت کی معلولیت یقینی نہ رہی مگر اوّل تو التصاق سیاق وسباق چنانچہ معروض ہو چکا معنی معروض کا مؤید ہے۔ اودھر اس امت کا خیر امت ہونا چنانچہ کلام اللہ میں فرمایا ہے کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ الخ اس پر شاہد۔ اس لیے کہ جب علت مصدرِ معلول ٹھہری تو اگر ایک علت دوسری سے افضل ہو گی تو اس کا معلول بھی اس کے معلول سے افضل ہو گا۔ چنانچہ تفاوت دھوپ اور چاندنی جو تفاوت فیما بین الشمس والقمر پر متفرع ہے اس کی نظیر ہو سکتا ہے باایں ہمہ معنیین آخرین کا رجوع تو معنی معروض کی طرف ضرور ہے اور ان کا توقف بمعنی اوّل پر لازم۔ اور الٹا کیجئے تو بن نہیں پڑتا وجہ اس کی یہ ہے کہ کسی کے احب اور اولیٰ بالتصرف ہونے کے لیے کوئی علت ضرور چاہیئے نہ محبت بے موجبات محبت اور محبوبیت بے موجباتِ محبوبیت ہو سکے نہ اولویت بالتصرف بے موجباتِ اولویت بالتصرف۔ اور ظاہر ہے کہ اس قدر احبیّت اعنی محبوبیّت کہ اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہو قرابت بقدر اقربیت مذکورہ میں موجود۔ اور قرابت کا موجبات محبت میں سے ہونا بدیہی ہے قابل انکار نہیں۔

علیٰ ہٰذا القیاس مُعیر کا مستعیر سے ستعار میں اولیٰ بالتصرف ہونا ضروری ہے اور علت کا معیر اور معلول کا مستعیر ہونا خود اس مضمون سے آشکارا ہو چکا جس میں وجود اور کمالات وجود معلول کا مستعار ہونا ذکر کیا گیا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرب مذکور کے لیے احبیّت اور اولویت بالتصرف علت نہیں ہو سکتی البتہ معاملہ بالعکس ہے چنانچہ مثل آفتاب نیم روز روشن ہو گیا۔ بلکہ اقربیت مذکورہ کے لیے برائے نام علیت کو علت کہہ لو ورنہ اس کی کوئی علت ہی نہیں۔ کیونکہ علیت اور اقربیت میں اگر فرق ہے تو اعتباری فرق ہے اور علیت کے لیے کوئی علت ہو ہی نہیں سکتی ورنہ علتِ اولیٰ کی جانب احتیاج نکلے گی۔

(نفی میراث کے بارے میں حیات جسمانی کے اثبات کی ضرورت)

جب یہ مضامین بھی ذہن نشین ہو گئے تو اور سنیئے کہ حیات روحانی نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا دائم قائم بلکہ لازم ذات روح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہونا تو اس تقریر سے معلوم ہو گیا پر دربارہ نفی میراث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

حیات روحانی سے کام نہیں چلتا یہاں تو حیات جسمانی کی ضرورت ہے اس لیے کہ اموال و ازواج لواحق و توابع اور متعلقات بدن میں سے ہیں۔ ان چیزوں کی اگر ضرورت ہے تو جسم ہی کو ضرورت ہے روح کو بالذات کچھ حاجت نہیں چنانچہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ اس لیے اثبات دوام حیات جسمانی کی ضرورت ہے۔

(آپ کا وجود باجود بواسطہ جسم اطہر مصدر حیات ہے جس سے روحانیت کے آثار علم و عمل صادر ہوتے ہیں)

مگر چونکہ یہ بات ایک تمہید پر موقوف ہے اس لیے معروض ہے کہ اوصاف کو اپنے موصوفات سے کبھی تو علاقہ صدور ہوتا ہے جیسے تعلق حرارت بآتش و تعلق نور بآفتاب ظاہر ہے کہ یہاں وصف حرارت و نور خارج سے آکر آتش و آفتاب پر واقع نہیں ہوا بلکہ انہی میں سے یہ اوصاف صادر ہوئے ہیں اس قسم کے تعلق کو ہم تعلق فعلی و فاعلی کہتے ہیں اور کبھی اوصاف کو اپنے موصوفات سے علاقہ وقوع ہوتا ہے جیسے تعلق حرارت بآب گرم اور تعلق نور بزمین۔ مثلاً ظاہر ہے کہ یہاں اوصاف مذکورہ آب و زمین سے صادر نہیں ہوئے بلکہ آتش و آفتاب سے صادر ہو کر آب و زمین پر واقع ہوئے ہیں۔ اس قسم کے تعلق کو ہم تعلق انفعالی اور تعلق مفعولی کہتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہیں کہ تعلق روح و جسم کی حقیقت کو دیکھا تو جسم کو مظہر افعال روح پایا یعنی غرض اصلی اس علاقہ بندی سے یہ ہے کہ روح سے افعال جوارح صادر ہوں جیسے نور اور جسم آفتاب میں باہم تلازم رکھنے سے غرض یہ ہے کہ اس سے اوروں کی طرف نور صادر ہوا کرے۔ الغرض جیسے نور لوازم ذات آفتاب میں سے نہیں۔ اگر ہے تو لوازم وجود میں سے ہے اور غرض اس تلازم سے صدور نور ہے۔ ایسے ہی جسمانی لوازم ذات جسم اطہر حضرت ساقی کوثر صلی اللہ علیہ وسلم میں سے نہیں لوازم وجود جسم مبارک میں سے ہے۔

اور غرض اس تلازم میں سے صدور آثار روحانیت ہے اور وہ ظاہر کہ بجز ایصال علم و عمل اور کچھ نہیں مگر چونکہ بے اعانت مظہر یعنی جسم یہ افعال نہ ہو سکتے تھے تو اس اکیل کی ضرورت پڑی۔

(جسم انسانی سے افعال کا ظہور در اصل فاعلیت حیات کے سبب سے ہے)

الحاصل اس صورت میں جسم انسانی بمنزلہ جسم آفتاب و کواکب و آئینہ مقابل آفتاب ہوگا۔ یعنی جیسے وہاں ایصال وافاضہ واصدار نور الی الغیر مدنظر ہوتا ہے ایسے ہی یہاں بھی ایصال منافع علمی و عملی مطلوب۔ اور اگر بوسیلہ جسم کوئی انفعال بھی پیش آجائے تو وہ ایسا ہے جیسے بوسیلہ مرایا و مناظر متلونہ۔ الوان مختلفہ نور پر عارض ہوں

اور وہ ان سے منفعل ہو سو جیسے یہ انفعال اتفاقی ہے۔ یہاں بھی اتفاقی کہیے۔ اغراض اصلیہ میں سے نہیں کہہ سکتے چنانچہ اعمال کا دارِ دنیا میں مطلوب ہونا اس پر خود شاہد ہے اور بعد خروج از دارِ مذکور تکلیف شارع کا ساقط ہو جانا اس کے لیے عمدہ دلیل ہے۔

ادھر حاصل جسم و تعلق مذکور سوا اس کے اور کچھ نظر بھی نہیں آتا جو اعضاء مظاہر قوت عملیہ ہیں مثل دست و پا ان کا نتیجہ تو بجز عمل اور کچھ ہے ہی نہیں اور جن اعضاء کو مظہر قوت علمیہ بنایا مثل چشم و گوش وغیرہ حواس خمسہ ان کا قصہ سنیئے کہ اول علم کا فعل متعدی ہونا اس کے فعل ہونے پر دال ہے وقوع علی الغیر فعل ہی کی شان ہے انفعال میں یہ بات کہاں اور اگر یہ ہو تو یوں کہو کہ مفعول اور منفعل فاعل ہیں۔ مفعول و منفعل نہیں۔ دوسرے علم بغرض عمل مقصود ہے بذات خود مقصود نہیں۔ اگر علم منافع ہے تو فعل طلب صادر ہونا چاہیئے۔ اور علم مضرت ہے تو فعل ہرب صادر ہونا چاہیئے بہر حال علم سے مقصود اصلی اعمال ہیں۔

(روح و جسم کے درمیان علاقہ فعلی ہے درمیان میں حائل کے وجود سے آثار حیات سمٹ جاتے ہیں مٹتے نہیں) اس لیے علاقہ فیمابین روح و جسم علاقہ فعلی ہے علاقہ انفعالی نہیں۔

اس صورت میں اگر کوئی چیز مانع وصول فعل فاعل اور مفعول میں حائل ہو تو فعل بمعنی مبداء فعل مثل نور آفتاب مثلاً فاعل کی طرف سمٹ جائے گا۔ اور اگر سمٹے گا نہیں تو زائل بھی نہ ہو گا ہاں مفعول سے زائل اور منفک ہو جائے گا۔ مثلاً آفتاب اور زمین یا آفتاب اور آئینہ میں اگر کوئی جسم کثیف حائل ہو جائے تو وہ نور جو آفتاب سے لے کر زمین اور آئینہ تک متصل تھا سمٹ کر زمین اور آئینہ سے جدا ہو جائے گا۔ اور آفتاب کی طرف چل دے گا نہ دونوں میں آدھوں آدھ منقسم ہو گا نہ تنہا زمین اور آئینہ کی طرف رہے گا اور اگر فرض کرو نور آفتاب بوسیلہ آئینہ یا کسی کوکب کے واسطے سے پہنچا ہو تو در صورت حیلولت جسم کثیف وہ نور جو آئینہ یا کواکب سے اس چیز کی طرف آتا تھا اس چیز سے جدا ہو کر آئینہ اور کوکب کی طرف چل دے گا۔ القصہ جس طرف علاقہ فاعلیت اور فعلیت[1] ہو گا وہ علاقہ بوجہ حیلولت ضد و موجبات تضاد منفک نہ ہو گا البتہ جس جانب علاقہ

---

[1] ہاں اگر علاقہ فعلی اگر علاقہ انفعال پر متفرع ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ علاقہ انفعالی منقطع ہو اور اس وجہ سے وہ علاقہ فعلی منقطع ہو جائے مثلاً نور کو قمر کے ساتھ اول علاقہ انفعالی ہے یعنی نور آفتاب اس پر واقع ہوتا ہے

باقی حاشیہ صفحہ ۲۹۳ پر

انفعال اور مغلوبیت ہوگا وہ علاقہ بوجہ حیلولیت مشارٌ الیہ زائل اور منفک ہو جائے گا۔

روح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بدن میں تعلق انفعال ممکن نہیں)

اس صورت میں علاقہ فیما بین روح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم و جسم اطہر بوجہ حیلولت موت یا موجبات موت قابل انفکاک نہیں بلکہ موجب استتار ہے چنانچہ اوّل اس کی طرف اشارہ کر چکا ہوں اور حیلولیت ابر و غبار کی مثال کے ملاحظہ سے واضح ہے۔ اور اگر بالفرض والتقدیر انفعال کو بھی اغراض اصلیہ تعلق روح و بدن میں سے کہیئے تو جسم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں تو اس بات کے کہنے کی گنجائش ہی نہیں۔ کیونکہ تکمیل روح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بوسیلہ جسم کسی اور کامل سے تو ہو ہی نہیں سکتی بلکہ اور بھی

بقیہ حاشیہ: دوسرا علاقہ فعلی ہے جو علاقہ اول پر متفرع ہے یعنی وہ واقع علی القمر قمر سے صادر ہو کر اور اشیاء پر واقع ہوتا ہے۔ سو یہ علاقہ ثانی اگرچہ بوجہ حیلولت اجسام کثیفہ ممکن الانقطاع نہیں پر بوجہ زوال علاقہ اول و انفکاک علاقہ ثانی منقطع ہو جاتا ہے چنانچہ واقفان حقیقت خسوف خوب جانتے ہیں مگر جہاں عالم اسباب میں علاقہ ثانی منقطع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ واقفان حقیقت خسوف خوب جانتے ہیں مگر جہاں عالم اسباب میں علاقہ ثانی علاقہ اول پر متفرع ہی نہ ہو جیسے علاقہ نور بالشمس تو وہاں حیلولت اضداد متصور ہی نہیں جو اسی طرح انقطاع کا اندیشہ ہو۔ مگر یہ بھی تو علاقہ روح و جسم محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ بوجہ حیلولت موت حیات کے ممکن الانقطاع نہیں کیونکہ جیسے شمس اور اس کے نور میں حیلولت اجسام کی گنجائش ہی نہیں تو یوں کہیئے کہ نور شمس اس میں اور اس کے نور کے بیچ میں آگیا۔ ایسے ہی غشا، موت جو ضد روح ہے جسم نبوی اور روح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیچ میں آسکتا ہے۔ ہاں جیسے غشار نور آفتاب وغیرہ موجبات ظلمت۔ نور آفتاب کو اوپر سے دبا لیتے ہیں ایسے ہی منشاء موت یعنی مابہ الموت جو اصل موت ہے حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو اوپر سے دبا سکتی ہے، سو اسی کو استتار کہتے ہیں اور وجہ اس کی وہی ہے جیسے نور آفتاب عالم اسباب میں مبدار اول نورانیت ہے اور یہی وجہ ہے کہ نور کا علاقہ فعلی جو اس کے ساتھ ہے کسی علاقہ انفعالی پر متفرع نہیں ایسے ہی روح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم عالم اسباب میں مبدار اول حیات ہے اور اسی لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کی روح کا علاقہ جو آپ کے جسم کے ساتھ خاص ہے عالم اسباب میں علاقہ انفعالی پر ہو ہاں عالم اسباب سے قطع نظر کیجیے تو خدا کے اعتبار سے سب منفعل ہیں واللہ اعلم ۱۲

(یہ حاشیہ طباعت اول میں موجود تھا)

ارواح کی تکمیل بوسیلہ اجسام روح باکمال محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے کی گئی ہے۔

(جو عوارض خارجیہ بواسطہ حیات کے لاحق نہیں ہوتے وہ اعراض اصلیہ میں سے نہیں)

اور سوا اس کے اور انفعالات جو مثلاً وقت خورد و نوش و مشاہدہ مرغوب و غیر مرغوب و استماع اخبار مختلفہ وغیرہ اسباب پیش آتے ہیں اغراض اصلیہ اولیہ میں سے نہیں اتفاقیات و لوازم و آثار اوقات میں سے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان امور میں سے تمام بنی آدم تک یکساں نہیں۔

(اگر انفعال مقاصد اصلیہ میں شمار ہو تو بھی حائل کے وجود سے فاعل منفعل تک نہیں پہنچ سکتا لیکن علاقہ مابین قائم رہتا ہے)

اور یہ بھی نہ سہی۔ ہم کہتے ہیں کہ انفعال منجملہ مقاصد اصلیہ اور اغراض اولیہ ہے مگر ہر انفعال کے لیے ایک فاعل کی ضرورت ہے جس کی طرف سے فعل صادر ہو اور منفعل پر واقع ہو سو وہ فاعل اسی صورت میں کوئی غیر ہی ہوگا۔ جیسے زید کے لیے عمرو مثلاً تو اس صورت میں اس فاعل اور اس منفعل میں کوئی چیز حائل ہوئی تو فاعل کو منفعل تک آنے نہ دے گی۔ پر کوئی صاحب فرمائیں اس سے علاقہ فیما بین روح و جسم کو کیا نقصان۔

(لازم وجود (حیات) کا ملزوم (وجود خارجی منفعل ہوتا ہے)

ہاں یہ صحیح ہے کہ لازم وجود کا ملزوم اصل میں منفعل ہی ہوتا ہے ورنہ منفعل نہ کہیے۔ اور بجمیع الوجوہ اور من جمیع الحیثیات مصدر ہی کہیے تو پھر لزوم فیما بین لزوم ذات ہوگا۔ اور لازم مذکور لازم ذات مگر یہ تو ظاہر ہے کہ ہر انفعال کے لیے ایک فعل اور ایک فاعل کی ضرورت ہے۔

(حائل کی ایک مثال)

سو وہ اگر سوا خالق کائنات کوئی اور ہے جیسے قمر و کواکب و آئینہ و زمین وغیرہ کے لیے آفتاب۔ تو اگر کوئی اور ہم جنس قمر و کواکب و آئینہ و زمین بیچ میں حائل ہو جائے گا تو وہ نور قمر و کواکب و آئینہ و زمین وغیرہ سے زائل ہو کر اس ہم جنس میں آجائے گا۔

(حائل کی صورت میں تبدل و تغیر منفعل میں پایا جائے گا نہ کہ فاعل میں)

الغرض منفعل کی جانب تبدل متصور ہے اور یہ جو دوربینوں وغیرہ میں کئی کئی آئینے آگے پیچھے ہوتے ہیں اور بشرط تقابل آفتاب نور آفتاب سب میں سے نکلا چلا جاتا ہے اور ایک دوسرے کے حق میں حاجب نہیں ہوتا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ جس قدر نور ادھر سے ادھر کو نکلا چلا جاتا ہے اس نور سے آئینہ ہائے مذکورہ منفعل نہیں ہوتے اگر انفعال ہوتا تو وہ نور نہیں رک جاتا

آگے نہ جانے پاتا اور جس قدر نور آئینہ کے ساتھ لگا رہ جاتا وہ نور بشرط حیلولت ہم جنس دیگر ضرور زائل ہو کر اس کے ساتھ لاحق ہو جاتا ہے۔

(کائنات کے حق میں ارادہ خداوندی ہی منشأ فیض ہے اس صورت میں حائل کا وجود ممتنع ہے)

اور اگر فاعل مذکور سوا خالق کائنات اور کوئی نہیں بلکہ خود خداوند عالم ہی منشأ فیض ہے۔ تو وہاں بجز تعلق ارادہ اور کسی سامان کی ضرورت نہیں چنانچہ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ (لیکن اللہ کرتا ہے جو چاہے) اور

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (پ۱۴ النحل ع۶) (ہمارا کہنا کسی چیز کو جب ہم اس کو کرنا چاہیں یہی ہے کہ کہیں اس کو ہو جا تو وہ ہو جائے۔)

اور لَا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ وغیرہ احادیث اس پر شاہد ہیں اور ظاہر ہے کہ ارادہ خداوندی کا روکنے والا سوائے ارادہ خداوندی اور کوئی چیز نہیں جو یہ احتمال ہو کہ کوئی چیز کائنات اور عالم اسباب میں ہو گی چنانچہ آیات مشارٌ الیہا اور حدیث مذکور اس پر شاہد ہیں اور یہی وجہ ہے کہ نور آفتاب بجز سلب خداوندی اور کسی چیز سے زائل نہیں ہو سکتا کیونکہ نور آفتاب سوائے خزانہ خداوندی عالم اسباب کے خزائن سے مستعار نہیں، یعنی مثل نور قمر و کواکب و آئینہ قلعی دار زمین وغیرہ فیض آفتاب ہے نور آفتاب اسی طرح کسی اور جسم سے مستعار نہیں۔

(نور آفتاب کی مانند آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات منبع ہدایت ہے)

مگر جب یہ بات ٹھہری تو پھر دوام حیات جسمانی نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضرور پڑا اس لیے کہ جیسے نور آئینہ آفتاب کی یہ صورت ہوئی کہ مابہ النور آئینہ اعنی نور اور آفتاب میں خداوند کریم نے علاقہ رکھا ایسے ہی مابہ الحیات والروحانیت اعنی روح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور جسم اطہر میں خود خداوند کریم نے علاقہ بندی کی ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جیسے منشاء و منبع نور آئینہ قمر و کواکب نور آفتاب ہے ایسے ہی منشاء و منبع روحانیت یعنی حیات جسم اطہر کسی اور کی روح ہے چنانچہ اوّل تو اس مضمون کے اثبات کے لیے کسی امتی کو سنی ہو یا شیعہ یا کوئی اور استدلال اور دلیل کی ضرورت نہیں، دوسرے وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ سے بشرط فہم و انصاف و ترک تقلید زید و عمرو یہ بات ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

طرف سے وقت ارسال جو وہی وقت حیات جسمانی تھا۔ اور ان کی طرف افاضہ اور فیض ہے۔
اور انکی طرف سے اس طرف کو افاضہ اور فیض نہیں چنانچہ مقتضائے حصر الآ ہر کسی کے نزدیک
یہی ہے۔ بایں ہمہ ارواح امت کی روحانیت کا مستعار ہونا آیت اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ
مِنْ اَنْفُسِهِمْ کے وسیلہ سے ثابت ہو چکا اور ارواح انبیاء علیہم السلام میں فیض نبوی محمدی صلی اللہ
علیہ وسلم کا ہونا جملہ خاتم النبیین سے بشرط اہل انصاف و فہم ظاہر و باہر۔ ہاں کوئی حجتی امتی نئی بات سن کر
بے وجہ گردن ہلائے تو ہلائے۔ مگر ان سے کیا کام ہے۔ اہل فہم و انصاف سے سروکار ہے سو ان کی
خدمت میں یہ عرض ہے کہ موافق حدیث اِنَّ لِکُلِّ اٰیَۃٍ ظَهْرًا وَّبَطْنًا (ہر آیت کا ایک ظاہر
ہے اور ایک باطن ہے) خاتمیت زمانہ کے لیے جو از قسم ظہر ہے یعنی معنی ظاہری ہے۔ کوئی بطن یعنی
معنی باطنی بھی چاہیئے۔ سو باعتبار باطن خاتمیت نبوت یہ ہے کہ آپ پر سلسلہ فیض نبوت ختم ہو جاتا
ہے یعنی جیسے مثلاً نور قمر و کواکب فیض آفتاب ہے اور نور آفتاب عالم اسباب میں کسی اور کا فیض نہیں ایسے
ہی نبوت انبیاء سابق علیہم السلام تو فیض محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ پر نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم
عالم اسباب میں کسی اور کا فیض نہیں جیسے آفتاب پر سلسلہ نور ختم ہو جاتا ہے اور اس وجہ سے خاتم النیرات
کہیے تو بجا ہے۔ ایسے ہی روح محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلہ نبوت اختتام پاتا ہے اور اس وجہ سے
آپ کو خاتم النبیین کہنا زیبا ہے۔ یہ تقریر خاتم بکسر التاء کی صورت میں تو جو قرأت ابوبکرؓ ہے محتاج تفصیل
نہیں پر خاتم بفتح التاء کی صورت میں جیسے قرأۃ حفص ہے۔ البتہ بظاہر کم فہموں کو چسپاں معلوم نہ ہوتی
ہوگی۔ اس لیے اتنا اور معروض کہ جیسے خاتم بفتح التاء بمعنی مہر کا اثر مختوم علیہ میں ہوتا ہے اور حروف مہر
مختوم علیہ میں منتقش اور منعکس ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی منبع فیض کا اثر مستفیض میں منتقش اور منعکس ہوتا ہے۔

(خاتم النبیین کے معنی منشا اور فیض نبوت کے ہیں اور خاتمیت زمانی بھی اس سے خود بخود ثابت ہو جاتی ہے)

اب اہل فہم کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ جب خاتم النبیین کے یہ معنی ہوئے
تو آپ کی فضیلت اور سیادت اور تاخر زمانی سب بجائے خود ہوئی۔ افضلیت اور سیادت کا حال تو
بے کہے ظاہر ہے۔ رہی خاتمیت زمانی۔ اس کی یہ وجہ ہے کہ مہمان کو اگر متعدد کھانے کھلاتے ہیں اور
مختلف قسم کی نعمتیں اس کے سامنے لے جاتے ہیں تو عمدہ اور افضل سب کے بعد دیتے دلاتے ہیں۔
سو ایسے ہی مہمانان وارد دنیا کے لیے دین اور کتب دین اور مردمان دین پرور نعمت خداداد ہیں جن میں

سے سب سے افضل اور عمدہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور یہ قرآن اور یہ دین و ایمان تھا اس لیے سب کے بعد آپ کا ظہور مناسب ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ یہی مفاد خاتمیت زمانی ہے۔

(خاتم النبیین کے معنی سے ثابت ہوا کہ آپکی نبوت کی طرح تمام انبیاء کی ارواح بھی آپکی روح پاک سے مستفید ہیں)

مگر جیسے اس تقریر سے آپ کی افضلیت اور سیادت اور خاتمیت زمانی ثابت ہوئی۔ ایسے ہی یہ بھی ثابت ہوا کہ آپ کی روح پر فتوح اور آپ کی حیات فیض انبیاء سابقین علیہم السلام نہیں۔ کیونکہ یہ نہیں ہوسکتا کہ جسم تو آب سے پیدا ہو اور حرارت آب۔ آتش سے حاصل ہو۔ بلکہ اگر حیات آتش فیض آب ہو تو حرارت بھی آب ہی کا فیض ہو گا۔ یہ برعکس کہ حرارت فیض آتش ہو ممکن نہیں۔ ایسے ہی یہ کیونکر ہو کہ روح محمدی تو ارواح انبیاء سابقین علیہ السلام سے پیدا ہوئی ہو اور نبوت انبیاء سابقین علیہم السلام فیض محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہو۔

بالجملہ ارواح انبیاء سابقین علیہم السلام روح محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفید ہیں پر روح محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کسی کی روح سے مستفید نہیں آپکے سارے کمالات بالقوۃ منجملہ لوازم ذات اور طبائع ذاتیہ ہیں۔ ہاں مرتبہ بالفعل البتہ شرائط فعلیت پر موقوف ہے اس میں قوت و فعلیت نبوت و ولایت ہو یا کسی اور کمال کی قوت و فعلیت ہو۔

ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ نفس روحانیت انبیاء سابقین علیہم السلام آپ کی روح پر فتوح صلی اللہ علیہ وسلم کا فیض نہ ہو بلکہ علاقہ بندی ارواح واجسادِ انبیاء سابقین علیہم السلام خاص خداوند خلاق کی طرف منسوب ہو یعنی ارواح انبیاء سابقین بے واسطہ فیض خداوندی ہوں اور ارواح امتیاں بواسطہ ارواح انبیاء کرام علیہم السلام پیدا ہوئی ہوں۔ اس میں یہ امت اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم ہوں یا کوئی اور امت اور اس کے نبی ہوں۔

(نبوت سے پہلے انبیا علیہم السلام میں مادہ روحانیت موجود تھا)

بلکہ جب اس بات کا لحاظ کیا جائے کہ ہر افاضہ اور فیض یعنی عروض میں وصف عارض کے سوا مفیض اور مستفیض پہلے سے ہونے چاہئیں تو یہ بات بروئے عقل واجب التسلیم ہو گی کہ قبل افاضہ نبوت انبیا سابقین علیہم السلام میں مادہ روحانیت چاہیئے۔ کیونکہ مستفیض کا قابل فیض ہونا ضرور ہے اور ظاہر ہے کہ وصف نبوت کے لیے سوا ارواح و نفوس کوئی قابل نہیں۔

رہی نفسِ روحانیت اور حیات سو اس کے قبول کے لیے پہلے سے روحانیت اور حیات کی ضرورت نہیں اجسام نامیہ اور جامدہ بھی اس کے لیے قابل ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ حیات جسمانی بنی آدم وغیرہ بنی آدم و حنین جذع (ستون کا فراق نبوی میں رونا) وغیرہ معجزات وکرامات۔ اور آیت وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ اس باب میں تسکین کے لیے کافی ہے۔ غرض فیض روحانیت امت کے لیے کچھ ضرورت نہیں کہ پہلے سے حیات حاصل ہو جو یہ شبہ پیش آئے کہ اسی طرح امت کے لیے روحانیت سابقہ چاہیئے۔ اور چونکہ وہ حیات اور روحانیت بلا واسطہ فیضِ خداوند عالم ہے تو اس کے اور جسم کے بیچ کا علاقہ قابل انفکاک و انقطاع نہیں۔

الغرض حیات جسمانی انبیاء کرام علیہم السلام کو دوام لازم ہوا اور منجملہ لوازم وجود کہنا پڑا۔

(تصرف پر قادر نہ ہونا نکاح اور ملک کے منافی نہیں) اس صورت میں متعلقات جسم یعنی ازواج و اموال سے علاقہ منقطع نہ ہوگا۔ مال مملوک اور ازواج منکوحات سمجھی جائینگی اور یہ عدم قدرت تصرف بمثل عدم قدرت تصرف محبوس و مُکْرَہ و مجبور، ملک اور نکاح میں رخنہ انداز نہ ہوگی۔ غرض ہماری ازواج و اموال کی طرح بوجہ عروض موت ملک اور نکاح سے خارج نہ سمجھے جائیں گے۔

(حیات شہداء اور انبیاء علیہم السلام میں فرق) اور شہداء اگرچہ موافق ارشاد خداوندی ہمارے نزدیک منجملہ احیاء ہیں پر ان کی حیات جسمانی بوجہ تعلق جسم دنیا نہیں بلکہ اجسام جنۃ سے ان کی ارواح کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے چنانچہ احادیث میں مصرح ہے اور لفظ قرآنی یعنی عِنْدَ رَبِّہِمْ اس کی طرف مشیر اس لیے متعلقات جسم دنیا سے ان کو کیا سروکار جو مانع میراث اموال و نکاح ازواج ہو اور اگر حیات شہداء سے مراد حیات روحانی ہے اور ان کی موت فقط یہی ہے کہ روح کو جو علاقہ جسم سے تھا اس کو توڑ ڈالا پر وہ کیفیت امساک جو بشہادت آیت۔

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَ الَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا ۚ فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی (پ ۲۴ سورۃ الزمر ع ۵)

(اللہ کھینچ لیتا ہے جانیں جب وقت ہو ان کے مرنے کا اور جو نہیں مریں ان کو کھینچ لیتا ہے ان کی نیند میں پھر رکھ چھوڑتا ہے جن پر مرنا ٹھہرا دیا ہے اور بھیج دیتا ہے اوروں کو ایک وعدہ مقرر تک)

حقیقت موت ہی ان کی ارواح پر عارض نہیں ہوتی تو اس صورت میں اعتراض ہی وارد نہیں ہوتا جو

حاجت جواب ہو مگر تقریر اول تحقیقی بات ہے اور اجسام انبیاء علیہم السلام کا زمین پر حرام ہونا اس پر شاہد اور شہداء سے بقائے اجسام کا وعدہ نہ ہونا یعنی زمین پر ان کے اجسام کا حرام نہ ہونا اور اس کے مؤید ہے۔

باقی بعض شہداء اور صلحاء کے اجسام کا بعد قرون دراز سالم نکل آنا اس کے مخالف نہیں۔ اوّل تو کیا معلوم کہ بعد میں ان کے اجسام سالم رہیں یا نہ رہیں۔ دوسرے نہ کھلنے کے لیے اسباب کثیر ہیں۔ فقط حرمت ہی نہیں۔ حرم کے جانور اصل میں حلال، حرم کے سبب حرام ہیں۔ شہد کے لیے مکھیاں محافظ ہیں۔ بوڑھوں سے چنے کے دانے نہیں چبتے۔ غرض نہ کھلنے کی بیس صورتیں ہیں۔ پر جو بات مستلزم حیات ہو یہاں بجز حرمت اجساد اور کچھ نہیں اس لیے کہ ماورا جن و انس زمین و آسمان وغیرہ کا محکوم و مخاطب و مامور خداوندی ہونا مثل آیت،

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَ يَا سَمَاءُ أَقْلِعِي (پ ۱۲ ھود ع ۴) (اور حکم آیا اے زمین نگل جا اپنا پانی اور اے آسمان تھم جا۔)

سے معلوم ہوتا ہے اور چونکہ محکوم و مخاطب ہونے کے لیے ادراک و شعور کی ضرورت ہے تو اس باب میں تسکین کے لیے وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وغیرہ آیات و احادیث و معجزات و کرامات و حکایات کافی ہیں۔ اور جب زمین و آسمان بھی مامور و مخاطب ہوئے تو پھر حرمت و حلت کے معانی حقیقت ہی مراد لینے چاہئیں مجاز کی کیا ضرورت۔

(حدیث إِنَّ اللهَ حَرَّمَ عَلَى الْأَرْضِ الخ میں حرمت کی اقسام) مگر حرمت حقیقی کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ احترام حرام مد نظر ہو جیسے حرمت لحم بنی آدم میں احترام بنی آدم ملحوظ ہے دوسرے یہ کہ احترام محرم علیہم مقصود ہو جیسے حرمت خنزیر و کلب و نجاسات میں ہوتا ہے۔ یعنی غرض اصلی یہ ہے کہ بنی آدم جیسے عالی مراتب کو ان اشیاء کا کھانا مناسب نہیں۔ سو حرمت اجساد انبیاء علیہم السلام میں احترام زمین تو مقصود ہو ہی نہیں سکتا ورنہ اجساد انبیاء کو ہمارے اجساد سے (معاذ اللہ) زیادہ ناپاک اور ناقص کہنا پڑے گا۔

الغرض ہمارے اجساد کا زمین پر حرام نہ ہونا اور اجسام انبیاء کرام علیہم السلام کا زمین پر حرام ہونا اس صورت (احترام محرم علیہم) میں خواہ مخواہ اس بات کو مقتضی ہے کہ عوام الناس کے اجسام پاک و طیب ہوں اور انبیاء کرام علیہم السلام کے اجسام ناپاک اور خبیث ہوں۔ سو ایسی بات بجز کفار اور کسی کے

منہ سے صادر نہیں ہو سکتی۔

(انبیاء علیہم السلام میں حرمت کی پہلی قسم احترام اجساد انبیاء علیہم السلام ملحوظ ہے)

اس لیے اس کا قائل ہونا ضرور پڑا کہ احترام اجسام انبیاء علیہم السلام ملحوظ ہے۔ مگر ظاہر کہ احترام اجسام زمین کی نسبت جبھی متصور ہے کہ وہ زندہ ہوں ورنہ اجسام حیوانات میں در صورت موت نمو بھی متصور نہیں جو یوں کہا جائے کہ زندہ نہیں تو کیا ہوا نامی تو ہیں۔ زمین سے پھر بھی افضل ہیں اس لیے کہ وہ منجملہ جمادات ہے۔ غرض اجسام حیوانات میں نمو اور حیات دونوں متلازم ہیں۔ ہوں جب دونوں ساتھ ہوں۔ نہ ہوں جب دونوں ساتھ نہ ہوں۔ سو اگر بہ نسبت اجسام انبیاء علیہم السلام موت کا قائل ہو جئے یعنی حیات جسمانی کی نفی کیجئے تو پھر احترام اجساد بھی متصور نہیں ورنہ حالت جمادیت کی رو سے تو ہمارے ان کے اجسام سب برابر ہیں۔ اور تعلق سابق کا لحاظ کیجئے تو پھر ایسا قصہ ہو کہ بول و براز میں حالت سابقہ یعنی حال وقت مطعومیت کا لحاظ کیا جائے۔

(انبیاء علیہم السلام کے اجساد کی سلامتی کو کسی دوا کی طرف منسوب کرنا بے دلیل ہے)

اور اگر فرض کیجئے حرمت سے حدیث مشار الیہ میں حرمت حقیقی مراد نہیں بلکہ اجسام کے بالطبع محفوظ رہنے یا زمین کی بالطبع نگہبانی کی طرف مجازاً اشارہ ہے تب محفوظیت بالطبع یا زمین کا ان کو طبعاً نہ کھانا بھی حیات جسمانی ہی پہ دلالت کرے گا۔ اس لیے کہ سوا اجسام احیاء سب حیوانات کے اجسام بعد موت بالطبع محل فساد اور قابل انقلاب ہیئت ارضی ہوتے ہیں۔ بعد موت اگر محفوظ رہتے ہیں تو کسی اور دوا و حافظ قوی مثل روغن و شہد و سرکہ وغیرہ کے سبب محفوظ رہتے ہیں بالطبع محفوظ نہیں رہتے۔ اور کسی دوا حافظ قوی کی طرف سلامت اجسام انبیاء کرام علیہم السلام کو منسوب کرنا قبل اقامت دلیل، اول تو مدعیان میراث کو مفید نہیں۔ دوسرے تجویز بحرمت اس صورت میں زیبا نہیں کیونکہ اس صورت میں روغن وغیرہ کا حافظ رہنا ایسا ہو گا جیسے کوئی جابر کسی حلال چیز کو کسی کو نہ کھانے دے۔

(احتمال ناشی عن غیر دلیل مفید ہو تو پھر ضروریات دین سے اعتماد اٹھ جائے گا)

بایں ہمہ احتمال ناشی عن غیر دلیل بھی مناظرہ میں مفید ہوا کرے تو اعجاز اور دعوائے نبوت اور کتب آسمانی میں بھی ایسے احتمال تو موجود ہیں کیونکہ یہ سب امور بدلائل انیّہ ثابت ہوتے ہیں اور دلیل انی میں ظاہر ہے کہ احتمال عموم لازم بر نسبت ملزوم ہوتا ہے۔ بایں ہمہ

شواہد[1] کا منقوض ہو سکنا استدلال میں مضر نہیں بلکہ نفس شاہد اگرچہ منقوض ہو سکے مفید ہوتا ہے۔

(حیات انبیاء علیہم السلام میں تعلق روح مع الجسد اور اس کے آثار)

القصہ حیات جسمانی انبیاء علیہم السلام کا بعد موت بھی اقرار ضروری ہے اور غرض حیات جسمانی بھی یہی ہے کہ بوجہ تعلق روح، جسم پر روحانیت اور حیات ایسی طرح عارض ہو جائے جیسے تعلق نور سے زمین پر نورانیت عارض ہو جاتی ہے یا تعلق آتش سے آب وغیرہ پر حرارت عارض ہو جاتی ہے۔ سو اس صورت میں جیسے زمین کو منور اور آب وغیرہ کو حار کہتے ہیں ایسے ہی وقت تعلق معلوم جسم کو حی اور زندہ کہیں گے اور چونکہ اموال و ازواج ضروریات اجسام احیاء یعنی ان اجسام کی ضروریات میں سے ہیں جن پر بوجہ تعلق روح روحانیت عارض ہو جاتی ہے۔ تو اگر وہ تعلق ٹوٹ جائے اور اس وجہ سے حیات عارضہ اسی طرح زائل ہو جائے جیسے بعد زوال تعلق نور زمین سے نورانیت زائل ہو جاتی ہے تو روح کو ازواج و اموال بلکہ خود ان اجسام کو ازواج و اموال کی کچھ ضرورت نہ رہے گی۔ اور اگر وہ تعلق نہ ٹوٹے تو پھر حیات جسمانی جوں کی توں رہے گی اور ازواج بدستور سابق نکاح میں اور اموال بدستور سابق ملک میں رہیں گے اور اس سبب سے نہ اموال میں میراث جاری ہو سکے گی نہ ازواج سے کوئی نکاح کا مجاز ہوگا۔

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ اوّل حضرت صدیق اکبرؓ کو وکیل بنایا)

ہاں جیسے کوئی صاحب مال اگر سفر کو جاتا ہے یا چلہ میں بیٹھ جاتا ہے تو اپنے محصلوں اور متعلقین کو جمع خرچ کا وکیل کر جاتا ہے ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ اوّل کو بایں وجہ کہ خلیفہ اموال و ازواج مسلمین کا محافظ اور محل ہوتا ہے بوقت ارادہ چلہ نشینی روضہ مبارک یہ ارشاد فرمایا۔

نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَاءِ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ

(ہم گروہ انبیاء کسی کو وارث نہیں بناتے جو چھوڑ جائیں صدقہ ہوتا ہے۔)

اس تقریر سے یہ شبہ بھی مرتفع ہو گیا ہو گا کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا اور حضرات اہل بیت کو کیوں نہ بتایا غرض ہم لوگ بھی اپنی اراضی کا جمع خرچ اپنے محصلوں اور وکیلوں ہی کو بتلایا کرتے ہیں۔

---

[1] شواہد کا خارجی دلائل سے معارضہ اور نقض۔ شواہد میں استدلال کے لیے مضر نہیں البتہ نفس شاہد ہی ثابت نہ ہو سکے تو پھر خصم کو مفید ہے۔ ۱۲۔ محمد عیسیٰ گورمانی۔

زنانِ پردہ نشین عفت گزین کو یہ تکلیف نہیں دیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کو ایسی تکلیف بیہودہ کاہے کو دیتے۔ بایں ہمہ کتب فریقین سے اس مضمون پر اہل بیت کا شاہد ہونا ثابت ہے۔

(شہادت کتب فریقین ترکہ نبوی کے میراث نہ ہونے پر اہل بیت متفق ہیں)

اہل سنت کی کتابوں کو پوچھئے تو حضرت امیر اور حضرت عباس رضی اللہ عنہما کا حضرت عمر رضہ کے سامنے

هَلْ تَعْلَمَانِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ

(کہا تم نہیں جانتے ہو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم کسی کو وارث نہیں بناتے ہم جو چھوڑیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔)

(بخاری ص ۴۳۶ ج ۱ و ص ۹۹۶ ج ۲)

کے جواب میں یہ کہنا اَللّٰهُمَّ نَعَمْ بخاری میں موجود ہے اور شیعوں کی کتابوں کو پوچھئے تو حضرت امام جعفر صادقؒ کا یہ ارشاد۔

اَنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ وَذَاكَ اَنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِرْهَمًا وَّلَا دِيْنَارًا وَ اِنَّمَا اَوْرَثُوْا اَحَادِيْثَ مِنْ اَحَادِيْثِهِمْ ، فَمَنْ اَخَذَ بِشَيْءٍ مِّنْهَا فَقَدْ اَخَذَ حَظًّا وَافِرًا۔

(علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ کیونکہ انبیاء نے کسی کو وارث نہیں بنایا (اور ایک نسخہ میں ہے کہ درہم و دینار کا وارث کسی کو نہیں بنایا۔ ہاں احادیث کا وارث بنایا جس نے ان احادیث (و علوم) میں سے کچھ حاصل کر لیا اس نے بہت کچھ پالیا۔)

(اصول کافی ص ۳۲ ج ۱ طبع تہران)

بروایت ابو البختری کافی میں موجود ہے۔ سو حصر اِنَّمَا سے دیکھئے کیا نکلتا ہے۔ انصاف ہو تو حدیث کافی حدیث بخاری یعنی لَا نُوْرَثُ سے زیادہ ہے کم تو کیا ہوگی۔ اب شیعہ ہی فرمائیں کہ امام جعفر صادق کون ہیں اور کیسے ہیں اگر ان کی بات بھی قابلِ تسلیم نہ ہو تو پھر بجز یزید و اتباعِ یزید اور کس پر نظر ہوگی۔

اب اور گذارش سنیئے کہ ائمہ سابق خاص کر حضرت امیر اور حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ تعالےٰ عنہما حضرت امام جعفر صادق رحمہ اللہ سے زیادہ تھے کم نہ تھے۔ اگر حدیث مسطور حضرت امام جعفر صادق رحمہ اللہ کو ائمہ سابق کی روایت سے پہنچی تب تو ان کی شہادت مضمون مذکور پر ظاہر ہے ورنہ بطریق وحی یا بذریعہ الہام اگر حدیث مذکور کا مضمون ان کو معلوم ہوا تھا تو ائمہ سابق کو بطور مذکور اس کی

اطلاع پہلے ہونی چاہیئے۔ اور یہ بھی نہ سہی تو ناظران وصیت نامہ خداوندی (ملاحظہ کریں) جو مختوم بخواتیم الذہب حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے اور کلینی میں مفصل مرقوم ہے شیعوں کو یاد ہی ہوگا کچھ کلام اللہ تو نہیں جو یاد ہی نہ ہو۔

اس میں حضرت امام جعفر صادق رحؒ کی نسبت یہ ارشاد ہے وَاَنْشُرْ عُلُوْمَ اَهْلِ بَيْتِكَ اس سے متبادر یہی ہے کہ علوم جعفری علوم جدیدہ نہیں علوم سابقہ ہیں۔ خاص کر وہ علوم جو متعلق بوقائع سابقہ ہوں، جیسے یہی حدیث ہے اس لیے کہ لفظ انما حصر پر دلالت کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ تصحیح حصر مشارٌالیہ بعد لحاظ اس امر کے کہ اور انبیاء علیہم السلام تو کیا خود سرور انبیاء علیہ السلام بہت کچھ چھوڑ کر اس عالم سے تشریف لے گئے ہیں۔ جبھی متصور ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی طرف سے موجبات ارث میں سے ہرگز کوئی امر ظاہر نہ ہوا ہو جو ان کی طرف فاعلیت ایراث منسوب ہو سکے اور یوں کہہ سکیں اَوْرَثُوْا دِرْهَمًا اَوْرَثُوْا مَالًا۔ مگر موجب ارث مورث کی جانب اگر ہے تو وہی انفکاک علاقہ روح وجسم ہے اس لیے مقتضیٰ اِنَّمَا اَوْرَثُوْا اَحَادِيْثَ مِنْ اَحَادِيْثِهِمْ یہی ہوگا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی ارواح طیبہ کو اجسام مطہرہ سے علاقہ معلوم بدستور حاصل ہے۔

بہرحال کتب فریقین حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر شاہد ہیں اور حدیث لَا نُوْرَثُ کا مضمون کتب معتبرہ شیعہ میں موجود ہے۔

(ایک شبہ کا ازالہ وارث ہونے کے لیے صرف تعلق روح کافی نہیں اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعد موت کسی کے وارث نہیں ہوئے)

ہاں اس صورت میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر علاقہ مذکور منقطع نہیں ہوا اور اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترکہ میں میراث جاری نہیں ہو سکتی تو اس وجہ سے لازم یوں تھا کہ آپ کے اقرباء کے ترکہ میں سے آپ کا حصہ نکالا جاتا کیونکہ آپ زندہ ہیں اور زندہ اموات کا وارث ہوا کرتا ہے مگر جب اس بات کا لحاظ کیا جائے کہ جیسے مورث کے لیے انقطاع علاقہ معلوم کافی ہے اسی طرح وارث ہونے کے لیے وجود علاقہ معلوم کافی نہیں ورنہ جو بچہ بعد مورث قبل وضع حمل مر جائے وارث قرار دیا جایا کرے۔ بشہادت احادیث صحیحہ تین چلّوں کے بعد روح ڈالی جاتی ہے اور بالیقین یہ بات معلوم ہے کہ اگر بچہ پیٹ میں مر جائے تو ساعت دو ساعت تک تو خیر اپر اس سے زیادہ اگر بچہ

شکم مادر میں ہے تو پھر اس کی زندگی معلوم۔ چہ جائیکہ کئی مہینے بعد مرگ بچہ شکم مادر میں ہے اور والدہ بحال خود باقی رہے، غرض یہ احتمال نہیں ہو سکتا جو ایام قرب وضع حمل میں یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ شاید بچہ کئی مہینے سے مردہ شکم میں موجود ہو پھر کیونکر اس کے لیے ترکہ والد میں سے مثلاً حصہ تجویز کریں۔ غیروں کی حق تلفی کا اندیشہ ہے۔ زندگانی محتمل پر میراث جو ایک امر یقینی ہے متفرع نہیں ہو سکتی۔ بالجملہ اگر بعد تین چلوں کے کسی عورت کا خاوند مر جائے اور بعد نو ماہ بچہ مرا ہوا اس عورت کے پیدا ہو تو بالیقین یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ بچہ اپنے والد کے بعد مرا ہے۔ اگر وارث ہونے کے لیے فقط علاقہ مذکور کافی ہو سکتا ہے تو لاریب ایسے اطفال اپنے والد وغیرہ کے وارث ہوا کرتے یعنی ان کے لیے موافق استحقاق حصہ نکالا جایا کرتا اور پھر موافق قواعد میراث جس کسی کو پہنچتا اس کو حوالہ کیا جایا کرتا۔ لیکن جب علاقہ مذکور کافی نہیں تو پھر بجز اس کے اور احتمال نہیں کہ وقت تعلق میراث مال میراث پر وارث کا قبض و تصرف ممکن ہو اگرچہ بوجہ نقصان طاقت یا کمی عقل وغیرہ اسباب قبض و تصرف مال میراث پر قبض و تصرف نہ کر سکے بالجملہ مال میراث بہ نسبت وارث محل قبض و موقع تصرف میں ہو مگر یہ بات جیسے بچہ شکم میں مفقود ہے ایسے ہی مدفون بلکہ معروض موت میں یہ بات مفقود ہے بلکہ غور سے دیکھئے تو اس شخص میں جس کی حیات زیر پردہ موت مستور ہو اور پھر اس پر مدفون بھی ہو چکا ہو۔ بمدارج زیادہ قبض و تصرف ممتنع ہے۔ کیونکہ بچہ شکم کے باہر آنے کی اُمید ہے اور مدفون میں اس اُمید کی گنجائش نہیں بچہ شکم اگرچہ ضعیف و ناتواں ہے اور بے عقل و ناداں ہے پر اسباب قبض یعنی یہی عقل و طاقت جس قدر ہے بطور خود ہے کسی عارض کے تلے دبی ہوئی نہیں کسی پردہ کے پیچھے مستور نہیں اور مدفون میت میں اگر حیات بھی ہے تو موت کے تلے دبی ہوئی ہے بہر حال علت ملک قبض و تصرف ہے اپنا ہو یا کسی اپنے ولی یا وکیل کا ہو۔ جہاں دونوں نہ ہو سکیں۔ وہاں تصور حدوث ملک ایک خیال خام ہے اپنا قبضہ تو ظاہر ہے ان دونوں صورتوں میں یعنی بچہ شکم ہو یا میت و مدفون ممکن ہی نہیں۔

رہا وکیل کا قبضہ یا ولی کا قبضہ، وہ قبضہ اصلی کا ظل و فرع ہوتا ہے وہ نہیں تو یہ بھی نہیں۔

(ایک سوال

کیا موت کے بعد زوالِ قبض سے ملک باقی رہتی ہے؟)

رہی یہ بات کہ اگر حدوث ملک بے حصول قبض ممکن نہیں تو بتائیے ملک بھی بعد زوال قبض ممکن نہیں پھر کیا وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ملک ہنوز باقی ہے۔

(جواب - اپنی زندگی میں لَا نُوْرَثُ فرمانا بغرض توکیل تھا لہذا قبضہ بذریعہ وکیل باقی رہا)

اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد لَا نُوْرَثُ فقط بغرض توکیل تھا اور ظاہر ہے کہ اس وقت توکیل صحیح بھی اور بقار توکیل و وکالت کے لیے فقط بقار شعور و قوی قابضہ کافی ہے۔ ہاں حدوث توکیل کے لیے بالبداہت موکل کا مقام توکیل میں ہونا ضرور ہے۔ اور ولی کا مقام تولیت میں ہونا لازم۔ سو ضروریات حصہ توکیل و تولیت و وکالت و ولایت قبل وضع حمل بچہ میں مفقود ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں قبل وفات سب موجود۔ ہاں بعد وفات یہاں بھی وہ سب امور مفقود ہو گئے۔ اس لیے وصیت و توکیل لانورث تو صحیح رہی اور وراثت بالعد کے لیے کوئی صورت نہ نکلی۔

(جواب ۲:- مالک اصلی خدا تعالیٰ ہیں ہماری ملک احتیاج کی وجہ سے ہے)

علاوہ بریں یہ گذارش ہے کہ مالک اصلی تو جناب خداوند کریم وحدہ لاشریک لہ ہے اور ملک مخلوقات فقط اس کے ملک کا پرتو ہے بلحاظ حاجت بنی آدم ان کو اپنا خلیفہ بنایا یعنی ان کو حاجت مند دیکھ کر اجازت تصرف عنایت فرمائی اور بقدر قبضہ جس کا ملک کے لیے علت ہونا اوراق میں سے ہی واضح ہو جائے گا ملک عرضی عنایت فرمائی۔ لیکن جب حاجت کا لحاظ کیا جائے تو پھر وہی اشیار قابل سمجھی جائیں گی۔ جن میں منافع بھی ہوں اور جو اشیار خالی از منفعت ہوں یا اُلٹی ان میں مضرتیں ہوں جیسے میتہ اور دم اور خنزیر اشیار قابل حدوث ملک وغیرہ تو وہ ملک نہ ہوں گی۔

(ملک جدید کے لیے حاجت مندی ضروری ہے لیکن لقائے ملک بغیر احتیاج کے بھی ہو سکتا ہے)

لیکن جیسے درصورت حاجت بوجہ عدم منافع محتاج الیہا ملک حادث نہیں ہو سکتی ایسے ہی بوجہ عدم احتیاج یا زوال حاجت، تعلق ملک قابل تسلیم نہ ہو گا۔ کیونکہ وہاں اگر شرط قابلیت نہیں تو یہاں وجہ فاعلیت کچھ نہیں۔ ہاں یہ مسلّم کہ علت ملک فقط وہ قبض تام ہے جس کی طرف ان اوراق میں اشارہ ملے گا۔ اور احتیاج موجب تحرک و تعلق قبض مذکور ہے اس لیے یہ ہو سکتا ہے کہ ملک باقی ہو اور احتیاج باقی نہ ہو۔ کیونکہ اسباب تعلق قوی فاعلیت مثل نور چراغ وغیرہ کا ہونا حدوث تعلق کے لیے ضرور ہے بقار تعلق کے لیے ضرور نہیں۔ اگر کسی مکان میں چراغ نہ ہو تو اس کے در و دیوار کے ساتھ تعلق نور کے لیے چراغ کا لانا مثلاً ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ بقار نور کے لیے حرکت

مذکورہ ضرور نہیں بلکہ الٹی وہ حرکت اس وقت سبب زوال تعلق ہے چنانچہ ظاہر ہے بالجملہ احتیاج موجب حدوث ملک یعنی سبب تعلق جدید ملک مالک ہے خود سبب ملک نہیں ورنہ خداوند کریم مالک نہ ہوتا۔ اس صورت میں ملک سابق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم زائل نہ ہوگی اور جدید پیدا نہ ہوگی۔

اب ناظران اوراق کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ وہ مقدمات ثلثہ جن پر دعوئے میراث راست ہوسکتا ہے ان میں سے ایک تو انقطاع علاقہ فیما بین روح وجسم مورث تھا اس کا حال تو معلوم ہوگیا۔ غرض اس کا اثبات تو شیعہ کیا کریں گے جواب دلائل بقاءِ علاقہ مذکور کا فکر فرماویں۔

(بنا میراث کی دوسری شرط کا فقدان) رہے دو مقدمہ باقیہ۔ ایک تو ان میں عموم خطاب یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ ہے جس کا اثبات شیعوں کے ذمہ ضروری ہے مگر شیعہ تو اس کو کیا ثابت کریں گے ہاں ہم سے دلائل وشواہد خصوص سنیئے ہم گلا پکارے کہتے ہیں۔

(فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ کی طرح یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ کا خطاب بھی صرف امتیوں کو ہے) کہ یہ خطاب فقط امتیوں ہی کے لیے ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عام نہیں اگر مجتہدان شیعہ کو غیرت مذہب ہو تو ہماری گذارش کا جواب معقول سوچ کر لائیں ورنہ فکر عاقبت فرمائیں اور سُنّی بن جائیں۔ وجہ خصوص کا شاید کسی کو انتظار ہو اس لیے معروض ہے۔ شروع سورۂ نسائیں اول یہ ندا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ الخ (پ۴ نساء ع۱) (اے لوگو ڈرتے رہو اپنے رب سے جس نے پیدا کیا تم کو ایک جان سے)

اس کے بعد اس ندا کے ذیل میں بہت سے خطاب ہیں ان میں سے ایک تو یہی خطاب یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ ہے اور اس سے پہلے خطاب۔

فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ (پ۴ نساء ع۱) (تو نکاح کر لو جو اور عورتیں تم کو خوش آویں دو دو تین تین چار چار)

سو اگر خطاب یوصیکم اللہ عام ہوگا تو خطاب فانکحوا پہلے عام ہوگا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وہی چار ازواج کی تحدید ہوگی۔ اس صورت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کو فدک نہ دینا اتنا محل اعتراض نہ ہوگا جتنا رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم کا چار سے زیادہ (بیویوں) کا جمع رکھنا مورد اعتراض ہو سکتا ہے۔

کیونکہ اوّل معتقدان خلیفہ اوّل ان کی معصومیت کے قائل نہیں اگر معتقد ہیں تو ان کی ولایت کے معتقد ہیں اور ولایت کے لیے ان کے نزدیک معصوم ہونا ضرور نہیں اگر ضرور ہے تو نبوّت و رسالت کے لیے ضرور ہے باایں ہمہ فہیم ہو تو کلام اللہ اس پر شاہد ہے۔ اولیاء کی تعریف میں تو یہ ارشاد ہے۔ اِنْ اَوْلِيَاۤؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ اور رسل کی تعریف میں یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (پ ۲۹ الجن ع ۲) (سو نہیں خبر دیتا اپنے بھید کی کسی کو مگر جو پسند کر لیا کسی رسول کو)

غرض حاصل ولایت اتقاء ہے اور حاصل رسالت ارتضاء کیونکہ من رسول بیان و تفسیر من ارتضٰی ہے اور ظاہر ہے کہ اتقاء مذکور فعل اولیاء ہے کیونکہ متقون صیغہ فاعل ہے اور اولیاء پر محمول اور ارتضاء مشار الیہ فعل خداوندی ہے چنانچہ رجوع ضمیر فاعل ارتضٰی الی اللہ اس پر گواہ عادل ہے اور سب جانتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ اطاعت سے راضی ہوتا ہے اور معصیت سے ناخوش

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ (اور اللہ راضی نہیں ہوتا نافرمان لوگوں سے۔)

کلام اللہ میں موجود ہے۔ سو اطلاق من ارتضٰی سے یہ بات نمایاں ہے کہ رسول بجمیع الوجوہ مرتضٰی ہوتے ہیں اور جب مرتضٰی کا رسول ہونا لازم ہوا چنانچہ مِنْ رَّسُوْلٍ کا بیان من ارتضٰی ہونا لیے اس کے بن ہی نہیں پڑتا تو یہ بات آپ لازم آگئی کہ اولیاء بجمیع الوجوہ مرتضٰی نہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اطلاق ارتضاء وہی حاصل معصومیت ہے۔

باایں ہمہ اتقاء مبنی للفاعل۔ اتقاء مبنی للمفعول کو مستلزم نہیں[1] آگ سے۔ کھائی کنویں سے ہر کوئی بچتا پھرتا ہے اور پھر کبھی بغیر پیش قدمی سے یا کسی کا جبر موجب وقوع ہو جاتا ہے کوئی کسی کے تلوار یا تیر یا نیزہ مارتا ہے تو بچنے کے لیے اپنے سے سبھی تدبیریں کرتا ہے مگر کبھی اس پر بھی زخمی ہو ہی جاتا ہے غرض اولیاء میں اتقاء مبنی للفاعل[2] کا ہونا چاہیئے۔ چنانچہ متقون کا صیغہ فاعل اس کے لیے دلیل کافی ہے۔ اور اتقاء مبنی للفاعل کو اتقاء مبنی للمفعول[3] لازم نہیں چنانچہ ایک

---

[1] یعنی اولیاء گناہوں سے بچتے ہیں [2] یعنی خدا گناہوں سے اولیاء کو بالکل بچالے یہ ضروری نہیں۔ ۱۲ مہر محمد۔

شاعر اردو بھی اسی مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

زہد و تقویٰ دھرا ہی رہا   ہاتھ اس کے سے مے پیتے ہی بنی

القصہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ولی تھے نبی نہ تھے اور ولایت کو اتقار مبنی للفاعل کافی ہے اتقار مبنی للمفعول ضروری نہیں اور جب مرتبہ مبنی للمفعول تک نوبت نہ پہنچے تو پھر معصومیت کہاں۔ علاوہ بریں رحساب دوستاں در دل، عجب نہیں کسی حق کے عوض میں خلیفہ اول نے فدک کو مجرا کر لیا ہو اور یہ بھی نہ سہی ادھر سے اگر تعدی ہوئی تھی تو ادھر عفو کر دیا ہو۔

یا حسب روایت علامہ حلی خلیفہ اول نے اگرچہ فدک کے دینے میں تامل کیا تھا مگر انجام

(بروایت علامہ حلی (شیعہ) حضرت صدیق اکبرؓ نے فدک حضرت فاطمہؓ کو دیا اور وہ راضی ہو گئیں)

کار حضرت سیدۃ النساء رضی اللہ عنہا کو واپس کر دیا ہو چنانچہ کتاب منہاج الکرامہ مصنفہ شیخ ابن مطہر حلی میں وہ روایت بایں الفاظ موجود ہے۔

لَمَّا وَعَظَتْ فَاطِمَةُ اَبَا بَکْرٍ فِیْ فَدَکَ کَتَبَ بِهَا کِتَابًا وَّرَدَّهَا عَلَیْهَا۔

(منہاج الکرامۃ صہ ۶۳)

(جب حضرت فاطمہؓ نے فدک کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ کو نصیحت کی تو آپ نے اس کے متعلق تحریر لکھ دی اور فدک فاطمہ کو واپس کر دیا۔

اور اگر فرض کیجئے حضرت فاطمہؓ کو خلیفہ اول نے فدک پر قبضہ نہیں دیا تو اس کی آمدنی تو بالفرض حسب دستور زمانۂ نبوت حضرت زہراؓ اور اہل بیت ہی کے تصرف میں آتی رہی۔ چنانچہ فریقین اس بات پر متفق ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے آمدنی فدک کو اپنے آپ خورد برد نہیں کیا اور کتب فریقین اس پر شاہد ہیں ایک روایت مدارج السالکین جس سے دعوے مذکور اور نیز قصہ تراضی طرفین معلوم ہو جائے نقل کرتا ہوں وہ یہ ہے۔

اِنَّ اَبَا بَکْرٍ لَمَّا رَاٰی اَنَّ فَاطِمَةَ انْقَبَضَتْ عَنْهُ وَهَجَرَتْهُ وَلَمْ تَتَکَلَّمْ بَعْدَ ذٰلِکَ فِیْ اَمْرِ فَدَکَ کَبُرَ ذٰلِکَ عِنْدَهٗ فَاَرَادَ اِسْتِرْضَاءَهَا فَاَتَاهَا وَقَالَ لَهَا صَدَقْتِ یَا بِنْتَ رَسُوْلِ اللّٰهِ فِیْمَا ادَّعَیْتِ وَلٰکِنِّیْ

(حضرت ابوبکرؓ نے جب دیکھا کہ حضرت فاطمہؓ ان سے خفا ہو گئی ہیں ترک ملاقات کر دی ہے اور فدک کے بارے میں پھر کوئی بات نہیں کی تو یہ بات آپ کو گراں گذری حضرت فاطمہؓ کو راضی کرنے کا ارادہ کیا تو آپ کے پاس آئے اور فرمایا آپ نے سچ کہا

رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عليه وَسَلَّمَ يُقَسِّمُهَا
فَيُعْطِي الْفُقَرَاءَ وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ بَعْدَ
اَنْ يُّؤْتِيَ مِنْهَا قُوْتَكُمْ وَاَنَا صَانِعٌ بِهَا
فَقَالَتْ اِفْعَلْ فِيْهَا كَمَا كَانَ اَبِيْ رَسُوْلُ
اللّٰهِ صلى اللّٰه عليه وسلم يَفْعَلُ فِيْهَا
فَقَالَ ذٰلِكَ عَلَيَّ اَفْعَلُ فِيْهَا مَا كَانَ
يَفْعَلُ اَبُوْكِ فَقَالَتْ وَاللّٰهِ لَتَفْعَلَنَّ فَقَالَ
وَاللّٰهِ لَاَفْعَلَنَّ ذٰلِكَ فَقَالَتْ اَللّٰهُمَّ
اشْهَدْ فَرَضِيَتْ بِذٰلِكَ وَاَخَذَتِ الْعَهْدَ
عَلَيْهِ وَكَانَ اَبُوْبَكْرٍ يُعْطِيْهِمْ مِنْهَا
قُوْتَهُمْ وَيُقَسِّمُ الْبَاقِيَ فَيُعْطِي الْفُقَرَاءَ
وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ - انتہی

اے رسول کی بیٹی ! جو تو نے دعویٰ کیا ہے لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ وہ تقسیم کرتے اور فقرار اور مساکین اور مسافروں کو دیتے تھے اس کے بعد کہ تمہارا راشن بھی نکالتے تھے میں بھی یہی کچھ کروں گا حضرت فاطمہؓ نے فرمایا آپ فدک میں وہ کام کریں جو میرے باپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ فرمایا بالکل ٹھیک! ضرور میں وہی کروں گا جو آپ کے والد کرتے تھے فرمانے لگیں خدا کی قسم تم ضرور کروگے۔ فرمایا ہاں اللہ کی قسم میں یہ ضرور کروں گا فرمانے لگیں اے اللہ تو گواہ رہ پھر حضرت فاطمہؓ اس پر خوش ہوگئیں اور عہد و پیمان لے لیا۔ حضرت ابوبکر اہل بیت کو فدک سے راشن دیتے تھے اور بقیہ فقرار مسکینوں اور مسافروں میں بانٹ دیتے تھے۔)

مگر اس قسم کے عذر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متصور نہیں.

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں بیک وقت چار سے زائد بیویاں تھیں)

مگر ہاں شاید کسی محقق کو یہ سوجھے کہ ازواج مطہرات میں سے چار منکوحہ ہوں باقی متعی ہوں یا چار حرہ ہوں باقی منجملہ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ ہوں۔ یا زمان واحد میں چار سے زیادہ نکاح نہ کئے ہوں۔ ہاں علی سبیل التعاقب زیادہ کی نوبت آئی ہو۔ مگر ایسا کون ہوگا جو اس دام فریب میں آجائے۔ کون نہیں جانتا کہ نہ حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی متعہ کیا نہ ائمہ اطہار میں سے کسی نے یہ کام کیا۔ بایں ہمہ چار سے زیادہ میں گنئے دیتا ہوں جو باتفاق فریقین حرہ منکوحہ تھیں متعی نہ تھیں اور پھر زمان واحد میں مجتمع تھیں حضرت عائشہؓ (صدیقہ) حضرت حفصہؓ۔ حضرت سودہؓ۔ حضرت ام سلمہؓ۔ حضرت میمونہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت ام حبیبہؓ یہ سب کی سب منکوحہ بھی تھیں اور سب کی سب حرہ بھی تھیں اور پھر سب کی سب ایک ہی زمانہ میں مجتمع بھی تھیں اس لیے احتمالات ثلاثہ میں سے ایک بھی نہیں چل سکتا۔

اس کے بعد شاید کوئی مجتہد العصر آیت یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّا اَحْلَلْنَا لَکَ اَزْوَاجَکَ الّٰتِیْ اٰتَیْتَ اُجُوْرَھُنَّ (اے نبی ہم نے حلال رکھیں تجھ کو تیری عورتیں جن کے مہر تو دے چکا ہے۔) کے بھروسہ تخصیص عموم خطاب فانکحوا یا نسخ کا خیال پکائے مگر وہ آیت تو دور ہے چوتھا سیپارہ اور اکیسویں پارہ میں بہت فاصلہ ہے۔ آیت فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ اگر ربع اخیر پارہ چہارم میں ہے تو وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ اول پارہ پنجم میں موجود ہے اور ظاہر ہے کہ عموم کلمہ ما بہر حال عموم کلمہ ازواج وغیرہ کلمات مندرجہ ذیل خطاب یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ سے کہیں زیادہ ہے سو اگر آیت یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ مخصص یا ناسخ حکم فَانْکِحُوْا مَا طَابَ ہے تو آیت وَاُحِلَّ لَکُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمْ بدرجہ اولی مخصص یا ناسخ حکم فانکحوا ما طاب ہوگی۔

(سورۃ نساء کا اول رکوع سورت فاتحہ کی طرح گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہلوایا گیا ہے)

ہاں ایک صورت نجات ہے وہ یہ ہے کہ جیسے سورت فاتحہ خدا نے بندوں کی طرف سے تصنیف کر کے ان کے حوالے کر دی ہے تاکہ وقت حضور دربار یعنی وقت ادائے نماز اس طرح سے آداب مجرا بجا لایا کریں ایسے ہی سورت نساء کو یوں سمجھو کہ خداوند کریم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ایک وعظ و پند تصنیف کر کے آپ کے حوالے کر دیا تاکہ وقت خطاب امت اس طرح ان کو سمجھائیں۔ غرض باعتبار تصنیف الحمد سے لے کر سورت والناس تک سارا کا سارا قرآن کلام خداوند رحمان ہے مگر باعتبار تکلم مقابل خطاب و غیبت سب خدا ہی کا کلام نہیں بندوں کا بھی کلام ہے سو جیسے کسی وکیل کا مسودہ عرضی جو اپنے کسی موکل کی طرف سے یا کسی منشی کا مسودہ جو کسی کی طرف سے مثلاً تحریر کرے یا کسی شاعر کا کسی عاشق و معشوق کی مثنوی میں ان کی گفتگو کو نظم کرنا۔ اس وکیل اور اس منشی اور اس شاعر کی طرف منسوب ہوتا ہے اور ان کا کلام کہلاتا ہے چنانچہ وقت مذاکرہ اکثر کہتے ہیں کہ یہ فلانے وکیل کی تقریر ہے اور فلانے منشی کی تحریر اور فلانے شاعر کا کلام ہے باایں ہمہ متکلم مقابل مخاطب وہ موکل اور وہ جاہل اور وہ عاشق و معشوق ہوتے ہیں ایسے باعتبار انشاء و تصنیف[1] تو قرآن سارے کا سارا خدا کا کلام ہے مگر باعتبار تخاطب کہیں اپنا ہی کلام ہے کہیں کسی اور کا۔ سو سورۃ الحمد تو باعتبار تخاطب تمام جہان کا کلام سمجھئے۔

---

[1] ترکیب و ترتیب قرآن کو سمجھانے کے لیے یہ مروجہ الفاظ استعمال کیے ورنہ قرآن کو انشاء و تصنیف نہیں کہہ سکتے کیونکہ کلام قدیم ہے۔ محمد شریف پاک۔ مہر محمد

چنانچہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ الخ اس پر شاہد ہے اگر باعتبار تخاطب نعوذ باللہ اس سورت کو کلام خداوندی سمجھئے تو یہ معنی ہوں کہ خدا بھی کسی کا بندہ ہے نعوذ باللہ منہا۔ خدا بھی نعوذ باللہ کسی کی عبادت کرتا ہے خدا بھی کسی سے مدد مانگتا ہے خدا تعالیٰ بھی کسی سے طالب ہدایت ہے علیٰ ہذا القیاس آیت وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ (پ ١٦ مریم ع ٤) (اور ہم نہیں اترتے مگر حکم سے تیرے رب کے اسی کا ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے اور جو اس کے بیچ میں ہے۔) باعتبار تخاطب فرشتوں کا کلام ہے چنانچہ قرینہ بامر ربک ہے اور قصہ شان نزول اس پر دلیل کامل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس سورت نساء۔ اول تو تمام و کمال ورنہ یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ تک تو بالضرور باعتبار تخاطب کلام حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اول تو وہی قرینہ فَانْكِحُوْا اس پر شاہد ہے اگر باعتبار تخاطب کلام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نہ کہیے کلام خدا کہیے تو پھر اول درجہ کے معصوم کی نسبت یہ اعتقاد رکھنا ضرور ہو کہ وہ سب سے بڑھ کر نعوذ باللہ منہا فاسق و فاجر و عیاش تھے۔ دوسری ندا یٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ میں ربکم کو غائب رکھا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر کلام کے لیے ایک متکلم اور اور ایک مخاطب مغایر یکدگر ہوتا ہے اور اگر غائب بھی ہوتا ہے تو وہ بھی مغایر حقیقی ہوتا ہے غرض یہ تینوں مفہوم ایک مصداق میں مجتمع نہیں ہو سکتے اور ان تینوں میں اتحاد متصور نہیں سو قرینہ غیبوبت ربکم خود اس پر شاہد ہے۔ کہ خداوند کریم باعتبار تخاطب متکلم نہیں اس صورت میں ظاہر ہے کہ سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کسی کا احتمال نہیں۔ کیونکہ ادھر تعیین غیر پر نہ کوئی دلیل ہے نہ کوئی قرینہ اور ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیامبر ہونا اس بات کے لیے خواستگار کہ بعد خداوند کریم باعتبار تخاطب اس کلام کے متکلم درحالت عدم قرینہ اگر ہو سکتے ہیں تو حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ہو سکتے ہیں مگر یہی بات بعینہ جملہ یُوْصِیْكُمُ اللّٰهُ میں سمجھ لیجیے اس جملہ میں بھی یوصی صیغہ غائب اللہ کے لیے ہے اور پھر قرینہ دوام حیات اور عدم زوال علاقہ فیما بین روح و جسم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے لیے عمدہ دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس خطاب میں داخل نہیں اور جب آپ مخاطب نہیں ادھر خدا غائب بمعنی مقابل متکلم و مخاطب۔ تو متکلم سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کون ہوگا غرض وجوہ ظاہرہ اس بات پر گواہ ہیں کہ باعتبار تخاطب یہ کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے خدا تعالیٰ کا کلام نہیں۔

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک اور ارواح امت میں متعدد وجوہ تفاوت کی بناء پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان احکام کے مخاطب نہیں)

اور باعتبار اصل کنہ کے دیکھئے تو حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ان احکام کے مخاطب ہو بھی نہیں سکتے۔ میراث کا حال تو معلوم ہی ہو گیا نکاح کی بات سنئے وہاں بھی وہی دوام حیات مانع ورود خطاب ہے۔ یعنی جب آپ منبع فیض روحانیت وحیات ہوئے اور امت کی ارواح کے لیے آپ کی روح پر فتوح صلی اللہ علیہ وسلم منشأ انتزاع اور علت اور موثرہ ہوئی اور ارواح امت فیض اور انتزاعیات اور معلول اور اثر ٹھہرے۔ تو پھر آپ کی روح کو امت کی ارواح میں وہ نسبت تجانس نہ ہوگی جو فیمابین ارواح امت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ افراد جنس واحد اگر باہم مساوی نہ ہوں تو بعد کمی وبیشی تعداد یا اوزان یا مساحت جو کچھ وہاں بن پڑے تساوی حاصل کر سکتے ہیں۔ پر فیوض وانتزاعیات وآثار ومعلولات کو منبع فیض اور منشاء انتزاع اور موثر اور علت کے برابر کسی طرح نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً ایک دھوپ دوسری دھوپ کے برابر نہ ہو تو بعد تسویہ ہر دو میدان اور رفع موانع آمد نور وغیرہ کے دونوں برابر کر سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس بڑی سطح سے چھوٹی سطح کے برابر قطع کر سکتے ہیں اور چھوٹی سطح کو بعد اضافہ جسم بڑی سطح کے برابر بنا سکتے ہیں۔ مگر سب جانتے ہیں کہ سارے جہاں کی دھوپیں ایک نور آفتاب کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ علیٰ ہذا القیاس وجود تمام کائنات ایک وجود خالق عالم کے برابر نہیں ہو سکتا۔ جب تساوی کا حال معلوم ہو گیا کہ کہاں ہو سکتی ہے کہاں نہیں ہو سکتی تو آگے سنئے۔

(باعتبار لغت بھی زوجیت طرفین کے تساوی کو چاہتا ہے)

مفہوم زوجیت وازدواج باعتبار لغت بھی انقسام بتساوییین کو مقتضی ہے اور باعتبار شرع بھی تساوی طرفین کا خواستگار۔ چنانچہ آیت وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ اس پر شاہد ہے اور ادھر دیکھا تو نکاح وازدواج سے حسن معاشرت مطلوب۔ چنانچہ آیت۔

وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً (پ ۲۱ روم ع ۳)

(اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ کہ تم کو بنایا مٹی سے پھر اب تم انسان ہو زمین میں پھیلے پڑے اور اس کی نشانیوں سے ہے یہ کہ بنا دیے تمہارے واسطے تمہاری قسم کے جوڑے کہ چین سے رہو ان کے پاس اور رکھا تمہارے بیچ میں پیار اور مہربانی۔)

سے اہل فہم کو یہ بات عیاں ہے۔ آخر حسن معاشرت میں بجز انس باہمی جو حاصل سکون مشارٌ الیہ اور مودّۃ مذکورہ ہے اور کیا ہوتا ہے۔

(نکاح میں مطلوب حسن معاشرت ہے جو کمالات علمی اور عملی کا نتیجہ ہے)

مگر مرجع کار حسن معاشرت دیکھا تو اخلاق کی طرف ہے اور اخلاق حاصل ضرب قوت علمیہ اور قوت عملیہ کا نام ہے۔ اس لیے کہ اخلاق کے تحلیل کرنے سے سوا اس کے اور کیا نکلتا ہے۔ رحمت وغضب کو دیکھیے تو بجز اس کے کیا ہے کہ کسی کی شکستہ حالی یا مخالفت کے علم کے باعث ادھر سے عمل داد و دہش یا ضرب و سرزنش ہوتا ہے۔ اس لیے مساوات مشارٌ الیہ جو مقتضائے زوجیت و ازواج تھا باعتبار حاصل ضرب قوت علمیہ و قوت عملیہ ہوگا۔

یا اس مضمون کو یوں تعبیر کیجیے کہ مساوات جسمانی تو مراد ہی نہیں باعتبار وزن ہو یا باعتبار پیمائش۔ اگر مراد ہے تو باعتبار روحانیت مراد ہے اور ظاہر ہے کہ کمالات روحانی یا علمی ہیں یا عملی یا ان دونوں سے مرکب اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مقصود وہ حاصل ترکیب ہر دو کمال ہے نہ علم خالی از عمل مطلوب ہے ورنہ حسن معاشرت اور اعمال عبادات وغیرہ کے کیا معنی تھے اور نہ فقط عمل خالی از علم جیسے افعال لایعنی اور حرکات بے معنی یا اعمال منافقین واہل تمسخر ہوتے ہیں۔ کیونکہ علم عظمت خداوندی وغیرہ ان اعمال کے ساتھ مضموم نہیں ہوتا ورنہ اس قسم کے اعمال مکروہ یا مردود نہ ہوا کرتے۔ لیکن حاصل کمالات علمی و کمالات عملی اخلاق ہوں یا ارادہ و نیت ہو یا اعمال ظاہرہ جو بشرط اخلاص صادر ہوئے ہوں۔ سب کے سب حاصل جمع کمالات مذکورہ تو نہیں ہو سکتے اس لیے کہ حاصل جمع عین مجموعہ اجزاء ہوا کرتا ہے اور یہاں ظاہر ہے کہ یہ سب امور مذکورہ غیر ہیں نہ عین اس صورت میں بجز اس کے کہ حاصل ضرب کہیے اور کیا کہیے۔ کیونکہ دو زیادہ سے ملاکر اگر کچھ حاصل کرتے ہیں تو اس کی یہی دو صورتیں جب یہ بات ذہن نشین ہو چکی تو آگے چلیے۔

(کمالات علمی وعملی مردوں میں بدرجہ اتم اور عورتوں میں اس کا نصف پائے جاتے ہیں)

مخدوم من! کمالات علمی ہوں یا عملی بہر حال مردوں کا حصہ دونا ہے اور عورتوں کا (مردوں سے) آدھا ہے۔ دلیل اس دعویٰ کی اول تو یہی آیت ہے۔ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ۔ کیونکہ یہ آیت اگرچہ بیان میراث میں نازل ہوئی ہے۔ کچھ میراث کی تخصیص نہیں فرمائی عموم الفاظ پر نظر چاہیے خصوص شان نزول پر خیال نہ چاہیے۔ چنانچہ اہل علم خوب جانتے ہیں اور عوام اگر نہیں جانتے تو ان کے

لیے اتنا اشارہ کافی ہے کہ اگر دو آدمیوں میں دس بیس گاؤں مشترک ہوں اور سب میں ایک ہی سا ہر ایک کا حصہ ہو تو اس صورت میں اگر ایک گاؤں میں سے کچھ غلہ آئے تو کارکن بوجہ ناواقفیت مقدار حصص اگر کسی واقف سے ہر ایک کے حصہ کی مقدار پوچھے تاکہ اس کے موافق تقسیم غلہ میں کاربند ہے۔ تو اس صورت میں اگر وہ شخص ہر ایک کا حصہ بتلائے گا تو اس کا یہ بتلانا ہر دفعہ کے لیے اور ہر ایک گاؤں کی آمدنی کے لیے کافی ہوگا اور فقط اسی دفعہ کے لیے نہ سمجھا جائے گا۔

(آیت میں مرد و عورت کے جسم کی مقدار سے بحث نہیں بلکہ ان کے حصص سے بحث ہے اور ذکر و انثیٰ کا اطلاق روح و جسم دونوں پر ہوتا ہے)

باقی کوئی صاحب اگر مقدار جسم زن و مرد میں اس حساب کو درست نہ پائیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ گفتگو درباره خط ذکر و خط انثیٰ ہے خود ذکر و انثیٰ میں یہ حساب نہیں اور ظاہر ہے کہ اطلاق ذکر و انثیٰ جیسا روح پر کیا جاتا ہے ایسا ہی جسم پر بھی یہ اطلاق کیا جاتا ہے چنانچہ احکام روحانی و جسمانی اور افعال و احوال روحانی و جسمانی میں یکساں فرق صیغہ مذکر و مؤنث ملحوظ رہتا ہے۔ قَامَتْ اور قَعَدَتْ اور فَرِحَتْ اور حَزِنَتْ یا عَلِمَتْ اور اَرَادَتْ اگر عورت کے لیے بولتے ہیں تو قَامَ، قَعَدَ، فَرِحَ۔ حَزِنَ یا عَلِمَ اور اَرَادَ مرد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مگر کون نہیں جانتا کہ قیام و قعود، احکام و افعال و احوال جسمانی میں سے ہیں۔ اور فرح اور حزن اور علم و ارادہ، و احکام و احوال و افعال روحانی میں سے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اطلاق ذکر و انثیٰ روح و جسم دونوں پر برابر شائع ہے۔ اس لیے ان دونوں کو اس حساب سے علیحدہ رکھ کر ان کے حقوق میں گفتگو کرنی چاہیئے۔ اور اسے بھی جانے دیجیے خاص علم و عمل میں عورتوں کا مردوں سے کم ہونا عقل و نقل دونوں سے سب کے نزدیک مسلم۔ یہاں تک کہ عورتوں کا ناقص العقل اور ناقص الدین ہونا حدیثوں میں مصرح اور زبانوں پر جاری۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِيْنٍ اَذْهَبُ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدٰكُنَّ۔ (میں نے تم عورتوں سے بڑھ کر عقلمند کی عقل کو اڑانے والیاں نہیں دیکھی ہیں حالانکہ تم عقل اور دین میں بھی ناقص ہو۔)

(بخاری صفحہ ۴۴ جز ۱، مسلم صفحہ ۶۱ جز ۱)

ادھر درباره شہادت کلام اللہ میں یہ ارشاد ہے۔

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ (اور گواہ کر و دو شاہد اپنے مردوں میں سے پھر اگر نہ

فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ	ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں تاکہ اگر بھول جائے ایک ان میں سے تو یاد دلا دے اس
(پ۳، بقرہ ع۳۹)	کو وہ دوسری)

سو اس سے بھی یہی نقصان عقل بقدر نصف ثابت ہوتا ہے کیونکہ ضلالت اصل میں صفت عقلی ہے علیٰ ہذا القیاس تذکر بھی صفات علمیہ اور عقلیہ میں سے ہے اس صورت میں حاصل یہ ہوا کہ نقصان عقل کے باعث عورت کی گواہی مرد کی گواہی سے آدھی رکھی گئی۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ صورت پیش آئی کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مسطور بالا اعنی ما رأیت من ناقصات عقل و دین الخ کو سن کر عورتوں نے یہ عرض کیا۔

مَا نُقْصَانُ عَقْلِنَا وَدِينِنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ	(ہماری عقل اور دین میں اے رسول اللہ کیا کمی ہے؟
فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ نِصْفَ شَهَادَةِ الرَّجُلِ۔	تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ عورتوں کی گواہی مرد کی گواہی سے آدھی ہے)
(بخاری ص۴۴ ج۱ مسلم ص۶۱ ج۱)	

اس پر عورتوں نے اقرار کیا تو پھر یہ فرمایا فذلک من نقصان عقلها۔ یعنی یہ گواہی کا آدھا ہونا نقصان عقل ہی کے سبب ہے۔ الغرض آیت مذکورہ اور حدیث مسطور کو ملائیے تو یہ بات لو یکہ حدیث اسی آیت سے نکل آتی ہے کہ عورتوں کی عقل مردوں کی عقل سے آدھی ہے اور جب عقل یعنی کمالات علمی میں تناصف تو کمالات عملی میں آپ تناصف ہوگا۔

(افعال اختیاریہ علم وعقل سے پیدا ہوتے ہیں) وجہ اس کی یہ ہے کہ اعمال اختیاریہ کا صدور یا بوجہ شوق و محبت ہوتا ہے یا بباعث نفرت و خوف یعنی عاقل جب کوئی حرکت باختیار خود کرتا ہے تو اس میں یا کوئی نفع سوچ لیتا ہے یا کوئی اندیشہ اس کے پیش نظر ہوتا ہے۔ سو اس کا حاصل وہی شوق اور محبت و نفرت ہے۔ سو ان دو صورتوں کے عاقل کے افعال کے لیے اور کوئی صورت نہیں مگر شوق وخوف اور محبت و نفرت بقدر علم منافع و مضار ہونا ظاہر ہے کہ مرد دانا شیر اور سانپ سے ڈرتے ہیں اطفال شیر خوار نہیں ڈرتے وجہ اس کی بجز اس کے اور کیا ہے کہ وہاں علم و عقل ہے یہاں نہیں چنانچہ

آیت قرآنی:

اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (اللہ سے ڈرتے وہی ہیں اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے)

(پ ۲۲ فاطر ع ۴)

سے بھی اس کا پتہ لگتا ہے کہ خوف بقدر علم ہوتا ہے۔

(تناصف عقل تناصف عمل کو لازم ہے) الغرض بعد تسلیم تناصف فی العقل اقرار تناصف فی العمل آپ لازم ہے ادھر کلام اللہ میں یہ ارشاد ہے۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِىٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (پ ۲۵ زخرف ع ۷) (اور یہ وہی بہشت ہے جو میراث پائی تم نے بدلے ان کاموں کے جو کرتے تھے۔)

اس آیت سے ظاہر ہے کہ مدار کار حصول جنت عمل پر ہے اور حدیثوں سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہر مرد جنتی کے پاس دنیا کی دو عورتیں بطور ازواج و نکاح ہوں گی۔ غرض جہاں ایک مرد ہوگا وہاں دو عورتیں ہوں گی اس سے بھی وہی بات نکلتی ہے کہ دو عورتیں مل کر عمل میں ایک مرد کے برابر ہوں گی۔ بہر حال تناصف فی العقل اور تناصف فی کمال العمل واجب التسلیم ہے۔

(بعض عورتوں کا بعض مردوں پر علم وعمل میں فوقیت رکھنا اسباب خارجیہ کی بنا پر ہوتا ہے) رہی یہ بات کہ بعض مرد کم عقل ہوتے ہیں اور بعض عورتیں عاقلہ ہوتی ہیں۔ علی ہذا القیاس بعض مرد فاسق اور بعض عورتیں دیندار ہوتی ہیں اس قاعدہ میں رخنہ گر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اسباب وموانع خارجیہ سے اگر ظہور آثار ماہیت میں کمی بیشی آئی تو مراتب ماہیت اور قدر وقیمت ماہیت میں تبدل نہیں آسکتا۔ مثلاً اگر کسی آئینہ میں گرد وغبار واقع ہو اور کوئی چینی کی رکابی طشتری صاف مصفی ہو اور اس وجہ سے ظہور نور آفتاب بہ نسبت آئینہ مشارٌ الیہ رکابی مذکور میں زیادہ ہو۔ تو صفائی میں رکابی آئینہ سے زیادہ نہ سمجھی جائے گی۔ بالجملہ نقصان عقل زنان مقتضاء مادہ انوثت ہے اور زیادتی عقل مرداں اقتضاء مادہ مذکورہ (ذکورة) ہے۔ چنانچہ الف لام کا لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ میں لام جنس ہونا بھی اس پر شاہد ہے۔ علی ہذا القیاس دین کا قصہ سمجھئے سو اگر بالفرض والتقدیر کسی فرد ذکر میں کمی اور کسی فرد انثیٰ میں زیادتی نظر آئے تو قاعدہ مذکورہ کے کلیہ ہونے میں اس سے کچھ رخنہ نہیں پڑتا۔

(چار عورتوں کا ایک مرد کے حق میں زوج کامل قرار پانے کی حکمت)

ان سب مراتب کے طے ہو جانے کے بعد یہ گذارش ہے کہ جب عقل و عمل میں عورتیں مردوں سے آدھی ہیں اور پھر مرد عورت میں ان دونوں کمالوں کا حاصل ضرب مطلوب ہے خود یہ دونوں کمالات مذکورہ زنان پر نسبت حاصل ضرب کمالات مذکورہ مرداں بقدر ربع ہے کیونکہ نصف کو نصف میں ضرب دیجئے تو یہی ربع (۱/۴) حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے ایک عورت ایک مرد سے (نکاح میں) بقدر ربع سمجھی گئی اور چار عورتیں مل کر اس کے حق میں زوج کامل قرار پائیں۔ مگر چونکہ ہر کسی کو اپنے حق کے نہ لینے یا اپنے حق کے چھوڑ دینے کا اختیار ہوتا ہے اور اپنے حق سے زیادہ لینے کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس لیے مرد نکاح نہ کرنے اور چار سے کم نکاح کرنے کا مجاز اور مختار رہا۔ پر چار سے زیادہ اختیار اس کو نہ ملا۔

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّت کی عورتوں کی نسبت مقدار علم و عمل میں بمنزلہ مصدر اور صادر، منشا اور وصف انتزاعی کے ہیں)

لیکن یہ بات بھی یاد ہوگی کہ امت کی چار عورتیں مل کر اگر امت کے ایک مرد کے مساوی ہو جاتی ہیں تو وجہ اس کی یہ ہے کہ باہم اصل مرد و زن امت میں تجانس تھا۔ اگر فرق تھا تو فرق مقدار تھا جس کے رفع کرنے کے لیے عورتوں کی جانب عدد اربع کی ضرورت پڑتی اور ذات پاک شہ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم اور زنان امت میں اس قسم کا فرق نہ تھا جس کو مقدار زنان کا کم و بیش کر دینا رفع کر سکے بلکہ وہ فرق تھا جو مصدر اور صادر اور علت اور معلول اور منشا، انتزاع اور وصف انتزاعی میں ہوا کرتا ہے اور تجانس بھی وہی تجانس تھا جو حقائق مذکورہ میں باہم ہوا کرتا ہے۔ یعنی وہ تجانس جو ازدواج اور زوجیت کے لیے ضرور ہے چنانچہ مفہوم زوجیت ہی اس پر شاہد ہے از قسم تجانس مرداں و زنانِ امت نہ تھا بلکہ از قسم تجانس علت و معلول وغیرہ تھا۔ غرض وجہ فرق فیما بین حضرت شہ لولاک صلی اللہ علیہ وسلم اور مردانِ امت مرحوم در بارہ تعدد ازواج یہ ہے کہ وہاں اور طرح کا تجانس ہے یہاں اور طرح کا تجانس ہے۔ یہاں تعداد زنان کی کمی بیشی موجب تساوی ایک مرد چار زن ہو سکتی ہے اور وہاں اس سے کام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ ایک علت اور ایک منشا، انتزاع کے مقابلے میں سارے معلول اور تمام انتزاعیات بھی درجہ تساوی نہیں رکھتے۔ ایک آفتاب کے آگے سارے جہاں کی دھوپیں گرد ہیں۔ ہاں یوں کہیے کہ آفتاب یا کرہ شعاعی کا جوڑا اگر مل سکے ہے تو دھوپ ہی مل سکے ہے چاند کی چاندنیوں اور آگ کی گرمیوں سے نہیں مل سکتا غرض اگر علت اور منشا، انتزاع کا نکاح اور ازدواج ہو سکتا ہے تو بشرط قابلیت اپنے معلولات اور انتزاعیات ہی

سے ہو سکتا ہے اور کسی علت یا اس کی معلولات یا اور کسی منشاء انتزاع یا اس کی انتزاعیات یا کسی اور مصدر اور اس کی صادرات سے نہیں ہو سکتا۔

مگر جیسے اس صورت میں یہ فرق فیما بین حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور مردمان امت مرحومہ معلوم ہوا ایسے ہی فرق دوام حیات حضرت سید الکائنات علیہ وعلیٰ آلہ افضل الصلوات والتسلیمات وعدم دوام حیات ہے۔ کیونکہ دربارہ کمالات روحانی آپ کا علت اور منشاء انتزاع اور مصدر ہونا جیسے اس بات کو مقتضی ہے کہ آپ کو دربارہ نکاح حد اربع میں محدود و مقید نہ رکھیں۔ ایسے ہی آپ کا علت اور منشاء انتزاع اور مصدر ہونا اس بات کو مقتضی ہے۔ آپ کی حیات روحانی اور حیات جسمانی دونوں قائم دائم رہیں کبھی انفکاک و زوال کی نوبت نہ آئے۔

(حاصل کلام) اس صورت میں خطاب فَانْكِحُوا اور خطاب يُوصِيكُمُ اللهُ آپکو بطور مسطور سابق خارج نکلنا اور ان احکام میں تفاوت معلوم کا ہونا ایک ہی وجہ پر مبنی اور متفرع ہیں۔ مگر چونکہ نکاح حاجات حیات اور میراث اتفاقات ممات میں سے ہے اس لیے اوّل کو اول رکھا اور دوم کو دوم ذکر کیا۔

اس تقریر سے بطلان مقدمہ ثانی منجملہ مقدمات ثلاثہ بھی۔ بعد تنقیح میراث کے لیے کہ اول ان کا ثابت ہونا ضروری تھا۔ روشن ہو گیا۔ یعنی یہ بات بخوبی معلوم ہو گئی کہ خطاب يُوصِيكُمُ اللهُ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم داخل نہیں اور جب آپ اس خطاب میں داخل ہی نہیں تو پھر شیعوں کو طعن میراث کی کیا گنجائش ہے جو اہل سنت کو فکر جواب ہو۔

(بنا میراث کی تیسری شرط کا فقدان) مگر ہاں مقدمہ ثالثہ ہنوز قابل تحقیق ہے۔ اس لیے کسی قدر اور تکلیف تحریر کی حاجت ہے۔

(فدک مال فئے تھا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خاص ملک نہ تھا) یعنی اب اس بات کی تنقیح ضروری ہے کہ مال متنازع فیہ اعنی فدک مملوک نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم تھا یا نہ تھا۔ سو ہم سے پوچھیے مگر گوش ہوش سے سنئیے اور پنبہ غفلت سے اور چرک تعصب سے گوش عقل کو اول پاک کر لیجیے۔ بشہادت کتب فریقین قریہ فدک منجملہ فئے تھا۔ منجملہ غنیمت نہ تھا اور بشہادت قرآنی زمین فئے منجملہ اموال غیر مملوکہ ہوتی ہے کسی کی ملک اس کے ساتھ متعلق نہیں ہو سکتی۔ سنیوں کے لیے نووی شرح مسلم کی عبارت اور شیعوں کے لیے کلینی کی روایت اس کے ہونے کے لیے کافی ہے۔

اول اہلسنت وجماعت کو شادکام کرتا ہوں۔ پھر شیعوں کی آنکھیں کھول جائیں گی۔

(فدک مال فئے ہے اہلسنت سے اس کا ثبوت) علامہ نووی جلد ثانی شرح مسلم کے باب حکم الفئی میں یوں ارشاد فرماتے ہیں۔

قال القاضي عياض في تفسير صدقات
النبي صلى الله عليه وسلم المذكورة
في هذه الاحاديث قال صارت اليه بثلاثة
حقوق احدها ما وهب له صلى الله عليه
وسلم وذلك وصية مخيريق اليهودي
له عند اسلامه يوم احد وكانت سبع
حوائط في بني النضير وما اعطاه الانصار
من ارضهم وهو ما لا يبلغه الماء وكان
هذا ملكا له صلى الله عليه وسلم
الثاني حقه من الفئ من ارض بني النضير
حين اجلاهم كانت له خاصة
لانها لم يوجف عليها المسلمون
بخيل ولا ركاب واما منقولات
اموال بني النضير فحملوا منها
ما حملته الابل غير السلاح
كما صالحهم ثم قسم صلى
الله عليه وسلم الباقي بين المسلمين
وكانت الارض لنفسه ويخرجها في
نوائب المسلمين وكذلك نصف
ارض فدك صالح اهلها بعد فتح

(قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ احادیث میں مذکور حضور علیہ
الصلوٰۃ والسلام کے صدقات کی تین قسمیں ہیں ایک وہ
جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہبہ کئے گئے جیسے مخیریق (سابق
یہودی نے احد کے دن اسلام لاتے وقت جائیداد کے
ہبہ کی وصیت کر دی تھی وہ بنو نضیر میں سات باغ
تھے۔ اور جو کچھ انصار نے پانی سے سیراب نہ ہو سکنے
والی زمین آپ کو ہبہ کر دی تھیں اور یہ آپ کی ملکیت
تھیں۔ آپ کے حق کی دوسری قسم بنو نضیر کا وہ مال
فے (جائیداد) ہے جب ان کو جلاوطن کیا تھا یہ آپ
کا خاص تھا کیونکہ مسلمانوں نے ان پر گھوڑے نہیں دوڑائے
اور نہ لشکر کشی کی تھی۔ ہے۔ بنو نضیر کے اموال منقولہ، تو ہتھیاروں
کے علاوہ بنو نضیر نے اونٹوں پر لادا۔ جتنی مقدار اونٹ اٹھا
سکتے تھے اور اپنے ساتھ لے گئے۔ جیسا کہ حضور
صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے صلح کی تھی۔
اور باقی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں میں
تقسیم کر دیا۔ اور زمین اپنے قبضے میں رکھی۔ اور آپ
اس کی پیداوار کو مسلمانوں کی مشکلات میں خرچ کرتے
تھے۔ اسی طرح خیبر کی فتح کے بعد فدک والوں نے آدھی
زمین بطور صلح دے دی وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کے خالص قبضے میں تھی اسی طرح وادی قریٰ کا تہائی

خیبر علی نصف ارضها وکان خالصًا له صلی اللہ علیہ وسلم وکذلک ثلث ارض وادی القری اخذہ فی الصلح حین صالح اھلھا الیھود وکذلک حصنان من حصون خیبر وھما الوطیخ والسلالم اخذھما صلحًا الثالث سھمہ من خمسہ خیبر وما افتتح عنوۃً[1] انتہی مقام الحاجۃ (نووی شرح مسلم ص ۹۲ ج ۲)

آپ کے پاس تھا جو یہودیوں نے بطور صلح دیا تھا۔ اسی طرح خیبر کے قلعوں میں سے دو قلعے وطیخ اور سلالم بطور صلح آپ نے لیے تھے۔ آپ کا حصہ سوم خیبر کا خمس تھا اور ان کا خمس جو علاقے شوکت و غلبہ سے فتح ہو گئے تھے۔)

اس عبارت سے صاف روشن ہے کہ مال متنازع فیہ یعنی زمین فدک منجملہ اموال واراضی فے تھی خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خریدی ہوئی یا کسی کی ہبہ کی ہوئی نہ تھی اور ہماری غرض اس وقت اتنی ہے کہ زمین فدک منجملہ اراضی فے ہے مگر چونکہ اس بات کا ثابت کرنا کہ فدک منجملہ فے تھی اس غرض سے تھا کہ فدک کو مملوک نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں کہہ سکتے جو میراث کا احتمال ہو یا ہبہ کا کسی کو خیال ہو چنانچہ انشاء اللہ عنقریب ہی یہ عقدہ حل ہوا چاہتا ہے تو بہ نسبت حقوق خمس بھی اب کسی کو خیال ملک کی گنجائش نہ رہیگی کیونکہ مصارف خمس اور مصارف فے ایک ہی ہیں۔ ادھر انداز بیان ایک ہے۔

آخر عبارت یہ ہے

[1] فکانت ھذہ کلھا ملکا لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاصۃً لاحق فیھا لاحد غیرہ لکنہ صلی اللہ علیہ وسلم کان لا یستأثر بھا بل ینفقھا علی اھلہ والمسلمین وللمصالح العامۃ وکل ھذہ صدقات محرمات التملک بعدہ۔ واللہ اعلم (شرح مسلم ص ۹۲ ج ۲)

یہ سب اموال واراضی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص ملکیت تھیں کہ ان میں کسی کا حق نہ تھا لیکن حضور علیہ السلام علی الخصوص خود خرچ نہ کرتے تھے بلکہ اپنے عیال پر اور مسلمانوں پر اور ضروریات عامہ میں خرچ کرتے تھے یہ کل صدقات وہ ہیں کہ حضور علیہ السلام کے بعد کسی کا (بطور وارث و موصی لہ) مالک بننا ناجائز ہے۔

عبارت کے آخری الفاظ محرمات التملک بعدہ مدعا پر واضح دلیل ہیں اور یہ کہ ملکیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مراد خصوصی حق تصرف ہے۔ ۱۲ مہر محمد۔

فئے میں اگر تین لام (داخل بر مستحقین) تھے تو یہاں بھی وہی تین لام آیت میں موجود ہیں۔ دیکھ لیجئے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ۔ (پ انفال ع ۵)

(اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے ہے اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے اور اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے۔)

غرض وہ دلائل جن سے فئے کا غیر مملوک ہونا ثابت ہوگا انہیں دلائل سے خمس کا غیر مملوک ہونا نکلتا ہے۔ ہاں بہ نسبت اموال موہوبہ البتہ یہ خیال بجا ہے لیکن اول تو بعد ثبوت حیات جسمانی حضرت رسول الثقلین و ظہور خصوص خطاب یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ بنسبت امت مرحومہ مملوکیت اموال موہوبہ وغیرہ شیعوں کو کچھ مفید نہیں۔ بایں ہمہ ہم سے ظاہر بین اگر اسے ہی ملک و محل میراث سمجھیں تو سمجھیں پر حضرات انبیاء علیہم السلام خصوصاً سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایسی ملک کو اولاً و بالذات اپنی ملک نہیں سمجھ سکتے ورنہ ان کی وہ حقیقت شناسی پھر کس دن کے لیے ہوگی۔

(بوجہ کمال عقل انبیاء علیہم السلام اپنے مقبوضہ اموال کو مال مستعار سمجھتے ہیں اور مال مستعار میں میراث جاری نہیں ہوتی) اول تو یہ بات کہ ملک خداوندی اور ملک عباد میں وہ نسبت ہے جو ملک مالک اصل اور قبضہ مستعیر میں ہوتی ہے دیکھنے والوں کو ان اوراق سے عیاں ہو جائے گی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات انبیاء پر خاص کر سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم و علیہم و آلہ اجمعین پر اسی طرح واضح تھی جیسے آفتاب نیمروز۔ پھر وہ کس طرح اموال مقبوضہ کو اپنا مال سمجھیں جو حقوق ورثہ کی اس میں گنجائش نظر آئے۔ یہ بات اپنے مال میں ہوتی ہے مال مستعار میں نہیں ہوتی۔ ہاں امتیوں کی نظر ایسی تیز نہیں ہوتی جو ایسے حقائق دقیقہ کو سمجھیں وہ اس بات میں مثل اطفال خورد سال ہوتے ہیں۔ کہ کسی بڑے بیگانے کی چیز بھی ہاتھ آتی ہے تو آپ سے دینا تو کجا مالک چیز بھی اگر لینا چاہے تو وہ گریہ زاری کریں۔ جس سے مالک ہی کو چشم پوشی اور ترک طلب کرنی پڑے۔

بالجملہ بوجہ کوتاہ نظری امت۔ خداوند کریم چشم پوشی فرماتے ہیں اور میراث کے جاری ہونے سے منع نہیں فرماتے۔ ہاں انبیاء کو بوجہ کمال عقل ایسی ہٹوں کی گنجائش نہیں جو ان کے لواحق تک پہنچے علاوہ بریں ہبہ مخیریق یہودی بوجہ اعتقاد رسالت تھا۔ اس صورت میں یہ ہبہ حقیقت میں نظر خداوندی

ہو اور وہی حاصل نکل آیا جو بہ نسبت اموال فئے باشارہ کلمہ فللّٰہ معروض ہو چکا ہے۔ الغرض جیسے اطفال خورد سال کو ان کے والدین کی وجہ سے اگر کچھ ہبہ کیا جاتا ہے تو ان کے والدین ہی کی ملک سمجھا جاتا ہے ایسے ہی ہبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بوجہ اعتقاد مذکور نذر خداوندی سمجھا جائے گا۔

(فدک مال فئے ہے۔ شیعہ سے اس کا ثبوت) خیر یہ بات تو ہو چکی اب عبارت کلینی بھی دیکھئے جس سے فدک کا فئے ہونا شیعوں کو اپنے اعتقاد کے موافق بھی ظاہر ہو جائے تو دفع الزام شیعہ کے لیے اہل سنت کو اپنی ہی روایات کافی نہیں اور قبل ثبوت غلطی روایات محدثان و مؤرخان اہل سنت پھر شیعوں کو گنجائش دم زنی نہ تھی۔ کلینی کے باب الفئ والانفال وتفسیر الخمس وحدودہ میں یہ روایت ہے۔

عن علی بن محمد بن عبد اللہ عن بعض اصحابنا واظنہ السیاری عن علی بن اسباط قال لما ورد ابو الحسن موسی علیہ السلام علی المھدی راٰہ یرد المظالم فقال یا امیر المومنین ما بال مظلمتنا لا ترد فقال لہ وما ذاک یا ابا الحسن قال ان اللہ تبارک وتعالی لما فتح علی نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم فدک و ما والاھا لم یوجف علیہ بخیل ولا رکاب فانزل اللہ علی نبیہ وآت ذالقربی حقہ فلم یدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من ھم فراجع فی ذلک جبریل علیہ السلام وراجع جبرئیل ربہ فاوحی اللہ الیہ ان ادفع فدک الی فاطمۃ علیھا السلام فدعاھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال

(شیعہ سند سے روایت ہے کہ امام موسیٰ کاظم مہدی کے پاس یہ دعویٰ لے کر آئے کہ امیر المومنین ہمارا حق ہمیں کیوں نہیں دیا جاتا؟ مہدی نے کہا وہ کیا ہے۔ تو فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے ہاتھ پر جب فدک اور اس کے مضافات کو فتح کیا جس پر مسلمانوں نے لشکر کشی نہیں کی تھی تو اللہ نے یہ آیت اپنے نبی پر اتاری کہ رشتہ دار کو اس کا حق دو (حالانکہ یہ آیات مکی ہیں) تو حضور علیہ السلام نہ جان سکے کہ وہ رشتہ دار کون ہیں۔ پس مراجعت کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بارے میں جبریل علیہ السلام سے جبریل علیہ السلام نے اللہ سے جا کر پوچھا تو اللہ نے وحی بھیجی کہ یہ فاطمہؓ کو دے دو تو حضور علیہ السلام نے حضرت فاطمہؓ کو بلایا اور فرمایا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فدک تجھے دے دوں حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ میں نے اللہ اور آپ کی طرف سے قبول کر لیا۔ حضور کی زندگی میں حضرت فاطمہؓ کے وکیل قابض رہے۔ جب ابو بکر خلیفہ ہوگئے تو

لها یا فاطمة ان الله امرلی ان ادفع الیكِ
فدك فقالت قد قبلت یا رسول الله
من الله ومنك فلم یزل وکلاؤها
فیها حیاة رسول الله صلی الله علیه وسلم
فلما ولی ابوبکر اخرج عنها وکلاءها
فاتته فسألته ان یردها علیها
فقال إئتینی باسود واحمر یشهد لك
بذلك فجاءت بامیر المومنین علیه
السلام وام ایمن فشهدا لها فکتب
لها بترك التعرض فخرجت و
الکتاب معها فلقیها عمر فقال
لها ما هذا معكِ یا بنت محمد
قالت کتاب کتبه لی ابن ابی قحافه
قال ارینیه فابت فانتزعه من
یدها ونظر فیه ثم تفل
فیه ومحاه وخرقه فقال لها
هذا لم یوجف علیه ابوك بخیل
ولا رکاب فضعی الحبال فی رقابنا
فقال له المهدی یا ابا الحسن حدها
لی فقال حد منها جبل احد
وحد منها عریش مصر وحد منها
سیف البحر وحد منها دومة
الجندل فقال له کل هذا قال

ان وکیلوں کو بے دخل کر دیا۔ حضرت فاطمہؓ واپس لوٹانے
حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئیں تو انہوں نے کہا کہ
کالا اور گورا گواہ لاؤ۔ آپ امیر المومنین اور ام ایمن
کو لائیں انہوں نے گواہی دی ابوبکر صدیقؓ نے لکھ
دیا کہ فاطمہؓ سے فدک کے معاملے میں نزاع نہ کیا جائے
آپ خط لیے آ رہی تھیں تو عمرؓ ملے تو پوچھا یہ کیا ہے؟
فرمایا ابن ابی قحافہ نے لکھ کر دیا ہے عمرؓ نے کہا مجھے
تو دکھاؤ آپؑ نے انکار کیا تب حضرت عمرؓ نے چھین
لیا اور دیکھ کر اس میں تھوک دیا اور نوشتہ مٹا کر پھاڑ
دیا اور کہا یہ وہ جائداد ہے کہ اس پر آپ کے والد بزرگوار
نے لشکر کشی نہیں کی تھی تو ہماری گردن میں رسی ڈال
دے تو مہدی نے کہا اے ابو الحسن! مجھے فدک
کی حد بندی بتائیں تو امام نے فرمایا ایک سرا احد
کا پہاڑ ہے دوسرا مصر کا عریش ہے ایک کنارہ
سیف البحر ہے اور دوسرا کنارہ دومۃ الجندل
ہے (یعنی سلطنت عباسی کا تقریباً سارا رقبہ)
مہدی نے کہا یہ سب؟ امام نے فرمایا ہاں اے امیر المومنین
یہ سب وہ ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
کوئی لشکر کشی نہیں کی تھی مہدی نے کہا یہ تو بہت
ہے اچھا غور کروں گا (انتہی)

نعم یا امیر المؤمنین ان هذا کله

مما لم یوجف علی اهله رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم بخیل ولا رکاب

فقال کثیر انظر فیہ - انتہی) (کافی کلینی ص۵۴۳ ج۱ مطبوعہ تہران)

اس[1] روایت بے سروپا سے اگرچہ بطور مشتے نمونہ از خروارے حسن وخوبی دیگر روایات شیعہ عیاں ہے.

اہل بیت کا فقر، دم وفات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تک ایسا (مخفی) نہیں جو کوئی نہ جانتا ہو. پھر اس پر دعوئے بحدود مذکورہ کرنا ئدہ سلطنت کا اس وقت اقرار کرنا ہے مگر ہم کو شیعوں کی تغلیط سے اس وقت کچھ ہاتھ نہیں آتا جو یوں کہیئے کجا فدک کجا کجا یہ حدود؟. کجا اہل بیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کجا یہ ثروت؟

اس وقت ان کی ہم تصدیق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لاریب فدک منجملہ فئے اور از قسم مِمَّا لَمْ يُوجَفْ عَلَيْهِ بِخَيْلٍ ہے.

(اراضی فئے کسی کی مملوکہ نہیں بلکہ حسب ارشاد خداوندی اس کی آمدنی قابل ملک ہے) لیکن جب قریہ فدک کا منجملہ اموال فئے ہونا بشہادت کتب فریقین ثابت ہو گیا تو اب اس بات کا اثبات باقی رہا کہ اراضی فئے قابل تعلق ملک نہیں. البتہ مثل اوقاف ان کی آمدنی قابل تعلق ملک ہے اس لیے یہ گذارش ہے کہ خداوند کریم اپنے کلام صادق میں یہ ارشاد فرماتا ہے.

وَمَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْهُمْ فَمَا أَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

(اور جو مال کہ لوٹا دیا اللہ نے اپنے رسول پر ان سے سو تم نے نہیں دوڑائے اس پر گھوڑے اور نہ اونٹ ولیکن اللہ غلبہ دیتا ہے اپنے رسولوں کو جس پر چاہے اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے.

مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ

جو مال لوٹایا اللہ نے اپنے رسول پر بستیوں والوں سے سو اللہ کے واسطے اور رسول کے اور قرابت والے کے اور یتیموں کے اور محتاجوں

---

[1] شیعہ کی روایت مذکورہ اگرچہ بے سروپا ہے لیکن ہمارے لیے مفید مطلب ہے. کیونکہ خلفاء راشدین کی حدود مملکت کی وسعت اور عمدگی پر دلالت کرتی ہے. ۱۲. محمد علیسی گورمانی.

وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ
دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ؕ وَمَآ اٰتٰىكُمُ
الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۘ
لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ
دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا
مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ وَالَّذِيْنَ
تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ
مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ
صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا
وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ
بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ
نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ
وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ
رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ
سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ
قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ
رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (پ ۲۸ حشر ع ۱)

کے اور مسافر کے تاکہ نہ آئے لینے دینے میں دولت
مندوں کے تم میں سے اور جو دے تم کو رسول سو لے لو
اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو اور ڈرتے رہو
اللہ سے بیشک اللہ کا عذاب سخت ہے۔ واسطے
ان مفلسوں وطن چھوڑنے والوں کے جو نکالے ہوئے
آئے ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے ڈھونڈتے
آئے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی اور
مدد کرنے کو اللہ کی اور اس کے رسول کی وہ لوگ
وہی ہیں سچے۔ اور جو لوگ جگہ پکڑ رہے ہیں اس گھر میں
اور ایمان میں ان سے پہلے وہ محبت کرتے ہیں اس
سے جو وطن چھوڑ کر آئے ان کے پاس اور نہیں پاتے
اپنے دل میں تنگی اُس چیز سے جو مہاجرین کو دی جائے
اور مقدم رکھتے ہیں ان کو اپنی جان سے، اور اگرچہ
ہو اپنے اوپر فاقہ۔ اور جو کوئی بچایا گیا اپنے جی کے
لالچ سے سو وہی لوگ ہیں مُراد پانے والے اور واسطے
ان لوگوں کے جو آئے ان کے بعد کہتے ہوئے اے
رب بخش ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے
داخل ہوئے ایمان میں اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں
بیر ایمان والوں کا اے رب تو ہی ہے نرمی والا مہربان)

(مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ میں کلمہ ما سے جائیداد غیر منقولہ مراد ہے)

جو لوگ کہ سیاق و سباق آیات مسطورہ سے واقف ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ سے مراد اراضی ہیں۔ احتمال عموم نہیں کیونکہ ما ایک کلمہ مبہم ہے۔ غیر ذوی العقول میں عام سے عام اور خاص سے خاص پر بول سکتے ہیں. اگرچہ باعتبار مفہوم کلمہ ما مع صلہ اس خاص کو کلّی ہی کہیں مگر جیسے انحصار فی فرد واحد کلیت مفہوم

کے مخالف نہیں ایسے ہی خصوص مصداق کلمہ اس کے مفہوم کے عموم کے مخالف نہیں۔ بہر حال یہ کلمہ بذات خود مبہم ہے اس لیے صلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر اگر صلہ سے بھی بوجہ تام رفع ابہام نہ ہو سکے اور نہیں ہوا کرتا تو یقین تمام کے لیے اور قرائن کی ضرورت ہوگی اگر کوئی کسی کو روپیہ دے کر کہا اَعْطَيْتُكَ فَاَنْفِقْهُ عَلٰى عِيَالِكَ مثلاً کہے تو صلہ مذکورہ سے یہ معلوم ہوگا کہ روپیہ دیا یا کچھ اور۔ ہاں قرائن خارجیہ سے البتہ یہ بات معلوم ہوگی سو یہاں بھی صلہ افاءَ سے تعیین حقیقت و ماہیت معلوم نہیں ہوتی البتہ آیت۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ (پ ۲۸ حشر ۱۶) (وہی ہے جس نے نکال دیا ان کو جو منکر ہیں کتاب والوں میں ان کے گھروں سے)

اور آیت یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ (اجاڑنے لگے اپنے گھر)

اور آیت وَلَوْ لَاۤ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمُ الْجَلَآءَ (اور اگر نہ ہوتی یہ بات کہ لکھ دیا تھا اللہ نے ان پر جلاوطن ہونا)

اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ اراضی مراد ہیں اموال منقولہ مراد نہیں۔

(مال غنیمت اور مال فئے میں فرق) اس کے بعد یہ عرض ہے کہ آیت اولیٰ میں جو یہ ارشاد ہے مَاۤ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ الخ اہل فہم کو اس سے اتنا معلوم ہو گیا ہوگا کہ مہاجرین و انصار وغیرہ کا اس میں کچھ حق نہیں۔ یعنی جیسے لشکر کشی کی صورت میں بزور لشکر کچھ زمین مال وغیرہ ہاتھ آتا ہے اور اس وجہ سے غانمیں اور غازیوں کا اس میں استحقاق ثابت ہو جاتا ہے ایسی طرح اموال فئے کو نہ سمجھنا چاہیئے۔

القصہ علت ملک یعنی قبضہ اگر بزور بازوے لشکر حاصل ہو تو لشکر مال مقبوض میں شریک ہوگا۔ اور اگر لشکر کو نوبت جد و جہد نہیں آئی بلکہ فقط فضل خداوندی قدر بہ کفیل قبض ہو گیا ہے تو پھر ملک خدا ہی کا رہے گا کسی اور کی ملک نہ سمجھا جائے گا۔ اور اس وجہ سے انہی لوگوں کو اس کی آمدنی دینا ضرور ہوگا جو خدا کے نام پر بیٹھے ہیں اور اس کے نام لگے ہوئے ہیں۔

(فئے میں مصارف کی تفصیل) چنانچہ آیت ثانیہ میں جو مصارف اموال فئے کی تفصیل بیان فرمائی تو بعینہٖ یہ بات اس سے نکلتی ہے فرماتے ہیں۔

مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِی الْقُرْبٰى۔ الخ

چونکہ خداوند کریم کھانے پینے کا محتاج نہیں۔ ادھر کوئی خاص مصرف مصارف خیر میں سے ایسا نہیں کہ اسی کو خدا کا مصرف کہہ سکیں اور سوا اس کے اور مصارف خیر کو نہ کہہ سکیں اس لیے کلمہ فللّٰہ فقط اسی جانب مشیر ہوگا کہ اموال فئے ملک خاص خداوندی ہے یعنی باعتبار ظاہر جیسے اور اموال کو جو بیع شراء وغیرہ اسباب ملک سے حاصل ہوں باوجود مملوکیت خداوندی اوروں کا مملوک بھی کہتے ہیں اس طرح اموال فئے میں سوا خداوند مالک الملک اور ونکی طرف انتساب درست نہیں ہاں اگر خداوند پاک نعوذ باللہ منہ خورد و نوش کا محتاج ہوتا یا مصارف خیر میں یہ تفریق ہوتی کہ یہ خدا کا مصرف ہے اور یہ نہیں تو البتہ پھر مثل اصناف باقیہ خداوند کریم بھی حصہ ششم کا شریک ہوتا۔ مگر جیسے خدائے پاک کا خورد و نوش سے پاک ہونا ظاہر و باہر ہے ایسے ہی عدم تخصیص بھی کسی مصرف کے لیے سب کے نزدیک مسلّم اگر نیت اچھی ہے تو جیسے مسجد کا بنانا مثلاً خدا کا کام ہے۔ ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وغیرہ اصناف باقیہ کو بھی بشرط نیت خیر کھلانا پلانا خدا ہی کا کام ہے۔ اس صورت میں مفاد کلمہ فللّٰہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ خانہ مالکیت میں باعتبار ظاہر بھی خدا ہی کا نام لکھا جائے۔

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مال فئے میں درجہ متوسط حاصل ہے یعنی آپ متولی بھی ہیں اور مصرف بھی) اس کے بعد فرماتے ہیں وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبٰى الغرض بعد لام فللّٰہ دو لام اور موجود ہیں جن سے اہل فہم کو بعد مرتبہ مالکیت دو اور مرتبوں کی خبر ملی جس میں سے مرتبہ استحقاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مرتبہ استحقاق خداوندی سے کم اور مرتبہ استحقاق ذوی القربیٰ وغیرہم سے زیادہ ہونا چاہیئے سو ایسا مرتبہ جو متوسط بین المرتبتین اور بمقتضائے توسط ذو جہتین ہو وہ تو مرتبہ تولیت مع مصرفیت ہے کیونکہ بلحاظ تولیت تو مرتبہ فوقانی یعنی مرتبہ مالکیت سے جو مشابہ ہے خداوند مالک الملک ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور بلحاظ مصرفیت مرتبہ استحقاق احتیاج کے ساتھ مشابہ ہے جو ذوی القربیٰ وغیرہم کے کے ساتھ مشابہ ہے اور یہ مرتبہ متوسط شان رسالت کو مناسب بھی ہے۔ اس لیے کہ کلمہ رسول ایک تو معنی خلافت و نیابت خداوندی پر دلالت کرتا ہے جس کے لیے تولیت کا ہونا بجائے خود ہے اس کے لیے شاہد کی ضرورت ہے تو سنیئے کہ

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تولیت کی مثال) مسجد خدا کے لیے مخصوص ہے باایں ہمہ بوجہ خلافت حضرت آدم علیہ السلام مسجود بن گئے اگرچہ ان کا مسجود ہونا ایسا تھا جیسا اب خانہ کعبہ مسجود (جہت سجدہ) ہے۔

یعنی جیسا کسی نے کہا ہے ع قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام مثل دیوار کعبہ مکرمہ قبلہ جہت و توجہ الی اللہ ہیں۔ بالذات خود مسجود نہیں۔ بغرض جیسے حضرت آدم علیہ السلام قائمقام اور خلیفہ علیم و علّام ہوئے اور اس وجہ سے آداب عبودیت باعتبار ظاہر ان کے لیے ایسی طرح تجویز کیے گئے ہیں جیسے قائم مقام حاکم بالادست کے لیے آداب مسند بالا دست تجویز کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ قائمقام حال کسی عہدہ ماتحت سے برائے چندے اس عہدے پر آیا ہو ایسا ہی قائمقام خدائے مالک الملک کے لیے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مرتبہ تولیت اموال خاص مملوکہ خداوندی جو خلافت مالکیت ہے مقرر ہوا اور آداب مرتبہ مالکیت یعنی مضمون جملہ۔

مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔ (اور جو دے تم کو رسول سو لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو)

جس سے آپ کا (قائمقام ہونے کی وجہ سے بطور نیابت) ہر طرح مختار ہونا اور باختیار خود تصرف کرنا اور اوروں کا آپ کے سامنے (اخذ غنیمت اور وصولی احکام میں) دست نگر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ آپ کے لیے تجویز کیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ آداب مالکیت یہی دست نگری اور چوں و چرا کا اس کے سامنے نہ کرنا ہے۔ باقی یہ فرق کہ یہاں قائمقامی بلحاظ مالکیت ہے اس کے لیے یہی قرینہ بہت ہے کہ اموال کی نسبت فللہ فرمایا ہے۔

(آیت اطاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حکومت اور علم میں نیابت و خلافت پر دلالت کرتی ہے)

اگرچہ آپ کا قائمقام ہونا بلحاظ اور صفات بھی اور مواقع قرآنی میں مصرح ہے چنانچہ جملہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (پ۵ النساء ع ۸) (حکم مانو اللہ کا اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں) اس نیابت و خلافت خاص کہ خلافت علم پر دلالت کرتا ہے۔ حکومت کی خلافت کا ہونا تو خود ظاہر ہے۔ ہاں خلافت علم شاید اس آیت سے سمجھ میں نہ آئی ہو اس لیے یہ عرض ہے کہ منشاء حکومت و امر و نہی خود بھی علم مصالح اور مضار ہی ہوا کرتا ہے چنانچہ طبیب کی اطاعت اسی وجہ سے سر دھرتے ہیں۔ اس لیے جو حاکم کہ مصالح و مضار رعیت سے واقف نہ ہو۔ اور اگر واقف ہو تو علم مصالح و مضار کے موافق امر و نہی نہ فرمائے ہر کس و ناکس اس کو قابل عزل سمجھتا ہے اور بوجہ ظلم اس کی حکومت کے کوئی راضی نہیں ہوتا۔

(اس امت کے لیے سجدۂ تعظیمی ممنوع ہونے کی حکمت)

ہاں جیسے بیمار کو بخیال ضعف و ناتوانی بوجہ اندیشہ مضرت واز دیاد مرض اس کے پیر و استاد اور ماں باپ وغیرہ مخدومان ذوی الاحترام اپنی تعظیم و توقیر سے منع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ایام صحت میں کبھی منع نہ کیا تھا ایسے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابنائے روزگار اور امت مرحومہ کو بوجہ ضعف عقول اپنی اس تعظیم سے جس کو سجدہ کہیئے اور بروئے انصاف بوجہ خلافت تامہ حضرت آدم علیہ السلام سے زیادہ آپ اس کے مستحق تھے منع فرمایا تاکہ یہ تعظیم انجام کار موجب شرک نہ ہو جائے جو امراض روحانی اور قلبی میں سب سے بڑا مرض ہے۔

بایں ہمہ آداب عہدہ اگر کسی وجہ سے کسی زمانہ میں وہ نہ رہیں جو اوّل مقرر تھے تو کچھ حرج نہیں خود عہدہ اور اس کی کارگذاری چاہیئے خاص کر جب کہ عہدہ دار خلافت و نیابت و ولی عہدی خود آداب مسند کو بایں لحاظ موقوف کر دے کہ کوئی مجھ کو بادشاہ نہ سمجھ لے۔ تو اس صورت میں یہ بات تو نظر بادشاہ میں موجب مزید رفعت ولی عہد و خلیفہ و نائب ہو گی گو ظاہر بینان کم فہم کیفیت ظاہرہ کو دیکھ کر کچھ اور سمجھ بیٹھیں۔ الغرض اگر بعض آداب مسند خلافت مفقود ہیں تو کچھ حرج نہیں کار عہدہ خلافت موجود ہے۔

(خلافت کے ساتھ تولیت ایک لازم شعبہ ہے)

ازانجملہ تولیت ہے۔ کیونکہ مالکیت قبض و تصرف و اختیار داد و دہش ہوتا ہے تو تولیت میں یہ سب موجود ہے اس لیے باقتضاء مفہوم رسالت جیسے اقرار خلافت ضروری ہے ایسے ہی تسلیم کار عہدہ خلافت یعنی تولیت بھی لازم ہے علاوہ بریں بیعت خلافت، جیسے بیعت اور نذر تخت نشینی ہر رند بازار سے نہیں لی جاتی بلکہ ارکین سلطنت اور رؤسا بادشاہت سے لی جاتی ہے۔ ایسے ہی سجدہ خلافت ملائکہ سے لیا گیا جو ملازمان درگاہ والا خداوندی تھے اوروں سے نہ لیا گیا۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کار رسالت ہی کے کام میں مصروف و مقید رہنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مال فیٔ کے ذریعہ آپ کے مصارف کا انتظام فرمایا)

مگر چونکہ تاکید سجدہ مذکور بایں وجہ زیادہ ہوئی کہ بشہادت جملہ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ خود ملائکہ منصب خلافت کے امیدوار تھے اور اس وجہ سے ان کا سجدہ اوروں کے رفع اشتباہ کے لیے کافی ہو گیا تو اب

اس کی بھی حاجت نہ رہی کہ اولاد بنی آدم کو ملائکہ سجدہ کریں کیونکہ وجہ تکرار خیال فضیلت نوع ملک مفضولیت نوع بشر تھا جب وہ خیال ہی نہ رہا۔ تو اب کیا حاجت ہے۔ نوع وہی کی وہی ہے۔ باپ ہو یا بیٹا ہو اس صورت میں یہ تکرار ایسا ہو گا جیسا فرض کریں اس شخص سے جس کی فضیلت اور لیاقت سلطنت میں کسی کو تامل ہو بعد تسلیم ہر روز وہ شخص بیعت کیا کرے بالجملہ رسالت و نیابت کے لیے بعد حضرت آدم علیہ السلام سجدہ کی حاجت نہیں۔ مگر جیسے رسالت کو خلافت لازم ہے اور کیوں نہ ہو اگر بادشاہ کسی شخص کو سفیر احکام مقرر کرے تو اسی سفیر کی اطاعت بادشاہ ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔ اور اسی کو خلافت کہتے ہیں ایسے ہی مفہوم رسالت اس بات کو مقتضی ہے کہ رسول اپنا کام تا اشتغال کار رسالت نہیں کر سکتا اور ظاہر ہے کہ مفہوم رسول ہر دم و ہر آن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بولا جاتا تھا۔ باقی رہا سونا کھانا پینا وغیرہ اگرچہ بظاہر کار رسالت سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو مگر بایں لحاظ کہ یہ نہ ہوں تو پھر کار رسالت ادا ہونا بھی معلوم۔ ان سب باتوں کو رسالت کا موقوف علیہ اور محتاج الیہ کہنا ضرور ہے اور کسب معیشت چونکہ مثل خواب و خورش و نوش لوازم بشریہ میں سے نہیں چنانچہ ہزاروں کو بے کمائی ملتا ہے اور اگر کمائی سے ملتا بھی ہے تو ہر کسی کو نئے ڈھنگ کی کمائی سے ملتا ہے۔ اس لیے اس کو منجملہ مبادی و مقدمات کار گذاری رسالت نہیں کہہ سکتے اس لیے اس کا ترک کرنا ضرور پڑا اور موافق وعدہ صادقہ مَنْ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ جس کی طرف آیت کریمہ۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ مَآ اُرِیْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِیْدُ اَنْ یُّطْعِمُوْنِ اِنَّ اللّٰہَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِیْنُ (پ ۲۷ ذریٰت ع ۳)

(اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو اپنی بندگی کو میں نہیں چاہتا ان سے روزینہ اور نہیں چاہتا کہ مجھ کو کھلائیں۔ اللہ جو ہے وہی ہے روزی دینے والا زور آور مضبوط)

بابلغ وجوہ مشیر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نان ونفقہ خدا تعالیٰ نے ذمہ ٹھہرا۔ اور کیوں نہ ہو یہ قاعدہ مقرر ہے کہ جو کسی کے کام میں محبوس رہتا ہے اس کا نان ونفقہ اسی کے ذمہ ہوتا ہے بی بی کا نان ونفقہ خاوند کے ذمہ اور غلام کا نان ونفقہ مولیٰ کے ذمہ اسی وجہ سے ہے۔ سو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے کام میں مصروف اور محبوس ہوئے تو آپ کا نان ونفقہ خدا کے ذمہ کیوں نہ ہو اس تقریر سے جملہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ لِیَعْبُدُوْنِ اور جملہ اِنَّ اللّٰہَ هُوَ

الرَّزَّاقُ ذُوالْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ میں باہم ارتباط معلوم ہوگیا ہوگا۔ اور نیز یہ بات بھی اہل فہم سمجھ گئے ہوں گے کہ جیسی تولیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم رسالت کی اس اضافت کا پرتو ہے جو مرسِل بصیغہ اسم فاعل یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ جس کے طفیل میں خلافت مشارٌ الیہ حاصل ہوئی۔ ایسے ہی احتیاج نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جس کے باعث نان و نفقہ کی ضرورت ہوئی اس اضافت کا پرتو ہے جو مرسَل الیہ یعنی امت کی طرف ہونی چاہیئے۔ جس کے باعث اشتغال مسطور لازم آیا۔ بالجملہ بحکم توسط مرتبہ رسالت اموال خاص خداوندی کی نسبت آپ متولی ہی رہے اور مصرف بھی مقرر ہوئے اور اس لیے باعتبار تلفظ بھی آپ کو بیچ ہی میں رکھا تاکہ اشعار شریعت مطابق اقتضار حقیقت رہے۔

(اخراجات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار آپ کے تابع قرار پائے اس لیے ان کو دیگر اصناف سے مقدم کیا گیا)

اس کے بعد ذوی القربیٰ کو بیان کیا کیونکہ مصرفیت ذوی القربیٰ یعنی اقربار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تابع مصرفیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر خانماں اور ہر خاندان میں کمانے والا وہ ہوا کرتا ہے جو سب میں لائق فائق ہو اور سوا اس کے سب اس کے دست نگر ہوا کرتے ہیں۔ سو خاندان نبوت میں سب میں افضل حضرت افضل المخلوقات ہی تھے۔ جب ان کو کار خداوندی میں فرصت کسب معیشت نہ ملی تو یوں کہو تمام خاندان والے نان و نفقہ کی طرف سے سراسیمہ ہوئے۔ اس لیے بعد آپ کے ان کا لحاظ کرنا پڑا اس کے بعد اصناف باقیہ میں مساکین اور ابناء السبیل ایسے درماندہ نہیں ہوا کرتے جیسے یتامیٰ ہوا کرتے ہیں کیونکہ مساکین کما تو سکتے ہیں اور پھر مساکین بہ نسبت ابناء السبیل زیادہ درماندہ ہوتے ہیں۔ آخر ابناء السبیل اپنے گھر سے تو خوش ہوتے ہیں ورنہ داخل زمرہ مساکین ہی سمجھے جاتے قسم علیحدہ نہ کی جاتی اس لیے بعد ذوی القربیٰ[1] بہ ترتیب معلوم ان کو ذکر فرمایا اور کیف ما اتفق بیان نہ کیا۔

---

[1] ذوی القربیٰ کی تفسیر و مصداق میں چند حوالجات ملاحظہ ہوں تفسیر روح المعانی ص ۲۴۷ پر ہے۔

والمراد بذی القربیٰ قرابتہ صلی اللہ علیہ وسلم والمراد بھم بنو ہاشم و بنو عبد المطلب لانہ صلی اللہ علیہ وسلم وضع السھم فیھم۔

ذی القربیٰ سے مراد حضور علیہ الصلاۃ والسلام کے رشتہ دار ہیں جو ہاشم کی اولاد سے ہوں اور عبد المطلب کی اولاد سے ہوں کیونکہ حضور علیہ السلام نے ان کو ہی فے کا حصہ دیا ہے

(باقی حاشیہ ص ۳۳۲ پر)

(ذوی القربیٰ میں القربیٰ کو بغیر اضافت ذکر کرنے کی وجہ)

باایں ہمہ اقربا نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ساری ہی امت کے اقربا ہیں چنانچہ تحقیق مسطور بالا در بارہ اولویت بمعنی اقربیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم گذر چکی۔ جس میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا بہ نسبت امت مرحومہ اقرب ہونا اور والد روحانی ہونا ثابت ہو چکا ہے اس مضمون کے مؤید ہے اور شاید اس لیے ذی قربی النبی صلی اللہ علیہ وسلم

بقیہ حاشیہ ۲: نیز کچھ آگے فرماتے ہیں "ہمارے نزدیک ذوی القربیٰ بنی ہاشم کے ساتھ خاص ہے اور یہی مطلب کے ساتھ کیونکہ یہ حدیث ہی ہے البتہ ان کو مستقل حصہ نہ ملے گا نہ مطلقاً (ہر حال میں) دیا جائیگا بلکہ ان کے مساکین، یتامیٰ اور مسافروں کو دیا جائے گا کیونکہ وہ ان الفاظ قرآنی میں شامل ہیں لیکن ان اقسام ثلثہ میں سے بنو ہاشم کو اولیت دی جائے گی کیونکہ خلفاء ثلاثہ رض (ایسا ہی کرتے تھے اور) ان کا الگ حصہ نہ نکالتے تھے۔ ہاں وہ خمس تین حصوں میں بانٹتے۔ ایک حصہ یتیموں کا ایک مسکینوں کا ایک مسافروں کا اور حضرت علی کرم علی وجہہ نے اپنے دور خلافت میں ان خلفاء ثلاثہ رض کی مخالفت نہیں کی حالانکہ بعض فروعی مسائل میں اختلاف رکھتے بھی تھے (ایضاً)

۳۔ شارح مسلم علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی "تفسیری فوائد" میں رقمطراز ہیں: "ف یعنی حضرت کے قرابت والوں کے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے زمانہ میں اس مال میں سے ان کو بھی دیتے تھے اور ان میں فقیر کی قید بھی نہیں تھی۔ اپنے چچا حضرت عباس کو جو دولت مند تھے آپ نے حصہ عطا فرمایا۔ اب آپ کے بعد حنفیہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت دار جو صاحب حاجت ہوں امام کو چاہیئے کہ انہیں دوسرے محتاجوں سے مقدم رکھے (قرآن پاک مترجم ۲۴۹)

۴۔ مفتی اعظم پاکستان علامہ محمد شفیع دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی تفسیر معارف القرآن ص ۲۶۴/۸ پر تحریر فرماتے ہیں۔ "پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حصہ اس مال میں رکھا گیا تھا وہ آپ کی وفات کے بعد ختم ہو گیا۔ ذوی القربیٰ کو اس مال میں سے دینے کی دو وجہیں تھیں ایک نصرت رسول یعنی اسلامی کاموں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد کرنا اس لحاظ سے اغنیاء ذوی القربیٰ کو بھی اس میں سے حصہ دیا جاتا تھا۔ دوسرے یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذوی القربیٰ پر مال صدقہ حرام کر دیا گیا ہے تو ان کے فقراء و مساکین کو صدقہ کے بدلے میں مال فے سے حصہ دیا جاتا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد (آپ کی) نصرت و امداد کا سلسلہ ختم ہو گیا البتہ فقراء ذوی القربیٰ کا حصہ بحیثیت فقر و احتیاج کے اس مال میں باقی رہا اور وہ اس مال میں دیگر فقراء و مساکین کے مقابلہ میں مقدم رکھے جائیں گے (کذا فی الہدایہ) ۱۲ از مہر محمد۔

باضافت نہ فرمایا بلکہ ذوی القربیٰ فرمایا تاکہ اطلاق لفظ عموم قرابت پر دلالت کرے اور بر نسبت اصناف باقیہ وجہ ترجیح اور علت تقدیم ہاتھ آئے۔ علاوہ بریں کار رسالت ایسا آسان نہیں کہ معین اور مددگار کی حاجت نہ ہو، ہزاروں سے مخالفت اور ہزاروں سے مقابلہ اور ایسے آڑے وقتوں میں اقربا ساتھ دیا کرتے ہیں اور اس وجہ سے ان میں سے کسی کو اپنے کھانے کمانے کی فرصت میسر نہیں آیا کرتی۔ اس لیے ان کے نان ونفقہ کو بھی ایسا ہی سمجھو جیسا نان ونفقہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(اقربا نبوی صلی اللہ علیہ وسلم فریضہ رسالت میں معین و مددگار تھے اس لیے ایسے فنڈ سے ان کا وظیفہ مقرر کیا ہے جس میں غانمین کی سعی و عمل کا دخل نہیں)

اور شاید یہی وجہ ہوئی کہ انہی اقربا کو آپ نے اس قسم کے اموال میں سے دیا ہے جن سے معونت و مددگاری ظہور میں آئی۔ چنانچہ ناظران احادیث پر پوشیدہ نہ ہو گا لیکن جیسے آیت اولیٰ یعنی مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ یُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اموال فے بعد احراز و قبض بھی خدا ہی کے ملک خاص میں ہیں اور بوجہ عدم اسباب مالکیت بشری اوروں کو اس سے کچھ تعلق نہیں آیت ثانیہ سے اول تو یہ بات روشن ہو گئی کہ وہ اموال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ملک نہیں ورنہ ذوی القربیٰ اور یتامیٰ اور مساکین اور ابناء سبیل کو اس سے کیا علاقہ تھا۔

(سوال۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ یُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ سے معلوم ہوتا ہے کہ فے تسلط سے حاصل ہوا اور پیغمبر کا تسلط خلیفہ کا تسلط ہے اور بالتبع لشکر کا)

غرض کلمہ لٰكِنَّ اللّٰهَ یُسَلِّطُ رُسُلَهٗ سے کوئی یوں نہ سمجھے کہ اگر اہل لشکر کو اس سے کچھ علاقہ نہیں تو کیا ہوا تسلط نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تو موجود ہے، اور تسلط و قبض ہی موجب و علت حقیقی ملک ہے۔

چنانچہ حدوث ملک اول نباتات خودرو اور حیوانات غیر پرورده میں اگر ہوتا ہے تو اسی قبض سے ہوتا ہے اور بعد ازاں بیع وشراء و اجارہ ہبہ میراث، وصیت سے اگر ملک حاصل ہوتی ہے تو بوجہ حصول قبض حاصل ہوتی ہے۔ غرض اگر قبضہ متبدل ہو جاتا ہے تو ملک بھی متبدل ہو جاتا ہے ان اسباب کو اسباب مستقلہ ملک نہیں کہہ سکتے ہاں یہ کہیے کہ اپنا قبضہ ہو یا وکیل عام یعنی خلیفہ و بادشاہ

عادل کا قبضہ ہو۔ یہ کچھ ضرور نہیں کہ اپنا ہی قبضہ ہو تو ملک ہو۔ نہیں تو نہیں۔

ہاں اگر خلیفہ وقت کا بھی قبضہ اٹھ جائے اور کفار متسلط ہو جائیں تو پھر ملک کے باقی رہنے کی کوئی صورت نہیں مگر تسلط نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اموال فے پر بشہادت آیت فے ہی ثابت ہے۔ اس لیے آپ کی ملک کا اقرار بھی لازم ہے۔ غرض اس تسلط سے یہ دھوکہ نہ کھانا چاہیئے کہ اموال مملوکہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ کیونکہ بشہادت جملہ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ یہ تسلط اپنی طرف سے نہ تھا بلکہ تسلط وکالت و رسالت تھا۔

(جواب - یہ تسلط ذات نبوی کا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے نیابت کا تسلط ہے)

اور حاصل جواب اس صورت میں یہ ہوا کہ تسلط کو یہ لازم نہیں کہ تسلط ذاتی ہو اگر تسلط من جانب الغیر ہوگا، جب بھی اس کا نام تسلط ہی ہوگا۔ اس صورت میں مفہوم تسلط، تسلط ذاتی اور تسلط وکالت دونوں سے عام ہوا بایں ہمہ آیت ثانیہ بھی تسلطِ وکالت ہی پر دلالت کرتی چنانچہ یہ معروض مذکور جو ابھی لکھ کر فارغ ہوا ہوں اس پر شاہد ہے اور نیز مضامین آئندہ اس کی تائید کرتے ہیں، پھر اس تسلط کا موجبِ ملک (ذاتی) سمجھ لینا کمال خوش فہمی پر دلالت کرتا ہے۔

القصہ اوّل تو جملہ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ ہی اس وہم کا جواب ہے۔ دوسرے آیت ثانیہ سے بھی معلوم ہوا کہ وہم مالکیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جو جملہ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ سے ہی ہو تا تھا محض بے جا ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مالک ہوں تو پھر نہ فللہ کے کوئی معنی ہیں اور (نہ) مصارف باقیہ کے ذکر کرنے کی کوئی وجہ ہے۔ بلکہ یہ دونوں کلمے باعتبار معنی مفہوم غلط ہو جائیں گے۔

(جملہ اصناف مصارف از قسم استحقاق مصارف ہیں نہ کہ استحقاق ملک اور استحقاق مصارف میں مستحق داد و فریاد نہیں کر سکتے اس لیے تعدد فقر اضر ورکی نہیں)

معہذا آیت ثانیہ سے یہ بات ہی واضح ہو گئی کہ مصارف مذکورہ کو استحقاق دعویٰ ملکیت نہیں ہو سکتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ استحقاق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک استحقاق مالکیت۔ دوسرا استحقاق مصرفیت۔ استحقاق مالکیت میں تو قبض یا مقتضیات قبض مثل بیع و شراء وغیرہ اسباب مذکورہ کا ہونا ضرور ہے اور اس وجہ سے جہاں قبض یا مقتضیات قبض میسر آجاتی ہیں وہاں مستحق کو داد فریاد کی گنجائش ہوتی ہے۔

اور استحقاق مصرفیت میں ناداری اور افلاس کافی خواہ وہ افلاس بوجہ عدم لیاقت ہو جیسے یتامیٰ میں ہوتا ہے یا بوجہ عدم مساعدۃ اسباب جیسے مساکین اور ابناء سبیل میں ہے یا بوجہ اشتغال بکار دیگر جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت عرض خدمت کر چکا ہوں اور نیز آپ کے اقرباء کی نسبت معلوم ہو چکا ہے۔

بہر حال مصارف مندرجہ آیت مَا اَفَآءَ اللّٰهُ کا استحقاق از قسم استحقاق مصرفیت ہے از قسم استحقاق مالکیت نہیں۔ اور اس باب میں مصارف مندرجہ آیت فے اور مصارف مندرجہ آیت صدقات اعنی اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ اور مصارف مندرجہ آیت خمس یعنی وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ الخ سب باہم ہمدوش یکدگر ہیں۔ بالجملہ مصارف مندرجہ آیت صدقات کا استحقاق بالاتفاق از قسم استحقاق مصرفیت ہے از قسم استحقاق مالکیت نہیں اور اس وجہ فقراء وغیرہ مصارف صدقات کو تو اغنیاء کی نالش کا اختیار نہیں اور اغنیاء کو کسی ایک فقیر کے دے دینے کا اختیار۔ اس لیے ایک کا دے دینا بھی موجب سقوط فرض ہو جاتا ہے ورنہ جہان کے تمام فقراء و مساکین کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر دینا بایں وجہ کہ حد بشری سے خارج ہے کسی سے ممکن نہ تھا اور اس قدر تکلیف دی جاتی تو پھر کسی صاحب زکوٰۃ کی نجات کی کوئی صورت نہ تھی مگر ایسے ہی مصارف مندرجہ آیت فے کو بھی نالش و فریاد وغیرہ لوازم استحقاق مالکیت کی گنجائش نہیں اور متولی کو عطاء مال فے غیر صنف واحد کی تخصیص کا اختیار۔ کیونکہ بدلالت مفہومات عنوانات مصارف مندرجہ آیت فے۔ ان کا استحقاق اگر ہے تو از قسم استحقاق مصرفیت ہے از قسم استحقاق مالکیت نہیں ہو سکتا چنانچہ بوجہ احسن معروض ہو چکا۔

(للرسول میں لام ملکیت کے تسلیم سے تمام اصناف میں ملک کے لزوم کے علاوہ دو خرابیاں لازم آئیں گی حضور علیہ السلام نے بلا وجہ ایک جہان کا مال دبائے رکھا۔ ۲ اور یہ کہ تمام اصناف کے افراد کی ملک محدود و متعین ہو۔)

اور اس کی تشریح کے لیے یہ اور معروض ہے کہ اگر بالفرض لام للرسول اختیار تولیت و مصرفیت پر دلالت نہ کرے بلکہ لام ملک ہو اور مالکیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر دلالت کرے تو اس صورت میں بالضرور لام لذی القربیٰ بھی لام ملک ہوگا اور مالکیت ذوی القربیٰ اور نیز بحکم عطف مالکیت اصناف باقیہ پر دلالت کرے گا۔ اس صورت میں اول تو جناب سید المعصومین

خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض لازم آئے گا۔ کہ ایک جہاں کا حق مدت العمر تک دبائے رکھا۔ تقسیم کر کے اصل زمین کا دینا تو درکنار آمدنی میں بھی یاد نہ کیا آخر کون کہہ دے گا کہ اموال فدک اور بنی النضیر کو ایسی طرح تقسیم کیا کہ کوئی مسکین اور یتیم اور ابن سبیل اور اقربائے نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کوئی باقی نہ رہا ہو۔ دوسرے اس صورت میں اموال اور اراضی فے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اصناف باقیہ میں مشترک ہوں گے۔ اور مال مشترک میں ضرور ہے کہ سہام بقدر افراد اصناف شرکاء ہوں اگر فرض کرو کسی مورث کے مال میں موافق مذہب اہل سنت کچھ ذوی الفروض اور کچھ عصبات شریک ہوں یا موافق مذہب فریقین یوں کہیئے کہ اولاد پسری اور دختری شریک ہوں مثلاً۔ تو اس صورت میں سہام بلحاظ حصص و افراد شرکاء مقرر ہوں گے فقط لحاظ عدد اصناف نہ کیا جائے گا۔

القصہ تعداد سہام میں افراد اصناف مندرجہ آیت مذکورہ پر نظر ہونی چاہیئے مگر ذوی القربیٰ اور یتامیٰ اور مساکین اور ابناء سبیل کے لیے کوئی عدد مقرر نہیں۔ اس لیے سہام مشترک کا کچھ تعین نہیں ہوسکتا اور اقرار ملک اصناف باقیہ کی کوئی صورت نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مالکیت اور ملک اموال فے میں ثابت ہو۔

(ہر صورت میں اہل تشیع مال فے سے ہمیشہ محروم رہیں گے کیونکہ جملہ اہل مصارف کا صحابہؓ کے حق میں دعا گو ہونا ضروری ہے)

اس سے بھی بڑھ کر اور لیجئے لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ۔ لِذِي الْقُرْبَىٰ سے بدل واقع ہوا ہے۔ اور اس پر بطور عطف یہ ارشاد ہے۔

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ (اور جو لوگ جگہ پکڑ رہے ہیں اس گھر میں اور ایمان میں ان سے پہلے)

اور نیز بطور عطف ہی پھر یہ ارشاد ہے۔

وَالَّذِينَ جَاءُوا مِنْ بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ۔ (اور واسطے ان لوگوں کے جو آئے ان کے بعد کہتے ہوئے اے رب بخش ہم کو اور ہمارے بھائیوں کو جو ہم سے پہلے داخل ہوئے ایمان میں)

اس لیے تابعین سے لے کر قیام قیامت تک جس قدر مسلمان پیدا ہوں اور صحابہؓ کے دعا گو ہوں ان سب کو اموال فے میں شریک ملک کرنا پڑے گا۔ مگر سب جانتے ہیں کہ اموال مملوکہ کے

لیے مالکوں کا بالفعل موجود ہونا ضروری ہے۔

جو لوگ ابھی ساحت وجود میں قدم رکھنے ہی نہیں پائے وہ کیوں کر مالک اموال مملوکہ بالفعل ہو سکیں ایسی بات کوئی نادان بھی نہیں کہہ سکتا تو اس پر شیعہ بے وجہ تکرار کرتے ہیں۔ اگر بالفرض اصناف مذکور مالکِ اموال و اراضی فے ہوتے بھی تو شیعوں کو کیا مل جاتا۔ کلام اللہ میں تو پہلے ہی ان کے محروم کرنے کے لیے یہ قید لگا دی ہے۔ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا الخ سو ان کی دعا گوئی بہ نسبت صحابہ کرامؓ (تبرا بازی) سبھی کو معلوم ہے۔ مگر شاید اسی جلن میں طعن فدک میں بے ہودہ سرائی ہے۔

(اغنیاء میں گردش مال کی ممانعت ملکیت خلصہ کی نفی کرتی ہے) علاوہ بریں جملہ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَةً بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ بھی اسی بات پر شاہد ہے کہ اموال فے اصناف مندرجہ آیت کی مملوک نہیں۔ بلکہ اگر یوں کہیے کہ یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اراضی مذکورہ اصناف مسطورہ بالفعل تو کیا مملوک ہوتے۔ آئندہ بھی مملوک نہیں ہو سکتے تو بجا ہے۔ اس لیے کہ درصورت تملیک اغنیاء میں متداول ہو جانا تو قریب الوقوع ہے۔ اس لیے کہ فقیروں کی اولاد کبھی غنی ہو جاتی ہے۔ سو اگر فقراء کو مالک کہیے تو ان کی اولاد کا ان کے انتقال کے بعد ان اموال کا مالک ہو جانا بوجہ میراث لازم ہے اور تداول مذکور کا وقوع میں آنا ضرور۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات عموم الفاظ کے مخالف ہے۔ اگرچہ بظاہر غرض اس جملہ سے فقط اتنی معلوم ہوتی ہے کہ خلیفہ وقت مثل سرداران زمانہ جاہلیت اس قسم کے اموال کو اپنا حق خاص نہ سمجھ لیں۔ ان تمام مضامین سے اراضی فے کا بالفعل غیر مملوک ہونا بلکہ بعض سے تو آئندہ کو بھی غیر مملوک ہونا ظاہر ہو چکا۔

(اموال منقولہ میں انتفاع بغیر قبض تام ممکن نہیں) اب لازم یوں ہے کہ فرق اموال منقولہ و غیر منقولہ ظاہر کیا جائے تاکہ بعض شبہات محتملہ کسی کم فہم کو حیران نہ کریں اس لیے یہ معروض ہے کہ لامِ لذی القربیٰ اور لامِ للرسول بلحاظ جہت ثانیہ یعنی جہت مصرفیت لامِ انتفاع ہے لامِ ملک نہیں۔ چنانچہ خود مضمون مصرفیت اس کے لیے شاہد ہے اور وجوہ مذکورہ بالا ان کے مالک نہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ مگر اموال منقولہ سے انتفاع اگر متصور ہے تو جبھی متصور ہے جب کہ اپنے ہاتھ میں آجائیں۔ روٹی کا کھانا اور کپڑے کا پہننا اور ہتھیاروں سے مدافعت دشمن قبل قبض ممکن نہیں۔ پھر

جب اس بات کا لحاظ کیا جائے کہ اموالِ فئے بشہادت فَلِلّٰہِ مملوکِ خداوندی مالک الملک ہیں اور اہل مصرف کے نفع کے لیے مقرر۔ پھر بایں ہمہ قبض اہل مصرف متحقق ہو گیا تو اس صورت میں اموال فئے اور ما فی الارض میں کیا فرق رہ گیا۔ وہ بھی بشہادت لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور بشہادت وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ خدا ہی کی ملک تھی اور پھر بشہادت خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا بنی آدم کے نفع کے لیے مخلوق۔ اس لیے کہ لام لَكُمْ لام نفع و انتفاع ہے۔ لام ملک نہیں۔ چنانچہ بدیہی ہے۔ وہاں جیسے علتِ تامہ ملکِ عباد قبض تام مستحکم تھا یہاں بھی قبض تام و مستحکم موجب ملک ہو گا مگر قبض تام یہی ہے کہ پہلے کسی اور کا قبضہ نہ ہو چکا ہو اور ہو چکا ہو تو معاوضہ قبض ہو چکا ہو جیسے بیع و شراء وغیرہ میں ہوا کرتا ہے ورنہ پھر وہ قبضہ یا تو قبضہ امانت ہو گا یا قبضہ غصب۔ سو قبضہ امانت تو قبضہ مالک ہی کا پرتو ہے۔ قبضہ تام اگر کہیئے تو اس کے قبضہ کو کہیئے کیونکہ مالک کو امین کے قبضہ کے اٹھا دینے کا اختیار ہے۔ امین کو قبضہ مالک کے اٹھا دینے کا اختیار نہیں۔ اور قبضہ غاصب گو قبضہ مالک کا پرتو نہیں پر قابض ولایت یعنی خلیفہ وقت کے قبضہ میں ہوتا ہے اور خلیفہ وقت حمایت مالک کے لیے مقرر ہوتا ہے حامی غاصب نہیں ہوتا۔ اسلیے قبضہ غصب بھی قبضہ تام اور قبضہ مستحکم نہیں۔

(اموالِ غیر منقولہ میں غیر کی تولیت سے بھی انتفاع ہو سکتا ہے) مگر قبضہ اہل مصرف اموال فئے پر چونکہ ایسا ہے جیسا قبضہ بنی آدم مَا فِي الْاَرْضِ پر کیونکہ یہ نہ قبضہ امانت ہے نہ قبضہ غصب۔ تو بالضرور یہ قبضہ موجب ملک ہو گا اور کیوں نہ ہو۔ حیوانات صحرائی اور نباتات خود رو یدہ اگر ملک میں آتی ہیں۔ تو بوسیلہ قبض ملک میں آتی ہیں اور ملک سے نکلتی ہیں تو بوسیلہ زوال قبض ملک سے نکلتی ہیں۔ ہاں زمین سے انتفاع اہل مصرف قبل قبض اور بعد قبض دونوں طرح متصور ہے اگر زمین فئے قبضہ متولی میں رہے اور اس کی آمدنی کو متولی اہل مصرف میں تقسیم کرتا رہے تب بھی غرض اصلی حاصل ہے اور خود اہل مصرف کے تصرف میں رہے اور وہ بطور خود اس کا انتظام کر کے اس کی آمدنی کو اپنے صرف میں لا دیں تب بھی متصور ہے۔ بہر حال قبضہ اہل مصرف ضروریات انتفاع میں سے نہیں جو خواہ مخواہ اس کی ضرورت ہو اور جب قبضہ ضروریات انتفاع میں سے نہ ہوا تو باشارہ لام اور انتفاع اس کی خواستگاری نہیں ہو سکتی۔ بغرض تولیت یا تخفیف تصدیع متولی ہو تو ہو۔

(مال فئ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ کا قبضہ بطور متولی تھا) اور ظاہر ہے کہ لام لِلرَّسُوْلِ جو بوجہ توسط تولیت پر دلالت کرتا ہے تو بحیثیت تولیت نیابت و امانت مالک حقیقی پر دلالت کرتا ہے۔ ملک پر دلالت نہیں کرتا۔ مگر آپ جیسے متولی تھے ایسے ہی مصرف بھی تھے چنانچہ توسط مذکور اس پر بھی شاہد ہے اس لیے زمین فئ اگر اہل مصرف کے قبضہ میں بھی آجائے گی تو قبضہ امانت یا تولیت ہوگا قبضہ انتفاع و ملک نہ ہوگا۔

(اراضی فئ کے لیے متولی کا ہونا لازمی ہے مصرف کے کسی ایک فرد یا ایک سے زائد افراد پر پیداوار تقسیم کرنا کافی ہے۔) ہاں یہ بات مسلم ہے کہ زمین فئ کی آمدنی یا غلہ کو متولی چاہیے۔ جمیع اصناف مصارف بلکہ جملہ افراد جملہ اصناف کو اگر بن پڑے تو بانٹ دیا کرے۔ چاہے ایک صنف کو یا ایک فرد کو دے دیا کرے بشرطیکہ قدر عطا کی مایحتاج سے بادی النظر میں زائد نہ معلوم ہو۔ کیونکہ استحقاق مصرفیت میں اگر دو شخص برابر بھی ہوں تو یہ ضرور نہیں کہ عطا میں بھی متساوی رہا کریں ورنہ اسی طرح کا انصاف اس قسم کے مستحقوں میں حد بشری سے خارج ہے۔

آیت صدقات یعنی اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِيْنِ الخ اور آیت خمس یعنی وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ الخ اور آیت فئ یعنی یہی مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ الخ۔ کے مصارف کو دیکھیے تو شرق و غرب و جنوب و شمال میں پھیلے ہوئے ہیں متولی کس کس کو ڈھونڈتا پھرا کرے۔ خاص کر جب کہ مال مقسوم قدر قلیل ہو۔ اس لیے اموال زکوٰۃ اور خمس اور فئ کا ہر ہر فرد کو دینا کسی کے نزدیک ضرور نہیں۔

(حاصل بحث) اس صورت میں قبضہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قریہ فدک پر یا قبضہ مرتضوی رضی اللہ عنہ برایام خلافت خلیفہ ثانی میں حاصل تھا، موجب ملک نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یا موجب ملک مرتضوی رضی اللہ عنہ نہیں ہو سکتا۔

علی ہذا القیاس بعض قریٰ فئ کا خرچ خانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص ہونا عاقل کے نزدیک دلیل ملک نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہو سکتا۔

(فدک کی بعض آبادیوں کی نسبت حضرت عمرؓ کا فرمان کَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم اسی مصرف پر دلالت کرتا ہے۔ اگر حق ملکیت ہوتا تو وارثوں کو اور حق مسند نشینی ہوتا تو یہ آپ کے بعد خلفاء کو منتقل ہوتا۔)

علی ہذا القیاس حضرت عمرؓ کا بعض قریٰ کی نسبت یہ کہنا کہ کَانَتْ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم خَاصَۃً اَوْ کما قال۔ اختصاص ملک پر دلالت

نہیں کرتا بلکہ اس اختصاص مصرفیت پر دلالت کرتا ہے اور بعض مواقع میں یہ غرض ہے کہ حصہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اموال خمس وفئے میں حق مسند و سجادہ نہیں جو آپ کے جانشین اور پھر آپ کے جانشینوں کے جانشین ہمیشہ اس کے مستحق رہیں۔ اور نہ حق ملکیت ہے جو بفرض محال اگر موت جسمانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس قسم کی فرض کیجئے جیسے ہمارے تمہارے لیے مقرر ہے تو وارثوں کو امید حصہ کشی فرائض ہو۔ بلکہ حق منصب رسالت ہے اس لیے آپ ہی کی ذات بابرکات علیہ و علی آلہٖ الصلوٰت والتسلیمات کے ساتھ خاص رہا۔ وارثوں کو بطور ملک دیا گیا نہ خلفاء کو اس میں کچھ دعویٰ ہوا۔ اور اگر بالفرض اس مال میں سے بوجہ تعلق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو کچھ نہ ملتا بھی تو خلفاء کو ملتا۔ اقرباء کو نہ ملتا۔

(خلفاء راشدین بھی مال فے پر بطور متولی کے قابض تھے ورنہ خود استعمال کرتے)

کیونکہ اول تو ذوی القربیٰ کے لیے خداوند عادل نے پہلے ہی ایک سہم مقرر کر دیا۔ دوسرے سہم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حق منصب رسالت و نبوت ہوا تو جو خلفاء کار نبوت ہوں انہیں کو ملنا چاہیے اور ظاہر ہے کسی کا خلیفہ وہی کام کیا کرتا ہے جس میں وہ خلیفہ ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر مستحق ہوتے تو خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین ہوتے۔ اقرباء نہ ہوتے۔ مگر انصاف اسے کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے استحقاق کی ایسی نفی کر دی کہ پھر کسی خلیفہ کو ہوس سہم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نہ رہے۔ ورنہ خو کردگان زمانہ جاہلیت اور افسانہ خوانان دورہ فترت آگے پیچھے اس قسم کی تاویلات شرعیہ سے اس سہم کو دبا بیٹھتے لیکن قدر شناسی بھی اسے ہی کہتے ہیں کہ حضرات شیعہ نے نہ عقل کی مانی نہ نقل کی سُنی۔ اس انصاف پر سننے کے بدلے خلفاء راشدینؓ کے حق میں گستاخیاں کر کے اپنی عاقبت خراب کی۔

سو اس کے آیت اولیٰ یعنی آیت فَمَا اَوْجَفْتُمْ کو پڑھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد کہ ھٰذِہٖ لِرَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم خَاصَۃً اور آیت ثانیہ یعنی فَلِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ

وَلِذِی الْقُرْبٰی کو یہ پڑھ کر یہ کہنا ھٰذِہٖ لِھٰٓؤُلَآءِ اسی جانب مشیر ہے کہ تولیت بالذات جسے ملک متوسط کہیئے اور برزخ بین الملک الحقیقی والملک المستعار نام رکھئے فقط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے ہے۔ یعنی جیسے مالک حقیقی خداوند مالک الملک کو اختیار ہے جسے چاہے عطا کرے جسے چاہے کچھ نہ دے بوجہ خلافت خداوندی یہ منصب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاصل ہے چنانچہ آخر آیت میں یہ ارشاد۔

مَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا۔ (اور جو دے تم کو رسول سو لے لو اور جس سے منع کرے سو چھوڑ دو)

اسی مضمون کی تصریح اور اسی اجمال کی تفصیل ہے۔

(افاضہ وجود و کمالات کا خزانہ اگرچہ خداوند کریم ہی ہے لیکن یہ بواسطہ خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہوتا ہے)

اور ہنر اس میں یہ ہے کہ افاضہ وجود و کمالات، وجود مخلوقات کی جانب اگرچہ خزانہ خداوندی ہی سے ہوتا ہے۔ مگر بشہادت آیت اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ اور آیت خاتم النّبیین۔ چنانچہ تقریرات مرقومہ بالا سے واضح ہو چکا اور نیز بشہادت دیگر آیات و تائید تحقیقات ارباب مکاشفات وہ سب افاضہ بواسطہ حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اسی طرح ہوتا ہے۔ جیسے شب کو بواسطہ قمر افاضہ نور آفتاب ہوا کرتا ہے اس لیے تولیت حقیقی جس کا ماحصل یہی خلافت تقسیم ہے آپ ہی کو عطا ہوئی۔ ہاں بطور کار گذاران پیش دست آپ کے بعد خلفاء راشدین رضؓ اس کام کو کرتے رہے۔ سو جیسے سلاطین زمان اگر کسی کو کچھ دیتے ہیں تو بواسطہ خدام و ملازمان سلطنت دلا دیتے ہیں اور پھر خدام و ملازمان کا دینا سلاطین ہی کا دینا سمجھا جاتا ہے ایسے ہی خلفاء راشدین رضؓ کی داد و دہش اموال فیئ میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی داد و دہش سمجھو ان کا دینا کوئی امر جداگانہ نہیں جو ان کے لیے بھی تولیت مستقل ثابت کی جاتی۔ ادھر آیت اولی کے بعد حضرت عمر رضؓ کا یہ کہنا ھٰذہ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاصۃً غلط ہو جائے۔

(استحقاق کی تین قسمیں اور قوی کا ضعیف کو متضمن ہونا)

الحاصل زمین فیئ میں تین استحقاق ایک دوسرے سے کم و زیادہ ہوتے ہیں۔ اول درجہ کا استحقاق جس کو استحقاق ملک و مالکانہ کہیئے وہ خداوند مالک الملک کے لیے ہے۔ اور دوسرے درجہ کا استحقاق جس کو تولیت اور استحقاق تصرف و اختیار تقسیم کہیئے وہ اصناف باقی کے لیے ہے۔

مگر چونکہ قوی ضعیف کو متضمن و مشتمل ہوا کرتا ہے اس لیے جیسے استحقاق اول استحقاق ثانی
کو متضمن اور مشتمل ہے ایسے ہی استحقاق ثانی بوجہ قابلیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جس کو احتیاج کہیے
استحقاق ثالث کو متضمن اور مشتمل ہو گا۔ اگرچہ بوجہ توسط آپ کا ذوجہتین[1] ہونا بھی دونوں استحقاقوں کا
بقدر قابلیت خواستگار تھا۔ مگر استحقاق اوّل اعنی استحقاق خداوندی قابل زوال نہیں ایسا ہی
استحقاق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یعنی استحقاق تولیت کسی وقت قابل زوال نہیں چنانچہ ما افاء اللہ فللہ وللرسول
کا جملہ اسمیہ ہونا ہی اس پر شاہد ہے ہاں اس طرح دوام استحقاق مصرفیت بھی ثابت ہو گا لیکن دوام استحقاق
مصرفیت نہ اس بات کا مقتضی ہے کہ مستحق کو حق ملنا ضرور ہے اور نہ درصورت اخذ غیر وہ استحقاق
زائل۔ موجب۔

(ملک خداوندی تمام استحقاقات ملک تولیت اور ملک مصرف کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے لیکن مرتبہ تولیت ملک مصرف کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا)

جب یہ بات روشن ہو گئی تو اتنا اور سُن لیجے کہ اگر مرتبہ توسط یعنی مرتبہ
تولیت اراضی فَے میں نہ ہوتا تو پھر مثل دیگر اراضی ان کی مملوک ہو جانے میں کہ دقت نہ تھی کیونکہ اس صورت
میں دو مرتبے ہوتے اور ظاہر ہے کہ مرتبہ اول یعنی خداوندی اور دونوں ملک کے ساتھ مجتمع ہو سکتا ہے اور
کیوں نہ ہو اوروں کی ملک خدا ہی کی ملک کا پرتو ہے وہ نہ ہو تو یہ کیوں کر ہو۔ ہاں مرتبہ تولیت اہل مصرف
کے ساتھ مجتمع نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ملک بشرطیکہ موانع تصرف مرتفع ہو جائیں۔ تصرفات مالکانہ کی خواستگار
(ہے) اور تولیت کے ساتھ سوا متولی اوروں کا اختیار متصور نہیں۔ بالجملہ مواقع مختلفہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ
اور نیز بعض صحابہؓ سے اظہار اختصاص نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بہ نسبت اموال فَے اکثر ثابت ہوا ہے
تو علی حسب الاختلاف یہ معانی ثلاثہ مراد ہیں۔ مگر کم فہمی کو کیا کیجیے۔ جیسے بھوکے کو دو اور دو سے چار
روٹیاں ہی سمجھ میں آتی ہیں۔ حضرات شیعہ کو کسی قسم کا اختصاص کیوں نہ ہو ملک نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی
سمجھ میں آتی ہے۔ ان تمام مضامین کے دیکھنے والوں کو نہ دربارہ فدک و اراضی بنی نضیر ان شاء اللہ
شبہ مالکیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم باقی رہے گا۔ اور نہ دربارہ حصہ خمس یہ وہم دل میں رہے گا۔ کیونکہ مصارف
خمس بھی وہی مصارف فَے ہیں اور انداز بیان بھی وہی ہے جو انداز بیان مصارف فَے ہے۔ وہاں اگر

---

[1] یعنی مرتبہ ذوجہتین اس کا متقاضی تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں استحقاق تولیت کی طرح استحقاق مالکیت بھی پایا
جاتا۔ ذی جہتین میں توسط جانبین سے نسبت رکھتا ہے اور جانبین سے متعلق ہوتا ہے۔ ۱۲۔ محمد علی عفی اللہ عنہ،

تین لام فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی مصنوعات ثلاثہ پر داخل ہوئے ہیں یہاں بھی وہی تین لام انہیں مصنوعات ثلاثہ پر وارد ہیں۔

(مخیریق یہودی کے ہبہ کے شبہ کے جوابات) ہاں احتمال تردد ہے تو بہ نسبت اموال موہوبہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے مگر یہ تردد اہل سنت کو اس وقت معتر تھا کہ سوا انکار مالکیت اور کوئی صورت جواب نہ ہوتی درصورت کہ دوامِ حیات جسمانی ثابت ہو چکا ہو۔ اور خصوص خطاب یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ ظاہر ہو گیا ہو۔ تو پھر ایک مملوکیت سے کیا ہوتا ہے۔

(اشیائے موہوبہ باعتقاد رسالت تھیں اور منصب رسالت وہی منصب خلافت و نیابت ہے) بایں ہمہ اموال موہوبہ کی ملک بھی اگر غور سے دیکھئے تو وہی ملک نیابت ہے۔ ہبہ مخیریق یہودی بوجہ اعتقاد رسالت تھا اور ظاہر ہے کہ منصب رسالت وہ منصب خلافت و نیابت خداوندی ہے۔ اس لیے مقتضائے حقیقت شناسی و حقیقت سنجی یہ ہے کہ ایسے ہدایا کو داخل خزانہ خداوندی سمجھئے اور سوا کارِ سرکاری اور کسی کام میں صرف نہ کیجئے۔ مگر کارِ سرکاری وہی تبلیغ احکام خداوندی یا اعلاء کلمۃ اللہ ہے۔ جس کے لیے رُسل بھیجے جاتے ہیں غرض کارِ رسالت و جہاد میں جو کچھ صرف ہو فبہا ورنہ باقی کو بجنسہ محفوظ رکھنا چاہیئے تاکہ آئندہ کو بھی اسی کام میں صرف ہو تا ہے۔ ہاں صرف ذوی القربیٰ اور یتامیٰ اور مساکین اور ابناء السبیل کو بھی منجملہ اعلاء کلمۃ اللہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ اگر یہ نہ ہو تو پھر تعمیل احکام ان اقسام سے معلوم اور ظاہر ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ بے تعمیل احکام ملکِ علام متصور نہیں اور اگر فرض کیجئے یہ صرف منجملہ صرف اعلاء کلمۃ اللہ نہیں تو بیش بریں نیست مصارف سرکاری ضرورت ادار رسالت اور ضرورت اعلاء کلمۃ اللہ میں منحصر نہ ہو۔ یہ چار قسمیں اور سہی۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اصناف مذکورہ کی خبر گیری بھی منجملہ مصارف خداوندی ہے جیسے خرچ مہمات صرف سرکاری شمار کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی خرچ خیرات بھی جو سرکار کی طرف سے ہوا کرتا ہے منجملہ مصارف سرکار سمجھا جاتا ہے۔

(خلیفہ کا ہبہ سرکاری ملک ہوتا ہے) بہر حال ہبہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم حق سرکاری ہے چنانچہ قواعد فقہیہ بھی اس کے موید ہیں اور دستور سلطنت بھی اس پر گواہ ہے اطفال خورد سال کو مثلاً اگر بلحاظ والدین کوئی کچھ دیتا ہے تو وہ حق والدین ہی فقہاء کے نزدیک سمجھا جاتا ہے۔ ادھر دربارِ گورنری کا نذرانہ خزانہ سرکاری میں جمع کیا جاتا ہے اور گورنر کو نہیں دیا جاتا۔

(خصوصاً انبیاء علیہم السلام اپنی ملک کو ملکِ مستعار سمجھتے ہیں اس لیے ان کے مال میں میراث نہیں) علاوہ بریں مالک حقیقی وہ خداوند مالک الملک ہے اور وہی ملک اس کی ملک کے سامنے حکم قبضہ عاریت رکھتی ہے۔ ہاں جیسے اطفال خورد سال کو یہ تمیز نہیں ہوتی کہ مال مستعار اور مملوک میں کیا فرق ہے اور اگر ان کو کوئی شخص برائے چندے کوئی کپڑا پہننے یا کوئی چیز برائے چندے لادے تو یہ نہیں سمجھتے کہ یہ کس نے دی ہے اور وہ کون ہے ایسے ہی سوا انبیاء علیہم السلام اور کسی کو یہ تمیز پوری پوری نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی ہے تو انبیاء علیہم السلام کے بتلانے ہی سے ہوتی ہے خود ان کی عقل اس کے ادراک کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ ہاں انبیاء کرام علیہم السلام کے واسطے۔ اس قبضہ اقتدارِ خداوندی سے واقف ہوتے ہیں جو علتِ ملک ہوتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے اس قبضہ اقتدار خداوندی کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ کَاَنْ لَّمْ یَکُنْ (گویا کہ نہیں) سمجھتے ہیں اور اس لیے قابلِ میراث نہیں سمجھتے۔ کیونکہ مال مستعار میں میراث جاری نہیں ہو سکتی

اور ظاہر ہے کہ ملکِ عباد بہ نسبت ملک خداوند مالک الملک بمنزلہ اختصاص استعارہ ہے ہاں امتیوں کو اپنا ہی قبضہ نظر آتا ہے۔ اس لیے بوجہ چشم پوشی اسباب میں واگذاشت مناسب سمجھی تاکہ مثل اطفال بے تمیز جو وقت استرداد عاریت غل مچایا کرتے ہیں شور برپا نہ کریں۔

(حضرت فاطمۃ الزہراءؓ پر خوارج کی طرف سے اعتراض) بالجملہ مال انبیاء کرام علیہم السلام کسی طرح قابلِ میراث نہیں ان اوراق کے دیکھنے والوں کو بشرط فہم اس بات میں تو انشاء اللہ شبہ باقی نہ رہے گا۔ کہ مقدمات ثلاثہ جن پر بناء دعوئ میراث ہے۔ تینوں کے تینوں غلط۔ اور ان کے نقائص اور ضد صحیح۔

پر شاید خلجان باقی رہے تو یہ رہے کہ اگر یہ ہی تھا تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا خلیفہ اول سے طالب میراث کیوں ہوئیں اور ہونا ہی تھا تو اس تازہ صدمہ میں کہ عالم میں کوئی صدمہ کسی پر ایسا نہ ہوا ہوگا۔ ایسی متاع قلیل کا سوال کیوں کیا اور کیا ہی تھا تو بعد استماع ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَا صَدَقَۃٌ سر تسلیم خم کرنا تھا نہ یہ کہ بر سر پرخاش خلیفہ اول ہو کر اُٹھے ترک کلام وسلام کر دیا۔

الغرض ردّ روافض کی طرح مدافعت خوارج بھی ضرور ہے تاکہ کوئی یوں نہ کہے۔ اس طرح سے مطالبہ بے جا اس ترکہ دنیا پر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے نہایت ہی مستبعد ہے اس لیے کچھ اور قلم گھسانے کی ضرورت ہے۔ سنئے۔

اس شبہ کو تحلیل کیجئے تو تین اعتراض نکلتے ہیں۔ ایک تو مطالبہ بے جا۔ دوسرے ایسے وقت میں یہ شورِ ناسزا۔ تیسرے عدم تسلیم ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم۔ سو بروئے انصاف بعد استماع تقریرات گذشتہ دونوں کی جواب دہی اگر ہے تو فریقین کے ذمہ ہے اور اگر کسی کو بوجہ کم فہمی امید جواب رسالہ ہذا ہو تو شبہ ثانی بالیقین دونوں طرف وارد ہے مگر ہماری نیازمندی دیکھئے کہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا پر کسی کی حرف گیری گوارا نہیں۔ ورنہ ہماری طرف سے بطور الزام شیعہ۔ جواب میں ہی یہ بات بے جا نہ تھی۔ درصورتیکہ خلیفہ اوّل رضی اللہ عنہ بحوالے ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ایک بات بیان کرتے ہوں اور پھر بات بھی ایسی ہو جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت یعنی علیت اور منشائیت انتزاع اور مصدریت ثابت ہوتی ہو۔ ادھر دوام حیات روحانی وجسمانی پر وہ بات شاہد ہو اور حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا مطالبہ میراث مستلزم عدم افضلیت اور عدم دوام حیات جسمانی ہو تو اس صورت میں اگر اعتراض ہے تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا پر ہے حضرت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ پر کیا اعتراض۔

(خوارج کے اعتراضات کے جوابات) بہرحال یہ غلام خاندان نبوت سگ کوچہ اہل بیت رضی اللہ عنہم بتقاضائے اعتقاد درونی دوبارہ مدافعت اعتراض مشارٌ الیہ یہ عرض پرداز ہے کہ دوام حیات جسمانی کا حاصل بجز طول حیات دنیا اور کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں کوئی فضیلت نہیں۔ ورنہ ایک جہان کا جہان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہو جاتا۔ مگر ہاں شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ طول حیات یا دوام حیات جسمانی لاریب موجب افضلیت ہے۔ مگر کچھ ضرور نہیں کہ وہ طول حیات یا دوام حیات بالائے روئے زمین ہو۔ داخل قبر بھی اگر حیات جسمانی ہو تو اوروں کو بوجہ طول حیات آپ سے افضل نہ کہہ سکتے مگر اس میں کیا تاویل کریں گے کہ اولیاء کے لیے حیاتِ جسمانی اگر میسر ہے تو فقط عالم شہادت ہی میں میسر ہے۔ قبر میں ان کو حیات جسمانی میسر نہیں۔ اور شیطان کو بالیقین طول حیات جسمانی (میسر ہے) علیٰ ہذا القیاس بہت سے کفار فجار کو (دنیا میں) ان سے زیادہ عطا ہوئی۔

الغرض اگر عقل ہو تو نفس حیات جسمانی یا طول حیات جسمانی فضائل وکمالات محمودہ میں سے نہیں بایں ہمہ یہ بات کچھ ایسی بدیہی نہیں کہ کوئی کہے یا نہ کہے خود بخود اس کی خبر ہو جائے۔ جب بدیہیات میں بسا اوقات عقل کو تنبیہ کی ضرورت ہو اور بعض کم عقل بے تنبیہ مطلع ہو جائیں اور اس وجہ سے عاقل جاہل اور کم عقل عاقل نہ سمجھے جائیں۔ چنانچہ سوئی بسا اوقات عاقلان تیز نظر کو بے تنبیہ نظر نہیں آتی اور کم عقل کی نظر بے اشارہ غیر اس پہ پڑ جاتی ہے تو اسی طرح قبل تنبیہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو اس کی اطلاع نہ ہوئی ہو اور بعد استماع اشارہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اعنی لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَا صَدَقَۃٌ آپ کی حیات جسمانی کی حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو خبر ہوئی ہو۔

(فائدہ) اور اس تنبیہ کے بعد آپ کو یا کسی اور کو اشارات "اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ" سے بعد ضم مقدمات معروضہ اس کی اطلاع ہو گئی ہو تو کیا بعید ہے۔ بلکہ اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو اس ارشاد کی خبر نہ ہوتی اور ہم جیسے کم عقل وکم فہم باشارہ تنبیہ مشارٌ الیہ یوں سمجھ کر کہ کلام اللہ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ ہے اس میں ضرور اس کی طرف اشارہ ہو گا۔ آیت اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ الخ سے آپ کی حیات روحانی سے مطلع ہو جاتے اور پھر بایں لحاظ کہ تعلق روح نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وجسم اطہر محض تعلق فاعلی ہے کوئی شائبہ انفعال نہیں چنانچہ معروض ہو چکا۔ آپ کی حیات جسمانی کی بقا کے قائل ہو جاتے تو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کی شان میں کچھ نقصان نہ آجاتا۔ اور ہماری شان کچھ اتنی سی بات سے عالی نہ ہو جاتی۔ کیونکہ یہ علم کچھ اس سے زیادہ نہیں کہ نور کا تعلق جسم آفتاب کے ساتھ کس قسم کا ہے۔ اور جسم قمر وآئینہ کے ساتھ کس قسم کا۔ اور ظاہر ہے کہ (ایسا) علم خداوند معبود کے یہاں موجب قرب درجات نہیں جو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے لیے اسکا ہونا ضرور ہو۔

(اعتراض ۔ حدیث لَا نُوْرَثُ سننے کے بعد حضرت سیدۃ کے غم وغصہ کے کیا معنی؟) یہ بات قبل اطلاع ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تو مطالبہ میراث اس طور پہ کچھ بے جا نہ ہوگا پہ بعد استماع ارشاد فیض بنیاد لَا نُوْرَثُ مَا تَرَکْنَا صَدَقَۃٌ۔ غم وغصہ کس لیے تھا بجائے تسلیم یہ کیا بر عکسی ہے۔

(جواب ۔ بخاری کی اس روایت کا راوی گو سچا ہے لیکن اصل معاملے کو سمجھنے میں اس سے غلطی ہو گئی عدم کلام کو ناراضگی پہ حمل کر لیا) سو اس کا جواب یہ ہے کہ روایت کی صحت کا مقتضا، فقط اتنا ہے کہ راوی قابل اعتماد ہو یہ نہیں کہ علم حقائق وقائع اور انتزاع اصولی واسباب، واقعات میں بھی اس سے غلطی نہ ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے قصہ سفر کو دیکھیے۔ حضرت خضر علیہ السلام کا کشتی کو توڑنا اور لڑکے کو مار ڈالنا بے جا نہ تھا چنانچہ کلام ربانی خود شاہد ہے تس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کہنے لگے

اَخَرَقْتَهَا لِتُغْرِقَ اَهْلَهَا لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا اِمْرًا۔ (پ ۱۵، کہف ع ۱۹) (کیا تو نے اس کو پھاڑ ڈالا کہ ڈبا دے اس کے لوگوں کو البتہ تو نے کی ایک چیز بھاری۔)

اور اَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيْرِ نَفْسٍ (کیا تو نے مار ڈالی ایک جان ستھری بغیر عوض کسی جان

لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا (پ ۱۵ کہف ع ۱۰) کے بے شک تو نے کی ایک چیز نامعقول)

فرمایا۔ حالانکہ خدا تعالیٰ سے کمال علم خضری کی تعریف سن کر بغرض طلب مزید علم مشتاق ملاقات ہو کر گئے تھے

سو جب خدا تعالیٰ تو حضرت خضر کی شان میں۔

اٰتَیْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا (پ ۱۵ کہف ع ۹) (دی تھی ہم نے رحمت اپنے پاس سے اور سکھلایا تھا اپنے پاس سے علم)

فرمائے اور پھر حضرت خضر علیہ السلام کی طرف سے باوجود اصرار موسیٰ۔ اس وجہ سے انکار ہو کر تم سے صبر نہ ہو سکے گا اور پھر آخر کار بعد اصرار بسیار (نہ) بولنے کا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عہد کرا کر ساتھ لیا ہو۔ تسپر حضرت موسیٰ علیہ السلام مخالف واقعہ۔ حضرت خضر علیہ السلام کے افعال شائستہ کو ناشائستگی پر حمل کر بیٹھے ہوں اور ظلم و ستم کو نظر بظاہر ان کے افعال سے انتزاع کر لیا ہو ویسے ہی اگر راوی واقعہ طلب میراث فدک بعد مطالبہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا اور ان کا خلیفہ اول سے اس ترک آمد و شد کو جو بعد ربط و ضبط قدیمی بوجہ صدمہ جانگزا واقعہ جانکاہ رحلت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم پیش آیا تھا۔ غم و غصہ پر محمول کر لیا ہو اور اس معاملہ میں پھر کلام نہ کرنے کو بعد اس مطالبہ اور انتزاع کے اگر بوجہ رنج ترک کلام پر محمول کر لیا ہو تو نہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کا کچھ قصور نکلے گا اور نہ روایت کی صحت میں بطور قواعد محدثین کچھ نقصان آئے گا اور اگر بفرض محال حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کے ذمہ کوئی دشمن دین بے اعتباری خلیفہ اول کی تہمت لگا کر اس رنج و غم کو صحیح بنادے تو پھر کیا حضرت آدم علیہ السلام باوجود ارشاد خداوندی

لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ (پ ۸ اعراف ع ۲) (پاس مت جانا اس درخت کے پھر تم ہو جاؤ گے ظالم)

اور اطلاع دہی خداوندی یعنی۔

یٰاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ (پ ۱۶ طٰہٰ ع ۷) (اے آدم یہ دشمن تیرا ہے اور تیرے جوڑے کا)

موافق بیان قرآنی قَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَیْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِیْنَ وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّیْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ (پ ۸ اعراف ع ۲) (دبولا کہ تم کو نہیں روکا تمہارے رب نے اس درخت سے مگر اسی لیے کہ کبھی تم ہو جاؤ فرشتے یا ہو جاؤ ہمیشہ رہنے والے اور ان کے آگے قسم کھائی کہ میں البتہ تمہارا دوست ہوں پھر مائل کر لیا ان کو فریب سے)

شیطان کی قسموں میں آ گئے سو جیسے بحسب ظاہر حضرت آدم علیہ السلام نے خدا کا اعتبار نہ کیا یعنی لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ اور اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ کا کچھ خیال نہ کیا ایسے ہی اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے حضرت ابوبکر رضی کا اعتبار نہ کیا ہو تو کیا زیادہ ہوا۔ اگر یوں کہو ارشاد لَا تَقْرَبَا اور ارشاد اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ کو بہت عرصہ ہو چکا تھا۔ اس لیے یاد نہ رہا ہو۔ ایسے ہی فضائل خلیفہ اوّل کو بھی سنے ہوئے بہت دن ہو گئے ہوں گے اس لیے حضرت زہرا رضی اللہ عنہا بھول گئی ہوں۔

اور یہ سہی حضرت ہارون کی نبوت حضرت موسیٰ علیہما السلام کی دعا سے ہوئی جس قدر ان کو اس کا علم تھا ہمیں تمہیں نہیں ہو سکتا۔ علیٰ ہٰذا القیاس ان کے لوازم نبوت یعنی معصومیت ہارونی کو جتنا وہ جانتے تھے ہم نہیں جان سکتے۔ بایں قصہ سامری کو سن کر جو غم و غصہ چڑھا تو حضرت ہارون علیہ السلام کی طرف سے بھی بدگمان ہو گئے اور نبوت اور معصومیت کا کچھ خیال نہ رہا۔ سر و ریش کے بال پکڑ کر کھینچنے کی نوبت تک آئی۔ ایسے ہی اگر غم رحلت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو فضائل خلیفہ اوّل پر کچھ نظر نہ رہی ہو اور متارکت و مہاجرت تک نوبت پہنچی ہو تو کیا زیادہ ہے۔

مگر اصل بات وہی ہے کہ انتزاع رائے میں بوجہ مذکور غلطی ہوئی ورنہ حضرت زہرا رضی اللہ عنہا سے بجز تسلیم ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَاهُ صَدَقَةٌ اور کچھ ظہور میں نہیں آیا۔ بہر حال مطالبہ میراث بوجہ عدم علم دوام حیات جسمانی رسول ربانی صلی اللہ علیہ وسلم تھا اس صورت میں اگر خطاب يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ کو حضرت زہرا رضی اللہ عنہا عام سمجھ گئی ہوں تو کیا حرج ہے۔ کیونکہ وجہ خصوص خطاب يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ بھی یہی حیات جسمانی تھی۔

(فدک وغیرہ اموال فے کو حضرت سیدہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قبض تام اور اختیار عام کے پیش نظر ملک نبوی سمجھ لیا ہو تو کیا بعید ہے)

رہا مقدمہ ثالثہ یعنی فدک کا غیر مملوک ہونا وہ بھی اگر آپ کو نہ معلوم ہو تو کیا خرابی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خرق سفینہ اور قتل طفل کو جو حضرت خضر کو کرتے دیکھا تو فقط اسی وجہ سے ظلم پر محمول کیا کہ خرق و قتل اصل میں ظلم و فساد ہی کی اقسام میں سے ہے۔ ہاں جیسے شگاف جراح کو بوجہ درد و دنبل محمود کہا ہے۔ ایسے ہی قتل و خرق بھی کہیں کہیں محمود ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے بذریعہ قبض و تصرف نبوی صلی اللہ علیہ وسلم جو بہ نسبت فدک مشہور و معروف عام و خاص تھا۔ اگر مملوک نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ لیا تو کیا زیادہ کیا آخر تصرف

وقبض تمام نبوی صلی اللہ علیہ وسلم وہ بھی اس قدر کہ جس کو جتنا چاہیں دیں اور جس کو نہ چاہیں نہ دیں۔ چنانچہ وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ بھی اس پر شاہد ہے ملک ہی کے لیے موضوع ہوا ہے۔ تولیت اس کی نسبت اسی طرح ایک امر شاذ و نادر ہے۔ جیسا خیر خواہی مساکین یعنی مالکان سفینہ بہ نسبت خرق سفینہ اور خیر خواہی والدین بہ نسبت قتل اولاد۔ غرض جیسے خرق سفینہ بغرضِ خیر خواہی مالکِ سفینہ اور قتل فرزند بغرض خیر خواہی والدین قلیل الوقوع اور دور از فہم ہے ایسے ہی امانتداری اور پھر تصرف عام قلیل الوقوع اور دور از فہم ہے۔ اور ظاہر ہے کہ تولیت میں قبضہ امانت و نیابت ہی ہوتا ہے۔

(جیسے خضر علیہ السلام کے اعمال میں موسیٰ علیہ السلام کو دھوکہ ہوا ایسے ہی حضرت سیدہؓ کو اموال فے میں ملک خاص کا دھوکہ ہو گیا تو کیا تعجب ہے)

سو جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو وہاں بوجہ قلت وقوع و بُعدِ فہم دھوکہ ہوا یہاں حضرت زہرا رضی اللہ عنہا کو اسی وجہ سے دھوکہ ہو گیا تو کیا اعتراض کی بات ہے۔ جو کوئی خارجی اول یہ اعتراض کرے اب سنئے اعتراضات خوارج کی مدافعت کے لیے یہ تقریر انشاء اللہ بوجہ احسن کافی ہے۔

(جواب اعتراض ۳۔ اگر حضرت سیدہؓ پر متاع قلیل کی طلب کا شبہ ہو تو اس کا جواب یہ ہے کہ رزق حلال کی طلب تارکان دنیا ہی سے متصور ہے)

ہاں اور استبعاد طلب متاع قلیل ایسے زمانہ صدمات میں ایسے تارکان دنیا سے باقی رہا۔ سو اس کے لیے اول تو یہ گذارش ہے کہ رزق حلال منجملہ ضروریات دینی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ طلبِ رزق حلال اور اس کا اہتمام و انتظام اگرچہ مقتضی اطلاق دینداری ہے۔ مگر متصور ہے تو دین داروں میں سے تارکانِ دنیا ہی سے متصور ہے کیونکہ جس کے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی وہی اس کی طلب کیا کرتا ہے سو ایسے دیندار جن کے پاس رزق حلال بھی نہ ہو بجز تارکان دنیا اور کون ہوں گے۔ ادھر متروکہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ احتمال ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی وجہ مکروہ یا حرام سے آپ کے پاس آیا ہو۔

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا متروکہ حضرت سیدہؓ کے لیے نشانی اور تسکین خاطر کا باعث تھا۔)

رہا انتقال ملک بوجہ میراث اس میں بھی فساد و بطلان کی گنجائش نہیں جو کراہت یا حرمت کا احتمال ہو تس پر متروکہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی نشانی اور آپ کا تبرک جس کی ضرورت اہل صدمہ

کو زیادہ ہوتی ہے سو ایسے نازک وقت میں اگر حضرت زہرا رضی اللہ عنہا نے مطالبہ میراث کیا تو عین مقتضائے ترک دنیا اور اقتضائے جوشش رنج والم تھا۔ یعنی آپ نے یہ سمجھا کہ تا حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم تو ہم کو رزق حلال کا کچھ فکر نہ تھا اب اس کی بھی ضرورت ہوئی اور آپ کی نشانی اور تبرکات سے دل کے بہلانے کی بھی حاجت ہوئی سو ایسی چیز جس میں دونوں باتیں ہوں ارضی ترکہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نظر آئیں اس خیال سے بخیال زوال حیات جسمانی وظن مالکیت نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم فدک کو طلب فرمایا کہ بے فکری ہو کہ عمر چند روزہ کو اسی طرح بسر کیجیے کہ غم فراق نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سے کسی سے کچھ علاقہ ہی نہ رہے۔ یا دخدا ہو یا یاد رسول صلی اللہ علیہ وسلّم۔ بہر حال یہ بات قابل مدح ہے نہ لائق اعتراض۔ شاہد رنج والم ہے نہ گواہِ سنگدلی۔ ترک دنیا کی طرف مصرح ہے حُبّ دنیا کی طرف مشیر نہیں۔ تاکیدات رزق حلال کی مثال پر دال۔ اور تحریمات رزق حرام کی تسلیم پر شاہد۔ محبت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانی اور ترک دنیا کی دلیل ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ خاتم النّبیّین والہٖ وازواجہ وذریّتہٖ واھل بیتہ اجمعین

ان (مندرجہ ذیل) پانچ جوابوں کے سوال گم ہوگئے پھر بھی یہ جوابات خالی نفع سے نہیں۔ اس لیے ان کو بھی نذر ناظرین کرنا مناسب سمجھا اور سوالات کا اندازہ[1] بھی ان جوابات سے سمجھ میں آتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد للّٰہ رب العالمین الرحمٰن الرحیم مالک یوم الدین والصلوٰۃ والسلام

علی سید الانبیاء والمرسلین وآلہ وصحبہ اجمعین۔ اما بعد

ہر چند تحریر سوالات سے سائل کی لیاقت اور حسن فہم ایسا آشکارا ہے جیسے کالے توے میں سے چاندنا۔ مگر بایں نظر کہ اگر ایسے سوالات کا جواب نہیں دیا جاتا اور یوں سمجھ کر کہ "جواب جاہلاں باشد خموشی" اگر ایسی خرافات کے جواب میں سکوت کیا جاتا ہے تو جاہلوں کو اور بھی جرأت ہو جاتی ہے اور باطل کو اور بھی حق سمجھنے لگتے ہیں اس لیے مختصر جواب سوالات مرقوم ہیں وباللّٰہ التوفیق۔

سوال (اوّل)

(اہل سنت وجماعت جو مرثیہ خوانی کو راگ گانے کو پر کہتے ہیں حالانکہ ہم یہ سوز میں سنتے ہیں خلیفہ اوّل نے تو رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم پر دف سننے کا اعتراض کیا تھا اس لیے اہل سنت کا عزاداری شیعہ پر طعن کرنا حجت نہیں، ملخصاً)

(جواب سوال اوّل) اہل سنت وجماعت جو مرثیہ خوانی کو منع کرتے ہیں تو نہ (صرف) بایں وجہ منع کرتے ہیں کہ یہ اقسام راگ سے ہے اور راگ ممنوع ہے اگر یہ وجہ ہوتی تو سائل کا یہ کہنا بجا تھا کہ ہم مرثیہ سوز میں سنتے ہیں اور جس کو گٹکری کہتے ہیں وہ نہیں سنتے۔ بلکہ وجہ ممانعت یہ ہے کہ مرثیہ خوانی، اور مرثیہ خوانی پر ہی کیا تقرر ہے۔ تعزیہ داری علم برداری سینہ زنی وغیرہ بدعات شنیعہ شیعہ سب ایجاد بندگان ہوا وہوس

---

[1] مصحح عرض کرتا ہے کہ ان پانچ گمشدہ سوالوں کی تقریر کو ہم نے جوابات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے فہم کے مطابق مرتب کرکے ہر جواب کے شروع میں لکھ دیا ہے۔ ۱۲ مہر محمد۔

ہیں نہ خدائے تعالیٰ نے اس قسم کی باتوں کے لیے ارشاد فرمایا نہ جناب سرور کائنات علیہ وآلہٖ افضل الصلوٰت والتسلیمات نے یہ راہ بتایا ہاں کلام اللہ ہی میں تو یہ ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (پ۲ بقرہ ع ۲۹) اور نیز یہ بھی ارشاد ہے۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (پ۸ اعراف ع ۱)

جس کے یہ معنی ہیں۔ کہ جو لوگ حدود خداوندی سے آگے بڑھ جاویں وہی لوگ ہیں ظالم۔ جس کے یہ معنی ہیں اے لوگوں تابعداری کرو اس چیز کی جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اور نہ پیروی کرو سوا اللہ کے اوروں کی۔

ادھر حدیث شریف میں تو یہ ارشاد ہے۔

مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (بخاری ص ۳۷۱ ج ۱ مسلم ص ۷۷ ج ۲)

جس کے یہ معنی ہیں کہ جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکالی وہ مردود ہے۔

اور سب اہل اسلام یہاں تک کہ شیعہ بھی اس بات کے معترف ہیں کہ مرثیہ خوانی تعزیہ داری علم برداری سینہ زنی سیاہ پوشی وغیرہ بدعات معمولہ شیعہ کا پتہ نہ کلام اللہ میں ہے نہ حدیث میں نہ خدائے تعالیٰ نے ان کاموں کے لیے فرمایا نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ راہ بتایا۔ پھر اس طرح ان کاموں کا معتقد ہونا اور ان واہیات پر ثواب عظیم کا امیدوار رہنا حدود اللہ سے آگے نکل جانا ہے کہ نہیں؟ اور دین میں نئی بات کا نکالنا ہے یا نہیں؟

بالجملہ شیعہ موافق ارشاد آیت وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ کے ظالم ہیں اور موافق ایماء نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی یہ ساری باتیں مردود ہیں اور اس لیے اہل سنت وجماعت ان پر معترض ہیں۔ نہ بوجہ راگ ہونے کے فقط مرثیہ کو منع کرتے ہیں۔ اب لازم یوں ہے کہ شیعہ انصاف فرمائیں اور راہ پر آئیں۔ ورنہ تو وہ جانیں خدا سے معاملہ پڑنا ہے نیک بد کا حساب اس کے ہاتھ ہے اور در بارہ وجہ ممانعت تسکین خاطر نہ ہو اور خدا کے ارشاد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس بیان سے دل کی گلجھڑی نہ کھلے تو ایک مثال عرض کرتا ہوں اس کو غور کریں گے تو میری یہ عرض مان ہی لیں گے۔ انشاء اللہ۔

(بدعات کی تمثیل) جیسے ہمارے تمہارے وجود میں آنکھ، ناک، ہاتھ، پاؤں چند اجزاء ہیں اور ہر ایک کی ایک مقدار ہے آنکھیں دو، ناک ایک، انگلیاں پانچ، علیٰ ہذا القیاس دین میں بھی بہت سے رکن ہیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور پھر ہر ایک کی ایک مقدار اور تعداد ہے نمازیں رات دن میں پانچ ہیں تو

روزے برس دن (پورے سال) میں تیس ہیں۔

علیٰ ہٰذا القیاس زکوٰۃ ہر سال ہے تو حج عمر بھر میں ایک بار مگر جیسے آنکھ، ناک اپنی مقدار معین اور تعداد معلوم سے کم ہوں جب بڑی بڑی معلوم ہوتی ہیں (زیادہ ہوں تب بھی بڑی بڑی معلوم ہوتی ہیں) جیسے ایک ناک کی جا دو ناکیں اور دو آنکھوں کی جگہ تین یا چار آنکھیں ویسے ہی بڑی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے فرض کیجئے کسی کی اصل سے ناک، آنکھ نہ ہوں یا ہوں تو ناک آدھی اور آنکھ ایک ہو۔ بالجملہ جیسے ہمارے وجود میں کمی بیشی اپنے اندازہ سے بڑی معلوم ہوتی ہے۔ ایسے ہی دین میں بھی کمی بیشی اندازہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بری اور ناموزوں ہوگی۔ اس مثال کے سن لینے کے بعد اہل انصاف تو انشاء اللہ انصاف ہی فرمائیں گے اور راہ پر آئیں گے اور جن کو خدائے تعالیٰ نے چشم انصاف ہی عنایت نہیں کی۔ وہ ہماری تو کیا خدا اور رسول کی بھی نہیں مانتے۔

(حضرت ابوبکرؓ پر طعن کا جواب) باقی جو کچھ سائل نے حضرت خلیفہ اوّلؓ پر طعن فرمایا ہے اس کا جواب بطور تحقیق تو اتنا ہی بہت ہے کہ ابوبکر صدیقؓ اہل سنت کے نزدیک نبی نہیں امام (معصوم) نہیں جو سارے احکام ان کو معلوم ہوں مزامیر کی برائی سنی سنائی ہوئی تھی۔ پر تفصیل یہ معلوم نہ تھی کہ دف تو عید کے دن جائز ہے اور باقی مزامیر حرام۔ سو اپنے اُسی خیال کے موافق منع فرمایا۔

باقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیدار ہونا ان کو بالیقین معلوم ہوتا تو پھر اس اعتراض کی گنجائش تھی کہ ابوبکر صدیقؓ اس کو مزمار شیطانی سمجھتے تھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مزمار شیطانی کا سننے والا سمجھا اور معصوم نہ سمجھا۔

علاوہ بریں اعتراض اسے کہتے ہیں کہ جس پر اعتراض کیا جائے اس کی ان باتوں کو توڑے جو ان کے نزدیک مسلّم ہوں اور اگر اس کے نزدیک ایک بات مسلّم ہی نہیں تو اس کا توڑنا اس کو کیا مضر ہے؟ مثلاً اہلِ اسلام پر اعتراض اسے کہتے ہیں کہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا نعوذ باللہ نبی نہ ہونا کاہن، ساحر، دنیا پرست ہونا ثابت کرے۔ اور ابوجہل کا کفر یا اس کی دنیا پرستی اور برائی کا ثبوت اہل اسلام کو کیا مضر ہے۔ سو اہلِ سنت و جماعت کے نزدیک مباحات جیسے امتیوں کو مباح ہوتی ہیں انبیاءؑ کو بھی مباح ہوتی ہیں ہاں اتنا فرق ہے کہ بہت سی مباحات امتیوں کے حق میں کسی قدر مکروہ ہوں تحریمی نہ سہی تنزیہی سہی۔ پر انبیاء کے حق میں وہی مباحات بایں وجہ کہ ان کے فعل سے حکم اباحت

معلوم ہو جاتا ہے موجب ثواب ہو جاتی ہیں۔

ظاہر کی باتوں ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے غذائے قوی ضعیف المعدہ کے حق میں موجب نقصان ہو اور قوی معدہ کے حق میں باعث قوت۔ لیکن ظاہر ہے کہ امور مکروہ میں اشتراک (وسوسہ) شیطانی ضرور ہوتا ہے بہت نہیں تھوڑا ہی سہی، باعث عذاب نہ ہو۔ سبب کراہیت ہی سہی۔ سو اگر فرض کیجیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے ہی تھے اور ابوبکر صدیق رض کو آپ کی بیداری کی اطلاع بھی تھی اور ادھر یہ امر مباح بوجہ کراہیت خالی از شر شیطانی نہ ہو تب بحیثیت بریں نیست کہ بوجہ مذکور انہوں نے اس کو مزمار شیطانی کہا ہو گا۔ مگر اس سے یہ کہاں سے لازم آیا کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی یہ اس کا سننا بوجہ اغوائے شیطانی ہو۔ ایک فعل ایک کے حق میں موجب ثواب اور دوسرے کے حق میں موجب عذاب ہوتا ہے۔ چونکہ سنی سنائی کا کھٹکا ہے تو میں بھی اس وضع کی مثال پیش کرتا ہوں۔ کلام اللہ کا سننا بعضوں کے لیے باعث ہدایت اور موجب ثواب اور بعض کے لیے موجب ضلالت اور باعث عذاب ہے میں نہیں کہتا کلام اللہ ہی میں ارشاد ہے۔

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا۔ (پ بقرہ ع ۳)

(گمراہ کرتا ہے خدا تعالیٰ اس مثال سے بہتیروں کو اور ہدایت کرتا ہے اس سے بہتیروں کو۔)

اب دیکھیے ثواب عذاب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک فعل میں جب دونوں مجتمع ہوں تو اباحت اور کراہیت تو نیچے ہی کے درجہ میں ہیں۔ یہ دونوں اگر بہ نسبت دو شخصوں کے ایک فعل میں مجتمع ہو جائیں تو استبعاد کیوں ہے۔ یا حضرت خلیفہ اول رض ہی سے ضد ہے کہ وہ سیدھی کہیں تب بھی الٹی سمجھیں یہاں تک تو بطور تحقیق جواب تھا۔

(صدیق اکبر رض پر حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے واقعہ سے اعتراض کا الزامی جواب)

اب بطور الزام سنیے۔ ہماری نہیں مانتے تو خدا کی تو مانیئے۔ خداوند علیم نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنے کلام پاک میں نبی فرمایا ہے۔ کبھی بھولے چوکے کلام اللہ کو دیکھا ہو گا تو شیعوں نے سورت مریم میں یہ آیت بھی دیکھی ہو گی۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا۔ (پ ۱۶ مریم ع ۴)

جس کے یہ معنی ہیں کہ دیا ہم نے موسیٰ کو اپنی رحمت سے ان کا بھائی ہارون نبی۔

اور انہی برادر بزرگوار کے حضرت موسیٰ علیہ السلام لے لبشہادت کلام اللہ سر کے بال پکڑ کر کھینچے۔ چنانچہ کلام اللہ پڑھا ہوگا تو سورۃ اعراف میں یہ بھی دیکھا ہوگا۔

وَاَخَذَ بِرَأْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ (اور پکڑا سر اپنے بھائی کا لگا کھینچنے اسکو اپنی طرف)

جس کا حاصل بعینہ یہی ہے جو معروض ہوا اور سورۃ طٰہٰ میں ہے۔

وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ هٰرُوْنَ اَخِي اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ۔ (پ ۱۶ طٰہٰ ع ۲) (اور دے مجھ کو ایک کام بٹانیوالا میرے گھر کا ہارون میرا بھائی اس سے مضبوط کر میری کمر اور شریک کر اس کو میرے کام میں۔)

اور سورت قصص میں جملہ فَاَرْسِلْ اِلٰى هٰرُوْنَ بھی دیکھا ہوگا جس کو اپنے ماقبل اور مابعد کے ساتھ ملانے سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کے لیے نبوت کی استدعا اسی وقت کی ہے جس وقت ان کو خلعت نبوت عنایت ہوئی۔

غرض فرعون کی طرف جانے سے پہلے حضرت ہارون علیہ السلام کی نبوت کے خواستگار ہوئے اور پھر قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (پ ۱۶ طٰہٰ ع ۲) (ملا تجھ کو تیرا سوال اے موسیٰ) سورۃ طٰہٰ میں اور كَلَّا فَاذْهَبَا بِاٰيٰتِنَآ اِنَّا مَعَكُمْ مُّسْتَمِعُوْنَ (کبھی نہیں تم دونوں جاؤ لے کر ہماری نشانیاں ہم ساتھ تمہارے سنتے ہیں) سورۃ شعراء (ع ۲ پ ۱۹) میں موجود ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ دعا اور استدعا فرعون کی طرف جانے سے پہلے ہی مقبول ہوئی۔ یہ سارے حوالے اس لیے دیے ہیں کہ کوئی حجتی لاامتی (یعنی رافضی جو امت نبی کہلانے پر فخر نہیں کرتا بلکہ شیعہ علی اور ملت جعفریہ کہلاتا ہے) بے وجہ تکرار نہ کرے اگرچہ شیعہ اپنی ہٹ دھرمی سے اب بھی شاید باز نہ آئیں کلام اللہ ہی کو بیاض عثمانی کہنے لگیں کلام ربانی نہ کہیں چنانچہ کہتے ہیں۔ اور اسی لیے علماء اہل سنت نے اور نیز اس ہیچمدان نے ہدیۃ الشیعہ میں اس کے جواب دندان شکن لکھے ہیں۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اگر شیعہ اصل سے کلام اللہ ہی کو نہ مانیں تو ہمارا اور بھی حساب اور ان کا لیکھا ہے ادھر نہیں۔ تو ادھر ہی سے اُن کو بچھاڑیں گے۔ آخر شیعہ اسی حدیث ثقلین کے تو بھی قائل ہیں۔ اس حدیث کا ماحصل یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں ایک کتاب اللہ دوسری اپنی عترت جب تک تم ان دونوں کو پکڑے رہوگے جب تک گمراہ نہ ہوگے۔ اور ظاہر ہے

کہ کلام اللہ کسی کے پاس ہو اور نہ پکڑے یعنی اس پر عمل نہ کرے یا پاس ہی نہ ہو کوئی چھین لے جائے یا جلادے جیسا حضرات شیعہ بہ نسبت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ گمان رکھتے ہیں۔ کلام اللہ پر عمل کرنا دونوں صورتوں میں میسّر نہیں اتنا فرق ہے کہ پہلی صورت میں مثل کفار زمانہ حضرت سید ابرار احمد مختار صلی اللہ علیہ وسلم ہوا کے دوسری صورت میں مثل کفار زمانہ جاہلیت،

(حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے نزاع کی حقیقت) بالجملہ کلام اللہ کے عالموں، حافظوں پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ حضرت ہارون علیہ السلام فرعون کے پاس جانے سے پہلے ہی نبی ہو چکے تھے۔ اور علیٰ ہذا القیاس حضرت موسیٰ علیہ السلام کا توارت کے لیے کوہ طور پر جانا اور حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنا جانا اور پھر سامری کا بنی اسرائیل کو گمراہ کر دینا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا غصہ میں لوٹ کر حضرت ہارون کے سر کے بال پکڑ کر کھینچ کر یہ کہنا۔ اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ جس کے یہ معنی ہیں تو نے میرے حکم کی نافرمانی کی۔ یہ سب باتیں فرعون کے غرق ہونے کے بعد کی ہیں، چنانچہ سورۃ اعراف سورہ طٰہٰ سورۃ شعراء کے سیاق و سباق اور نیز باتفاق شیعہ و سُنّی ثابت ہے۔ اب حضرات شیعہ کی خدمت میں اس غلام خاندان اہل بیت کی یہ گذارش ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اگر حضرت ہارون علیہ السلام کو وہی حکم کیا تھا جو حکم خدا ہے اور انہوں نے اس کی نافرمانی کی۔ جس کی نسبت یہ فرمایا اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ تب تو حضرت ہارون علیہ السلام کی عصمت کیونکر تھامے گا اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہی نے کوئی امر خلاف شرع ارشاد فرمایا تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معصومیت کو نعوذ باللہ داغ لگے گا۔ اور اگر وہ حکم نہ موافق شرع تھا نہ مخالف شرع یونہی مباحات دنیوی میں سے تھا تو حضرت ہارون علیہ السلام کا قصور ہی کیا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی ہتک عزت کی نہ ان کی نبوت کا لحاظ کیا نہ بزرگی اور بڑائی کا لحاظ کیا قطع نظر نبوت کے حضرت ہارون بڑے بھائی بھی تو تھے تو بڑا بھائی بجائے باپ ہوتا ہے۔ بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ حرکت (بظاہر نبوت سے قطع نظر) از قسم معصیت تھی جس سے عصمت کو داغ تو کیا لگے بالکل سیاہی بن جائے۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی عصمت باوجود اس دست و گریبان ہونے کے بھی (باتفاق سنی شیعہ) نہیں جاتی اور ہارون علیہ السلام کو عاصی سمجھنے سے چنانچہ آیت اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ شاہد ہے ان کی عصمت کو داغ نہیں لگتا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اگر دف کو مزمار شیطانی سمجھ کر منع کیا تو کیا بے جا کیا۔ اس میں

اور اس میں تو زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ قصہ کلام اللہ میں ہے جس کے انکار سے آدمی کافر ہو جاتا ہے یہ قصہ حدیث واحد میں ہے جس کے انکار سے کفر عائد نہیں ہوتا۔ وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام جو نبی ہیں اور نبی بھی کیسے نبی۔ حضرت ہارون علیہ السلام کو عاصی سمجھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ نبی کا فہم کیسا ہوتا ہے یہاں اگر دف کو مزمار شیطانی سمجھا تو ابوبکر صدیق رض نے سمجھا جو ان کے معتقدوں کے نزدیک

نبی نہیں (بزرگ) امتی ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم ہیں۔ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے بدرجہا کمتر ہیں ان کی غلط فہمی سے سنیوں کو کچھ عیب نہیں لگتا۔ کیونکہ ان کے یہاں سوائے نبی کے کوئی معصوم ہی نہیں اور شیعوں کے اصول کے موافق نبی تو نبی امام بھی معصوم ہے۔ پھر سنی تو اعمال ہی میں معصوم کہتے ہیں جسے معصوم کہتے ہیں۔ شیعہ معصوموں کو فہم میں بھی معصوم سمجھتے ہیں جیسے اعمال میں معصوم ہوتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ گناہ ان سے صادر نہیں ہوتا ویسے ہی غلط فہمی سے معصوم ہوتے ہیں۔

(حضرت ابوبکر صدیق رض کی غلط فہمی اہل سنت کو مضر نہیں) سو اگر حضرت ابوبکر صدیق رض نے غلطی سے دف کو (بظاہر کثرت استعمال در لہو ولعب کی وجہ سے جیسے ریڈیو) مزمار شیطانی کہہ دیا تو کیا گناہ کیا۔ ایک غلط فہمی جس سے نہ ولایت میں نقصان ہے۔ سنیوں کے نزدیک نہ خلافت میں بلکہ ان کے نزدیک نبی سے بھی (جیسے کہ قصہ خضر و موسیٰ علیہما السلام) غلط فہمی ممکن ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شیعوں کے نزدیک غلط فہمی ممکن ہی نہیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام کو جو انہوں نے عاصی سمجھا تو شیعوں کے نزدیک نعوذ باللہ صحیح ہی سمجھا ہوگا۔ علاوہ بریں حضرت ابوبکر صدیق رض نے اگر شیطان کی طرف نسبت کیا تو بجانے والوں کے فعل کو نسبت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت نہیں کیا بلکہ آپ ہی کی خاطر ان کو جھڑکا۔ یعنی جیسے اور کافروں فاسقوں سے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب نہیں کرتے تھے لڑتے جھگڑتے تھے یہاں بھی مقتضائے ادب و محبت نبوی غصہ ہوئے اور منع کیا۔ اور جیسے اور کفار فجار کے اعمال کے دیکھنے کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انہوں نے یوں خیال نہیں کیا کہ آپ برضا و رغبت دیکھتے ہیں۔ ایسے ہی یہاں بھی بشرط علم بیداری یہ نہ سمجھا تھا کہ آپ برضا و رغبت سنتے ہیں بلکہ سیاق کلام سے یہ بات فہم ہو تو یہ بات صاف روشن ہے کہ ابوبکر صدیق رض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت یہی خیال کیا کہ آپ کو یہ فعل برا معلوم

ہوتا ہو گا۔ پر آپ شاید ایسے چپ ہوں جیسے بعض بزرگ بوجہ کمال حلم چھوٹوں کی بہت سی بد لحاظیوں پر سکوت کرتے ہیں۔ غرض ابوبکر صدیق رضؓ کے گمان میں یہ آیا کہ آپ کو (یہ دف بجانا) لاریب بُرا معلوم ہوتا ہے مگر چونکہ مکروہ بات تنزیہی ہے آپ منع نہیں فرماتے اس لیے آپ نے کچھ ارشاد نہ فرمایا۔ سو ابوبکر صدیق رضؓ کو بوجہ کمال ادب اتنی بات بھی بُری معلوم ہوئی اور یہ قصہ ایسا ہے کہ اپنے بزرگ کے سامنے کوئی لڑکا حقہ پینے لگے اور وہ بوجہ دانشمندی خود تو کچھ نہ کہیں پر ان کے خادم یوں کہیں کہ ایسی بے ادبی بزرگوں کے سامنے۔

لیکن تحریر ملاحظہ قصہ موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے خوب روشن ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود حضرت ہارون علیہ السلام ہی کو عاصی سمجھا۔ اور اسے بھی جانے دیجئے عصیان اور مزمار شیطان میں بھی زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مزمار شیطانی کہنے سے تو فقط اتنی بات معلوم ہوئی کہ شیطان کو اس فعل میں دخل ہے یا شیطان اس سے خوش ہوتا ہے۔ یہ نہیں ثابت ہوتا کہ شرک ہے یا کفر ہے یا گناہ کبیرہ یا صغیرہ یا مکروہ تحریمی یا تنزیہی۔ غرض ایک گول بات ہے کہ جس کے بیس پہلو ہیں اور ظاہر ہے کہ شیطان کو ان سب باتوں میں دخل ہے۔ بلکہ طول امل اور حدیث نفس (وسوسہ) تک بھی شیطان ہی سے ہوتے ہیں۔

(شیطان کا وسوسہ کاملین کی شان میں عیب نہیں اور مزمار شیطانی سے آدم کیطرف وسوسہ شیطانی کی نسبت زیادہ شدید ہے)

ادھر حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت شیطان کی وسوسہ اندازی خود کلام اللہ ہی میں مذکور ہے۔

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ (پھر بہکایا ان کو شیطان نے) سورہ اعراف (ع۲) میں اور

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ (پ۱ بقرہ ع۴)

(پھر ہلا دیا ان کو شیطان نے اس جگہ سے پھر نکالا ان کو اس عزت و راحت سے کہ جس میں تھے۔)

کبھی دیکھا سنا ہو گا۔ ادھر سورت حج میں۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ (پ۱۷ حج ع۷)

(اور جو رسول بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے یا نبی سو جب لگا خیال باندھنے شیطان نے ملا دیا اس کے خیال میں)

موجود ہے۔ ان سب آیتوں کے ترجمے دیکھئے اور انصاف کیجئے کہ وسوسہ اور القاء شیطانی کی

اضافت مزمار شیطانی کی اضافت سے کس بات میں کم ہے۔ مگر عصیان نافرمانی کو کہتے ہیں جس سے انبیاء بالیقین معصوم ہیں۔

اب حضرات شیعہ برائے خدا انصاف فرمائیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کے مزمار الشیطان کہنے اور سمجھنے سے عصمت کو بٹا لگتا ہے یا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ کہنے سے۔ صاحبو! یہ ساری خرابی کلام اللہ کے یاد نہ ہونے اور کلام اللہ پر تمسک اور عمل نہ کرنے کی ہے اگر حضرات شیعہ کو کلام اللہ کی طرف توجہ ہوتی تو اس اعتراض کو تو منہ پر ہی نہ لاتے۔

خیر خداوند کریم ہمیں انہیں کلام اللہ کی پیروی کی توفیق دے۔ بالجملہ حضرات شیعہ کی خدمت میں اب ہماری یہ عرض ہے کہ ابوبکر صدیق رضؓ بمقتضائے تقریر بے قصور نکلے پر آپ صاحبوں کو ہمارے اس اعتراض کا جواب دینا چاہیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باوجودیکہ حضرت ہارون علیہ السلام کی نبوت اور عصمت کے سب سے زیادہ واقف تھے کیوں کہ آپ ہی کی استدعا سے ان کو نبوت کی نوبت پہنچی۔ پھر کیوں ان کو عاصی سمجھا اور پھر سمجھے بھی تو اس درجہ کو کہ شک کا بھی احتمال نہیں، ہر طرح سے یقین کا یقین ہے ورنہ سر کے بال اور داڑھی کے بال پکڑنے اور کھینچنے کی نوبت نہ آتی بلکہ آیت۔

فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَاءَ وَلَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ (پ۹ اعراف ع۱۸) (سو مت ہنسا مجھ پر دشمنوں کو اور نہ ملا مجھ کو گنہگار لوگوں میں)

سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو زمرہ ظالمین سے سمجھا[1] (معاذ اللہ)

(سوال دوم)

حضرت علی رضؓ صفات و کمالات میں حضرت ابوبکر رضؓ سے افضل تھے مگر ابوبکر رضؓ نے حضرت علی رضؓ کا حق دبا لیا مصلّی اور خلافت کے وارث بن بیٹھے۔ تو ابوبکر کیسے خلیفہ عادل ہوئے)

---

[1] خلاصہ جواب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضؓ کا دف کو شیطان کے کھیل کا آلہ کہنا کمال اتباع نبوی اور آرام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر تھا جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بھائی سے یہ نامناسب سلوک غلط فہمی اور جوش توحید کی بنا پر تھا۔ دونوں قصوں میں کوئی اعتراض کا پہلو نہیں۔ ۱۲ مہر محمد۔

جواب سوال دوم
(شیعہ کی پیش کردہ حدیث کا کوئی پایہ نہیں)

اس سوال سے کچھ معلوم نہ ہوا کہ غرض سائل کیا ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افضلیت حضرت رابع الخلفاء سید آل عبا امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ مدنظر ہے اور بایں وجہ در پردہ خلفاء ثلاثہ کے عدم استحقاق کا منظر ہے سو اس کا جواب اول تو یہی ہے کہ حدیث مسطور سنیوں کے نزدیک احادیث معتبرہ میں سے نہیں صحاح ستہ میں ہے نہ مشکوٰۃ میں نہ کسی اور حدیث کی کتاب میں۔ باقی صواعق محرقہ اول تو حدیث کی کتاب نہیں۔ ردِّ روافض میں ایک کتاب ہے۔ اور اگر فرض کیجیے اس میں کسی حدیث کا ہونا بھی سنیوں کے الزام کھانے کو ویسا ہی ہے جیسے حدیث کی کتابوں میں کسی حدیث کا ہونا تو پھر کیا، اہل سنت وجماعت اپنی کتابوں میں صحیح ضعیف معتبر، غیر معتبر ہر قسم کی حدیثیں لکھتے ہیں۔ مگر اس کی تین صورتیں ہیں۔

(اہل سنت کی کتب حدیث کے چار درجے)

ایک تو یہ کہ مصنف کتاب یہ التزام کرے کہ اپنی کتاب میں صحیح حدیث کے سوا اور کسی قسم کی حدیث بیان نہ کروں گا جیسے بخاری شریف صحیح مسلم وغیرہ اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے نسخہ طبیب کہ اس میں جو ہے بیمار (خاص) کے لیے مفید ہی مفید ہے۔

اور ایک صورت یہ ہے کہ صحیح ضعیف ہر قسم کی حدیثیں لاتے ہیں پر صحیح کو جدا بتلا دیتے ہیں اور ضعیف کو جدا ضعیف کہہ جاتے ہیں۔ جیسے ترمذی شریف کہ اس میں کسی حدیث کو کھول کر لکھتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے اور کسی حدیث کو کھول کر کہہ جاتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے اکثر کتب طب میں ادویہ مفردہ مرکبہ نافعہ مضرہ اور اغذیہ نافعہ مضرہ سب لکھتے ہیں پر اس کے ساتھ یہ لکھ دیتے ہیں کہ یہ دوا یا غذا نافع ہے اور یہ دوا یا غذا مضر ہے۔ سو کتب طب میں کسی مضر چیز کو دیکھ کر جیسے کوئی نادان بھی یہ نہیں کہہ پڑتا کہ فلانی دوا یا غذا طب کی کتاب میں ہے آؤ اس کو استعمال کریں۔ ایسے ہی احادیث ضعیفہ کو کتب احادیث میں دیکھ کر استدلال میں استعمال کرنے کا خیال بھی کسی عاقل کو نہیں آسکتا۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مصنف اپنی کتاب میں فقط موضوعات یا احادیث ضعیفہ ہی کو جمع کرے اور غرض التزام سے یہ ہو کہ دینداران سادہ لوح کے لیے یہ کتاب ایسی رہے جیسے طبیب پرہیز کی چیزوں کی تفصیل لکھ کر حوالہ کر دے تاکہ کل کو کوئی دھوکہ نہ کھائے۔ موضوعات ابن جوزی وغیرہ سب اسی قسم کی ہیں سو ایسی کتابوں سے سنیوں کے الزام کے لیے کوئی حدیث نقل کی

کی جائے تو بڑی ہی شوخ چشمی ہے۔

یہ چوتھی صورت یہ ہے کہ بطور بیاض کسی نے ایک مجموعہ اکٹھا کیا اور رطب و یابس سب اس میں بھر لیں تاکہ وقت فرصت تحقیق کر کے صحیح کو رہنے دیں گے اور ضعیف نکال دیں گے اور پھر اتفاق سے یہ اتفاق نہ ہوا یا ہوا تو وہ اصل بیاض کسی کے ہاتھ لگ گیا۔ اس صورت میں بھی عاقل کا یہ کام نہیں کہ اس سے استدلال کرے اکثر غیر مشہور کتابیں حدیث کی اسی قسم کی ہیں، سو غیر مشہور کتابوں سے حدیثوں کا بیان کرنا جب تک مفید مطلب نہیں کہ کسی محقق نے اس کی تصحیح نہ کی ہو چنانچہ ظاہر ہے۔ سو اس حدیث کی کسی محقق اہل سنت نے آج تک تصحیح نہیں کی جو حضرات شیعہ کو گنجائش استدلال ہو۔

(حضرت ابوبکر صدیق رض تمام صحابہ رض اور امت میں افضل ہیں)	اور ان سب کو جانے دیجئے [1]

حضرت علی رضی اللہ عنہ میں ہے۔ اس سے زیادہ فضیلتیں خلفاء ثلاثہ رضی اللہ عنہم میں موجود ہیں۔ کتابیں معتبر بھری ہوئی ہیں۔ لکھنے کی کچھ حاجت نہیں اس سے زیادہ کیا ہوگا۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اگر میں کسی کو سوا خدا کے دوست اور خلیل بناتا تو ابوبکر رض کو بناتا"، اس سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل سمجھتے تھے۔ علی ہذا القیاس اور بہت سے فضائل ہیں۔ حضرت علی رض کی اس فضیلت سے جو حدیث مذکور سے مستنبط ہے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ وہ سب سے افضل ہیں۔ ہاں حضرت ابوبکر صدیق رض کی فضیلت مذکورہ سے ان (ابوبکر رض) کی افضلیت واضح ہے۔

(صدیق اکبر رض نے حضرت علی رض کو خلافت دیکر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی ہے)	اور اس کو بھی

---

[1] نوٹ:۔ اس مقام میں اصل نسخہ میں تین سطریں غائب ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عبارت چھوٹ گئی ہے لہٰذا اصل کے مطابق یہاں تینوں سطروں کی مقدار بیاض رہنے دیا گیا ہے۔ ۱۲ محمد علیشی گورمانی۔

جانے دیجئے ہم پوچھتے ہیں کہ حدیث مذکور اگر صحیح ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علیؓ افضل ہوں گے یا نہ ہوں گے؟ اگر آپ سے بھی افضل ہوں گے تو ہمیں بھی کچھ شکایت نہیں مگر جیسے باوجود افضلیت حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکومت نہ دی اپنے ہی تحت تصرف میں رکھی ایسے ہی حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بھی ہو گیا۔ اتنا فرق ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اتباع نبوی کیا کہ حق بحقدار کو نہ پہنچایا اور اسی وجہ سے مصیب بالصواب ہی ہوں گے انشاء اللہ۔ کیوں کہ اتباع سنت تو ہر حال موجب ثواب ہی ہوتا ہے شیعہ بھی اس کے قائل ہیں۔ اور سنی بھی اس کے معترف اور اگر باوجود ان فضائل کے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل نہیں تو یہ مطلب ہو گا۔ کہ یہ فضائل ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی فضائل ہوں گے یا ان فضائل کے مقابل میں اور فضائل ہوں گے تو سنیوں کی بھی یہی گذارش ہے کہ ابوبکر صدیقؓ میں بھی یہ فضائل ہوں گے یا ان کے مقابل میں اور فضائل ہوں گے۔ بالجملہ بدستاویز حدیث مذکور اگر حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ ابوبکر صدیقؓ سے افضل تھے تو اسی حدیث کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل تھے کیونکہ یہ فضائل تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس حدیث کے موافق نصیب نہیں ہوئے اور وہ بھی حضرات شیعہ کے طور پر کیونکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ سے تو ان کی افضلیت اسی وجہ سے ثابت ہو گی۔ کہ اس حدیث کے سیاق سے حضرت امیرؓ ہی کا اختصاص ان اوصاف کے ساتھ معلوم ہوتا ہے پھر جب بوجہ اختصاص ایک کے افضل ہوتے ویسے ہی سارے جہان سے افضل ہوں گے اس میں سید الانبیاء ہو یا سید الصدیقین ہو اس صورت میں ابوبکر صدیقؓ کو تو خلافت کے دبا لینے کے لیے یہی حجت کافی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود فضیلت حضرت امیرؓ ان کو حکومت نہ دی آپ ہی قابض و متصرف رہے۔ مجھ کو لازم ہے کہ میں بھی اسی طرح حضرت امیرؓ کو حکومت نہ دوں تاکہ حق کے نہ دینے میں رسول اللہ کی پیروی ہاتھ سے نہ جائے۔

وقت وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدیق اکبرؓ کو امام بنانا ان کو خلیفہ بنانے کے مترادف ہے

علاوہ بریں وقت وفات امام مسجد کیا تو ابوبکر کو کیا جس سے ہر عام و خاص نے یہی سمجھا کہ جو دین کا پیشوا ہے وہی دنیا کا پیشوا یعنی جیسے حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دین کے پیشوا تھے اور امام نماز تھے اسی لیے

دنیا کے بھی امام یعنی حاکم تھے ایسے ہی ابوبکر رضؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کا امام بنایا جو سب دین کی باتوں میں افضل ہے لاریب دین میں یہ سب سے زیادہ ہوں گے سو انہیں کو دنیا کا بھی امام بنانا چاہیئے۔ علیٰ ہٰذا القیاس خود ابوبکر رضؓ کے ذہن میں (بالفرض) یہی آیا ہو کہ جب مجھے دین کا امام بنایا دنیا کا بھی میں ہی امام ہوں گا۔

(خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو ان کا حق نہ دیا) لیکن حضرات شیعہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت امیرؓ کا حق نہ دیا اور آپ دبائے رکھا پھر وقت وفات بھی کیا تو وہ کیا جس سے سب عام و خاص الٹا سمجھ گئے۔ تو آپ نے کس کی پیروی کی خدا کا حکم تو یہی ہے کہ حاکم ہو تو افضل ہو ورنہ پھر شیعوں کو سنیوں پر کیا اعتراض رہے گا۔ سو اس صورت میں لازم یوں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حاکم حضرت امیرؓ کو بناتے آپ محکوم بنتے۔

(جب خدا کے ذمہ عدل واجب ہے تو خدا نے حضرت علیؓ کا حق ان کو کیوں نہ پہونچایا) اور اسے بھی جانے دیجئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے کچھ خوف ہوا ہو گا ابوبکرؓ و عمرؓ سے نعوذ باللہ ڈر گئے ہوں گے خود خداوند کریم با ایں ہمہ دعوئے عدل و انصاف جس کے معنی شیعوں کے نزدیک یہ ہیں کہ خدا کے ذمہ پر عدل واجب ہے خلافِ انصاف وہ کوئی بات کر ہی نہیں سکتا حضرت امیرؓ کا حامی اور طرفدار کیوں نہ ہوا یا توں کہیئے کہ خدا کے ذمہ حق کا پہنچانا واجب نہیں تب تو سنیوں کا مذہب برحق نکلا کہ خدا کے ذمہ عدل واجب نہیں اس کو اختیار ہے جو چاہے سو کرے۔ چنانچہ خود ہی فرماتا ہے۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (پ۱۷ انبیاء ع ۲) (اس سے پوچھا نہ جائے جو وہ کرے اور ان سے پوچھا جائے۔)

اور کیونکر اختیار نہ ہو وہ سب کا مالک ہے ظلم تو جب ہو جب کسی غیر کی چیز میں بے موقع تصرف کرے اگر کوئی شخص اپنی سلطنت اور ریاست یا خزانہ یا کوئی اور چیز کسی کمتر کو ہبہ کر دے اور افضل کو ہبہ نہ کرے تو اس کو کوئی نادان بھی ظلم نہیں کہہ سکتا۔

(در حقیقت صدیق اکبرؓ کی خلافت بوجہ آپکی افضلیت کے عدل کے عین مطابق ہے) یا یوں کہو خدا پر عدل تو واجب ہے پر انصاف یہی تھا کہ حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوں کیوں کہ وہ

سب سے افضل تھے تب اہل سنت کا بالا جیتا رہا۔

(کیا شیخین از خود خلیفہ بن گئے اور معاذ اللہ خدا تعالیٰ ان سے مغلوب ہو گیا) یا یوں کہو عدل بھی واجب تھا اور حق بھی حضرت علیؓ کا تھا پر نعوذ باللہ نعوذ باللہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کے سامنے خدا کی کچھ نہ چلی زبردستی یہ دونوں علیؓ کا حق دبا بیٹھے۔ تب سنیوں ہی کا بول بالا رہا۔ جن کے ایسے پیشوا کہ نعوذ باللہ خدا کی بھی ان کے سامنے نہ چلے ان کو حضرت کی پیروی کی کیا پروا اور ان کی ناخوشی کا اندیشہ؟

حضرات شیعہ یا تو ان باتوں کا معقول جواب دیں ورنہ فکر آخرت کریں اور توبہ توبہ کریں۔ ان سب صاحبوں کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اس طرح کے کلمات کے زبان پر لانے سے واللہ جی ڈرتا ہے خدا کی شان کے آگے ابوبکرؓ اور عمرؓ تو کیا چیز ہیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو افضل مخلوقات ہیں اور محبوب ذات پاک ہیں ایک بندہ ہی ہیں ایک ذرہ ہلانے کی طاقت نہیں رکھتے پر کیا کیجیے۔ نقل کفر کفر نہ باشد حضرات شیعہ کی خرافات کو بناچاری نقل کرنا پڑا۔

(سوال سوم

حضرت علیؓ خلیفہ برحق تھے اور محمد بن ابی بکر حضرت علیؓ کی جماعت میں تھا اور جب وہ معاویہؓ کے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا تو ان پر حضرت عائشہؓ روئیں اور پھر امیر معاویہؓ نے حضرت امیرؓ سے جنگ کی اور حضرت عائشہؓ نے بھی ان سے جنگ کی حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حَرْبُكَ حَرْبِي فرمایا ہے۔ تو اہل سنت کے یہ بزرگ عقیدت کے لائق کیسے ہوئے۔)

جواب سوال سوم اس سوال کے دیکھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جناب سائل وقت سوال کچھ بھنگ بھی نوش جان کیے ہوئے ہیں۔ اہل فہم کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ سنیوں پر اعتراض کرتے ہیں یا شیعوں پر یا دونوں پر یا یوں ہی ایک غمزہ بے جا اور عشوہ بے محل ہے۔

واقدی معتبر مؤرخ نہیں صاحبو! اول تو واقدی اہل سنت کے نزدیک مؤرخ معتبر نہیں مجمع البحار کے آخر میں دیکھ لیجیے۔ واقدی کی شان میں کیا لکھا ہے۔

(حضرت علیؓ نے حضرت عائشہؓ کی صحابیت و زوجیت کا خیال کیوں نہ کیا۔)

مگر اس بات کو تو ناظران اوراق عقب گذاری پر محمول کریں گے اور یہ کہیں گے کہ ساری باتوں کو محرر اوراق غلط بتانے لگا۔ اور صاحب سوال۔ جناب معترض کو کوئی یوں نہ کہے گا کہ حضرت نے جو بات لکھی ہے۔ طوفان شیطانی ہی لکھا ہے۔ کوئی اہل علم تو بتائے کہ حضرت نے سوا ایک بات کے کون سی بات سچی لکھی ہے۔ اس لیے یہ عرض ہے کہ ہم نے آپ کی خاطر اس روایت کو مانا۔ حضرت عائشہؓ کے رونے کی اگر شکایت ہے تو حضرت امیرؓ بھی بشہادت سوال محمد بن ابی بکر کو روئے اگر حضرت عائشہؓ نے اس بات کا دھیان نہ کیا کہ کل اُس نے میری صحابیت اور زوجیت کا کچھ لحاظ نہیں کیا تھا تو حضرت امیرؓ نے بھی اس کا کچھ دھیان نہ فرمایا کہ کل اس (محمد بن ابی بکر) نے حضرت عائشہؓ زوجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجیت اور صحابیت کا دھیان نہیں کیا تھا۔ مجھ کو اس کے غم میں رونا مناسب نہیں۔ بلکہ یوں کہو حضرت امیرؓ نے بھی جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ کی زوجیت اور صحابیت کا لحاظ نہیں کیا۔ اگر اس بات کا لحاظ نہ کرنا برا تھا اور اس وجہ سے ان کا غم مناسب نہ تھا تو یہ فرمایئے حضرت امیرؓ نے ایسا برا کام کیوں کیا۔

اور اگر یہ مدعا ہے کہ حضرت امیر جنگ جمل میں حق پر تھے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ محمد بن ابی بکر صدیق نے اپنی بہن کا کچھ لحاظ نہ کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ لاریب حضرت امیرؓ برحق تھے۔ ہم وہ نہیں کہ مثل شیعہ حق بات کو ہضم کر جائیں پر اس کہنے سے کیا فائدہ محمد بن ابی بکر سنیوں کے کون سے مقتدا، اور پیشوا اور امام وقت تھے جن کا فعل سنیوں کے نزدیک مستند ہو۔ دوسری (بات) یہ ہے کہ اگر ان کا فعل سند بھی ہو تو حاجت سندی کیا ہے۔

(اہل سنت حضرت علیؓ کی خلافت حقہ کے اسی طرح قائل ہیں جیسے خلفاء ثلاثہؓ کی خلافت کے)

اہل سنت حضرت امیرؓ کی خلافت کے وقت ان کے خلیفہ برحق ہونے کے ویسے ہی قائل ہیں جیسے خلفاء ثلاثہؓ کی خلافت کی حقیقت کے ان کے ایام خلافت کے قائل ہیں۔ سند کی تو اس وقت ضرورت ہوتی جب اہل سنت حضرت امیرؓ کے برحق ہونے کے منکر ہوتے پر اس بیہودہ سرائی سے کیا فائدہ تو اس پر حضرت عائشہؓ اور حضرت امیرؓ کے رونے سے آپ کو کیا ہاتھ آیا۔ یہ تو فرمایئے یہ کونسی دلیل ہے اسے کلام اللہ کی آیت کہیئے یا حدیث کی دلالت کہیئے اس دیوانوں کی سی ترنگ

سے اس بحث میں کیا ہاتھ آیا۔ خلافت حضرت امیر اس سے ہاتھ آگئی یا آپ کی امامت کا تمسک اور قبالہ سے اس درست ہو گیا نقل مشہور ہے " بیاہ میں بیج کا لیکھا " گیا امامت حضرت امیر کجا جمل تقریر۔

اگر مقصود دلی وہی اظہار خبث باطن بہ نسبت فی وجہ طہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہے اور اس پردہ میں حضرت عائشہؓ پر طعن مدنظر ہے تو موافق مصرع مشہور " کلوخ انداز را پاداش سنگ است " مناسب تو یوں تھا کہ انتقام ام المؤمنین محبوبہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم میں ہم بھی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑتے پر ایسے نابکاروں کو برا کہا تو کیا ہوا۔ شیطان کو برا کہنے کی حاجت ہی کیا ہے اور اس کی ہجو و مذمت کی ضرورت ہی کیا ہے جیسے ان کی خوبی اور بزرگی معلوم ہے۔ حضرات روافض کی شان میں یہی مشہور ہے۔ ع۔ الرافضی فوارۃ اللعنۃ   از رومی خیزد و برومی ریزد

بالجملہ رافضیوں کے برا کہنے کی حاجت نہیں۔ ہاں جواب اعتراض چاہیئے۔

(تحقیقی جواب۔ جنگ جمل خطاء اجتہادی کی بناء پر ہوئی اور خطاء اجتہادی قابل مؤاخذہ نہیں)

صاحبو! تحقیقی جواب تو اس کا یہ ہے کہ لاریب اپنے ایام خلافت میں حضرت امیرؓ افضل بشر تھے اور بے شک وہ برحق تھے اور حضرت عائشہؓ خطاء پر تھیں لیکن بوجہ خطا و نسیان انسان معیوب نہیں۔ ورنہ روزہ میں بھول کر پانی پینا، کھانا کھانا بوجہ خطاء جیسے وضو کرتے میں کبھی پانی حلق میں اتر جاتا ہے۔ ایسے امور کا مرتکب ہونا موجب عذاب و وجوب کفارہ ہوا کرتا۔ علیٰ ہذا القیاس بوجہ غلطی اگر کوئی حرکت ناسزا ہو جائے تو اس پر بھی خدا کے یہاں سے گرفت نہیں ورنہ ابر کے روزہ قریب غروب آفتاب کہ ابھی آفتاب غروب نہ ہوا ہو اگر کوئی شخص بوجہ غلطی یوں سمجھ لے کہ آفتاب غروب ہو گیا اور یہ سمجھ کر روزہ کھول لے اور پھر آفتاب نمودار ہو جائے چنانچہ اکثر ہو جاتا ہے تو لازم یوں ہے کہ ایسا شخص معذب ہوا کرے حالانکہ بالاتفاق شیعہ سنی ایسے افعال پر خدا کے یہاں مواخذہ نہیں۔ ایسے ہی مشاجرات صحابہؓ اور محاربات اصحاب جو باہم پیش آئے یا منازعات انبیاءؑ جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا قصہ گذرا سب بوجہ غلطی ہوتے ہیں جان بوجھ کر نہیں ہوتے جو ان پر اعتراض کیا جائے۔

(حضرت علیؓ کی قصاص لینے میں تاخیر کیونکہ بلوائیوں کا غلبہ اور زور تھا)

باقی رہی یہ بات کہ وجہ غلطی کیا ہوئی اس کا جواب اول تو یہ ہے کہ ہم کو اس سے کیا بحث حضرت موسیٰ

علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کی طرح دونوں کو بزرگ سمجھنا چاہیئے اور تحقیق مدنظر ہے تو سنئے حضرت عثمانؓ کے قاتل حضرت امیرؓ کے ساتھ ہو لیے تھے۔ سو حضرت امیرؓ اوّل تو بایں وجہ قصاص کے لینے میں دیر کر رہے تھے کہ ان شورہ پشتوں نے بنی بنائی بڑے زور کی خلافت کو جب الیا زیر وزبر کر دیا تو میری خلافت تو جمنے ہی نہیں پائی۔ میرے قابو کیونکر آئیں گے۔

(حضرت معاویہؓ نے محمد بن ابی بکر کو قاتلین عثمانؓ میں سمجھ کر مارا) دوسرے بڑی کی بات ہے تحقیق کے بعد قاتل غیر قاتل کو پہچان کر قصاص لیا جائے گا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ وغیرہ یہ سمجھے کہ حضرت امیرؓ ان ظالموں کے طرفدار ہیں چنانچہ حضرت امیر معاویہؓ نے یہ جو محمد بن ابی بکر کو مارا تو اس کی وجہ بھی یہی ہوئی کہ ان کو منجملہ مشیران قاتلین سمجھتے تھے یہ بات جدا رہی کہ یہ (مشیر) تھے یا نہ تھے۔

(جنگ جمل میں بلوائیوں کا ہاتھ تھا) تو اس پر حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کا خود ارادہ قتال بھی نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ کے قاتل جو ان لوگوں کو ڈراتے تھے تو اپنی جان بچانے کو بصرہ کو جاتے تھے۔ حضرت امیرؓ نے تعاقب کیا۔ انجام کار بایں وجہ کہ قاتلان مذکور نے بغرض فساد دو گروہ ہو کر دونوں لشکروں پر شب خون مارا ہر ایک نے دوسرے کی دغا سمجھی اور لڑا لڑا کر قصہ تمام کیا۔

(اس طرح کی خطا کا صدور قصہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام میں موجود ہے۔) مگر بشہادت کلام اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام پر کشتی توڑ ڈالنے اور لڑکے کو مار ڈالنے کے مقدمہ میں اعتراض کیا چنانچہ سورہ کہف میں یہ قصہ مفصل مذکور ہے۔ جسے شوق ہو سولہویں سیپارے کے شروع سے پہلے ایک رکوع نکال کر دیکھنا شروع کرے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ان کے پاس جانا اور دوبارہ تسلیم عہد و پیمان کرنا پھر بایں ہمہ اعتراض کرنا اور نیز حضرت خضر علیہ السلام کا ان باتوں میں بے قصور ہونا سب بخوبی واضح ہو جائے گا۔ اور نیز یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غلطی بھی کھائی پر بے بتلائے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ اب میری یہ عرض ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے پاس آپ نہیں گئے خدا کے بھیجے ہوئے گئے۔ خدا نے ان کے علم اور بزرگی کی ان سے تعریف کی پھر انہوں نے یہ کہہ لیا کہ تم سے میری باتوں پر صبر نہ ہو سکے گا۔ تم میرے ساتھ نہ ہو۔ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اقرار کر لیا کہ میں کچھ تکرار نہ کروں گا۔ بایں ہمہ نور نبوت و کمال عقل الیا کہ کیسی ہی

باریک بات کیوں نہ ہو اُسے سمجھ جائیں پر اس پر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ سمجھے اور نہ سمجھنا تو درکنار یوں (بھی) نہ سمجھے کہ اس میں کوئی کچھ بھید ہوگا۔ صبر کرنا چاہیئے اور پھر نہ سمجھنے کی نوبت یہاں تک آئی کہ بے بتلائے نہ سمجھے اگر ہم جیسے اور تم جیسے مسانِ دنیا کم عقل کم فہم ان قصوں کی حقیقت کو نہ سمجھیں جن میں مراتب مذکورہ میں سے ایک بات بھی محو نہیں تو کیا بعید ہے بلکہ لازم یوں ہے کہ نہ سمجھیں ہاں یہ سمجھ کر کہ ہماری سمجھ کا قصور ہے ان بزرگواروں کا قصور نہیں ان پر اعتراض نہ کریں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہم کو اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں۔

(مشاجرات صحابہؓ میں کف لسانی واجب ہے) اس تقریر سے حضرت معاویہؓ پر بابت قتل محمد بن ابی بکر اگر اعتراض ہے یا بہ نسبت محاربات حضرت امیرؓ کچھ طعن ہے وہ بھی مندفع ہوگیا۔ بالجملہ اہل سنت وجماعت کے نزدیک یہ محاربات بوجہ غلطی واقع ہوئے طرفین میں سے قصور کسی کا نہ تھا جیسے حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے دست وگریبان ہونے اور ہاتھا پائی میں قصور دونوں میں سے کسی کا نہ تھا۔

(جملہ حَرْبُكَ حَرْبِي کے مفہوم پر مفصل بحث) باقی رہا جملہ حربک حربی اس کے یہ معنی ہیں کہ جان بوجھ کر نہ بوجہ غلط فہمی جو تم سے لڑے گا تو گویا وہ مجھ ہی سے لڑے گا یہ نہیں کہ جس طرح سے کوئی تم سے لڑے عمداً لڑے یا خطاءً بوجہ غلطی لڑے یا بوجہ غلط فہمی وہ سب میری ہی لڑائی کے برابر ہے۔ ورنہ آیت۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَأً (پ ۵ نساء ع ۱۳) (اور مسلمان کا کام نہیں کہ قتل کرے مسلمان کو مگر غلطی سے)

جس کے معنوں سے صاف یہ بات روشن ہے کہ قتل خطاء میں کچھ گناہ نہیں غلط ہو جائیگی اور یہ بھی نہ سہی اگر حدیث مذکور عام ہے تو اس وجہ سے عام ہوگی کہ ظاہر الفاظ عموم پر دلالت کرتے ہیں مگر جیسے مفہوم حَرْبُكَ کو عام لیتے ہو مفہوم حَرْبِي کو بھی عام لیجئے اور پھر بہ ہدایت فہم تقابل ملحوظ رکھئے۔ یعنی یوں کہیئے تم سے عمداً لڑنا تو مجھ سے عمداً لڑائی کے برابر ہے اور تم سے خطاءً لڑنا مجھ سے خطاءً لڑنے کے برابر ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمداً لڑنا اور آپ کی جان بوجھ کر تکذیب کرنی بری ہے اور غلطی بے خبری میں اگر کسی سے یہ حرکت ہو جائے اور بعد علم متنبہ ہو کر شرائط آداب بجالائے تو عقل نقل کی رُو سے قابل عتاب نہیں۔ عقل کی گواہی کی تو حاجت نہیں اہل عقل کے

نزدیک بدیہی ہے۔ نقل کی بات پوچھیے تو کلام اللہ موجود ہے بَعۡدِ مَا تَبَيَّنَ اور مِنۡ بَعۡدِ مَا جَآءَتۡهُمُ الۡبَيِّنٰتُ اور لفظ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ سے صاف ظاہر ہے کہ عتاب اسی وجہ سے ہے کہ وہ جان بوجھ کر ایسی حرکتیں کرتے ہیں بلکہ آیت

وَلَئِنِ اتَّبَعۡتَ اَهۡوَآءَهُمۡ بَعۡدَ الَّذِیۡ جَآءَكَ مِنَ الۡعِلۡمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ (پ بقرہ ع ۱۴)

(اور اگر بالفرض تو تابعداری کرے انکی خواہشوں کی بعد اس علم کے جو تجھ کو پہنچا تو تیرا کوئی نہیں اللہ کے ہاتھ سے حمایت کرنے والا اور نہ مددگار)

سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی بوجہ بے خبری اگر کچھ خلاف مرضی خداوندی کر جائیں تو کچھ حرج نہیں (جیسے اساری بدر سے فدیہ اور تبوک میں بے عذر منافقوں کو چھٹی وغیرہ) بالجملہ خدا کی مخالفت بوجہ غلطی جب مضر نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت بدرجہ اولیٰ مضر نہ ہوگی۔ پھر حضرت علیؓ کی مخالفت اگر بوجہ غلطی ہو تو اس کا تو کچھ ذکر ہی نہیں۔ اور یہ بھی نہ سہی لفظ حربک عام اور لفظ حربی شیعوں کی زبردستی سے خاص ہے مگر جیسے حدیث مذکور میں پہلا لفظ عام ہے۔

آیت وَمَنۡ يَّقۡتُلۡ مُؤۡمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيۡهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيۡمًا۔ (پ۵ النساء ع ۱۳)

(اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر تو اسکی سزا دوزخ ہے پڑا رہے گا اسی میں اور اللہ کا اس پر غضب ہوا اور اس کو لعنت کی اور اس کے واسطے تیار کیا بڑا عذاب)

بھی باعتبار الفاظ عام ہے باغی زانی قطاع الطریق اس میں سب آگئے اب فرمایئے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زانی کو قتل کیا۔ حضرت امیرؓ نے سینکڑوں باغیوں کو تہ تیغ کیا ادھر اب تک یہ آیت سب کی معمول بہا نہ مجتہدان شیعہ اس سے انکار کر سکیں نہ علماء اہل سنت۔ پھر یہ انصاف ہے کہ ایک حدیث کے بھروسے جس میں کسی قدر ضعف[1] ہے اس پر بھی احتمال ہے کہ غلط ہو۔ اتنا غل و شور ہے کہ العظمۃ للہ

---

[1] یہ حدیث حربک حربی یا انا حرب لمن حاربتم بالکل ضعیف اور ناقابل احتجاج ہے۔ انا حرب لمن حاربتم کے الفاظ باب مناقب فاطمہ ترمذی میں ہیں امام ترمذیؒ فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے صرف اسی سند میں ملی ہے اور ام سلمہ کے مولیٰ صبیح معروف نہیں ۲۔ مسلسل تین راوی شیعہ کثیر الخطاء۔ اور غریب الروایۃ ہیں۔ تقریب التہذیب سے ان کا حال یہ ہے ۱۔ علی بن ہادم خزاعی کوفی صدوق اور شیعہ ہیں۔ ابو نصر ہمدانی کثیر الخطاء صدوق اور غریب حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ ۳۔ ابو محمد سدی کوفی تشیع سے متہم ہیں صدوق وہمی ہیں۔ ۱۲۰۔ مہر محمد۔

آیت کو نہیں دیکھتے کہ اس میں شمہ بھی باقی نہیں چھوڑا تو اس پر غلطی اور کذب رواۃ کا احتمال نہیں پھر اس کے باعث کہاں کہاں یہ اعتراض پڑتا ہے۔

(الزامی جواب۔ ازواج مطہرات تمام مومنوں کی مائیں ہیں تو پھر حضرت علیؓ نے اپنی والدہ عائشہؓ سے مقابلہ کیوں کیا)

اور جواب الزامی یہ ہے کہ حضرت امیرؓ کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حربک حربی فرمایا ہے تو ازواج مطہرات کے حق میں۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ (پ ۲۱ احزاب ع ۱)

(نبی سے لگاؤ ہے ایمان والوں کو زیادہ اپنی جان سے اور اس کی عورتیں ان کی مائیں ہیں۔)

اور عام والدین کے حق میں۔

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا (پ ۱ بقرہ ع ۱۰)

(عبادت نہ کرنا مگر اللہ کی اور ماں باپ سے سلوک نیک کرنا)

فرمایا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج جو امہات المومنین ہیں ان کے حق میں تو اس سے بھی زیادہ تاکید ہوگی۔ اب میری یہ عرض ہے کہ حضرت علیؓ کے ایمان کیا۔ کمال ایمان میں بھی شک کی گنجائش نہیں جو یوں کہیے کہ اوروں کی والدہ تھیں ان کی نہ تھیں پھر کیا یہی احسان تھا کہ ایسی والدہ کا یوں مقابلہ کرتے اور اگر یہ خیال ہے کہ خطا پر تھیں۔ تو یہ بات کس منہ سے کہیں مناسب ہے سنی کہہ لیں تو کہہ لیں شیعوں کو اس کے کہنے کی مجال نہیں کیونکہ آیت

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا (پ ۲۲ الاحزاب ع ۴)

(اللہ یہی چاہتا ہے کہ دور کرے تم سے گندی باتیں اے نبی کے گھر والو اور ستھرا کرے تم کو ایک ستھرائی سے)

ان کے نزدیک عصمت پر دلالت کرتی ہے۔

(آیت تطہیر کا شان نزول) اور پھر یہ آیت دیکھ لیجئے کس کی شان میں نازل ہوئی ہے۔ ازواج مطہرات کی یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی؟ کلام اللہ موجود ہے دیکھ لو ازواج کا ذکر ہے یا حضرت امیرؓ کا اور اگر حدیث عبا پر کود تے ہو تو اس سے صاف یہی بات نکلتی ہے کہ یہ آیت ان کی شان میں نازل نہیں ہوئی ورنہ اس دعا کی کیا حاجت تھی کہ عبا میں پنج تن کو شامل کر کے یہ فرمایا۔ اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاۗءِ

اَهْلِ بَيْتِي الخ بالجملہ دعا کرنے سے جیسے دخول پنج تن زمرہ اہل بیت میں معلوم ہوتا ہے ایسے ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ان کی شان میں نازل نہیں ہاں یہ دعا قبل نزول آیت ہوتی تو یہ بھی احتمال تھا کہ دعا ہی باعث نزول ہوئی ہے مگر اس پر سُنی ہی نہیں شیعہ بھی اس طرف ہیں کہ آیت پہلے نازل ہوئی۔ دعا پیچھے ہوئی۔

(آل عبا کو اہل بیت کہنے کا مطلب) باقی پنج تن کو پہلے سے اہل بیت فرمایا یہ نہ فرمایا کہ ان کو اہل بیت میں داخل کر دے سو اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے بیگانے۔ اور بیگانے اپنے نہیں ہو سکتے۔ جس کی جو قرابت ہے وہی رہتی ہے۔ کوئی غیر آدمی کی نسبت یہ دعا تو کر ہی نہیں سکتا کہ الٰہی یہ شخص میرا حقیقی بیٹا بن جائے ہاں جس سے محبت شدید ہوتی ہے اس کو خود بیٹا کہہ دیا کرتے ہیں اگرچہ بیگانہ ہی کیوں نہ ہو۔ لے پالک کو عرف میں بیٹا کہتے ہیں لیکن حقیقی بیٹا ہونا اس کا ممکن نہیں اسی طرح جو اہل بیت نہ ہوں۔ ان کا اہل بیت ہو جانا ممکن نہیں جو اس کی دعا کیجائی کہ الٰہی ان کو اہل بیت حقیقی بنا دے ہاں ان کے ساتھ بھی معاملہ اہل بیت ہی کا سا تھا۔ اس لیے آپ نے فرمایا الٰہی یہ بھی میرے اہل بیت ہیں تو اپنا وعدہ ان کے ساتھ پورا کر اور اگر یوں کہیئے کہ اہل بیت تو پہلے ہی سے تھے پھر دُعا کے وقت ان کو اس لقب سے یاد کر لیا تھا سو یہ بات غور سے دیکھیے تو گوز شتر سے کم نہیں۔ جناب باری تعالیٰ کو یہ معلوم نہ تھا کہ اہل بیت نبوی کون ہیں جو آپ کے تبلانے اور جتلانے کی ضرورت ہوئی۔ جب خداوند کریم نے وعدہ تطہیر کر لیا تھا آپ پورا کرتا پھر دعا کی کیا حاجت تھی۔

(آیت تطہیر ازواج کی شان میں ہے) بالجملہ بروئے انصاف شیعوں کے حق میں بھی یہی ہو گا کہ آیت ازواج مطہرات ہی کی شان میں ہے ہاں جیسے کوئی بادشاہ کسی امیر سے وعدہ کرے کہ تمہارے گھر کے لوگوں کو میں انعام دوں گا اور وہ امیر وقت تقسیم انعام اپنی دختر اور داماد اور نواسوں کو بھی لے جائے اور یہ کہے کہ اپنے میرے گھر کے لوگوں کے لیے وعدہ انعام کیا تھا یہ بھی میرے گھر کے لوگ ہیں۔ کچھ اجنبی نہیں تو وہ بادشاہ باوجودیکہ جانتا ہے کہ بیٹی دوسرے گھر کا چاند ہے گھر کے لوگوں میں داخل نہیں۔ نواسے اور داماد تو درکنار۔ گھر کے لوگ اگر ہیں تو بی بی ہے چنانچہ اہل بیت کا ترجمہ ہی اہل خانہ ہے یا فرزند وغیرہ جو اس کے گھر رہتے ہیں مگر بوجہ عموم کرم و مزید قدر شناسی امیر مذکور ان کو بھی انعام دے تو کچھ بعید نہیں ایسے ہی یہاں بھی سمجھنا چاہیئے کہ پنج تن باوجودیکہ شرف گوناگوں رکھتے ہیں پر اصل سے اہل بیت میں سے نہ

تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے ماورا دیگر انعامہائے بے پایاں انعام اہل بیت میں بھی شریک ہو گئے۔ چنانچہ قرینہ دعا اس پر عمدہ شاہد ہے اور بہت ہاتھ پاؤں ماریئے تو یہ بات بن پڑتی ہے کہ لقب اہل بیت تو اوّل سے ازواج اور پنج تن دونوں کو شامل ہے خطاب خاص ازواج ہی کے ساتھ ہے گو وعدہ مذکورہ سب ہی کے ساتھ ہو۔ جیسے کوئی بادشاہ اپنے نوکروں میں سے کسی ایک نوکر کو بلا کر یوں کہے کہ ہمارا کل کو ارادہ ہے کہ اپنے نوکروں کو انعام دیں سو یہ خطاب گو اس ایک ہی کے ساتھ خاص ہے پر وعدہ سب ہی نوکروں کے لیے ہے۔

(پنج تن کے اہل بیت میں داخل ہونے کی وجہ)

بالجملہ پنج تن کے اہل بیت میں داخل ہونے کی دو صورتیں ہیں ورنہ اصل سے یہ آیت ازواج ہی کے حق میں ہے۔ ان کے خارج اہل بیت ہونے کا کوئی احتمال نہیں اگر احتمال ہے تو اہل بیت کے خارج ہونے کا احتمال ہے اگرچہ غلط ہو۔ کیونکہ باتفاق اہل سنت وہ بھی اس فضیلت میں شریک ہیں۔ اوّل سے ہی یا پیچھے ہو گئے پھر جب آیت مذکورہ عصمت پر دلالت کرے۔ چنانچہ شیعہ پنج تن کی عصمت اس سے ثابت کرتے ہیں تو ازواج مطہرات بدرجہ اولیٰ معصوم ہوں گی۔ انہوں نے جو کچھ حضرت امیر کے ساتھ کیا بجا ہوگا۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ حضرت امیر المؤمنین رضؓ نے ان کے ام المؤمنین ہونے کا لحاظ نہ کیا۔ فرزند کو والدین کی اطاعت چاہیئے والدین کو فرزند کی اطاعت کی حاجت نہیں یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت امیر رضؓ کے ذمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہوئی کیونکہ وہ حضرت امیر رضؓ کے حق میں بمنزلہ والد کے تھے یہ نہ ہوتا تو ازواج مطہرات ام المؤمنین ہی کیوں ہوتیں پھر جب حضرت امیر رضؓ نے باوجودیکہ موافق عقیدہ شیعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ حدیث مندرجہ سوال دوم سے واضح ہے اور نیز حالِ قالِ شیعہ سے ٹپکا پڑتا ہے (یعنی عملاً امیر رضؓ کو افضل جانتے ہیں) زبان سے کہیں یا نہ کہیں۔ بایں وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اختیار رکھی کہ وہ بمنزلہ والد تھے۔ تو حضرت عائشہ رضؓ ان کے حق میں بمنزلہ والدہ تھیں۔ اور پھر والدہ بھی کیسی معصوم۔ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری بھی ان کو ضرور تھی، سو اب حضرات شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ اپنے اعتراضات کا جواب تو دندان شکن لے چکے ہمارے ان اعتراضات کا جواب بھی چاہیئے۔

باقی رہا یہ قصہ کہ حضرت ام حبیبہ رضؓ نے گوسفند بھون کر حضرت عائشہ رضؓ کے پاس بھیجا اور ان کے

بھائی کی نسبت کچھ کہلا بھیجا اور حضرت عائشہ رضہ نے گوسفند کا کھانا چھوڑ دیا۔ اوّل تو قصہ بے سند اور اگر ہو بھی تو اس کا ذکر کرنا اور مباحثہ کو ایسے مضامین سے طول دینا خود جنگ آزمانا ہے۔ صاحبو! مباحثہ ہے کوسنا پیٹنا نہیں۔ جو حضرات شیعہ عورتوں کی طرح ایسی باتیں گاتے ہیں۔ اس کے جواب میں فقط یہ شعر کافی ہے۔ ع

الجھنے کو بلائیں آپ تو کچھ خیر ہے صاحب لگایا ہاتھ کس نے آپ کی زلف پریشان کو

غرض ایسی باتوں سے دین شیعہ مستحکم نہیں ہوتا حقانیت کی سند ہاتھ نہیں آتی۔ پھر کیا فائدہ دیوانوں کی طرح جاہلوں کے دل میں شبہ شک ڈالتے ہیں۔

(سوال چہارم

اہل سنت وجماعت امام جعفر صادق وغیرہ اہل بیت کو نہیں مانتے مگر امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کو مانتے ہیں جو معصوم نہ تھے۔ پھر ابوحنیفہ نے تو شراب کو حلال کیا ہے اور امام شافعی نے ولد الزنا لڑکی سے زانی کا نکاح جائز کہا ہے)

جواب سوال چہارم (اہل سنت ائمہ مجتہدین کو معصوم نہیں سمجھتے)

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما اول ہمارے نزدیک ایسے امام نہیں جنکی بات خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کے برابر ہو۔ ایک مجتہد ہیں اگر ان کی بات کوئی بھی ہو جس پر اعتراض کی گنجائش ہو تو کیا ہوا ہمارے نزدیک تمہارے نزدیک دونوں کے نزدیک مجتہد سے خطا ممکن ہے پھر وہ بھی فروع میں اور فروع میں بھی ایسی بات جو خواہ مخواہ ظاہر نہیں۔

(شیعہ کے ائمہ معصومین کے نزدیک عاریت فرج حلال ہے)

مگر ستم تو یہ ہے کہ حضرات شیعہ اماموں سے جن کی عصمت کے مثل انبیاء معتقد ہیں ایسی روایتیں کرتے ہیں جو صاف کلام اللہ کے مخالف ہیں "ارشاد" میں جو تصنیف علامہ حلی ہے موجود ہے کہ اپنی باندی کو دوسرے پر حلال کر دے تو اس کو اس سے صحبت جائز ہے[1]۔ پھر باندیوں میں بھی کسی کی تخصیص نہیں جس سے

---

[1] علامہ حلی کی کتاب "ارشاد" کے علاوہ شیعہ کی کتب اصول میں بھی ایسی روایتیں بکثرت موجود ہیں۔ چند ذیل میں درج کیجاتی ہیں۔
باقی حاشیہ ص ۳۷۳ پر)

اس کی اولاد ہو اس کا حلال کر دینا بھی جائز ہے۔ اور غیروں کو عاریت دے دینا در کنار وقف کر دینا شیعوں میں جائز ہے۔

بلکہ ابن بابویہ تو حضرت امام مہدی کے نام سے ایک واقعہ ایسا روایت کرتا ہے جس کے سننے سے مسلمانوں کا بدن کانپتا ہے۔ حاصل کلام اس کا یہ ہے کہ مہمانوں اور دوستوں کے لیے باندیوں اور حرموں کی شرمگاہ کی عاریۃ دینے میں بڑا ثواب ہے۔ اور عمدہ عبادات میں سے ہے۔

(شیعہ کے نزدیک متعہ بہت ہی بڑا کار ثواب ہے) ادھر متعہ کا آوازہ اور اس کے فضائل کا شور تو بھی نے سنا ہو گا یہی وجہ ہے کہ سینکڑوں سنی شیعہ ہوئے چلے جاتے ہیں اور کیوں نہ

بقیہ حاشیہ :: ۱۔ عن الحسن العطار قال سالت اباعبد اللہ علیہ السلام عن عاریۃ الفرج قال لا بأس (استبصار ص ۱۳۸/۳)

حسن عطار کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے شرمگاہوں کو عاریت دینے کے بارے میں پوچھا انہوں نے کہا کچھ حرج نہیں۔

۲۔ عن عبد الکریم عن ابی جعفر علیہ السلام قال قلت لہ الرجل یحل لاخیہ فرج جاریتہ قال نعم لہ ما احلّ لہ منہا۔ (کافی ص ۲۹۸/۵ تہذیب الاحکام ص ۲۴۲ استبصار ص ۱۳۶)

عبد الکریم کہتے ہیں میں نے ابو جعفر علیہ السلام سے اس آدمی کے بارے میں پوچھا جو اپنی باندی کی شرمگاہ اپنے کسی بھائی کے لیے حلال کر دے تو فرمایا اس کے لیے حلال ہے جو اس نے حلال کیا۔

۳۔ عن الفضیل بن یسار قال قلت لابی عبد اللہ علیہ السلام جعلت فداک ان بعض اصحابنا قد روی عنک انک قلت اذا احل الرجل لاخیہ جاریتہ فھی لہ حلال؟ فقال نعم قلت لہ فما تقول فی رجل عندہ جاریۃ نفیسۃ وھی بکر احل لاخیہ مادون فرجھا الہ ان یقتضّھا؟

فضیل بن یسار کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادق علیہ السلام کہا آپ پر میری جان قربان ہو ہمارے بعض اصحاب نے آپ سے روایت کی ہے کہ آپ نے کہا ہے جب کوئی آدمی اپنے کسی بھائی کے لیے اپنی لونڈی حلال کر دے وہ اس کے لیے حلال ہے تو انہوں نے کہا ہاں میں نے کہا میں نے کہا آپ اس آدمی کے بارے میں کیا کہتے ہیں جس کے پاس ایک خوبصورت لونڈی ہو اور باکرہ (کنواری) ہو اس لونڈی کو اپنے کسی بھائی کے لیے فرج کے علاوہ حلال کرے

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۷۴ پر)

ہوں جیتے جی یہ مزے اور مرنے کے بعد وہ مرتبے کہ حضرات ائمہ کا مرتبہ نصیب ہو۔ قطرات غسل سے فرشتے پیدا ہوں۔ ایسا دین اور ایسا ایمان تو قسمت ہی سے ملتا ہے۔ اعتبار نہ ہو تو تفسیر میر فتح اللہ شیرازی میں اس آیت فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (پ۵ ع ۱) کی تفسیر میں دیکھ لیں میں نے تو کچھ بھی نہیں لکھا۔ انہوں نے تو وہ فضائل نقل کئے ہیں۔ کہ جن کے سننے کے بعد رمضان کی طرف سے جدا جی ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔ جہاد کی قدر جدا ہی جی سے نکل جاتی ہے بلکہ کوئی عبادت متعہ کے سامنے آنکھوں میں نہیں جچتی۔ غرض ایسی ایسی لذتوں کی بدولت اس مذہب کی رونق ہوئی ورنہ جہاد و اجتہاد ائمہ تو معلوم۔ جس سے یہ فروغ ہوتا۔ اور کہہ سکتے کہ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جہادوں سے اسلام کو فروغ ہوا۔ اماموں کے جہادوں سے مذہب شیعہ کو ترقی ہوئی۔

(بقیہ حاشیہ

قال لا لیس لہ الا ما احل لہ منہا لو احل لہ قبلۃ منہا لم یحل لہ ماسوی ذلک، قلتُ ارأیتَ ان احل لہ مادون الفرج فغلبتہ الشہوۃ فافتضہا قال لا ینبغی لہ ذلک قلتُ فان فعل ایکونُ زانیاً ؟ قال لا ولکن یکون خائناً الا (کافی ص ۴۶۸ ج ۵ طبع تہران)

کیا وہ اس کی بکارت زائل کر سکتا ہے؟ فرمایا نہیں یہ اس کے لیے روا نہیں سوائے اس کے جو اس نے حلال کر دیا فضیل کہتے ہیں میں نے کہا آپ کیا فرماتے ہیں۔ اگر اس کے لیے فرج کے علاوہ حلال کیا تو اس آدمی پر شہوت ۔ نے غلبہ کیا اور اس نے اس لونڈی کی بکارت زائل کر دی امام نے کہا یہ اس کے لیے مناسب نہیں میں نے کہا اگر اس نے ایسا کیا تو کیا زانی ہوگا؟ امام نے کہا نہیں خائن ہوگا۔

(۴) عن ابی عبد اللہ علیہ السلام اذا احل الرجل للرجل من جاریتہ قبلۃ لم یحل لہ غیرہا فان احل لہ منہا دون الفرج لم یحل لہ غیرہ وان احل لہ الفرج حل لہ جمیعہا ۔ (کافی ص ۴۶۹ ج ۵ مطبوعہ تہران)

امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی کے لیے اپنی لونڈی کا بوسہ حلال کر دے تو اس کے لیے سوا بوسہ کے اور کچھ حلال نہیں اگر شرمگاہ کے علاوہ حلال کر دے تو اس کے لیے اس کے علاوہ کچھ حلال نہیں اگر شرمگاہ حلال کر دے تو اس کا تمام بدن حلال ہے۔ ۱۰ محرم

(سورۂ مومنون اور سورۂ معارج کی آیات میں صرف منکوحہ اور لونڈی حلال ہیں لیکن متعہ والی عورت کسی قسم میں داخل نہیں)

لیکن باایں ہمہ صاف کلام اللہ کے مخالف (پ ۱۸) سورۂ مومنون (ع ۱) اور سورۂ معارج (پ ۲۹ ع ۲) میں دیکھئے یوں فرماتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ

(اور جو اپنی شہوت کی جگہ کو تھامتے ہیں مگر اپنی عورتوں پر یا اپنے ہاتھ کے مال باندیوں پر سو ان پر نہیں کچھ الزام پھر جو کوئی ڈھونڈے اس کے سوا سو وہی ہیں حد سے بڑھنے والے۔)

جس کا ماحصل یہ ہے کہ جو لوگ بی بی اور باندی کے سوا اور کسی سے صحبت کریں تو وہ لوگ حد سے نکل جانے والے ہیں اور ظاہر ہے کہ متعہ کی عورت نہ بی بی ہے نہ باندی۔ بی بی تو اس لیے نہیں کہ بشہادت آیت فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ نکاح چار (عورتوں) سے زیادہ نہیں اور متعہ میں شیعوں کے نزدیک یہ قید نہیں۔

اور لفظ نکاح سے زوجیت ثابت نہیں ہوتی تو اس ہٹ دھرمی کا کیا علاج ہے کہ سورت نساء کے دوسرے رکوع میں فرماتے ہیں وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ (اور عورتوں کے لیے چوتھائی مال ہے اس میں سے جو چھوڑ مرو تم) اور لَهُنَّ کی ضمیر اَزْوَاجُكُمْ کی طرف راجع ہے جو پہلی آیت میں مذکور ہے۔ اور ازواج سب جانتے ہیں کہ بی بی کو کہتے ہیں۔ غرض جو لفظ ازواج سورۂ مومنون اور سورۂ معارج میں ہے وہی سورۂ نساء میں ہے۔ سو سورۂ نساء میں ازواج کی نسبت میراث میں در صورتیکہ اولاد نہ ہو رُبُعْ، اور اولاد ہو تو ثُمُنْ، فرماتے ہیں۔

سو متعہ کی عورت اگر ازواج میں داخل ہوتی تو اس کو میراث بقدر مذکور ملا کرتی۔ حالانکہ باتفاق شیعہ، متعہ کی عورت وارث نہیں ہوتی۔ علیٰ ہذا القیاس اور احکام مثل عدت، طلاق عدل وغیرہ کی جو بہ نسبت ازواج کلام اللہ میں مذکور ہیں متعہ کی عورت کی نسبت شیعہ تجویز نہیں کرتے اگر اندیشہ تطویل نہ ہوتا تو میں ہی سب کو بتلاتا۔ مگر یوں سمجھ کر کہ کلام اللہ موجود ہے پڑھنے والے خود دیکھ لیں گے اسی پر اکتفا کی جاتی۔ بالجملہ زن متعہ داخل ازواج تو نہیں چنانچہ خود شیعہ بھی اپنی کتابوں میں زن متعہ کو ازواج میں شمار نہیں کرتے۔

باقی رہا باندی ہونا اس کے ابطال کی کچھ حاجت نہیں۔ خود ظاہر ہے کون کہہ دے گا کہ زن متعہ باندی ہے ورنہ بیع، شراء، ہبہ، عتق وغیرہ سب احکام جاری ہوتے۔ جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ زن متعہ زوجہ ہے نہ باندی تو متعہ کرنے والے منجملہ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ہوئے یا نہ ہوئے؟ یعنی منجملہ ظالمین جو بمعنی عادین ہے۔ اب غور فرمائیے کہ یہ مسئلہ بالاتفاق (شیعہ) منجملہ عبادات ہے سبحان اللہ سُنیوں پر ان باتوں پر طعن جو ان کے ہاں اگر ہیں تو منجملہ مباحات ہیں نہ عبادات، پھر وہ بھی اختلافی نہ اتفاقی اور وہ بھی اجتہادی ہے نہ یہ کہ بحوالہ نصوص قرآنی یا نصوص احادیث۔ پھر ان میں بھی کوئی بات خلاف عقل ونقل نہیں بلکہ عقل ونقل دونوں اس کے مؤید ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان شاء اللہ عنقریب ہی واضح ہوا جاتا ہے۔ اور اپنی خبر نہیں لیتے کہ صریح زنا مخالف قرآن شریف پھر اس کو یہ بھی نہیں کہ مباح کہہ کر چپ ہو رہیں بروایت ائمہ اس کے فضائل بھی بیان کریں۔ پھر فضائل بھی ایسے ویسے نہیں کہ انسان گرفتار ہوا و ہوس تو درکنار فرشتہ بھی ہو تو ان فضائل کو سن کر لوٹ پوٹ ہو جائے اور متعہ کرنے کو تیار ہو آدمی ہو کر پر طعن کرے تو اپنی خبر لے لے۔

(شاید متعہ کسی بھی مذہب و ملت میں جائز نہ ہوا ہو)

حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر آج تک اس فحش صریح کا یہ اہتمام کسی مذہب، کسی ملت، کسی دین، کسی آئین، میں نہ ہوا ہوگا۔ پھر اس پر طرہ یہ ہے کہ بعض روایتوں سے تو اجازت عام معلوم ہوتی ہے۔ کہ کنواریاں اور رانڈیں ہی نہیں خاوند والیاں بھی اس عیش ونشاط سے اپنا جی ٹھنڈا کر لیں۔ پھر وہ بھی ایک ہی سے نہیں۔ پانچ دس مردوں سے اختیار ہے چنانچہ علی بن احمد بیتی جو شیعوں میں بڑے جلیل القدر عالم تھے۔ اس پر فتوےٰ دے مرے کہ متعہ دوریہ یعنی ایک عورت کئی مردوں سے متعہ کر لے جائز ہے اور وہی کیا اور بھی بڑے بڑے عالم ان کے ہم زبان ہیں، علیٰ ہذا القیاس اصح علمائے شیعہ کے نزدیک یہی ہے کہ خاوند والیوں کو بھی متعہ جائز ہے۔ اور اگر یہ بات شیعان زمانہ بروئے نقل بالفرض تسلیم نہ کریں تو بروئے عقل تو قابل تسلیم ہی ہے۔ اگر مجتہدین اولین کے خیال میں اس قسم کے متعہ کی اباحت نہیں آئی۔ تو مجتہد العصر کو تجدید دین فرمانی چاہیے۔ وجہ اباحت اگر ذہن میں نہ آئی ہو تو یہ خاکسار عرض پرداز ہے۔ پھر شکرانہ احسان ضروری ہے۔

(نکاح معاملات کے قبیل سے ہے اور متعہ عباداتسے اس لیے متعہ میں تعداد محدود نہیں) نکاح میں جو عورت کے لیے تعدد ازواج جائز نہیں تو یہ وجہ ہے کہ نکاح از قسم معاملات ہے۔ بیع شرا کی طرح جس سے معاملہ ہو گیا ہو گیا۔ منجملہ عبادات میں نہیں جو ثواب کی امید ہو اور تائید ثواب کے لیے دس پانچ سے کیا جائے اور ترویج دین کے لیے خاوند والیوں کو اجازت دی جائے ہاں بحمد اللہ نعوذ باللہ متعہ میں ماشاء اللہ نعوذ باللہ یہ فضائل ہیں کہ نہ پوچھیے ایک متعہ میں حضرت سید الشہدا رضی اللہ عنہ کا دوسرے میں حضرت سبط اکبر رضی اللہ عنہ کا تیسرے میں حضرت امیرؑ کا چوتھے میں خود مقام سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نصیب ہوتا ہے اور غور کیجئے تو بقیاس صاحب پانچویں مرتبہ میں خدائی کی امید۔ وہ وعدہ نہ سہی پر قطرات غسل سے ملائک کا تولد کس قدر موجب برکات ہو گا۔ وہ ملائک اس احسان کے بدلے کیا کچھ عرق ریزیاں دعا و استغفار میں کریں گے اور ان کی تسبیحات کا ثواب بے پایاں کیا حلوا بے دود کی طرح مفت ہاتھ آئے گا۔ سند مطلوب ہے تو تفسیر میر فتح اللہ شیرازی ملاحظہ فرمائیے الغرض یہ فضائل متعہ اس بات کو مقتضی ہیں کہ جس قدر ہو سکے دریغ نہ کیجئے۔ عورت کی طرف دیکھیے تو اس کے حق میں متعہ کا کرنا مردوں کے حق میں بڑی فیض رسانی ہے۔ اگر وہ نہ کریں تو مردوں کو یہ فضائل کیوں کر میسر آئیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس مردوں کی طرف دیکھیے تو ان کا متعہ کرنا عورتوں کے لئے فیض کا کام ہے۔ سو اس فیض کو طرفین میں عام ہی رکھنا چاہیئے۔

(متعہ کو نکاح پر قیاس کرنا باطل ہے کیونکہ عورتیں بمنزلہ کھیتی کے ہیں اور متعہ کی صورت میں تقسیم اولاد ممکن نہیں) اور نکاح پر قیاس نہ فرمائیں کیونکہ وہاں مقصود بالذات توالد و تناسل ہوتا ہے۔ تحصیل فضائل نہیں ہوتا نکاح کی عورت بمنزلہ زمین زراعت ہوتی ہے۔ چنانچہ خود حضرت خداوند تعالیٰ بھی یہی ارشاد فرماتا ہے نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ۔

سو اس زمین میں اگر دس پانچ کا اشتراک ہو گا تو اس کی پیداوار بھی اعنی اولاد بھی مشترک ہو گی اور بایں نظر کہ مقصود بالذات اس زمین سے جسے بی بی کہیئے۔ یہ پیداوار ہے جسے اولاد کہیئے سو جیسے زمین اصلی سے اس کی پیداوار مقصود ہوتی ہے یہاں بھی ہر کوئی اس پیداوار کا خواستگار

ؔ فضائل متعہ عند الشیعہ کو مذکورہ حوالے صـ $\frac{228}{2}$ پر تفصیلاً مع اصل عبارات و صفحہ نمبر درج کر دیے ہیں۔ ملاحظہ فرمالیں۔ ۱۲۔ محمد اشرف)

ہوگا اور نیز خواہش طبعی تو لد اولاد بھی اسی کو مقتضی ہے پھر بوجہ محبت طبعی یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کو لیجیے اس کو نہ لیجیے جو سب میں یوں تقسیم ہو جائے کہ در صورت تعدد اولاد ایک بچہ ایک لے لے اور دوسرا بچہ دوسرا لے لے۔ اور نہ یہ ہو سکے کہ ہر ہر بچہ کو کانٹ چھانٹ کر گوشت کی طرح تقسیم کرلیں جیسے در صورتیکہ ایک ہی بچہ ہو صورت تقسیم یہی نظر آتی ہے اس لیے چار و ناچار نکاح میں مردوں کا تعدد تو ممکن نہ ہوا ہاں عورتوں کے تعدد میں کچھ خرابی نہ تھی۔ پر متعہ میں مقصود بالذات اولاد ہوتی ہی نہیں بلکہ قضاء حاجت اور تحصیل ثواب یا دوسرے کی حاجت کا روا کر دینا اور ثواب کا کام کرا دینا (ہوتا ہے) بلکہ بعض صورتوں میں تحصیل اولاد ممکن ہی نہیں۔ جیسے ایک ایک دو دو شب کے لیے کوئی عورت روز متعہ کرتی رہے، اس لیے کہ ایسی صورت میں اوّل تو بوجہ کثرت مجامعت جیسے رنڈیوں کی اولاد بہت کم ہوتی ہے اولاد ہی کیوں ہوگی اور اگر ہوگی بھی تو کبھی کی ہوگی کسی ایک کی کیونکر کہہ دیجیے جو اس کے حوالہ کر دیجیے پھر اولاد مقصود نہ ہوئی تو وہی قضاء حاجت و تحصیل و ثواب یا دوسرے کی حاجت روائی اور تائید کا ثواب باقی رہ گئے۔

سو اس کی ممانعت قرین عقل و نقل ہرگز نہیں فیض اور ثواب کا کام ہے جس قدر ہو سکے غنیمت ہے ایک سے کرنے میں ایک کا فیض اور ایک کا ثواب ہوگا تو دس اور دس پانچ سے کرنے میں زیادہ ہی فیض اور زیادہ ہی ثواب ہوگا۔

(خاوند والی عورت کے متعہ میں اشتباہ اولاد مقصود نہیں کیونکہ الولد للفراش)

علیٰ ہذا القیاس خاوند والیوں اور ان کے خاوندوں کے حق میں متعہ میں مضرت مفقود اور منفعت موجود ہے عورت کے حق میں اپنی قضاء حاجت جدا دوسرے کی حاجت روائی جدا اپنا ثواب جدا دوسرے کے ثواب میں شریک ہو جانا جدا۔ پھر خاوند کے لیے بے محنت بچوں کی اُمید بے بوئے جوتے کھیتی پکی پکائی ہاتھ آگئی اس سے زیادہ اور کیا نفع ہوگا غرض جو وجہ ممانعت تعدد ازواج عورت کے حق میں نکاح میں تھی یہاں اصلاً نہیں پھر تجدید دین کو کیوں ہاتھ سے دیجیے اور کاہے کو اس فتویٰ فیض سے احتراز کیجیے۔ بالجملہ اپنے گھر کا تو یہ حال پھر شیعہ امام ابو حنیفہ رح اور امام شافعی رح پر طعن کریں تو یہ کریں کہ ایک نے تو شراب کو حلال فرمایا دوسرے نے اولاد الزنا کو (نکاح میں) حلال بتایا۔

(امام اعظم ابو حنیفہؒ نے شراب کو حلال نہیں کہا) صاحبو! امام ابوحنیفہؒ نے اگر شراب کو حلال کہاہے تو مطلق شراب کو حلال نہیں کہا ہے۔ حالت اضطرار میں حلال کہا ہے جس میں خود خداوند کریم نے مردار وغیرہ محرمات کو حلال کہا ہے اعتبار نہ آئے تو سورہ مائدہ کے پہلے رکوع کی آیت حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ سے لے کر فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ تک تلاوت فرمائیں۔ آیت حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ سے اگر مردار وغیر محرمات کا حرام ہونا معلوم ہو گا تو آیت۔

فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّاِثْمٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (پ ۶ مائدہ ع ۶)

(پھر جو کوئی لاچار ہو جاوے بھوک میں لیکن گناہ پر مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے)

سے انہی محرمات کا حالت اضطرار میں جواز معلوم ہو جائے گا۔ سو حضرات شیعہ ہی انصاف فرمائیں کہ امام ابوحنیفہؒ نے ایسے وقت میں اگر شراب کو حلال فرمایا تو خدا ہی کے اشاروں پر چلے کچھ خدا کی مخالفت تو نہیں کی جو اس قدر رنج و ملال ہے مگر ہاں شاید حضرات روافض کو خود جناب احکم الحاکمین پر اعتراض ہو اور نہیں تب اب کریں گے۔ خیر اگر یہ ہے تو ہمیں بھی شکایت نہیں اور جواب کی کچھ حاجت نہیں فقط اس وقت یہ ایک شعر کافی ہے۔ ؎

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی گو مشت خاک ما ہم بر باد رفتہ باشد

بایں ہمہ امام ہمام نے بوقت مذکور اگر کہا ہے تو حلال ہی کہا ہے۔ فرض، واجب، سنت، مستحب تو نہیں کہا جائز ہی فرمایا ہے۔ مستوجب حصول درجات ائمہ اطہار و سید ابرار صلی اللہ علیہ و علی آلہ و اصحابہ اجمعین تو نہیں فرمایا۔ متعہ کے برابر کر دیتے تو جائے اعتراض تھی کہ ایسی ناپاک چیز کو ایسے پاک کام کے برابر کر دیا فقط جواز پر اس قدر ترش رو ہونا مناسب نہیں۔

(امام شافعیؒ کی طرف سے حرمت مصاہرۃ کا جواب) رہے امام شافعیؒ انہوں نے اگر اولاد الزنا کا نکاح جائز فرمایا۔ تو بایں نظر فرمایا کہ زنا سے نسب ثابت نہیں ہوتا چنانچہ میراث کا نہ ملنا اس کی دلیل ہے پھر حرمت نسب و مصاہرہ ثابت کیوں ہو گی۔ اور میں جانتا ہوں انہوں نے کچھ بے جا نہیں کہا۔ قطع نظر اس کے کہ نسب جیسی نعمت جس کے نعمت ہونے پر ادھر اپنا وجدان، ادھر دوسری آیت قرآن واقعہ سورہ فرقان۔

وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ بَشَرًا فَجَعَلَهٗ

(اور وہی ہے جس نے بنایا پانی سے آدمی پھر ٹھہرایا اس

کے لیے حد اور سسرال اور تیرا رب سب کچھ کر سکتا ہے)

دو شاہد عادل گواہ ہیں، ایسے فعل قبیح سے جسے زنا کہتے ہیں کیونکہ ثابت ہو ورنہ زنا بھی منجملہ انعامات
ہو محرمات نہ ہو۔ متعہ کو دیکھا کہ باوجود کثرت فضائل و فور محامد عظمت ثواب ثبوت نسب نہیں۔
چنانچہ اولاد متعہ کو میراث نہیں پہنچتی، پھر جب شیعوں کے نزدیک متعہ ثبوت نسب نہ ہوا۔ امام شافعیؒ
اس پر قیاس کر کے زنا کو ثبوت نہ سمجھیں تو خفا ہونے کی بات نہیں، شیعوں کو تو آفرین و تحسین کرنی
چاہیئے۔ ہاں یہ شکایت ہو تو بجا ہے کہ زنا متعہ کے ساتھ زنا مشہور کی اتنی برابری میں بھی بے ادبی ہے
زنا متعہ کجا زنا مشہور کجا۔ پھر زنا معلوم کو ایسے زنا کے ساتھ جو عبادت ہو اتنا بھی مشابہ نہ رکھنا چاہیئے
مگر یہ شکایت اور یہ اعتراض ہے تو اہل سنت کے پاس اس کا جواب نہیں اور ہے تو یہ ہے۔

"جواب جاہلاں باشد خموشی"

لیکن شیعہ انصاف کریں تو جائے شکایت نہیں۔ ہاں زنا معلوم کو فضائل میں زنا متعہ کے برابر
کر دیتے تو بے جا تھا۔ اب کیا ہے ابھی زمین و آسمان کا فرق باقی ہے اور ان سب باتوں کو جانے
دیجئے امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ سنیوں کے نزدیک، شیعوں کے سے امام نہیں جو ان کی غلطی سے سنیوں
کا کوئی رکن مذہب ڈھ جائے۔

(شیعہ مذہب کے اصول بھی قرآن پاک سے ٹکراتے ہیں)

علاوہ بریں مسائل مذکور کچھ اصول احکام مذہب اہل سنت اور مسائل متفق
علیہ میں سے نہیں پھر ان کی حلت حرمت بھی ایسی زبان زد عام نہیں
ہاں ائمہ شیعہ کی روایت سے ثابت، جن کی طرف بطور شیعہ احتمال خطا ممکن نہیں۔ پھر مسائل متفق علیہا
اور اصول مذہب میں سے اگر کوئی اس مسئلہ کو نہ مانے تو شیعہ ہی نہیں تو اس پر اس کا حال اور اس کی حلت
ایسی واضح کہ کسی پر مخفی نہیں۔ اب لازم یوں ہے کہ ہمارے اس اعتراض کا جواب دیجئے ورنہ یہ شرط
انصاف نہیں کہ دوسروں سے تقاضا کریں اور اپنے آپ آئیں بائیں بتلائیں۔ باقی فروع کو بھی اسی
پر قیاس کیجئے ؎ تو قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔

یہ اصول سو اصول کی کچھ نہ پوچھئے ائمہ کو ان کے اعتقاد کے موافق علم ازل و ابد اور اپنی موت
وحیات کا اختیار جس کے بطلان پر بیسیوں آیتیں کلام اللہ کی گواہ۔ زیادہ کی فرصت نہیں ایک
ایک آیت دونوں کے بطلان کے لیے پیش کش ہے۔ اول کے لیے۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ

(تو کہہ خبر نہیں رکھتا جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کی مگر اللہ اور ان کو خبر نہیں کب جی اٹھیں گے)

جو (پ ۲۰) سورہ نمل (رکوع ۵) میں واقع ہے اور دوسرے مسئلہ کے ابطال کے لیے،

اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (پ ۱۱ یونس ع ۵)

(جب آپہنچے گا ان کا وعدہ پھر نہ پیچھے سرک سکیں گے ایک گھڑی اور نہ آگے سرک سکیں گے۔)

جو کئی جا لفظ فاء کی تقدیم و تاخیر کے ساتھ واقع ہے۔ سوا اس کے اور کچھ حاجت نہیں مشتے نمونہ خروارے۔ ہاں اگر اس بات کا اعتبار نہ ہو کہ شیعہ کا یہ مذہب اور یہ اعتقاد ہے یا نہیں تو کلینی کو ملاحظ فرمائیں اور پھر یہ فرمایئے کہ سنیوں کو تو ذرا سی مخالفت کلام اللہ پر اتنے طعنے پھر وہ مخالفت بھی موافق

لہ شیعہ محدث کلینی باب قائم کرتے ہیں " ان الائمۃ علیہم السلام یعلمون متی یموتون وانہم لا یموتون الا باختیار منہم " یعنی ائمہ اپنی موت کے وقت سے باخبر ہوتے ہیں اور وہ اپنے اختیار سے ہی مرتے ہیں۔ اسی باب کے نیچے روایت نقل کی ہے۔

قال ابو عبد اللہ علیہ السلام ای الامام لا یعلم ما یصیبہ والی ما یصیر فلیس ذلک بحجۃ اللہ علی خلقہ (کافی ص ۲۵۸/۱ طبع تہران)

امام جعفر صادق نے فرمایا جو امام اپنے آئندہ پیش آنے والے حالات و واقعات سے باخبر نہ ہو وہ اللہ کی طرف سے اس کی مخلوق پر حجت نہیں۔

اسی طرح کلینی نے دوسرا باب قائم کیا ہے: باب: ان الائمۃ علیہم السلام یعلمون ما کان وما یکون وانہ لا یخفی علیہم الشیٔ صلوات اللہ علیہم، یعنی ائمہ ازل سے ابد تک کا علم جانتے ہیں اور ان پر کوئی چیز مخفی نہیں رہتی۔ اس باب کے نیچے کلینی اپنی سند کے ساتھ روایت نقل کرتے ہیں۔

لہ عن سیف التمار قال کنا مع ابی عبد اللہ علیہ السلام جماعۃ من الشیعۃ فی الحجر فقال علینا عین؟ فالتفتنا یمنۃ ویسرۃ فلم نر احداً فقلنا لیس علینا عین فقال و رب الکعبۃ ورب البنیۃ ثلاث مرات۔

سیف تمار کہتے ہیں امام جعفر صادق شیعہ کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے تھے تو انہوں نے کہا کہ ہماری کوئی جاسوسی کر رہا ہے پس ہم نے دائیں بائیں توجہ کی تو ہم نے کسی کو بھی نہ دیکھا ہم نے کہا ہماری کوئی بھی جاسوسی نہیں کر رہا تو امام نے کہا کعبہ کے رب اور عمارت

(باقی صفحہ ۳۸۲ پر)

مصرع مومن سے میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا۔
اپنے ہی قصور فہم سے مخالفت معلوم ہوتی ہے اور اپنی خبر نہیں لیتے کہ اصول سے فروع تک جتنے مسئلے ہیں سب کے سب کلام اللہ کے مخالف اور پھر مخالفت بھی کیسی کچھ۔ کہ الہٰی پناہ! موافقت کے لیے دوسرا ہی کلام اللہ (امام غار والا) چاہیئے اس کلام کی موافقت تو معلوم واللہ اعلم۔

(سوال پنجم

حضرات اہل سنت شیعوں کی عزاداری امام حسین ؑ میں سیہ پوشی اور سینہ زنی پر معترض رہتے ہیں۔ حالانکہ خانہ کعبہ کا غلاف کالا ہے۔ اور جلال الدین سیوطی کے فتویٰ سے خلفاء عباسیہ شاہانہ سیاہ لباس استعمال کرتے تھے)

بقیہ حاشیہ

لو کنت بین موسیٰ والخضر لاخبرتهما انی اعلم منهما ولانبئتهما بما لیس فی ایدیهما۔ لان موسیٰ والخضر علیهما السلام اعطیا علم ما کان ولم یعطیا علم ما یکون وما هو کائن حتیٰ تقوم الساعة وقد ورثناه من رسول الله صلی الله علیه وسلم وراثة۔ (اصول کافی صفحہ ۲۶ طبع تہران)

کعبہ کے رب کی قسم یہ انہوں نے تین مرتبہ کہا اگر میں موسیٰ اور خضر کے پاس ہوتا تو انہیں خبر دیتا کہ میں ان دونوں سے زیادہ جانتا ہوں اور انہیں وہ چیز بتاتا جو ان کے پاس نہ تھی اس لیے کہ موسیٰ اور خضر علیہما السلام کو جو کچھ ہو چکا اس کا علم تو دیا گیا اور قیامت تک ہونے والے امور کا علم انہیں نہیں دیا گیا اور ہم نے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وراثت پائی ہے۔

۲۔ سمعوا اباعبدالله یقول انی لاعلم ما فی السموات وما فی الارض واعلم ما فی الجنة واعلم ما فی النار واعلم ما کان وما یکون (کافی صفحہ ۲۶۱/۱ طبع تہران)

امام جعفر صادق سے بہت سے شیعہ راوی نقل کرتے ہیں کہ امام نے کہا بے شک میں جانتا ہوں جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور میں جانتا ہوں جو کچھ جنت میں ہے اور میں جانتا ہوں جو کچھ ہو چکا یا جو کچھ ہونے والا ہے۔ ۱۲۰۔ محمد اشرف۔

جواب سوال پنجم | اس سوال کا کیا جواب لکھئے جیسے اپنے مذہب اور اہل مذہب کی دردمندی باعث تحریر جواب ہے ایسے ہی حضرات شیعہ کی خوش فہمی پر افسوس موجب پیچ وتاب ہے۔ علماء شیعہ کو اگر اعتراض کرنا نہیں آیا تھا تو اہل سنت ہی سے سیکھ لیتے جہاں کلام اللہ کا (ان کو) استاد بنایا تھا۔ کہ اگر وہ نہ ہوتے تو پھر کلام اللہ بھی جہاں میں نہ ہوتا۔ فہم مطالب میں بھی ان ہی کی جوتیاں سیدھی کرتے۔

(دعویٰ و دلیل میں مطابقت نہیں) | دلیل کیا ہے مدلول کیا ہے۔ کجا خانہ کعبہ اور خلفاء عباسیہ کی سیہ پوشی۔ کجا حضرت سید الشہداءؓ کے ماتم کی سیہ پوشی ۔

غم میں اور فرحت میں ہے فرق زمین و آسماں کا
کھول کر آنکھیں تو دیکھو وہ کہاں اور یہ کہاں

اجی حضرات کچھ انصاف فرمایئے خانہ کعبہ پر نوحہ کرنے والوں کو کیوں کر قیاس کریں وہ خدا کا گھر یہ خدا سے بے خبر اگر خدا یاد ہوتا تو یہ گریہ وزاری اور یہ نوحہ و بے قراری نہ ہوتی خدا تو فرمائے۔

وَاصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ (پ۱۰ الانفال ع۶) (اور صبر کرو بیشک اللہ ساتھ ہے صبر والوں کے)

یہاں الٹے رونے دھونے سے کار، خدا تو فرمائے۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ (پ۴ ال عمران ع۱۵) (اور اللہ محبت کرتا ہے ثابت قدم رہنے والوں سے) یہاں اور برعکس رونی زار و نزار ہے ساجی صاحب حضرت سید الشہداءؓ سے صدمہ ہے تو صبر کیجئے خدا کی اطاعت کو ہاتھ سے نہ دیجئے اور رنج و صدمہ نہیں اور یہی سچ ہے تو دونوں نہ کیجئے اور کالے کپڑوں اور جھوٹے آنسوؤں سے دعویٰ محبت نہ کیجئے۔ اگر یہی دین و آئین ہے تو منافقین زمانہ نبوی بدرجہ اولیٰ دیندار اور مستحق کرامت پروردگار ہوں گے۔ آپ اگر اظہار محبت سید الشہداءؓ کرتے ہیں تو وہ اظہار محبت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے ان کے اگر جی میں (محبت) نہ تھی تو محبت تو آپ کے بھی جی میں نہیں

(گریہ وزاری دلیل ایمان و محبت نہیں) | باقی رہا سوز خوانی اور تصویر واقعہ کربلا سے اگر رونا آتا ہے تو اس میں آپ ہی کا کیا کمال ہوا۔ مجوس، ہنود و نصاریٰ یہود بھی اگر اس کیفیت کو سنیں تو رو اٹھیں۔ کیفیات مصائب کو سن کر تو اجنبیوں کو بھی رونا آجاتا ہے اس کو محبت نہیں کہتے چنانچہ ظاہر ہے۔ اور اسے بھی جانے دیجئے اگر یہی قیاس ہے تو کل کو بوجہ مقبولیت غم امام رضی اللہ عنہ سیہ پوشان محرم الحرام دعوائے مسجودیت کریں گے۔

رہی خانۂ کعبہ جس کی سیہ پوشی دستاویز سیہ پوشی محرم ہے قبلۂ نماز اور مطافِ
عشاق و جانگداز ہے۔ جب سیہ پوشی وہاں سے اڑائی تو قبلہ و کعبہ بننے کے لیے کون مانع ہے حضرت
قبلہ و کعبہ مجتہد العصر تو برائے نام ہی قبلہ و کعبہ ہیں، پر نوحہ کناں در سیہ پوشانِ محرم واقعی قبلہ
و کعبہ بنیں گے۔ اور حضرت قبلہ و کعبہ مجتہد العصر بھی ناچار ان کی جانب جھکیں گے۔ آخر ہم سنتے
ہیں کہ حضرت مجتہد العصر در بارہ سیہ پوشی و سینہ زنی و تعزیہ داری و مرثیہ خوانی ان اہتمام اور ان
امور خیر میں جو شعر و محبت ہیں مثل عوام کوشش و اجتہاد نہیں فرماتے۔ علیٰ ہذا القیاس مجتہدانِ گزشتہ کا حال
بھی ایسا ہی سنتے چلے آتے ہیں۔ بالجملہ قیاس کرنے کو کوئی مشابہت بھی چاہیے۔ لباس خانۂ کعبہ پر
لباس نوحہ گراں بے صبر کو قیاس نہ کرنا چاہیے۔ وہ اور قسم کی چیز، مظہرانِ غم اور قسم۔ بایں ہمہ ایک قسم میں
بھی ایک حال کا لحاظ ضرور ہے۔ بیمار کو صحیح تندرستوں پر قیاس کر کے بدپرہیزی کی چیزیں نہ کھلانی
چاہئیں اگرچہ دونوں ایک ہی قسم کی چیز ہیں۔ سو جیسے صحیح تندرستوں کو پلاؤ، زردہ، شیرمال، باقرخانی عمدہ غذا
کھلانے میں کوئی حرج نہیں اور بیمار کھائے تو خیر نہیں۔ ایسے ہی خانۂ کعبہ کے لیے سیاہ پوشی جائز ہو اور
نوحہ گروں کے لیے جائز نہ ہو تو کیا مضائقہ ہے ہاں اگر سیہ پوشی زین کے مقدمہ میں ایسی ہوتی جیسے زہر قاتل
بنی آدم کے لیے نہ صحیح تندرست کو کھانا چاہیے نہ بیمار کو تو اس وقت اس اعتراض کا موقع تھا ہم بھی
کہتے کہ جو چیز اصل سے بری ہے وہ سب کے لیے بری ہے اور سب جگہ پر بری ہے۔ مگر لباس سیاہ
کسی کے نزدیک کسی مذہب میں اصل سے برا نہیں جو یوں کہئے کہ خانۂ کعبہ کے لیے بھی برا ہے اور خلفاء
عباسیہ کے لیے بھی برا ہے۔ اس میں اگر برائی ہے تو اسی وجہ سے برائی ہے جو در باب مرثیہ خوانی جواب
سوالِ اول میں مرقوم ہو چکی۔ یعنی بایں وجہ کہ یہ کام شیعوں کے نزدیک ان کاموں میں سے ہے جس پر ثواب
کی امید ہے پھر بایں ہمہ نہ کلام اللہ میں اس کا پتہ نہ حدیث شریف میں اس کا نشان۔ کلام اللہ کا حال
تو ظاہر ہے بلکہ کلام اللہ میں اگر ہے تو صبر کی تاکید ہے نہ یہ کہ جزع فزع کیا کرو نفاق کی ممانعت ہے
نہ یہ کہ غم کی صورت بنا کر سب کو جتلایا کرو۔ چنانچہ اوپر مذکور ہو چکا۔

رہی عزاداری کی قرآن کی طرح احادیث میں بھی تائید نہیں

رہی احادیث نبوی وہ کلام اللہ کے موافق اور کیوں نہ ہو
موافق آیت شریف وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ جس کے یہ معنی ہیں کہ اتاری
ہم نے تجھ پر کتاب جس میں سب چیز کا بیان ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ احادیث میں بجز تفصیل اجمال

کلام اللہ اور شرح مشکلات قرآن اور کچھ نہ ہو گا۔ ورنہ احادیث میں سوائے کلام اللہ اگر اور بھی ایسے احکام ہوں جن کا کلام اللہ میں صراحۃً ذکر ہو نہ اشارۃً۔ تو پھر اس کی کیا صورت ہو گی کہ کلام اللہ میں سب چیز کا بیان ہے۔ سو بایں نظر کہ کلام اللہ میں صاف صاف صبر کی تاکیدیں اور نفاق کی ممانعتیں ہیں۔ اور اس قسم کے خرافات کا اصلاً ذکر نہیں جو حضرات شیعہ محرم وغیر محرم میں کرتے ہیں۔ تو اہل فہم کو یقین ہو گیا ہو گا کہ حادثہ میں جو ہو گا وہ اس کے موافق ہو گا مخالف نہ ہو گا۔ اس صورت میں اس قسم کی واہیات موافق آیت مطبوعہ

اِتَّبِعُوا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (پ ۸ اعراف ع ۱) (چلو اسی پر جو اترا تم پر تمہارے رب کی طرف سے اور نہ چلو اس کے سوا اور رفیقوں کے پیچھے)

سب ممنوع ہوں گے اور پھر موافق آیت۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (پ ۲ بقرہ ع ۲۹) (اور جو کوئی بڑھ چلے اللہ کی باندھی ہوئی حدود سے سو وہی لوگ ہیں ظالم)

ان کاموں کے کرنے والے داخل زمرہ ظالمان ہوں گے۔

(بدعت کی تعریف اور امثلہ سے اس کی تفہیم) ہاں اگر مثل خلفاء عباسیہ اور لباس خانہ کعبہ سیاہ پوشی موجب ثواب نہ سمجھتے جیسے بہت سے اہل شوق سیاہ، سبز، زرد وغیرہ الوان کے کپڑے پہنتے ہیں اور کچھ موجب ثواب نہیں سمجھتے تو یہ کام ممنوع نہ ہوتا۔ بالجملہ موافق آیات مذکورہ اور نیز موافق حدیث مشہور و مذکور۔

مَنْ اَحْدَثَ فِىْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ (بخاری ص ۳۷۱ ج ۱ مسلم ص ۷۷ ج ۲)

اور نیز موافق حدیث كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (مسلم ص ۲۸۵ ج ۱) (ہر بدعت گمراہی ہے) جو باتیں کلام اللہ اور احادیث سے ثابت نہ ہوں پھر ان کو بے ضرورت شرعیہ ثواب سمجھ کر کرے تو وہ باتیں سب منجملہ بدعات ہوں گی باقی وہ کیا چیزیں ہیں جو بوجہ ضرورت شرعیہ باوجودیکہ کلام اللہ اور حدیث میں نہیں ہوتیں موجب ثواب ہوتیں ہیں۔ تفصیل تو ان کی ممکن نہیں ہاں کوئی ایک نظیر مدنظر ہو تو بغور سنیئے۔

منجملہ ان کے توپ بندوق وغیرہ سے جہاد کا کرنا۔ دین کی کتابوں کا تصنیف کرنا ہے یعنی یہ چیزیں ہر چند کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں مگر ان کی مثال ایسی ہے جیسے طبیب نسخہ میں دو تولہ شربت بنفشہ مثلاً لکھے اور بیمار کسی سے شربت بنفشہ کی ترکیب دریافت کر کے دوائیں جمع کرے مٹھائی لائے چولہا بنائے آگ جلائے قوام پکائے شربت بنفشہ بنائے ہر چند اتنے

بکھیڑے کی نسبت نسخہ میں تصریح نہ تھی مگر بایں نظر کہ شربت بنفشہ بے اس بکھیڑے کے حاصل نہیں ہو سکتا، لاچار کرنا پڑے گا اور اس بکھیڑے کا کرنا امتثال امر طبیب سمجھا جائے گا موجب خوشنودی طبیب ہو گا۔

سو جیسے طبیب نے نسخہ میں فقط دو تولہ شربت بنفشہ ہی لکھا تھا اور اس جھگڑے کا اصلاً مذکور نہ تھا اور پھر بایں ہمہ اس کا کرنا موجب ناخوشی نہیں بلکہ اگر شربت بنفشہ تیار نہ ملے تو اس جھگڑے کا نہ کرنا البتہ موجب ناخوشی ہو گا ایسا ہی تصنیف کتب اور آلاتِ مذکورہ کی ہر چند کتاب اللہ اور احادیث نبوی میں کہیں تصریح نہیں، پر بایں نظر کہ جہاد اور علم اس زمانہ میں دونوں پر موقوف ہیں تو ان کا کرنا موجب ناخوشی نہ ہو گا بلکہ نہ کرنا موجب نارضامندی خداوند ذوالجلال اور رسول باکمال صلی اللہ علیہ وسلم ہو گا۔

(بدعت کی حسی مثال) ہاں اگر ایسی کمی بیشی ہو جیسے طبیب نے دو دوائیں لکھیں تھیں۔ یہ اس میں اپنی رائے سے ایک دو بڑھا دے یا گھٹا دے یا اوزان ادویہ میں اپنی رائے سے کمی بیشی کر دے جیسے طبیب ایسے تصرفات سے ناخوش ہوتا ہے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے تصرفات سے ناخوش ہوں گے ان کی مثال ایسی ہے جیسے فرائض خمسہ کو چار کر دیجئے یا چھ کر لیجئے یا اعداد رکعات میں تصرف کر کے دخل دیجئے مگر چونکہ معمولات شیعہ کا نہ کلام اللہ و حدیث میں کہیں پتہ ہے نہ کوئی حکم احکام شرعیہ ضروریہ میں سے اس پر موقوف بلکہ معمولات مذکورہ کے باعث صبر جو احکام ضروریہ شرعیہ میں سے ہے ہاتھ سے جاتا رہتا ہے تو لاریب حسب ہدایت مثال مذکور سب موجب ناخوشی خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔

اب سنیئے کہ جیسے کلام اللہ اور احادیث اہل سنت میں ان معمولات کا کہیں پتہ نہیں احادیث اہل تشیع بھی ان کے بیان سے خالی ہیں اس لیے علماء شیعہ جو متقی بھی ہوتے ہیں ایسی باتوں سے احتراز ہی کرتے ہیں اور اگر فرض کیجئے احادیث شیعہ میں کہیں اس قسم کا مذکور بھی ہو تو قطع نظر اس سے کہ شیعوں کے نزدیک وہ حدیثیں معتبر بھی ہیں یا نہیں۔ ان حدیثوں میں ہونا اہلسنت کے اعتراض کا دافع نہیں ہو سکتا شیعوں کی معتبر حدیثوں کو بھی اہلسنت معتبر نہیں سمجھتے جو ان میں ہونا ان کے لیے حجت ہو۔ ہاں اگر حضرت سائل سیہ پوشی خانہ کعبہ اور سیہ پوشی خلفاء عباسیہ پر قیاس فرما کر اہل سنت پر الزام نہ رکھتے اور قصد اثبات سیہ پوشی قواعد اہل سنت سے نہ کرتے تو خیر یہی کہتے کہ وہ جانیں اور ان کا کام جانے مگر ستم تو یہ ہے کہ بے وجہ اہل سنت سے حجتیں کرتے ہیں مصرع مشہور ہے ع

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

(لباسِ خلفاءِ عباسیہ سے سیہ پوشی پر استدلال صحیح نہیں)

اب گذارش دیگر یہ ہے کہ لباس خلفاء عباسیہ اگر بوجہ ماتم داری حضرت سید الشہداء تھا علیٰ ہذا القیاس استارِ خانہ کعبہ بغرض مذکور سیاہ مقرر ہوا تب تو خلفاء عباسیہ کی داد دیجئے اور اہلسنت کی فریاد نہ کیجئے اور اگر بوجہ عزاداری حضرت سید الشہداء رضی اللہ عنہ نہیں بلکہ بوجہ زیب و زینت و آرائش ہے تو آپ کو کیا زیبا ہے کہ ایسے غم میں یہ خوشی۔ پھر وہ بھی باقتدار خلفاء عباسیہ جس سے آئمہ اہل بیت نے کیا کیا رنج اٹھائے اور کیا کیا داغ کھائے اور کوئی اور وجہ ہے تو پہلے اس کی تعیین فرمایئے پھر قیاس دوڑایئے۔ مگر دل میں تو آپ بھی جانتے ہیں کہ یہ لباس خلفاء عباسیہ نے بوجہ آرائش اختیار کیا تھا کوئی صدمہ باعث سیہ پوشی نہیں ہوا۔ علیٰ ہذا القیاس خانہ کعبہ کا غلاف کسی تعزیہ میں سیاہ نہیں ہو گیا آرائش خانہ معظمہ مقصود ہے کوئی تعزیت مقصود نہیں۔ سو شیعہ حضرات کو بھی اس واقعہ پر اظہار سرور مد نظر ہو گا جو لباس زینت اختیار کیا۔ اور شاید کیوں کہیے یقینی کہیے۔ تماشہ، سرفہ، باجا، طبل، ڈھول، نفیری، روشنی، گانا، بجانا، کون سی بات شادی کی چھوڑ دی۔ فقط ایک آنکھوں کو تھوک لگا کر زور سے چلانا اور سینہ پر ہاتھ مار کر محفل کو سر پر اٹھانا غم میں شمار کر لیجئے یا بھانڈوں کا تماشہ قرار دے لیجئے۔ مگر غم کا کوئی سامان ہی نہیں۔ ہے تو شادی ہی کا سامان ہے۔ سو جیسے بوجہ شہادت سامانِ عیش و نشاط وقت شادی بھانڈوں کی کسی مصیبت کی نقل ہیں یہ چیخنے کو غم پر کوئی محمول نہیں کرتا یہاں بھی وہی سارا سامان موجود ہے۔ غم نہ سمجھئے شادی شیعہ سمجھئے۔

(شیعوں کے اصل پیشوا کون ہیں)

اور کیونکر نہ سمجھئے شیعوں کی اصل کو ٹٹولیے تو ان کے پیشوا وہی ہیں جنہوں نے اوّل حضرت سید الشہداء کو کربلا رضی اللہ عنہ کو بلایا پھر دغا دے کر عبید اللہ بن زیاد کے ساتھ ہو کر حضرت کو قتل کروایا۔ سو ان کو اور ان کی امت کو خوشی نہ ہو گی تو اور کیا ہو گا۔ اور اسے بھی ایک طرف رکھیے۔ ہم پوچھتے ہیں حضرت سید الشہداء کا اظہارِ غم ہی چاہیئے۔ مثل اہلسنت صبر کر کے اس غم میں دل کو نہ جلایئے۔ پر یہ تو بتایئے کہ یہ قاعدہ اظہارِ غم کا کہاں سے اڑایا۔ اللہ تعالیٰ نے مثل قواعدِ دین اس کے لیے کوئی قاعدہ نہیں بنایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم نہیں فرمایا۔ بجز اس کے کہ نصاریٰ سے یہ بات اڑائی ہو اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نصرانیوں میں اظہار غم کے لیے اس قسم کے احکام صادر ہوئے ہیں۔ مگر اہل دانش جانتے ہوں گے کہ میور صاحب کے مارے جانے میں جو حکم سیہ پوشی ہر عام و خاص

کو ہوا تھا تو ان کے دل میں اس بات سے غم نہیں گھس گیا تھا بلکہ فقط ایک نفاق ہی نفاق تھا خیر یہ تو بھی جانتے ہیں کہ ان باتوں سے دل میں غم نہیں آجاتا۔

(حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت علیؓ کی مشابہت اور دو گمراہ فرقوں کا ظہور)

اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا، کہ مثل حضرت عیسیٰ علیہ السلام وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام ایک قوم تمہاری محبت میں ہلاک ہو گی اور ایک قوم تمہاری عداوت میں (مسند احمد ص۱۶۰ ج۱) روافض وخوارج نے سچ کر دکھایا یعنی اگر خوارج نے در بارہ عداوت حضرت امیر رضی اللہ عنہ یہود کی پیروی اختیار کی تھی۔ حضرات شیعہ در بارہ افراطِ محبت نصاریٰ کے قدم بقدم چلے۔ نصیریہ نے تو صاف صاف حضرت امیرؓ کی خدائی کا اقرار کیا۔ اور اثنا عشریہ نے گو اس طرح بے پردہ اقرار نہ کیا پر بوجہ اثبات علم غیب وغیرہ پردہ میں خدائی کا اقرار کیا۔ کیونکہ علم غیب بشہادت کلام اللہ چنانچہ مذکور ہو چکا خدائی کو ایسی طرح لازم ہے جیسے آفتاب کو دھوپ۔ سو جیسے دھوپ سوا آفتاب اور کسی چیز میں نہیں ایسے ہی علم غیب سوائے خداوند علیم کسی اور میں نہ سمجھنا چاہیئے اور کوئی سمجھے تو یوں سمجھو کہ یہ شخص اس کو خدا سمجھتا ہے۔

(شیعہ فرقہ کی حضرت امام حسینؓ سے محبت عیسائی فرقہ کی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ محبت کے مشابہ ہے)

نصرانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سولی پر چڑھنے کو اپنے گناہوں کے لیے کفارہ سمجھتے ہیں۔ حضرات شیعہ حضرت سید الشہداءؓ کے خون کا خون بہا شیعوں کی مغفرت خیال کرتے ہیں اور ان کے یہاں حضرت مسیح کی حاضری ہوتی ہے۔ جس میں نان وشراب کو بلفظ گوشت وخون مسیح علیہ السلام تعبیر کر کے نوش کرتے ہیں۔ یہاں باحتمال اختلاط خون سید الشہداء خاک کربلا کو پانی شربت میں گھول کر حضرت کا خون پیتے ہیں اور کیوں نہ پئیں حضرت کے خون کے پیاسے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس اور چال ڈھال کو خیال کیجئے تو بالکل وہی نسبت ہے جو کہا کرتے ہیں ؎ سگ زرد برادر شغال۔

فرصت نہیں ورنہ میں ہی تفصیل کر دیتا۔ ایک اظہار غم کے لیے سیہ پوشی رہ گئی تھی سو وہ بھی امام ہمام رضی اللہ عنہ کے غم کے بہانہ کر دکھائی۔

(جلال الدین سیوطیؒ پر طعن کا جواب)

باایں ہمہ یہ تو فرمایئے کہ امام جلال الدین پر یہ اعتراض تو کیا، پر نشان کتاب کیوں نہ بتایا۔ مصرعہ۔ انکار سے ہے صاف اس نیرے اقرار سے ظاہر۔

اور ہم کہتے ہیں کہ جلال الدین سیوطیؒ نے خلفاء عباسیہ کے لیے فتویٰ سیہ پوشی ہی دیا پر یہ فرمایئے مثل سیہ پوشی محرم موجب ثواب تو نہیں فرمایا جو آپ کو گنجائشِ قیاس ہو۔ اس کے سوا آپنے جو بھاگتے ہوئے اور ایک پشتنگ مارا اور یہ فرمایا "کہ جلال الدین سیوطیؒ نے خلفاء عباسیہ کو اولوالامر قرار دیا" اس کی کیا حاجت تھی اگر اختیار باعتبار ظاہر لیتے ہو تو اس میں کچھ کلام ہی نہیں آپ بھی جانتے ہیں کہ وہ خلیفہ تھے۔ آپنے سوال ہی میں ان کو بلقب خلفاء عباسیہ یاد کیا ہے پھر امام جلال الدین نے اگر ان کو اولی الامر کہہ دیا تو کیا گناہ ہے اور اگر باعتبار وجوہ استحقاق لیجیے۔ یعنی، قریشیت، صلاحیت تقویٰ وغیرہ جن کی فراہمی سے خلیفۂ وقت، خلیفہ راشد کہلاتا ہے۔ تو اس کو آپ بھی جانتے ہیں کہ اہل سنت وجماعت میں سے کوئی بھی ان کو خلیفہ راشد نہیں کہتا بلکہ اکثروں کو ملوک جبارین سے سمجھتے ہیں خلفاء راشدین پورے پورے تو ان کے نزدیک پانچ ہی ہیں چار یار (جن کی خلافت موعودہ علیٰ منہاج النبوۃ تھی) اور ایک امام حسن رضی اللہ عنہم مگر ان کے خلیفہ راشد ہونے اور اوروں کے نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اور سب ظالم ہی تھے اس کی ایسی مثال ہے جیسے شیعہ کہتے ہیں کہ ولی حضرت امیرؓ ہی ہیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ گیارہ امام باقی نعوذ باللہ گنہگار رہیں۔ رہا خلفاء عباسیہ کا مصداق۔

أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (پ نساء ع ۸) (حکم مانو اللہ اور حکم مانو رسول کا اور حاکموں کا جو تم میں سے ہوں۔)

کا مصداق ہو کر واجب الاطاعت ہونا سو اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کے نزدیک خلیفہ کا مقرر کرنا بایں غرض کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا کرے یعنی ضروریات دین کو جاری کرے اور بدعات اور سیئات اور کفریات کو مٹائے چنانچہ لفظ اولوالامر بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔ سو اگر وہ اقامت دین قائم کرے تب اس کی اطاعت کرے ورنہ گناہ کے مقدمہ میں کسی کی اطاعت نہیں۔ بالجملہ جب وہ کار مذکور نہ کرے تب وہ اولی الامر ہی نہیں اگر بالکل برعکس کرتا ہے تو بالکل نہیں۔ اور اگر کسی قدر وہ اقامت دین بھی کرتا ہے تو اسی قدر وہ اولوالامر بھی ہے اتنی ہی باتوں میں اس کی اطاعت واجب ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ اگر وہ اقامتِ دین نہ کرے تو کیا کیجیے اگر صبر و تحمل اپنے اندر نظر آئے تو مثل سید الشہداء رضی اللہ عنہ اپنی جان پر کھیل جائے۔ ورنہ مثل دیگر ائمہ صبر کرے اور چوں وچرا نہ کرے۔

اس کے بعد کچھ ارشاد ہے اس کی تشبیہ میں حیران ہوں۔ بواسیر خر کہیے یا گوز شتر لکھیے بہر حال اس میں تو آپنے اسی عورت کا کام کیا ہے جو آپ گوز مار کر اوروں کے ذمہ لگایا کرتی تھی۔ خیر اس سے تو شاید آپ برا مانیں گو بُرا ماننے کا موقع نہیں ہدایت آپ کی طرف سے ہے اور یہ سنا ہی ہوگا۔ "کلوخ انداز را پاداشش سنگ است" مگر پھر ہم درگذر کرتے ہیں اور دوسرا شعر آپ کی مجرا میں نقل کرتے ہیں۔ ع

کاز لف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے بر آہوئے چین بستہ اند

(فقہ جعفریہ کے فحش مسائل) مخدوم من! ایسے کیوں بھولے بن گئے ہو۔ لف حریر کے مسئلے کی شہرت تو شرق سے غرب تک پہنچ گئی۔ سنیوں سے تو تب پھیر اٹھائی تھی جب مذہب شیعہ پر تبرا کر لیتے اور ہماری طرف سے ہمیشہ باد سن لیتے۔ مگر آپنے کچھ تو خدا کا خوف کیا ہوتا حضور رمز یہی ہے اس طوفان بے تمیزی کے لچھن بھی دیکھنے میں ہمیں پر تہمت لگائیں پھر ہمیں سے آنکھیں ملائیں یہ

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

بحر الرائق مثل کتب شیعہ نادر الوجود نہیں۔ کہیں اوّل سے آخر تک یہ بات نکل آئے کہ اس قسم کے افعال (مذکور در سوال گمشدہ) جائز ہیں تو ہم آپ کو سلام کر جائیں۔ ہاں اہل فقہ ہر قسم کے احتمالات لکھ کر ان کے احکام لکھ دیا کرتے ہیں۔ مثلاً شیعوں کے یہاں روزہ میں اگر کوئی شخص اپنی ماں کا بوسہ لے لے تو اس کے ذمہ کفارہ نہیں آتا۔ یا بیٹی سے زنا کرے اور حضرت ائمہ سے اعتقاد باقی ہے تو کافر نہیں ہو جاتا۔ سو جیسے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ بیٹی سے زنا اور ماں کا بوسہ لینا جائز ہے ایسے ہی اگر کسی سنی نے ایسی ہی (صورت فرض کر کے) کوئی بات لکھ دی تو اس سے اس کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ اہل سنت وجماعت اور شیعہ میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ روزہ رکھنا ناقض نماز نہیں اور نماز کا نہ پڑھنا ناقض صوم نہیں۔ مگر اہل فہم کے نزدیک اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ روزہ کا نہ رکھنا اور نماز کا نہ پڑھنا جائز ہے۔ ہاں شیعوں کے فہم میں اگر ایسی عبارات سے ایسے معنیٰ سمجھ میں آجائیں تو کیا بعید ہے کہ انہیں اللہ نے فہم نہیں دیا۔ مگر انہیں فہم نہیں تو ہماری بھی ان سے کلام نہیں اہل فہم سے کلام ہے بالجملہ حضرات شیعہ کی قدیمی عادات ہے کہ اپنا عیب دوسروں کے ذمہ لگاتے ہیں ؎

خطا کرد و سزا میدہی کرا جاناں۔

یہ مزید فہم و فراست شاید اغلام زنان سے ہی میسر آیا ہے جبھی اس فہم میں سارے جہان سے ممتاز ہیں یہ چیز اور سب کے یہاں حرام ہے ہاں حضرات شیعہ البتہ اس دولت بے زوال سے کامیاب ہیں یہ عقل اور یہ مضامین وہیں سے نکالے ہوں گے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ سے لے کر اس زمانہ تک جتنے انبیاء علیہم السلام گذرے ہیں ان کے دین میں یہ بات کبھی جائز نہیں ہوئی۔ جو لوگ پابند دین نہیں اپنے کسی آئین کے پابند ہیں ان میں سے کسی نے آج تک یہ بات تجویز نہیں فرمائی۔ ہاں علماء شیعہ نے زن منکوحہ اور باندی سے اغلام کرنا حلال طیب رکھا ہے چنانچہ "ارشاد" میں علامہ حلّی ارشاد فرماتے ہیں۔

والوطی فی الدبر کالوطی فی القبل فی جمیع الاحکام حتی فی تعلق النسب۔

(اور دُبر (جائے براز) میں جماع کرنا اسی طرح جیسے قبل (جائے پیشاب) میں جماع کرنا۔ تمام احکام میں حتی کہ نسب (بچہ) ثابت ہونے میں بھی)

جس کے (عند الشیعہ) یہ معنی ہیں کہ اغلام کلام اللہ میں بتصریح مذکور ہے[1] (معاذ اللہ۔ کیونکہ) نِسَاؤُكُمْ حَرْثٌ لَكُمْ جس کے کھلے ہوئے یہ معنی ہیں کہ تمہاری عورتیں تمہارے کھیت ہیں اور سب

---

[1] وطی فی الدبر یعنی عورت سے اغلام عند الشیعہ جائز ہونے کے اس کے علاوہ بھی دوسری متعدد معتبر کتب شیعہ سے ثبوت موجود ہیں۔ شیعہ کی مشہور کتاب "استبصار" میں تو ایک مستقل باب بھی اس سلسلے میں موجود ہے یہ باب اتیان النساء فی مادون الفرج " اور پھر اس باب کے نیچے مختلف سندوں کے ساتھ متعدد روایتیں جمع کی ہیں۔ چند درج ذیل ہیں۔

۱۔ عن عبد اللہ بن ابی یعفور قال سالت اباعبد اللہ علیہ السلام عن الرجل یاتی المرأۃ فی دبرھا قال لا بأس اذا رضیت (استبصار ص۲۴۳ ج۳ وتہذیب الاحکام ص۴۱۴ ج۲)

عبد اللہ بن ابی یعفور کہتے ہیں میں نے امام جعفر صادق سے اس آدمی کے بارے میں سوال کیا جو عورت سے اس کی جائے براز میں وطی کرتا ہے فرمایا جب وہ راضی ہو تو کچھ حرج نہیں۔

۲۔ عن ابی الحسن الرضا علیہ السلام عن اتیان الرجل المرأۃ من خلفھا فی دبرھا

ابو الحسن رضا علیہ السلام سے کسی نے سوال کیا جو آدمی عورت کے ساتھ جائے براز میں وطی کرے تو انہوں

(باقی حاشیہ صفحہ ۳۹۲ پر)

جانتے ہیں کہ کھیت بغرض زراعت ہوتا ہے سو وہ زراعت جو اس کھیت سے مقصود ہے اور وہ پیداوار اس زمین میں ہوتی ہے یہی اولاد ہے جو بطریق معہود ہے عورت کی مباشرت سے متصور ہے۔ اغلام سے متصور نہیں ہاں کوئی افسون یا طلسم (جادو) حضرات شیعہ کے پاس شاید ایسا ہو مثل بازی گروں کے۔ کہیں ڈالیں اور کہیں سے نکالیں۔ شعر

نہیں میں خون سے مژگان تر یہ خار دلنشیں نکلے   جنوں پر نیشتر کیسی کہیں ڈوبے کہیں نکلے

قربان جایئے اس مذہب کے جس میں دنیا میں یہ عیش ونشاط، اور آخرت میں وہ درجات۔ اور بھی کچھ نہ ہو تو اس مذہب کی افضلیت کے لیے متعہ کے فضائل اور حرموں اور امہات الاولاد کی بغرض صحبت و اغلام عاریت دینے کے ثواب اور درجات اور اغلام کا جواز کافی ہے۔ سبحان اللہ اہل سنت پر آوازہ پھینکتے ہیں اور اپنے آپ کو نہیں دیکھتے مگر یوں کہیے کہ اس اسرار کی برکات کی اہلسنت کو خبر نہیں۔ شعر۔

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم   اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

اب فرمایئے کہ لذت کی باتوں کو خدا اور رسول کے نام پر لگا کر شیعوں نے دین آئین بنا رکھا ہے

بقیہ حاشیہ

فقال احلتها آیة من کتاب اللہ تعالیٰ قول لوط علیہ السلام (ھؤلاء بناتی ھن اطھر لکم) (استبصار ص ۲۴۳/۳ و تہذیب الاحکام ص ۴/۱۵۰)

نے فرمایا کہ اس کو تو قرآن پاک کی آیت (یہ میری بیٹیاں ہیں تمہارے لیے حلال ہیں) نے حلال کیا جو لوط علیہ السلام کا قول ہے۔

۲۔ عن صفوان یقول قلت للرضا علیہ السلام ان رجلا من موالیک امرنی ان اسألک عن مسئلة فهابك واستحیا منك ان یسألك قال ما هی قال قلت للرجل ان یاتی امرأته فی دبرها قال نعم ذلک له۔

صفوان کہتے ہیں میں نے ابوالحسن رضا علیہ السلام سے کہا آپ کے موالی میں سے ایک آدمی نے مجھے آپ سے ایک مسئلہ پوچھنے کے لیے کہا ہے وہ خود آپ سے پوچھنے سے شرماتا اور ڈرتا ہے انہوں نے کہا وہ کیا ہے تو صفوان کہتے ہیں میں نے کہا۔ وہ آدمی جو اپنی بیوی سے اس کی دبر میں وطی کرے تو انہوں نے کہا ہاں یہ اس کے لیے درست ہے۔ ۱۲۔ محمد اشرف۔

(استبصار ص ۲۴۳/۳ و تہذیب الاحکام ص ۴/۱۵۰)

یا اہل سنت نے؟

اب لازم یوں ہے کہ بس کیجئے مگر یوں عرض کر دیجئے کہ ایسی باتوں کا سننا (سنانا) تمام شیوہ نہیں پر موافق جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُہَا کے ہم کو بھی دو کر (لہجہ) میں جواب دینا پڑا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ اور صحبت معہود کے احکام سارے ایک ہیں یہاں تک کہ ثُبُوتِ نسب بھی ہے۔ کیا مزے کی بات ہے۔ کتاب (ارشاد) سے اغلام کرنا جائز تھا وہ کیا افسون ہو گا۔ جس سے بچہ بھی دُبُر کی راہ سے آجائے۔ بہر حال حضرات شیعہ کے مذہب میں بڑا لطف ہے کہ متعہ تھا ہی اغلام بھی ہے:

وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ وَخُلَفَاۗءِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ وَاَہْلِ بَیْتِہٖ وَجَمِیْعِ اُمَّتِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔